ستاروں پر کمند
طاہر جاوید مغل

پیش لفظ

''ستاروں پر کمند'' ایک غریب اور بے آسرا نوجوان کی کہانی ہے۔ قدرت نے اسے بلندی کی طرف جانے
کا ہنر عطا کیا تھا۔ وہ اپنے دور دراز گاؤں میں حیران کن تیزی سے درختوں پر چڑھ چڑھ کر لوگوں کو حیران کرتا
تھا۔ پھر ایک فن شناس کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اس نے بھانپ لیا کہ یہ نوجوان اس گاؤں سے نکلا تو اس کی شہرت
کے ڈنکے دور دور تک بجنے لگیں گے۔ لیکن وہ اس خودسر نوجوان کو کیسے آمادہ کرتا؟

تب اسے معلوم ہوا کہ اس مفلس نوجوان کی ایک دکھتی رگ بھی ہے۔ وہ ایک ایسی لڑکی سے بے پناہ پیار
کرتا ہے جسے حاصل کرنا اس کے لیے ناممکن ہے۔ اس نے نوجوان کو بتایا کہ ناممکن کو ممکن کیسے بنایا جا سکتا ہے۔
دیواروں میں دَر کیسے کھولے جاتے ہیں، کانچ سے پتھر کیسے توڑا جا سکتا ہے اور سربکف چوٹیوں کو زیرِ قدم کیسے لایا
جا سکتا ہے۔

پھر وہ ایک دشوار ترین سفر پر نکلے۔ انہوں نے سخت موسموں سے ٹکر لی اور برف زاروں میں اپنے حوصلوں
کی آزمائش کی۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آگے بڑھے اور بڑھتے چلے گئے۔ عادل کی ''محبت'' اس
کی توانائی تھی اور یہ توانائی اسے حالات کے بے رحم طوفانوں سے ٹکرانے کی ہمت دے رہی تھی۔ آخر وہ اپنی
منزل پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ ایک خطرناک مقابلے میں ''گمنام عادل'' نے دنیا کے نامور اور مشاق ''راک
کلائمبرز'' کو شکست سے دوچار کیا۔ وہ اب اپنی محبت کو پا لینے کے قابل تھا...... لیکن نہیں ابھی آزمائش ختم نہیں
ہوئی تھی......

ابھی ایک اور مہلک طوفان اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ رشتوں کے پھیلائے ہوئے زہر اور عداوت کے
بطن سے جنم لینے والی موت کا طوفان تھا۔ اور وہ ان برفانی طوفانوں سے بھی بڑا تھا جن کا سامنا عادل اور اس
کے ''فن شناس'' نے کے ٹو کے دامنوں میں کیا تھا۔ یہ طوفان عادل کی ''محبت'' سمیت بہت کچھ بہا کر لے جانے
کا ارادہ رکھتا تھا۔ تھکے ہوئے عادل کو اس طوفان کا رخ موڑنا تھا یا پھر اپنی جان دینا تھی......

محبت، چاہت اور بلند حوصلوں میں گندھی ہوئی ایک ایسی دلکش داستان جو قارئین کو مدتوں یاد رہے گی۔

طاہر جاوید مغل

عادل بھاگ رہا تھا۔ اس کا جوان جسم ہانپ رہا تھا۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں
تھیں۔ اس کی آنکھوں میں شعلے رقصاں تھے اور کشادہ سینے میں غم کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ وہ سخت سردی میں کھیتوں کھلیانوں
اور پگڈنڈیوں پر بھاگتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے پھیپھڑے پھٹنے لگے، اس کی ہمت جواب دینے لگی لیکن وہ خود کو
اذیت دینا چاہ رہا تھا۔ ایسی بے پناہ اذیت کہ اس کا دھیان اس جسمانی اذیت کی وجہ سے اپنے جانکاہ غم سے ہٹ
جائے۔

وہ بھاگتا ہوا کیکر اور ٹاہلی کے گھنے درختوں میں داخل ہو گیا۔ اس جھنڈ میں کئی جگہ اونچے سرکنڈے بھی تھے جن کے
اوپر کے سفید سرے یخ بستہ ہوا میں ہولے ہولے ہل رہے تھے۔ وہ سرکنڈوں کے اس حصار میں چلا گیا۔ یہاں ٹاہلی یعنی
شیشم کا ایک نوخیز لچکدار پودا بھی تھا۔ تنے کا لپیٹ بمشکل چودہ پندرہ انچ ہو گا۔ اس تنے کے اوپر ایک بوسیدہ لحاف لپیٹا گیا
تھا بلکہ یہ لحاف کا ایک ٹکڑا تھا۔ اس سفید لحاف کے ٹکڑے پر سیاہ روشنائی سے کسی بندے کا ٹیڑھا میڑھا چہرہ بنایا گیا تھا۔
نیچے لکھا تھا۔ ''نوری نت۔''

عادل نے اپنی سانسیں ذرا درست کیں۔ تب اس نے جبڑے بھینچ لیے اور دونوں مکے کس کر نوری نت پر پل پڑا۔
اس نے اسے اندھا دھند ٹھوکریں، گھونسے اور گھٹنے رسید کیے اس پر جیسے جنون سوار ہو گیا تھا۔ اس کی ضربوں میں تواتر اور
سختی تھی۔ دھم دھم کی آوازوں سے ویرانہ گونجنے لگا تھا۔ سردی کے باوجود اس کا خستہ حال لباس پسینے سے تر ہو گیا اور
چہرے کی رگیں اُبھر آئیں۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے شعلے قدرے ماند نظر آنے لگے۔ وہ
لحاف پوش تنے پر مکے برساتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''ڈھائی کروڑ کی حویلی...... ڈھائی کروڑ کی حویلی...... ڈھائی کروڑ اور
صرف ڈھائی کروڑ۔ اس کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا...... کچھ نہیں آتا۔''

بُری طرح ہانپنے کے بعد وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس کی سفید شلوار مٹی میں لتھڑ گئی
تھی۔ کرتہ بھیگ کر پنڈے سے چپک گیا تھا اور ایک تعویذ کھلے گریبان میں سے نکل کر ہوا میں جھول رہا تھا وہ پھر بڑبڑایا۔
''ڈھائی کروڑ کی حویلی۔''

اس کے بعد وہ کافی دیر خاموش بیٹھا رہا۔ دور کہیں ٹیوب ویل چلنے کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ قریب ہی زمیندار مختار
کے ڈیرے پر کوئی بھینس ڈکرائی اور اس کی آواز سناٹے میں دور تک گئی۔ اس کے بعد آوارہ کتوں کا شور سنائی دیا اور تب
ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ عادل کے بس میں ہوتا تو وہ ساری رات یہیں سرکنڈوں کے بیچ بیٹھا رہتا اور اپنے اندر کی

آگ کو اس یخ بستہ ہوا کی مار مار تا رہتا لیکن وہ جانتا تھا کہ ماں گھر میں اکیلی اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔ اس کی نگاہ بار بار دروازے کی طرف اُٹھتی ہو گی اور وہ کھدر کے پرانے لحاف کو بار بار اپنے ناتواں جسم کے گرد لپیٹتی ہو گی۔ وہ جیسے ایک نادیدہ ڈور سے اسے باندھ کر رکھتی اور شام ہوتے ہی اپنی طرف کھینچنے لگتی تھی۔ شاید ساری مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

وہ چند گہری سانسیں لینے کے بعد اپنی جگہ سے اُٹھا۔ چپل دوبارہ پہنی اور د دقدموں سے گھر کی طرف چل دیا۔

یہ بہاولپور کا ایک دور افتادہ گاؤں تھا۔ پکی سڑک یہاں سے کم وبیش پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ گاؤں میں صرف ایک پرائمری سکول تھا جو چھپروں کے نیچے قائم کیا گیا تھا اور ڈاکٹر و اسپتال وغیرہ کا تو یہاں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا...... ڈاک ہفتے میں ایک بار ماسٹر بشیر کے گھر میں آتی تھی اور لوگ خود اپنے خط دیکھ دیکھ کر وہاں سے لے جاتے تھے۔ سڑک کی طرح بجلی کا تار بھی ابھی اس گاؤں سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ گاؤں کے اردگرد کی زمین سیم اور تھور کا شکار تھی اور یہ مسئلہ اردگرد کے آٹھ دس دیہات میں موجود تھا۔ زمین کے اس مرض نے سڑک اور بجلی کی طرح خوشحالی کو بھی اس گاؤں سے کافی فاصلے پر رکھا ہوا تھا، بس گزر بسر ہوتی تھی۔

عادل گاؤں کی تاریک گلیوں سے گزرتا ہوا ایک چھوٹے سے گھر کے سامنے جا رُکا۔ یہ گاؤں کے مختصر ترین گھروں میں سے ایک تھا جہاں عادل اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا...... برآمدے میں تاریکی تھی، اندر کمرے میں لالٹین کی مدھم روشنی زندگی اور حرکت کا احساس دلاتی تھی۔

ماں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اتنی دیر کر دی عادے پتر! مجھے تو نیند آنے لگی تھی۔''

''بس ذرا کام پڑ گیا تھا ماں! تجھے اتی واری کہا ہے، دیر ہو جائے تو سو جایا کر۔ چولہے کے پاس سے روٹی سالن ڈھونڈنا کون سا مشکل کام ہوتا ہے۔''

''مگر تجھے دیکھے بغیر سو جانا تو میرے لیے مشکل کام ہوتا ہے نا۔ چل اب منہ ہتھ دھو لے، میں تیرے لیے کھانا لاتی ہوں۔'' ماں نے کہا۔ منہ ہتھ کی بات کرتے ہوئے اس کی نگاہ عادل کے چہرے پر پڑی اور وہ چونک گئی۔ ایسے معاملے میں ماؤں کی حِس تیز ہی ہوا کرتی ہے۔ ''کیا بات ہے عادے! تُو کچھ پریشان سا ہے۔ کہیں پھر اپنے تائے کی طرف تو نہیں چلا گیا تھا؟''

''نہیں ماں! تُو بھی ہر ویلے نا بس...... باریکیاں ہی ڈھونڈتی رہتی ہے۔'' وہ جھلا کر بولا اور جلدی سے نلکے کی طرف چلا گیا۔

کچھ دیر بعد اپنی چادر سے ہاتھ پونچھتا ہوا واپس آیا تو ماں نے چارپائی پر کھانے کی چنگیر رکھ دی اور لالٹین کچھ قریب کھسکا دی۔ عادل آلتی پالتی مار کر بیٹھا تو اس نے کمبل اس کے کندھوں پر ڈال دیا۔ ''تُو نہیں کھائے گی؟'' عادل نے پوچھا۔

''میں نے تو نماز کے بعد ہی کھا لیا تھا۔ شریفاں کے گھر سے تڑکے والے چاول آ گئے تھے۔ تُو تو کھاتا نہیں ہے۔ میں نے ہی کھا لیے...... بلکہ کچھ زیادہ ہی کھا لیے۔''

دال کدو کا کل والا سالن ہی تھا مگر روٹی تازہ تھی اور پھر اس میں ماں کے ہاتھ کا سواد بھی تھا۔ عادل کا دل کچھ کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا مگر ماں سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے دو چار لقمے لیے تو پھر دل بھی کرنے لگا۔ کھانا کھا کر اس نے

ڈکار لی اور گڑ کی ڈھیلی ڈھونڈنے کے لیے ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ گڑ بھی ختم ہو چکا تھا، بس کنستر کے نیچے تھوڑا سا بھورچُور پڑا تھا۔ اس نے گڑ کھا کر ایک اور چھوٹی سی ڈکار لی۔ نلکے کے تازہ پانی سے کلی کی اور اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ ماں نے لالٹین کی لَو بالکل نیچی کر دی تھی۔

وہ کمبل کے نیچے کروٹ پر کروٹ لیتا رہا۔ بدن اور دماغ میں پھر چنگاریاں سی بھرنے لگی تھیں۔ تایا فراست کی شکل بار بار نگاہوں میں گھومتی تھی اور ان کے کہے ہوئے وہ الفاظ جنہوں نے اس کو چھید دیا تھا اور کسی وقت اسے لگتا تھا کہ شاید انہوں نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ کہاں وہ اونچی حویلیوں میں رہنے والے، مُربعوں اور باغوں کے مالک، کہاں وہ کسی کے فارم پر دیہاڑی پر کام کرنے والا مزدور اور مزدور بھی وہ جسے ابھی پچھلے تین ہفتوں کی پگار بھی نہیں ملی تھی۔ مہینے کے پہلے ہفتے کی پگار فارم کے مالک کرم داد نے اسے پھل کی صورت میں دی تھی بلکہ کہنا چاہیے کہ اس کے گلے ڈال دی تھی۔ یہ کوئی تیس درجن مالٹے ہوں گے۔ مالٹوں کو بوری میں بھر کر بیس کلومیٹر دور قصبے تک لے جانا اور ان کو منڈی میں بیچنا عادل کے لیے کافی مشکل تھا۔ آنے جانے کے لیے بھاڑا درکار تھا، اس لیے یہ کچے پکے مالٹے وہیں چھوٹے کمرے کے ایک کونے میں پڑے رہے تھے۔ ماں نے تھوڑے بہت اڑوس پڑوس کے بچوں کو دے دیئے تھے، باقی وہیں پڑے سوکھ رہے تھے۔ اتنی سردی میں ان مالٹوں کو کھانا بھی خود پر جبر کرنے کے مترادف ہی تھا۔

عادل کو کافی دیر تک نیند نہیں آئی۔ اچانک اسے آہٹ کا احساس ہوا۔ اس نے کمبل میں سے سر نکال کر دیکھا۔ ماں اپنے بستر پر موجود نہیں تھی۔ اسے برآمدے کی طرف سے کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی۔ لالٹین کی مدھم روشنی بھی اُسی طرف تھی۔ وہ ہولے سے چارپائی پر سے اُترا اور کچے فرش پر ننگے پاؤں چلتا ہوا برآمدے کی طرف آیا۔ ماں چولہے کے پاس بیٹھی تھی، اس کے سامنے مرچ مسالا کوٹنے والی کونڈی تھی۔ عادل نے روٹی کے جو ٹکڑے چھوڑے تھے وہ اس کے ہاتھ میں تھے۔ وہ انہیں کونڈی میں رگڑ رگڑ کر کھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے ایک آہ بھری اور چپکے سے واپس آ کر بستر پر لیٹ گیا۔

وہ مسلسل جاگ رہا تھا۔ آج بڑی تلخ رات تھی، کسی زہر کی طرح اس کے رگ و پے میں اُتر رہی تھی اور آگ بن کر اس کے خون میں گردش کر رہی تھی۔ کیا وہ اسے کھو دے گا؟ کیا وہ ہمیشہ کے لیے اس سے دور ہو جائے گی؟ کیا وہ اس کے بغیر زندہ رہ سکے گا اور کیا...... وہ زندہ نہ رہا تو اس کی ماں زندہ رہ پائے گی؟ اَن گنت سوالات تھے اور ہر سوال اس کی گردن پر کند چھری کی طرح حرکت کرتا تھا۔

اچانک کمرے کی کچی دیوار پر مخصوص ٹھک ٹھک سنائی دی۔ عادل کا بستر اس دیوار کے بالکل ساتھ تھا۔ عادل نے اس ٹھک ٹھک کا جواب دیا۔ اس نے اپنے ہاتھ کی پشت سے دو تین بار دیوار پر ہلکی سی چوٹ لگائی اور پھر گرم کمبل سے باہر نکل آیا۔ ماں سو رہی تھی، اس کی بھاری سانسیں نیم تاریک کمرے میں گونج رہی تھیں۔ عادل نے کمبل کو درست کر کے چارپائی پر رکھا بغیر آواز پیدا کیے چپل پہنی اور کمرے سے نکل آیا چند ہی لمحے بعد وہ گھر کی کچی سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ چکا تھا۔ ساتھ والے گھر کی چھت پر ایک کچا ڈھارا سا بنا ہوا تھا۔ اس ڈھارے کی دیوار کے سائے میں کوئی موجود تھا یہ عادل کی پڑوسن ریحانہ تھی۔ ریحانہ ان ملازموں میں سے تھی جو تایا فراست کی وسیع و عریض حویلی میں صفائی ستھرائی کا کام کرتے تھے۔ ریحانہ، عادل کو بھائی کہتی تھی اور اس کی حیثیت عادل اور شہزادی کے رازدار کی سی تھی۔ شہزادی تایا فراست

کی اکلوتی بیٹی کا نام تھا۔ وہی بیٹی جو عادل کے رگ و پے میں سما چکی تھی...... جو سانس بن کر اس کے سینے میں آتی جاتی تھی، دھڑکن بن کر اس کے دل میں دھڑکتی تھی اور لہو بن کر اس کی رگوں میں سنسناتی تھی۔

قدرے فربہ اندام ریحانہ نے خود کو گرم چادر میں لپیٹا ہوا تھا اور ڈھارے کی دیوار کے بالکل ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ دونوں چھتوں کے درمیان بس دو تین فٹ اونچی کچی منڈیر تھی۔

ریحانہ بولی تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ''عادے بھائی! شہزادی شام سے رو رہی ہے۔ آج جو کچھ ہوا اس کا بہت دُکھ ہے اسے۔ بہت زیادہ دُکھ ہے۔''

''خیر، یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔'' عادل نے لمبی سانس کھینچی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا جوان سینہ کچھ اور بھی پھیل گیا۔

ریحانہ کچھ دیر خاموش رہ کر بوجھل آواز میں بولی۔ ''عادے بھائی! شہزادی نے مجھے تمہارے لیے ایک پیغام دیا ہے۔''

''کیا کہتی ہے؟''

ریحانہ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ''عادے بھائی! وہ بھی کہتی ہے کہ اس کا اور تمہارا میل نہیں ہو سکتا۔ بدنامی اور جگ ہنسائی کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ اس لیے چنگا یہی ہے کہ اپنے رستے وکھرے کر لیے جائیں۔ وہ کہتی ہے کہ مجھ میں اور دُکھ سہنے کی ہمت نہیں ہے اور نہ وہ تم کو اور ماں جی کو دُکھی دیکھ سکتی ہے۔ اس نے...... تمہارا دیا ہوا...... یہ چھلا بھی واپس کیا ہے۔ اور تم سے معافی مانگی ہے۔'' ریحانہ نے ریشمی کپڑے کی دھجی میں لپٹا ہوا چاندی کا چھلا عادل کی طرف بڑھایا۔

عادل گم صم بیٹھا رہا۔ اس نے چھلا واپس لینے کے لیے بھی ہاتھ نہیں بڑھایا۔

''کیا سوچ رہے ہو عادے بھائی؟''

وہ تلخی سے بولا۔ ''یہ چھلا اسے واپس کر دو ریحانہ! اس سے کہنا کہ یہ میں نے اسے دے دیا ہے، چاہے اپنے پاس رکھے یا کوڑے میں پھینک دے۔''

''بھائی! یہ بات نہیں ہے کہ وہ تم سے پیار نہیں کرتی۔ وہ جتنا کرتی ہے بس میں ہی جانتی ہوں، پر وہ مجبور ہے۔ وہ اپنے ماں پیو کی مرضی کے خلاف نہیں جا سکتی۔ وڈے مالک نے اسے بہت زیادہ جھڑکیاں دی ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ اب کبھی اُسے گھر سے اکیلے باہر نکلنے دیں گے اور اگر اس نے کہیں ایسا کیا تو وہ تو اس کا خون پی جائیں گے۔''

''مطلب یہ کہ وہ حوصلہ چھوڑ رہی ہے۔ ہار مان رہی ہے پر میں اتنی آسانی سے ہار نہیں مانوں گا ریحانہ! میں پوری کوشش کروں گا۔ آخری دم تک کروں گا۔ تایا فراست نے جو بات کہی ہے، میں اسے ویاہ کر دکھاؤں گا۔ چاہے اس میں جان ہی چلی جائے۔ انہوں نے تین سال کی مہلت دی ہے اور ابھی اس میں سے بس ایک دن کم ہوا ہے۔'' اس کی آواز غصے اور جوش سے لرز رہی تھی۔

ریحانہ نے التجا کے لہجے میں کہا۔ ''عادے بھائی! ایویں ہوا کے پیچھے نہ بھاگو، جو کام ہو نہیں سکتا اس کے لیے خود کو رولنے سے کیا فائدہ اور پھر وڈے وڈیرے تو یہی کہتے ہیں نا کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ اگر تمہارا جوڑا بھی بننا ہو گا تو کسی نہ کسی طرح خود ہی بن جائے گا۔ نہیں تو خود کو جتنا مرضی ہلکان کرو، کچھ نہیں ہو سکے گا، اس لیے......''

''اچھا زیادہ پڑنانی نہ بن تُو۔'' عادل نے تلخی سے اس کی بات کاٹی۔ ''میں نے جو کچھ کرنا ہے وہ میں چنگی طرح جانتا ہوں اور تُو جا کر اس سے کہہ دینا۔ میں اتنی آسانی سے ہار نہیں مانوں گا اور اگر ہار ہی گیا تو پھر صرف اس کو ہی نہیں ہاروں گا، ساتھ میں اپنی جان بھی ہاروں گا۔''

وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

وہ رات تو جیسے تیسے کٹ گئی۔ اگلا دن اس کے لیے اور بھی گمبھیر تھا وہ صبح سویرے ناشتہ کیے بغیر ہی گھر سے نکل گیا۔ ماں اس وقت پھٹے ہوئے لحاف میں گھٹنے پیٹ سے لگائے پڑی تھی۔ جاتے جاتے عادل نے اپنا والا کمبل بھی آہستہ سے اس پر ڈال دیا تھا۔ سورج ابھی اُگا نہیں تھا۔ زمین پر کلر تھا اور گلیوں میں کہرے کی چادر تھی۔ وہ بے مقصد پیدل چلتا رہا اور ایک بار پھر درختوں کے اسی جھنڈ میں پہنچ گیا جہاں شیشم کے ایک نوخیز تنے کے ساتھ پرانا گدیلا سا بندھا ہوا تھا اور چھوٹا سا اکھاڑا بھی تھا۔ عادل کے ہجولی لڑکے یہاں زور آزمائی کرتے تھے......اور کبھی کبھی سچ مچ لڑ بھی پڑتے تھے۔ مگر ان لڑائیوں میں نفرت یا عداوت نہیں ہوتی تھی بس وقتی غصہ ہوتا تھا، کسی نے کسی کے حلیے کے بارے میں کوئی بات کہہ دی، کسی کی محبوبہ کے بارے میں کوئی پھبتی کس دی، یا ایسی ہی کوئی اور بات۔ ایسی لڑائیاں جتنی جلدی شروع ہوتی تھیں اتنی ہی جلدی ختم بھی ہو جاتی تھیں۔

مگر اس وقت صبح سویرے درختوں کے اس جھنڈ میں، ٹھٹھرے ہوئے سرکنڈوں کے درمیان اور کوئی نہیں تھا۔ بس ایک آوارہ کتا ایک کونے میں دبکا ہوا تھا۔ وہ بھی اسے دیکھ کر خاموشی سے ایک طرف نکل گیا۔ عادل نے ''نوری نت'' پر چند زوردار مکے برسائے مگر یہاں بھی اس کا دل نہیں لگا۔ وہ وہاں سے نکل آیا اور درختوں کے درمیان پیدل ہی آگے بڑھنے لگا۔ اس کا قد چھ فٹ سے کم نہیں تھا۔ شانے چوڑے، جسم دبلا پتلا لیکن بہت مضبوط، کمر چیتے کی طرح پتلی اور ٹانگیں سبک۔ غربت کے باوجود چہرے پر صحت مندی کی جھلک تھی اور انگ انگ سے جوانی کی سرمستی اور توانائی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی...... ہاں وہی عمر جب چال میں پہاڑی ندیوں کی سی طغیانی ہوتی ہے اور لب و لہجے میں برق لہراتی ہے، جب مشکلات ہیچ محسوس ہوتی ہیں اور سنگلاخ رکاوٹوں کے ساتھ ٹکرانے کو دل چاہتا ہے۔

وہ کسی جوان چیتے ہی کی طرح لمبے ڈگ بھرتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی چال ڈھال سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس کے جسم میں بے پناہ لچک ہے اور اس کی حسیات بے حد تیز ہیں۔ وہ کافی دور نکل آیا۔ اب سورج نکل آیا تھا اور ''سردیوں'' کی زرد دھوپ، کہرے کی چادر کو چیرنے کی کوشش کر رہی تھی، ایک ویران جگہ پر سُوا (چھوٹی نہر) کا پانی جھلک دکھا رہا تھا۔ کناروں پر گھاس تھی اور دھوپ تیزی کے ساتھ اس گھاس پر سے اوس کے موتی چن رہی تھی۔ وہ ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور بہتے پانی کو دیکھنے لگا۔ یہ جگہ ان یادگار جگہوں میں سے تھی جہاں شہزادی اس سے ملی تھی۔ یہ ملاقاتیں بہت زیادہ تو نہیں تھیں لیکن جتنی بھی تھیں انمٹ حروف میں عادل کے دل پر نقش تھیں۔ وہ سوچنے لگا۔ یہاں وہ بیٹھی تھی، اس نے اس شاخ پر ہاتھ رکھا تھا، یہاں اس نے ٹیک لگائی تھی۔ عید سے ایک دن پہلے کی وہ کتنی خوبصورت شام تھی۔ اَن گنت اندیشوں کے باوجود ان کی آنکھوں میں سپنوں کی جھلک تھی، آنے والے دنوں میں انہونیوں کی امید تھی۔ انہوں نے خاموشی کی زبان میں وعدے کیے تھے، پیمان باندھے تھے۔ اس نے ایک آہ بھری اور سوچنے لگا۔ یہ انہونیوں کی امید انسان کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتی، یہ دریاؤں اور ندی نالوں کا پانی کیوں وہیں سر ٹکراتا ہے جہاں اسے رستہ نہیں ملتا۔

وہ دیر تک اس چھوٹی نہر کے کنارے بیٹھا رہا۔ آخر اس نے طے کرلیا کہ وہ اپنی بوڑھی والدہ کو اپنے منہ بولے طفیل ماموں کے گھر چھوڑ کر شہر کا رخ کرے گا اور اپنی قسمت آزمائے گا۔ شہزادی کو جیتنے کے لیے ایک ایسی بھرپور کوشش جو کوشش کے لفظ کا حق ادا کردے اور جس کے بعد دل میں کوئی حسرت نہ رہے۔ ابھی تک اس نے لاہور کا صرف نام سنا تھا۔ وہاں گیا نہیں تھا لیکن اس ''شہرِ ہفت رنگ'' کے بارے میں اسے کافی معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ سب سے بنیادی ''علم'' تو یہی تھا کہ لاہور یہاں سے کم وبیش 500 میل کے فاصلے پر ہے۔ اسے پہلے پیدل، پھر تانگے، پھر بس اور آخر میں ریل گاڑی پر سفر کرنا ہوگا یا آخر میں پھر کسی اور بس میں بیٹھنا ہوگا۔ اس سفر کے لیے اسے کم از کم ایک ہزار روپے کرایہ درکار تھا۔ اس کے علاوہ اضافی طور پر دو تین سو روپیہ تو اس کی جیب میں ہونا چاہیے تھا یعنی کل ملا کر تقریباً تیرہ چودہ سو روپیہ...... اور عادل کے لیے یہ اچھی خاصی رقم تھی۔ وہ آج کل ایک مقامی زمیندار کرم داد کے فارم پر درختوں سے پھل اُتارنے اور ان کو چھانٹنے کا کام کر رہا تھا۔ اس کی پچھلے تین ہفتے کی مزدوری اکیس سو روپے بنتی تھی لیکن عادل کو معلوم تھا کہ ملک کرم داد اسے یکمشت تیرہ چودہ سو روپے سے زیادہ نہیں دے گا۔ اس سے کرائے کا انتظام تو ہو جاتا لیکن وہ جو پچھلے دو مہینے سے ماں کے لیے نئے لحاف کا سوچ رہا تھا اس کا کیا بنتا اور گھر کے راشن کا کیا ہوتا۔ بے شک اس نے ماں کو ماموں طفیل کے گھر چھوڑ کر جانا تھا مگر کھانے پینے کا خرچا تو ماموں طفیل کو دیئے بغیر گزارا نہیں تھا۔ ماں کو تھوڑی بہت دوا کی ضرورت بھی پڑتی رہتی تھی اور عادل کو ہرگز گوارا نہیں تھا کہ وہ یہ سارا بوجھ ماموں طفیل پر ڈالے......

وہ بہت دیر تک اس گمبھیر ''معاشی مسئلے'' کو حل کرنے کی کوشش کرتا رہا...... ایک بار ریل میں بلاٹکٹ سفر کرنے کا خیال بھی اس کے ذہن میں آیا لیکن پھر اس نے خود ہی اس کو رَد کر دیا۔ سوچتے سوچتے اچانک عادل کے ذہن میں امید کی ایک کرن چمکی...... پانچ چھ دن بعد ساتھ والے گاؤں شاہ نوانہ میں میلا تھا۔ علاقے کے لوگ سال بھر اس میلے کا انتظار کرتے تھے۔ یہاں بہت سے کھیل تماشے بھی ہوتے تھے۔ کبڈی، کشتی، رسّا کشی اور اس طرح کے دیگر مقابلے میلے کی جان تھے۔ ان میں سے ایک مقابلہ درختوں پر چڑھنے کا بھی ہوتا تھا۔ پچھلے سے پچھلے سال عادل نے بھی اس مقابلے میں حصہ لیا تھا اور پندرہ سو روپے نقد کا پہلا انعام حاصل کیا تھا۔ پچھلے سال والدہ بیمار تھی اور وہ اسے لے کر تحصیل ہسپتال گیا ہوا تھا، اس لیے اس مقابلے میں حصہ نہیں لے سکا تھا اور چودھری مختار کے باغ میں کام کرنے والا ملازم فیروز عرف حبشی پہلے نمبر پر آ گیا تھا۔ میلے اور مقابلے کا سوچ کر عادل کے رگ وپے میں حرارت سی جاگ گئی اور سینے میں میٹھا میٹھا جوش لہر لینے لگا۔

درخت پر چڑھنے والا مقابلہ اس میلے میں پچاس ساٹھ سال سے مسلسل ہو رہا تھا۔ بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ عرصے سے ہو رہا تھا۔ یہ بڑا دلچسپ مقابلہ تھا۔ ایک ہموار جگہ پر درخت کے چار بالکل سیدھے تنے تھے۔ یہ کھجور کے سوکھے ہوئے درخت تھے۔ قریباً ایک ہی جتنے موٹے تھے اور ان کی اونچائی ٹھیک 12 گز یعنی 36 فٹ تھی (ممکن تھا کہ ان کی اصل لمبائی کم زیادہ ہو لیکن انہیں کاٹ کر برابر کر دیا گیا تھا۔) مقابلے کے وقت ان چاروں خشک تنوں کے بالائی سرے پر ایک ایک سرخ جھنڈا گاڑا جاتا تھا۔ کھلاڑیوں کو خالی ہاتھ تیزی سے ان درختوں پر چڑھنا ہوتا تھا۔ جو سب سے پہلے جھنڈا اُتار لیتا تھا جیت جاتا تھا۔ بالکل سادہ سا کھیل تھا۔ نہ جانے کیوں عادل کو یقین ہونے لگا کہ اس مرتبہ وہ نہ صرف کھیلے گا بلکہ جیتے گا بھی اور یہ جیت اسے اس دور دراز کلر زدہ گاؤں سے اُٹھا کر روشنیوں کے شہر لاہور تک پہنچانے

میں مدد دے گی۔

○……❖……○

چھ سات روز بعد میلے کا منظر تھا۔ شاہ نوانہ گاؤں کے اردگرد کھیتوں اور کھلے میدانوں میں دور تک رنگ برنگے خیمے اور عارضی چھپر نظر آ رہے تھے۔ چھوٹی بڑی اَن گنت دکانیں سجی ہوئی تھیں۔ تھیٹر، سرکس، جھولے وہ سب کچھ یہاں موجود تھا جو پنجاب کے دیہی میلوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ آج میلے کا دوسرا اور بھرپور دن تھا۔ عادل کو معلوم تھا کہ آج تایا فراست اور ان کے گھر کی عورتیں بھی میلے میں آئیں گی۔ وہ صبح ہی سے شہزادی کی دید کا منتظر تھا۔ دس بجے کے قریب تین سجے سجائے تانگوں کا قافلہ میلے کی حدود میں داخل ہوا۔ آگے پہلے دو دو مسلح گھڑ سوار تھے۔ ان تانگوں کی چاروں جانب ریشمی چادروں سے پردہ کیا گیا تھا۔ یہی علاقے کا رواج تھا۔ تایا فراست خود بھی ایک سفید گھوڑی پر سوار تھے۔ ساتھ میں ان کے دو بیٹے قاسم اور عاصم بھی گھڑسواری کر رہے تھے۔ دونوں تنومند جوان تھے۔ تایا فراست کی طرح ان دونوں کے زرق برق لباس اور اونچے شملے بھی ان کی شان وشوکت کو نمایاں کر رہے تھے۔ دیکھا جائے تو قاسم اور عاصم رشتے میں عادل کے تایا زاد بھائی تھے لیکن ''حیثیت'' کے فرق نے جہاں اور بہت سے فاصلے پیدا کیے تھے وہیں ان دونوں کو بھی عادل سے بہت دور رکھا تھا۔

عادل دور ایک مٹھائی فروش کی عارضی دکان کے عقب میں کھڑا تھا۔ اس کی تمام تر توجہ درمیانی تانگے کی طرف تھی۔ اسے معلوم تھا کہ شہزادی اسی تانگے سے اُترے گی۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ دوسری عورتوں کے ساتھ شہزادی اسی تانگے سے اُتری۔ عادل کی پیاسی نگاہیں اس کی جھلک دیکھنے میں کامیاب رہیں۔ وہ ستاروں کے جھرمٹ میں چاند کی طرح تھی۔ گورا رنگ، سبک بدن، مہندی رنگ کے جھلملاتے لباس میں وہ سچ مچ ''شہزادی'' ہی نظر آتی تھی۔

سب عورتیں میلے کے اس حصے کی طرف چلی گئیں جہاں صرف عورتوں کے لیے اسٹال وغیرہ لگائے گئے تھے۔ اس جانب مردوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ عادل اپنے دوستوں کے ساتھ اِدھر اُدھر گھومتا رہا اور سہ پہر کا انتظار کرتا رہا۔ درختوں پر چڑھنے والا دلچسپ مقابلہ سہ پہر کے وقت ہی ہونا تھا۔ مقامی رواج کے مطابق اسے ''چڑھائی'' یا ''چڑھائی کا مقابلہ'' کہا جاتا تھا۔

کھلے میدان میں کھجور کے چار بالکل سیدھے تنے کھڑے تھے۔ عام دنوں میں بھی لڑکے بالے ان پر چڑھنے اُترنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ان کے چھوٹے بڑے ڈنڈل قدرے ہموار اور چکنے ہو چکے تھے۔ یہ چڑھائی کرنے والوں کے جسموں کو زیادہ چھیلتے نہیں تھے۔ آج ہر درخت کے اوپر ایک چھوٹا سا سرخ جھنڈا لہرا رہا تھا اور درختوں کے نیچے زمین پر چونے سے دائرے بنائے گئے تھے۔ میدان میں سیکڑوں لوگ جمع ہو چکے تھے اور بے چینی سے مقابلے کے آغاز کے منتظر تھے۔

عادل کو امید تھی کہ تایا فراست اور ان کے گھر والے بھی مقابلہ دیکھنے والوں میں شامل ہوں گے...... اور گھر والوں میں شہزادی بھی تھی مگر یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ تایا کے گھرانے میں سے صرف ان کا ایک سمبندھی اور بیٹے قاسم اور عاصم ہی تماشائیوں میں موجود تھے۔ آج کافی کچھ معمول سے ہٹ کر ہوا تھا۔ اس سے پہلے شہزادی اور دیگر لڑکیاں پورے میلے میں گھوما پھرا کرتی تھیں، مگر آج وہ صرف زنانے حصے تک ہی محدود رہی تھیں۔ یہاں چڑھائی کے مقابلے میں بھی تایا کے

گھر کی کوئی عورت موجود نہیں تھی۔ ہاں کچھ دوسرے زمینداروں کی طرح چودھری مختار کے گھر کی عورتیں اور ملازمائیں بھی تماشائیوں میں دکھائی دے رہی تھیں۔ چودھری مختار کا ''کاماں'' فیروز عرف حبشی، عادل کا سب سے تگڑا حریف تھا۔ وہ اصیل مرغ کی طرح اکڑا اکڑا پھر رہا تھا۔ اسے پچھلے سال کی جیت کا کاتھا۔

عادل کا دوست کوڈا اس کے پاس آیا اور کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ''لے میرے یار! تھوڑا سا اور خوش ہو جا۔ چودھری مختار صیب نے بتایا ہے کہ اس بار انعام کی رقم پندرہ سو سے بڑھا کر دو ہزار کر دی گئی ہے۔ سو سو والے لال رنگ کے پورے وی نوٹ۔ آج جان لڑا دے سجن پیارے۔''

''حبشی کدھر ہے؟'' عادل نے پوچھا۔

''اُدھر گرم شرم کر رہا ہے اپنے آپ کو۔ ڈنڈ بیٹھکیں لگا رہا ہے۔ ابھی باداموں کی پوری آدھ کلو گریاں کھلائی ہیں اسے چودھری مختار نے۔ اوپر سے دو کلو گرم دودھ پیا ہے اُس نے۔ تُو بھی تھوڑا سا کچھ کھا پی لے۔ حلوا پوری لاؤں تیرے لیے؟''

''نہیں، میں نے بھی ابھی دودھ پیا ہے۔''

''جھوٹ نہ بول عادے۔ مجھے تو لگتا ہے تُو نے ناشتہ بھی چنگی طرح نہیں کیا۔''

''تُو نے میرے پیٹ میں وڑ کر دیکھ لیا ہے؟'' عادل نے خشک لہجے میں کہا تو کوڈا چپ ہو گیا۔

ویسے کوڈا کہہ ٹھیک ہی رہا تھا۔ سویرے باسی روٹی کے ساتھ اس نے تھوڑا سا اچار کھایا تھا اور بس۔ شاید کھانے کو کچھ ہوتا بھی تو اس کا دل نہ چاہتا۔ آج کل کچھ عجیب کیفیت تھی اُس کی۔ ہر چیز سے دل اچاٹ تھا۔ وہ بس جلد از جلد اس خشکی مارے گاؤں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اپنی زندگی کے لیے اور شہزادی کے لیے ایک بھرپور لڑائی لڑنا چاہتا تھا۔ تایا فراست نے ٹھیک ہی تو کہا تھا اس سے کہ وہ خود پر غور کرے اور دیکھے کہ شہزادی کے مقابلے میں وہ کہاں کھڑا ہے۔

ڈھول پر چوٹ پڑی اور مقابلہ شروع ہو گیا۔ کل سولہ لڑکے اس مقابلے کے لیے منتخب ہوئے تھے۔ ان میں عادل اور فیروز عرف حبشی بھی شامل تھے۔ چار چار لڑکوں کی چار ٹولیاں تھیں۔ ہر ٹولی میں سے ایک لڑکے کو جیتنا تھا۔ آخر میں جیتنے والے چاروں لڑکوں کا فائنل مقابلہ ہونا تھا پہلے نمبر پر آنے والے کو دو ہزار اور دوسرے پر آنے والے کو پانچ سو روپے حوصلہ افزائی کے ملنا تھے۔ آج ایک نئی بات بھی ہوئی تھی اور وہ یہ کہ شہر سے ایک مووی کیمرے والا بھی یہاں آیا ہوا تھا اور فلم بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

پہلے چار لڑکوں کا مقابلہ ہوا۔ وہ تنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے اپنے جوتے اُتار دیئے تھے اور نظریں 36 فٹ اوپر سرخ جھنڈوں پر گاڑ دی تھیں۔ ان میں فیروز عرف حبشی بھی شامل تھا۔ چودھری مختار اس کی حوصلہ افزائی کے لیے خود موقعے پر موجود تھا اور بار بار اس کی پیٹھ ٹھونکتا تھا۔ آخر ڈھول پر چوٹ پڑی اور چاروں لڑکوں نے تیزی سے درختوں پر چڑھنا شروع کر دیا۔ پتا نہیں کیوں عادل کے دل میں یہ دبی ہوئی خواہش موجود تھی کہ حبشی اس کھیل میں آگے نہ جا سکے اور یہیں ہار جائے۔ شاید ہر سخت حریف کے حوالے سے دوسرے حریف کی یہی خواہش ہوتی ہے۔ بہر حال ہوا وہی جس کی توقع تھی۔ آدھی چڑھائی کے فوراً بعد گہری رنگت والا حبشی آگے نکل گیا...... اور آخر تک آگے ہی رہا۔ اس نے سب سے پہلے جھنڈا اُکھاڑ کر ہوا میں لہرایا اور فضا تالیوں اور نعروں سے گونج اُٹھی۔

عادل کی طرح فیروز عرف حبشی بھی ''باغ مزدور'' تھا اور ہر طرح کے درختوں سے پھل اُتارنے کا کام کرتا تھا۔ یقیناً اس کا یہ پیشہ بھی ''چڑھائی'' والے کھیل میں اس کی مدد کرتا تھا۔

عادل کی باری تیسری ٹولی کے ساتھ تھی۔ وہ آگے بڑھنے لگا تو کوڈے نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''لال رنگ کے پورے وی نوٹ۔''

چاروں لڑکے تنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ ڈھول پر چوٹ پڑی اور تیزی سے چڑھائی شروع ہو گئی۔ شروع میں عادل تھوڑا سا پھسل گیا۔ دوسرے آگے نکل گئے، اس کے باوجود اس نے ہمت کر کے زور مارا اور آخر میں یہ مقابلہ جیتنے میں کامیاب ہو گیا۔ (اب وہ فائنل کھیلنے کا حق دار تھا) درخت کی چوٹی پر پہنچ کر اس نے سرخ جھنڈا ہوا میں لہرا دیا۔ اس کے دوستوں اور ہمدردوں نے شور مچا کر اسے داد دی۔ بلندی سے اسے پورا میلا نظر آ رہا تھا۔ دور تک شامیانوں اور عارضی جھونپڑوں کی قطاریں، پکوانوں کی دکانوں سے اُٹھتا ہوا دھواں، عادل کی نگاہیں ایک کھیت کے کنارے کھڑے تین عدد تانگوں پر جم گئیں۔ ان کے گرد ریشمی چادروں کا پردہ تھا۔ پردوں میں سے کچھ چہرے بھی جھانک رہے تھے ان میں ہی سے ایک چہرہ یقیناً شہزادی کا بھی ہوگا۔ عادل نے سوچا اور اس کا کشادہ سینہ خوشگوار دھڑکنوں سے بھر گیا۔ اس نے ایک بار پھر جھنڈا ہوا میں لہرایا اور نیچے اُتر آیا۔

اگلے مقابلے میں وہ چاروں لڑکے شامل تھے جو اپنی اپنی ٹولی میں پہلے نمبر پر رہے تھے اور یہ بڑا سخت مقابلہ تھا، کسرتی جسم والا تنومند حبشی اس کی طرف جلتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے جسم پر ایک لمبا کچھا (نیکر) اور بنیان تھی۔ عادل کے جسم پر فقط شلوار تھی، اس کے سینے پر درخت کی رگڑیں تھیں۔ حبشی کے مقابلے میں عادل کا جسم چھریرا تھا۔ خاص طور سے اس کی کمر دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کشادہ سینے کے نیچے یہ پتلی کمر بالکل چیتے کے جیسی تھی۔

فائنل مقابلہ سنسنی خیز تھا۔ ڈھول پر چوٹ پڑتے ہی چاروں لڑکوں نے تیزی سے تنوں پر چڑھنا شروع کیا۔ انہوں نے ٹانگوں اور بازوؤں کو کلاوؤں کی شکل دے دی تھی اور چھوٹی چھوٹی جستوں کی صورت میں اوپر چڑھ رہے تھے۔ عادل کے جسم میں عجیب سی آگ بھری ہوئی تھی۔ اس آگ نے اس نہایت سخت مقابلے کو اس کے لیے آسان بنا دیا۔ وہ آدھا رستہ طے ہونے سے پہلے ہی آگے نکل گیا اور پھر اس فرق کو بڑھاتا چلا گیا۔ حبشی سرتوڑ کوشش کے باوجود اس کے قریب بھی نہیں پھٹک سکا۔ ایک نہایت واضح فرق کے ساتھ عادل نے یہ مقابلہ جیتا اور سرخ جھنڈا ہوا میں لہرا دیا۔ نیچے ڈھول کی تھاپ پر بھنگڑے ڈالے جانے لگے۔ جیت کی خوشی منانے والے زیادہ تر کھیت مزدور اور غریب غربا ہی تھے۔ عادل نے ایک بار پھر دور نیچے ریشمی پردوں والے سجے سجائے تانگوں کو دیکھا۔ کیا وہ خوش رنگ، ہرنی جیسی آنکھوں والی بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ''شہزادی! تُو مجھے دیکھ رہی ہے یا نہیں دیکھ رہی...... لیکن یقین رکھ کہ تیرا عشق مجھے ایسے ہی آگے بڑھائے گا، میں ایک دن ایسے ہی تیرے نام کا جھنڈا ہوا میں لہراؤں گا اور تجھے گلے سے لگاؤں گا۔''

○......❖......○

اب عادل کے پاس راشن کے پیسے موجود تھے۔ ماں کے اوپر لحاف بھی آ چکا تھا...... پہلے والی روئی میں کچھ مزید روئی ڈال لی گئی تھی اور اس پر چھینٹ کا نیا کپڑا اچڑھا دیا گیا تھا۔ ماں نے بڑی محبت سے لحاف کو اپنے اردگرد لپیٹا ہوا تھا۔

لالٹین کی زرد روشنی میں ماں کے سفیدی مائل بال چمک رہے تھے اور چہرے پر مسرت کی جھلک تھی۔ وہ چارپائی پر پائنتی کی طرف بیٹھا ماں کے پاؤں دبا رہا تھا اور ساتھ ساتھ سوچ رہا تھا کہ اس کو اپنی روانگی کے بارے میں کس طرح بتائے۔ وہ تو اس سے ایک دو دن کی دوری بھی برداشت نہیں کرتی تھی۔ کہاں اب ہفتوں اور مہینوں کی جدائی پڑنے والی تھی۔ ماں بہت خوش تھی۔ عادل نے سوچا، چلو ابھی اس خوشی کو برقرار رہنے دیتے ہیں، کل اطمینان سے، پہلے ان کا ذہن بنائیں گے پھر بتائیں گے۔

ماں سوگئی تو وہ آہستہ سے اُٹھا اور اپنے بستر پر آ گیا۔ کمبل لپیٹ کر اور دیوار سے ٹیک لگا کر لیٹا رہا۔ روزن میں سے درمیانی راتوں کا چاند جھانک رہا تھا۔ اس نے سوچا یہی چاند پال پور گاؤں کے آخری سرے پر تایا فراست کی شاندار حویلی پر بھی چمک رہا تھا۔ حویلی کے برجوں پر، اس کے باغیچوں پر، کھلے برآمدوں کے فرش پر، کیا پتا، شہزادی بھی کسی ادھ کھلی کھڑکی یا نیم وا روزن میں سے اس چاند کو دیکھ رہی ہو۔ (پال پور تایا فراست کا گاؤں تھا۔ عادل کے گاؤں لالی اور پال پور میں مشکل سے تین چار فرلانگ کا فاصلہ ہوگا۔ ان دنوں گاؤں کو لوگ ''جوڑے گاؤں'' بھی کہتے تھے)

کمبل میں لپٹے لپٹے اور چاند کو دیکھتے دیکھتے عادل کے خیالات اسے ماضی کے دھندلکوں میں لے گئے۔ ایک پورا دور اس کی آنکھوں کے سامنے ایک فلم کی طرح چلنے لگا۔ عادل کے ابا جان امانت علی اور شہزادی کے ابا جان فراست علی دو ہی بھائی تھے۔ دادا کی وفات کے بعد جائیداد کی تقسیم میں چھوٹے بھائی امانت علی کے حصے میں دو باغ اور دو تین ایکڑ کی کھیتی آئی تھی۔ امانت کو کھیتی باڑی کا زیادہ شوق نہیں تھا۔ وہ درویش منش بندہ تھا۔ عموماً سردیوں گرمیوں میں صرف کھدر کے کپڑے پہنتا اور کھانے پینے کے شوق سے بھی بہت دور تھا۔ ہر ضرورت مند کی بہت کھلے دل سے مدد کرتا اور کبھی کبھی اپنی اس غیر معمولی فیاضی کی وجہ سے دھوکا بھی کھاتا۔ اسے چونکہ کھیتی باڑی سے دلچسپی نہیں تھی اس لیے اپنی زمین اس نے ٹھیکے پر دے دی تھی جو دھیرے دھیرے ٹھیکے دار کے پاس ہی چلی گئی۔ زمین کے معاوضے میں ملنے والی رقم کا زیادہ تر حصہ اس نے لالی گاؤں میں بننے والی مسجد کی تعمیر میں ڈال دیا تھا۔ دونوں باغ امانت علی کے اپنے پاس تھے۔ تاہم ایک باغ بعد ازاں عادل کی دو بڑی بہنوں کی شادی کے سلسلے میں فروخت ہو گیا۔ دوسرے باغ کی زمین کا کچھ جھگڑا بھی چل رہا تھا۔ لہٰذا آٹھ دس سال پہلے جب عادل کی والدہ شدید بیمار ہوئیں اور انہیں علاج کے لیے بہاولپور کے بڑے ہسپتال میں داخل کرانا پڑا تو امانت علی نے یہ دوسرا باغ بھی فروخت کر دیا۔ یہ باغ بس اونے پونے ہی بیچا گیا تھا۔ عادل کو معلوم تھا کہ اگر اس موقع پر تایا فراست ان کی کچھ مالی مدد کر دیتے تو یہ باغ بکنے سے بچ جاتا اور آج ان کی آمدنی کا معقول ذریعہ ہوتا۔

والدہ تو صحت یاب ہو کر گھر آ گئی تھیں لیکن انہی دنوں عادل کے ابا جان بیمار پڑے اور ایسے پڑے کہ پھر بستر سے اُٹھ نہ سکے۔ انہوں نے صرف 48 سال عمر پائی تھی۔ عادل اس وقت فقط آٹھ نو سال کا تھا۔ یتیمی اور غربت نے ایک ساتھ اس کے گھرانے کو آ دبوچا تھا۔

دوسری طرف تایا فراست کی کہانی کافی مختلف تھی۔ وہ دنیادار ذہن کے مالک تھے اور زمینداری میں بھی پوری دلچسپی رکھتے تھے۔ جائیداد کی تقسیم میں بھی انہوں نے اپنی دلچسپیوں کا خاص خیال رکھا تھا۔ انہوں نے ایسی نہری زمین رکھی تھی جو کاشت کے حوالے سے زرخیز اور منافع بخش تھی۔ آبائی گھر بھی انہوں نے اپنے پاس رکھا، جسے بعد ازاں انہوں

نے وسیع کر کے ایک شاندار حویلی کی شکل دے دی تھی ان کے دونوں بیٹے قاسم اور عاصم بھی زبردست کاروباری ذہن کے مالک تھے۔ بلکہ بڑا بیٹا قاسم تو کاروباری ہونے کے ساتھ ساتھ جھگڑالو اور پھڈے باز بھی تھا۔ یہ تو کسی حد تک تایا فراست نے اسے لگام دے رکھی تھی ورنہ وہ کئی زمینوں پر ناجائز قبضے کر چکا ہوتا۔

اب تایا فراست اور عادل کے گھرانے میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ حقیقت کی نظر سے دیکھا جاتا تو اپنے باپ کی طرح عادل بھی کاشت کاری یا کاروبار میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا لیکن روپیہ کمانے کے لیے جس خاص قسم کی حسابی ذہانت اور عمومی سنجیدگی کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس میں دور دور تک نہیں تھی۔ اس کے بجائے اس پر ایک طرح کا کھلنڈرا پن طاری رہتا تھا۔ وہ اپنے ہمجولیوں کے ساتھ آوارہ بگولے کی طرح لالی گاؤں کی گلیوں میں چکراتا رہتا تھا۔ تایا کی حویلی زیادہ دور نہیں تھی۔ دو چار فرلانگ کا ہی تو فاصلہ تھا لالی گاؤں میں اور پال پور میں لیکن ''یہ دو چار'' فرلانگ کا فاصلہ دراصل ہزاروں میل کا فاصلہ تھا۔ یہ وہی فاصلہ تھا جو امیر اور غریب رشتے داروں کے درمیان پیدا ہوتا ہے اور اولادیں بڑی ہونے کے بعد مزید بڑھتا جاتا ہے۔ معاشی حیثیت کا روز افزوں فرق بھی اس فاصلے کو بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ تایا اور اس کے بیٹوں نے کبھی نظر اُٹھا کر اپنے اس غریب رشتے دار کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ عادل اور اس کے گھر والوں کو شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں نہیں بلایا جاتا تھا اور اگر کبھی کبھار کسی محفل میں آمنا سامنا ہو بھی جاتا تو ان کا تعارف کرانے سے گریز کیا جاتا تھا۔ ایک ایسے ہی موقعے پر عادل کو یادگار شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ تایا فراست کے ڈیرے پر ان کے کچھ ہم عصر زمیندار آئے ہوئے تھے۔ شہر سے آیا ہوا ان کا کوئی مجسٹریٹ دوست بھی موجود تھا۔ شکار وغیرہ کا پروگرام تھا۔ عادل کامے کی حیثیت سے ملک کرم داد کے باغ میں ہی کام کر رہا تھا۔ انہوں نے آموں کی دو بڑی ٹوکریاں تایا فراست کے لیے ڈیرے پر بھجوائی تھیں۔ یہ ٹوکریاں عادل ہی لے کر گیا تھا۔ روانی میں اس نے مہمانوں کے سامنے تایا فراست کو تایا ابا کہہ کر مخاطب کر دیا تھا۔ تایا فراست کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ اس وقت تو خاموش رہے لیکن بعد میں انہوں نے عادل کو بُری طرح سے بے عزت کیا اور خبردار کیا کہ آئندہ وہ انہیں اس طرح مخاطب نہیں کرے گا۔ اس کے بعد انہوں نے عادل کے مالک کرم داد کو بھی سخت سرزنش کی اور کہا کہ وہ عادل کو کسی کام سے ڈیرے یا حویلی پر نہیں بھیجیں گے۔

اپنے تایا زاد کزنوں سے بھی عادل کی ملاقات نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس نے شہزادی کو بھی بس ایک دو بار ہی دیکھا تھا۔ حویلی کے اندر شہزادی کو اس نے آخری بار شاید تب دیکھا تھا جب وہ چھ سات سال کی ہوگی۔ عادل اس وقت بمشکل دس سال کا تھا۔ عادل کی دادی فوت ہوئی تھی اور وہ تھوڑی دیر کے لیے تایا فراست کی شاندار حویلی میں گئے تھے۔ حویلی کی ان اونچی دیواروں کے پیچھے کیا ہوتا تھا، کیا رونقیں تھیں، کیا روز و شب تھے عادل کو کچھ معلوم نہیں تھا......اور وقت گزرتا چلا جا رہا تھا۔

لیکن پھر دو سال پہلے بہار کی ایک شام ایسی آئی تھی جب سات پردوں میں چھپی ہوئی شہزادی اس کے سامنے آشکار ہوئی اور اس طرح ہوئی کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ہاں وہ بہار کے دن تھے، جب دلوں میں گلاب کھلتے ہیں اور ہواؤں میں نشہ سرایت کر جاتا ہے اور جب رگوں میں جوان لہو بھی دوڑتا ہو تو خوامخواہ ناچنے گانے اور اُچھلنے کودنے کو دل چاہتا ہے۔ اس شام عادل بھی ہوا کے کسی آوارہ جھونکے کی طرح درختوں میں گھوم رہا تھا۔ یہاں بانس کے بھی بہت سے

درخت تھے۔ عادل بانسری بنانے کے لیے کسی اچھی لکڑی کی تلاش میں تھا۔ اچانک اسے چلانے کی نسوانی آواز سنائی دی۔ وہ ایک درخت پر چڑھتا چڑھتا ٹھٹک کر رُک گیا۔ آواز دوبارہ آئی تو وہ دیوانہ وار اس سمت میں بھاگا تھا۔ اس نے گھنے پیڑوں کی اوٹ سے دیکھا، پال پور کی حویلی کا ایک سجا سجایا تانگا راستے پر آڑھا ترچھا کھڑا تھا۔ ایک پرانی سی کھٹارا جیپ پاس ہی موجود تھی۔ جیپ پر سے اُترنے والے تین ڈھاٹا پوش افراد تانگے کے گھڑ سوار محافظوں سے مارا ماری کر رہے تھے۔ ایک گھڑ سوار زمین پر بے سُدھ پڑا تھا۔ اس پر غالباً کلہاڑی سے وار کیا گیا تھا۔ عادل کے دیکھتے ہی دیکھتے بارہ بور کی رائفل سے ایک فائر ہوا جو سیدھا گھڑ سوار کے گھوڑے کی پچھلی ٹانگ میں لگا۔ گھوڑا بدک کر بھاگا۔ اس سے پہلے کہ رائفل بردار گھڑ سوار سنبھل سکتا، گھوڑا سرپٹ ہو گیا۔ گھڑ سوار کا سر شیشم کی ایک تناور شاخ سے ٹکرایا اور وہ اُلٹ کر زمین پر آ رہا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل کر کہیں جھاڑ جھنکاڑ میں گھس گئی تھی۔ ڈھاٹا پوشوں میں سے ایک دراز قد شخص نے گرنے والے کے قدموں میں سیون ایم ایم کے سنگل فائر کیے۔ وہ بوکھلا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

اس دوران میں ڈھاٹا پوش تانگے کے گرد لپٹی ہوئی ریشمی چادر کھینچ کر علیحدہ کر چکے تھے۔ اندر موجود ایک ادھیڑ عمر عورت کے سر پر رائفل کے کندے سے بے رحم ضرب لگائی گئی۔ وہ وہیں نشست پر گر گئی۔ تانگے میں موجود نوجوان لڑکی کو اُٹھا کر کھٹارا جیپ میں ڈال لیا گیا۔ وہ بُری طرح چلا رہی تھی اور مدد کو پکار رہی تھی۔ عادل نے کسی حد تک پہچان لیا۔ ہو نہ ہو یہ تایا فراست کی بیٹی شہزادی تھی۔ جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ اب عادل کے لیے صرف تماشائی بنے رہنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے اندر جیسے ایک برق سی کوندی۔ کسی شکاری جانور کی طرح جھپٹتے ہوئے اس نے پندرہ بیس قدم کا فاصلہ بھاگ کر طے کیا اور ہر خطرے کو نظر انداز کرتے ہوئے کھلی جیپ میں کود گیا۔ جیپ کے اندر زبردست دھینگا مشتی ہوئی۔ عادل ڈھاٹا پوش ڈرائیور پر جا پڑا۔ اس نے گاڑی رکوانے کی کوشش کی۔ ایک شخص تو شہزادی کو دبوچے بیٹھا تھا، دوسرا عقب سے عادل کے ساتھ چمٹ گیا۔ عادل نے اس کی پسلیوں میں کہنی کی شدید ضرب لگائی اور جیپ کے اگنیشن میں سے چابی نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران میں جیپ کا رُخ مڑ گیا۔ وہ نیم دائرے کی شکل میں گھومی اور بانس کے چند نوزائیدہ پودوں کو توڑتی ہوئی سر کے بل ایک جوہڑ میں جا گری۔ اس کے پچھلے پہیے اوپر کی طرف اُٹھے ہوئے تھے اور بونٹ دلدلی جوہڑ میں ڈوب چکا تھا۔ عادل کو عقب سے دبوچنے والا اُلٹ کر جوہڑ میں گر چکا تھا۔ دوسرے کو اپنے سر کی زوردار ٹکر سے عادل نے جوہڑ میں پہنچا دیا۔ جیپ کے جوہڑ میں گرنے سے ڈرائیور کے سر پر کوئی اندرونی ضرب آئی تھی اور اس کی ناک سے خون رِسنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ نیم جان سا نظر آ رہا تھا۔ عادل نے اس کی گدی پر ایک زوردار ہاتھ جمایا اور اسے بالکل ہی بے سدھ کر دیا۔ اس ڈرائیور کی بارہ بور ڈبل بیرل رائفل جیپ کے فرش پر ہی پڑی تھی۔ عادل نے بلا توقف یہ رائفل اُٹھائی اور یخ بستہ جوہڑ میں کود گیا۔ جوہڑ میں گرنے والے دونوں افراد اب نہتے تھے۔ عادل کے ہاتھ میں رائفل تھی اور جسم میں بجلی کوندر ہی تھی۔ یوں بھی وہ لڑکپن سے ہی لڑائی بھڑائی کا شوقین تھا اور اس حوالے سے اس نے اپنے ہاتھ پاؤں کافی کھول لیے تھے...... دو منٹ کے اندر اس نے دونوں ڈھاٹا پوش افراد کو جوہڑ سے نکل کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ ان میں سے ایک نے تھوڑی سی مزاحمت دکھائی لیکن جب عادل نے اس کی ٹانگوں پر بارہ بور کا فائر مارنے کا ارادہ کیا تو اس نے بھی پیٹھ دکھائی اور سرکنڈوں میں رُوپوش ہو گیا۔

شہزادی ابھی تک جیپ میں تھی۔ اس نے کھلی چھت والی جیپ کا ایک راڈ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا اور مدد کے لیے

پکار رہی تھی۔ جیپ لمحہ بہ لمحہ جوہڑ کی گار میں دھنستی جا رہی تھی۔ عادل جیپ تک آیا، اس نے سہمی ہوئی شہزادی کو اپنے بازوؤں میں اُٹھایا، اس کا ایک ہاتھ شہزادی کی گردن کے نیچے اور دوسرا اس کی ٹانگوں کے نیچے تھا وہ ایک طرح سے اس کی گود میں تھی۔ وہ اسے اسی طرح لے کر جوہڑ سے باہر نکل آیا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی۔ ''تم...... عادل ہو نا؟ چچی کے بیٹے؟''

عادل نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

ان کے کنارے پر پہنچنے سے پہلے ہی تایا فراست کے گھڑ سوار موقع پر پہنچ چکے تھے۔ ان مسلح گھڑ سواروں میں سب سے آگے تایا کا بڑا بیٹا قاسم تھا۔ بڑی گراری والا ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔ ان لوگوں کو وہی محافظ بلا کر لایا تھا جو پیچھے درختوں کے اندر روپوش ہونے میں کامیاب ہوا تھا۔

''مجھے اُتار دو۔'' کنارے پر پہنچتے ہی شہزادی نے لرز کر کہا تھا۔

قاسم کی انگارہ آنکھیں دیکھ کر عادل نے شہزادی کو اُتارنے میں زیادہ دیر نہیں کی تھی۔

قاسم نے تو کچھ نہیں کہا لیکن چند منٹ بعد جب تایا فراست موقع پر پہنچا تو اس نے شکریے کے دو چار بول عادل کے لیے کہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ بہ امر مجبوری تھا۔ لڑائی بھڑائی کے دوران میں عادل کی کلائی پر چوٹ بھی آئی تھی اور یہاں سے خون بہہ رہا تھا۔ تایا فراست نے اپنے ایک کارندے سے کہا تھا کہ وہ عادل کو فوراً گاؤں کے جراح کے پاس لے جائے اور مرہم پٹی کرائے۔

بعدازاں حملہ آوروں کے بارے میں یہی معلوم ہوا تھا کہ وہ تایا کی فیملی کے ایک دیرینہ دشمن چودھری سہراب خان کے کارندے تھے اور انہوں نے ایک پرانا بدلہ چکانے کی کوشش کی تھی۔

بہرحال اس واقعے کے تیسرے روز عادل کی پڑوسن ریحانہ خاموشی سے عادل کے گھر آئی۔ وہ صبح سویرے حویلی کے کام کاج کے لیے پال پور چلی جاتی تھی اور شام پڑے واپس آتی تھی۔ آج بھی وہ وہیں سے آ رہی تھی۔ ''چاچی کہاں ہے؟'' اس نے دائیں بائیں دیکھ کر عادل سے پوچھا۔

''سو رہی ہے۔'' عادل نے جواب دیا۔

ریحانہ کی آنکھوں میں عجیب سا تاثر اُبھرا۔ ذرا شوخی سے عادل کو دیکھ کر بولی۔ ''حویلی میں شہزادی نے تیری چوٹ کا حال پوچھا ہے اور...... تیرا شکریہ بھی کہا ہے۔''

عادل کے دل میں جیسے ایک جلترنگ سا بج اُٹھا تھا۔ اس نے اپنی چڑھی ہوئی سانس کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''اور کیا کہتی تھی وہ؟''

''تیرے لیے تو اور کچھ نہیں کہا۔ ویسے تیرے بارے میں باتیں شاتیں پوچھ رہی تھی۔ تُو کس طرح کا ہے، کیا کرتا ہے، چاچی کی طبیعت آج کل کیسی ہے وغیرہ وغیرہ۔''

عادل خاموش کھڑا رہا۔ دل کی کیفیت کچھ عجیب تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ ریحانہ اس کی طرف دیکھ کر پھر شوخ انداز میں مسکرائی اور بولی۔ ''تجھے بھی کچھ کہنا ہے شہزادی باجی سے؟''

عادل نے دھڑکتے دل کے ساتھ سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ ''کہہ دینا، یہ ذرا سی چوٹ ہے۔ اپنے خاندان کی عزت

کے لیے تو جان بھی چلی جائے تو معمولی بات ہے۔''

''ٹھیک ہے، کہہ دوں گی۔'' فربہ اندام ریحانہ نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا اور چلی گئی۔

اس کے بعد نامہ و پیام کا ایک سلسلہ شروع ہوا، اور دو دلوں کے درمیان ایک ایسا دروازہ کھلا جو کسی کو نظر نہیں آتا تھا مگر جس میں سے گزرنے والی خوشبودار ہوا عادل اور شہزادی کے سینوں میں محبت کے گلاب کھلا رہی تھی۔ مہینے دو مہینے بعد کسی نہ کسی بہانے انہیں ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع بھی مل ہی جاتا تھا اور پھر پچھلی عید کے موقع پر جب حسبِ دستور پال پور گاؤں کی بہت سی لڑکیاں چوڑیاں چڑھوانے کے لیے لالی گاؤں آئی تھیں۔ عادل کو کماد کے ایک بلند و بالا کھیت میں شہزادی سے مختصر سی ملاقات کا موقع بھی مل گیا...... یہ ملاقات قابلِ اعتماد راز داں ریحانہ کی کوشش سے ہی ہو پائی تھی۔

اس روز عادل نے شرماتی لرزتی شہزادی کو چھوا تھا، اسے گلے بھی لگایا تھا۔ سرما کی سونا رنگ دوپہر کی وہ چند ساعتیں عادل کے لیے یادگار اور بے مثال تھیں۔ اس روز ان کی محبت کو لمس کی سچی گواہی ملی تھی۔

وہ نام ہی کی نہیں، دیکھنے میں بھی شہزادی ہی تھی۔ سرخ و سپید رنگ، نرم و نازک جسم، بڑی بڑی شربتی آنکھیں، اس کے طور اطوار میں ایک طرح کا دلکش وقار تھا۔ وہ سات آٹھ ماہ کے اندر ہی عادل کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اُترتی چلی گئی۔ اسے اپنے باپ کے اونچے شملے اور عزت کا بے پناہ خیال تھا۔ اسی لیے وہ اپنے اس تعلق کے سلسلے میں بے حد محتاط تھی۔ وہ دونوں یہ بھی بڑی اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے راستے میں بے شمار رکاوٹیں ہیں۔ اونچی شان والا تایا کا گھرانا اپنی بیٹی ایک باغ مزدور کو دینے پر کیسے آمادہ ہو سکتا تھا۔ شہزادی نے ایک دو بار اسے اشاروں کنایوں میں کہا بھی تھا کہ وہ اپنے گھر کی مالی حالت درست کرنے کی کوشش کرے۔ اس نے عادل کو اپنے ایک ماموں زاد شبیر کی مثال بھی دی تھی۔ اس کے پاس اپنی کوئی زمین نہیں تھی۔ اس نے زمین ٹھیکے پر لینی شروع کی اور محنت کر کے کچھ ہی عرصے میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا۔

عادل کے ذہن میں بھی ایسے کئی خیالات یلغار کرتے رہتے تھے لیکن ابھی اس کے اندر شاید وہ ٹھہراؤ نہیں تھا جو بندے کو بڑے اور سنجیدہ کاموں پر آمادہ کرتا ہے...... کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ حالانکہ شہزادی اپنے تعلق کے سلسلے میں بے حد محتاط تھی لیکن پھر بھی آشکار ہونے والی بات آشکار ہو کر رہی۔ یہ سب کچھ دس بارہ دن پہلے ہوا تھا۔ شہزادی حویلی کی اونچی دیواروں کے پیچھے گم تھی۔ وہ وہاں سے کم کم ہی نکل پاتی تھی لیکن کبھی کبھار کوئی موقع مل ہی جاتا تھا...... شہزادی کی ایک خالہ زاد کی شادی تھی۔ یہ بھی زمیندار لوگ تھے اور ایک قریبی گاؤں فتح پور میں رہتے تھے۔ ایسی شادیوں پر عادل اور اس کی ماں کو شاذ و نادر ہی بلایا جاتا تھا۔ اس شادی پر بھی نہیں بلایا گیا تھا۔ بہرحال اس شادی کے موقع پر عادل کو شہزادی سے ملنے کا کوئی بہانہ مل سکتا تھا۔ شہزادی کو دو دن وہاں فتح پور گاؤں میں رہنا تھا۔ عادل اور شہزادی کی راز داں ریحانہ بھی ساتھ جا رہی تھی۔

پروگرام کے مطابق مہندی کی رات عادل بھی خاموشی سے فتح پور گاؤں پہنچ گیا۔ شام کے وقت کچھ لڑکیاں دو تین بڑی عمر کی عورتوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے نکلیں۔ کچھ لڑکیاں کچے پکے امرود توڑنے کے لیے ایک باغیچے میں گھس گئیں۔ کچھ پھلواری میں گھومنے پھرنے لگیں۔ جو لڑکیاں باغیچے میں گھسیں ان میں شہزادی بھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ عادل اسی باغیچے کے پچھواڑے درختوں کے جھنڈ میں موجود ہے۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ جھنڈ میں آئی۔ عادل نے اس

کے لرزاں ہاتھ تھامے۔ ویلوٹ کے عنابی کامدار جوڑے میں وہ جگمگا رہی تھی۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ''عادل! مجھے ایسے کاموں کے لیے نہ کہا کرو، مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔''

''میں اپنے دل کا کیا کروں شہزادی، میری سمجھ میں نہیں آتا۔'' عادل نے اسے کھینچ کر گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

اس نے چند سیکنڈ بعد خود کو عادل سے علیحدہ کیا اور بولی۔ ''اچھا اب مجھے جانے دو۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ خالہ کی بیٹی فوزیہ کو شک ہو گیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی وہ مجھے گھور رہی تھی۔''

''ایک تو تمہیں وہم بھی بڑے ہوتے ہیں شہزادی۔'' عادل نے اس کے نرم گلاب ہاتھوں کو تھامتے ہوئے کہا۔

لیکن یہ وہم نہیں تھا۔ فوزی کے حوالے سے شہزادی کا شک بالکل درست تھا۔ اچانک شاخوں میں سرسراہٹ ہوئی۔ شہزادی تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔ شام کی نیم تاریکی میں ایک لڑکی کا چہرہ اور بڑی بڑی آنکھیں نظر آئیں۔ یہ فوزی ہی تھی۔ چہرہ جلد ہی اوجھل ہو گیا۔ ''ہائے میں مری'' شہزادی کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

پھر وہ بھی جھاڑیوں میں اوجھل ہو گئی۔ عادل اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔

اس کے بعد وہی کچھ ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ خالہ زاد فوزیہ نے ساری بات شہزادی کی والدہ کو بتائی تھی۔ شہزادی کی والدہ یعنی تائی مجیدہ تو عادل کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔ کہاں یہ کہ وہ ان کی بیٹی کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ حویلی میں اندر خانے جیسے ایک آگ سی بھڑک گئی تھی۔ ایک دن عادل کی ہمراز ریحانہ نے اسے اطلاع دی۔ ''عادے! مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ قاسم یا عاصم میں سے کوئی تجھے پکڑ لے۔ مجھے لگتا ہے کہ ان دونوں کو بھی اس گل کا پتا چل گیا ہے۔''

''جو ہو گا دیکھا جائے گا۔'' عادل نے سینہ تان کر کہا تھا۔

لیکن اگلے ہی دن تایا فراست نے عادل کو ڈیرے پر بلا بھیجا تھا۔ ڈیرے کے ایک کمرے میں تایا فراست اور عادل میں طویل گفتگو ہوئی تھی۔ تایا فراست نے درشت لہجے میں بات شروع کی تھی، مگر پھر یہ دھیما لہجہ بتدریج گھن گرج میں بدل گیا تھا۔ ایک موقع پر تو یوں لگا تھا کہ شاید تایا فراست غصے سے پھٹ پڑیں گے۔ لیکن پھر کچھ دیر بعد یہ سنگین ترین مرحلہ گزر گیا اور گفتگو پھر سے قدرے نرم انداز اختیار کر گئی۔ اسی مرحلے میں تایا فراست نے وہ بات کہی تھی جس نے عادل کے تن بدن میں ایک اور طرح کی آگ بھڑکائی تھی۔ تایا فراست نے کہا تھا۔ ''عادے! وہ جو کپڑے پہنتی ہے اس کا ایک جوڑا...... تیری سارے مہینے کی کمائی میں نہیں آ سکتا۔ تیری اور ہماری حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ باقی باتوں کو چھوڑ وہ سامنے جو حویلی نظر آ رہی ہے نا تجھے، اس کی قیمت ہی ڈھائی کروڑ سے زیادہ ہے۔ کبھی کروڑ کا یا لاکھ کا یا پندرہ وی ہزار کا ہی منہ دیکھا ہے تُو نے؟''

عادل خاموش کھڑا رہا تھا۔

تایا فراست نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔ ''میں ظالم باپ نہیں ہوں اور نہ ہی ظالم تایا ہوں لیکن اپنی اولاد کا اچھا بُرا سوچنے کا مجھے پورا حق ہے۔''

عادل نے ہولے سے کہا تھا۔ ''مگر تایا جی! بندہ ہمیشہ ایک جیسا تو نہیں رہتا، کہتے ہیں کہ چنگا ویلا گزر جاتا ہے تو بُرا بھی گزر جاتا ہے۔''

''تو تیرا چنگا ویلا گزر گیا ہے نا۔ اب میں اپنی دھی کو بُرے ویلے میں دھکا دے دوں؟''

''مجھے تھوڑا سا وقت دیں تایا جی! میں کچھ کر کے دکھا دوں گا۔''

''کیا کر کے دکھا دے گا تو؟ کیا کر کے دکھائے گا؟''

عادل نے اپنے بال پیشانی سے ہٹا کر کھڑکی سے باہر تایا کی بلند و بالا حویلی کو دیکھا تھا۔ ان لمحوں میں اس کے اندر ایک نیلا شعلہ سا بھڑک رہا تھا۔ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تایا جی! آپ مجھے ڈھائی سال کی مہلت دے دیں۔ میں آپ کو کم از کم......اتنے پیسے ضرورا ـکر کے دکھا دوں گا۔ حق حلال کے پیسے۔''

''سبحان اللہ......سبحان اللہ'' تایا جی نے اپنی بھاری مونچھوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں ڈھائی کروڑ کی بات کر رہا ہوں......ڈھائی لاکھ کی نہیں۔''

''میں نے سن لیا ہے تایا جی! اچھی طرح سن لیا ہے۔''

اور پھر وہیں، ڈیرے کے اسی کمرے میں تایا اور بھتیجے کے درمیان یہ مکالمہ عجیب سے انداز میں اپنے اختتام کو پہنچا تھا۔ عادل نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بڑے دعوے سے کہا تھا کہ وہ تین سال کے اندر اندر کم از کم ڈھائی کروڑ روپیہ اکٹھا کر کے دکھا دے گا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ وہ اس دوران میں کبھی شہزادی سے ملنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اس کے بعد وہ ''سلام تایا'' کہہ کر تیز قدموں سے باہر نکل آیا تھا۔

اور اب عمل کا وقت آ چکا تھا۔ وہ گاؤں سے لاہور جانے کے لیے تیار تھا اور سوچ رہا تھا کہ صبح ماں کو کس طرح بتائے کہ وہ کچھ عرصے کے لیے اس سے دور جا رہا ہے۔

یخ بستہ رات میں روزن کے اندر سے چاندنی کی لکیر کو دیکھتے دیکھتے اس کے خیالات دور دور کی پرواز کر کے واپس آ گئے۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے اونگھنے لگا۔ رات کا تیسرا پہر شروع ہو رہا تھا۔ لالی گاؤں کی گلیوں میں سناٹے کا راج تھا۔ سفر کی صبح اس کے سر پر تھی، وہ سو گیا۔

O....❖....O

ٹھیک دو روز بعد وہ ایک طویل سفر طے کر کے روشنیوں اور رنگوں کے شہر لاہور پہنچ چکا تھا۔ دریائے راوی کے کنارے کی وہ وسیع و عریض آبادی جہاں پنجاب بھر سے بلکہ ملک بھر سے لوگ کھنچے چلے آتے ہیں۔ اس نگری کی بانہیں بہت کشادہ ہیں۔ یہ مواقع کا شہر ہے، یہ داتا کی نگری ہے۔ دور دراز گاؤں سے آنے والا عادل یقیناً یہاں کھو کر رہ جاتا لیکن ایک آسرا یہاں اس کے لیے موجود تھا۔ یہ اس کے گاؤں کا رہائشی اور بچپن کا دوست عبدالقدیر تھا۔ قدیر آٹھ نو سال پہلے لاہور چلا آیا تھا۔ شروع شروع میں اس نے ہتھ ریڑھی پر کباڑ اکٹھا کیا تھا، پھر اپنا کباڑ خانہ کھولا...... بعد میں اس نے پرانے لوہے کو ڈھالنے والی ایک بھٹی لگائی اور سلائی مشینوں کے ڈھانچے تیار کرنے شروع کر دیئے۔ اب اس کا اچھا بھلا کارخانہ تھا اور وہ مزید ترقی کر رہا تھا۔ اس کا ایڈریس عادل کے پاس موجود تھا۔ عادل سیدھا اسی کے پاس بادامی باغ میں پہنچا۔ قدیر نے اسے خوش آمدید تو کہا لیکن اتنی گرمجوشی سے نہیں جتنا عادل سمجھتا تھا...... دو تین روز کی سوچ بچار کے بعد قدیر نے اسے اپنے ایک کباڑ خانے میں کباڑ وغیرہ تولنے کے کام پر لگا دیا، اس کی تنخواہ چھ ہزار روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ اسی میں اسے کھانا وغیرہ بھی کھانا تھا۔ ہاں کباڑ خانے کے اندر ہی ایک کوٹھری میں اسے رہائش ضرور میسر آ گئی۔ نوکری

کے پہلے دن، شام تک ردی کاغذ، لوہا اور پلاسٹک وغیرہ تول تول کر وہ نڈھال ہو گیا۔ رات کو جب وہ بان کی چارپائی پر لیٹا اور اس نے حساب لگایا تو دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ تین سالوں میں ڈھائی کروڑ اور پہلے دن کی کمائی دو سو روپے۔ جن میں سے پچاس روپے خرچ ہو چکے تھے۔ اس رفتار سے سفر جاری رہتا تو اسے منزل تک پہنچنے میں چار، ساڑھے چار سو سال تو لگ ہی جانے تھے۔

دوسری طرف لالی گاؤں میں ایک اور کام ہو رہا تھا۔ رات کے نو بجے تھے جب دُھول سے اَٹی ہوئی ایک کار گاؤں میں پہنچی اور چودھری مختار کے حویلی نما مکان کے سامنے آ کر رُکی۔ اس میں سے دو افراد نکلے۔ ایک تو وہی جواں سال شخص تھا جس نے پانچ چھ روز پہلے میلے میں گھوم پھر کر ویڈیو بنائی تھی اور خاص طور سے ''چڑھائی'' والے کھیل کو عکس بند کیا تھا۔ دوسرا بھاری توند والا ایک سیٹھ نما شخص تھا۔ اس نے سفید شلوار قمیص پر براؤن کوٹ پہن رکھا تھا۔ چودھری مختار کو مہمانوں کی آمد کا شاید پہلے سے ہی پتا تھا۔ اس نے گھر کے دروازے پر سیٹھ کا استقبال کیا۔ دونوں گلے ملے، لیکن ملنے سے پہلے ہی دونوں کی توندوں نے معانقہ کیا۔

دس پندرہ منٹ بعد یہ لوگ گھر کی وسیع بیٹھک میں بیٹھے تھے اور گرما گرم دودھ پتی کی چسکیاں لے رہے تھے۔ چودھری مختار کا بیٹا ناصر بھی یہاں موجود تھا۔ یہ لمبے قد کا دبلا پتلا لیکن کرخت سا لڑکا تھا۔

چودھری مختار نے اپنا بڑا سا سر اوپر نیچے ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھ گیا، میں سمجھ گیا رانا صاحب! آپ اس لڑکے عادل کی بات کر رہے ہو، مائی سکینہ کا پتر ہے وہ...... پر......شاید آپ کو پتا نہیں......وہ تو بس اتفاق سے ہی جیت گیا اس دن۔ ورنہ میرے کامے حبشی نے تو اس کی مت مار کے رکھ دینی تھی۔ پچھلے دو تین سالوں سے حبشی ہی پہلا نمبر لیتا ہے جی چڑھائی والے کھیل میں۔''

''حبشی؟'' کیمرا مین نے سوالیہ نظروں سے چودھری مختار کو دیکھا۔ ''یہ وہی کالا سا لڑکا ہے جو دوسرے نمبر پر آیا تھا؟''

''آہو جی! پر دوسرے نمبر پر تو وہ اس لیے آیا تھا......کہ......اسے......چوٹ لگی ہوئی تھی۔ ورنہ میں نے کہا ہے نا جی کہ اس نے تو مت مار دینی تھی عادے کی۔ یہ حبشی میرا جدی پشتی ملازم ہے۔ اصلی نام فیروز ہے اس کا...... ہمارے باغوں میں پھل توڑنے کا کام کرتا ہے۔ اوکھے سے اوکھے درخت پر بالکل باندر کی طرح چڑھتا ہے جی۔ لوگ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں تو میں ابھی تھوڑی دیر میں اسے ملواتا ہوں آپ سے۔''

رانا صاحب نے ٹٹولنے والی نظروں سے چودھری مختار کو دیکھا، پھر سگریٹ کا طویل کش لے کر کہا۔ ''چلیں آپ کے بندے سے بھی مل لیتے ہیں لیکن یہ عادا کہاں ہے اب؟''

''وہ تو کہیں چلا گیا ہے اب......شاید لاہور گیا ہے محنت مزدوری کے لیے۔'' چودھری مختار نے گول مول انداز میں کہا۔

''کچھ اتا پتا ہے اس کا؟'' اس بار جواں سال کیمرا مین نے پوچھا۔

''آہو جی، وہ......'' چودھری کے بیٹے ناصر نے کہنا چاہا لیکن چودھری نے انگلی کے ہلکے سے اشارے سے اسے منع کر دیا۔ ناصر جلدی سے بات بدل کر بولا۔ ''وہ ادھر پرانے لاہور کے علاقے میں ہی کہیں ٹھہرے گا۔ یہی بتایا تھا اس

نے۔''

''پرانا لاہور تو بھئی بہت بڑا ہے۔ پورا ایک علیحدہ شہر ہے۔'' رانا صاحب نے کہا۔

چودھری مختار نے بیٹے سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''جاؤ چوکیدار رشید سے پوچھو، شاید اس کو کچھ پتا ہو۔ اس کے ساتھ کافی یارانہ ہے اس کا۔''

ناصر ''جی اچھا'' کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ چودھری مختار نے پیچھے سے ہانک لگائی۔ ''اور حبشی کو بھی دیکھ۔ شاید واڑے میں بیٹھا ریڈیو سن رہا ہو۔''

ایک دو منٹ بعد چودھری مختار بھی ''ابھی آیا'' کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ برآمدے میں دراز قد ناصر کھڑا تھا۔ چودھری نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ کر تیز سرگوشی میں کہا۔ ''تیرا دماغ کام کرتا ہے یا نہیں۔ ہمیں کیا لوڑ ہے عادے کے بارے میں بتانے کی۔ یہ رانا صاحب لاہور کے کافی وڈھے سیٹھ ہیں۔ انہوں نے دو چار دن پہلے ''چڑھائی مقابلے'' کی فلم دیکھی ہے۔ یہ کھیڈ ان کو بڑی پسند آئی ہے۔ آج کل رانا صاحب نے لاہور میں کوئی نمائش وغیرہ لگا رکھی ہے۔ یہ وہاں بھی یہ کھیڈ کرانا چاہتے ہیں۔ اگر عادے کے بجائے یہ ہمارا حبشی وہاں جائے گا تو چنگا بھلا روپیہ ملے گا۔ مشہوری علیحدہ سے ہوگی اور پھر تجھے تو پتا ہی ہے عادے کے کرتوتوں کا۔ اس کی نظریں جہاں پر جمی ہوئی ہیں تُو بھی جانتا ہے۔ ہمیں کیا لوڑ ہے اسے اس معاملے میں آگے کرنے کی؟ بات سمجھ رہا ہے نا میری؟''

ناصر نے اثبات میں سر ہلایا۔

چودھری مختار بولا۔ ''تجھے کیا پتا ہے عادے کے بارے میں؟''

''اس نے یہی کہا تھا کہ وہ شاید قدیر کباڑیے کے پاس جائے گا۔ قدیر بادامی باغ میں رہتا ہے۔''

''اس گل کا اور کس کو پتا ہے؟''

''میرے خیال میں چوکیدار رشیدے کے سوا اور کسی کو پتا نہیں۔''

''تو بس ٹھیک ہے جا کر رشیدے کو سمجھا دے کہ کوئی پوچھے تو بتانا کچھ نہیں۔ کسی کو بھی نہیں بتانا۔''

''ٹھیک ہے ابا جی۔''

''اور دیکھ اس حبشی کو۔ اِدھر اُدھر ہی کہیں ہوگا۔ اس کو لبھ کے لے آ۔''

چودھری مختار واپس مہمانوں کے پاس آ بیٹھا۔ اس کی آنکھوں میں ہوشیاری اور لالچ کی چمک تھی۔

پانچ دس منٹ بعد دراز قد ناصر واپس بیٹھک میں پہنچ گیا۔ اس نے والد کو بتایا کہ چوکیدار رشیدے کو بھی عادے کا کچھ پتا نہیں۔

چودھری مختار نے بیٹے سے کہا۔ ''تم ادھر مہمانوں کے پاس بیٹھو۔ میں حبشی کو ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔''

چودھری مختار باہر گیا۔ حبشی ایک قریبی کمرے میں موجود تھا۔ وہ ابھی ابھی پہنچا تھا۔ اس کا قد زیادہ لمبا نہیں تھا۔ مگر جسم مضبوط اور کسرتی تھی۔ چال ڈھال میں عجیب کی طرح کی چستی اور تیزی تھی۔ وہ جدی پشتی اس گاؤں میں رہنے والا تھا۔ گہرے سانولے رنگ کی وجہ سے اس کا نام حبشی پڑا تھا۔ ''خیر ہے چودھری جی! آپ نے بلایا تھا'' اس نے سوالیہ نظروں سے چودھری کو دیکھا۔

''خیر ہی ہے بلکہ کچھ زیادہ ہی خیر ہے۔ لیکن اسی طرح کرنا ہے جس طرح میں کہوں۔''

''آپ حکم کرو جی۔''

''اپنی قمیص اوپر اُٹھا اور منہ دوجے پاسے کر۔''

حبشی نے روبوٹ کی طرح ہدایت پر عمل کیا اور قمیص اُٹھانے کے بعد منہ دیوار کی طرف کر کے کھڑا ہو گیا تھا۔

چودھری مختار نے جیسے سب کچھ پہلے ہی سے سوچ رکھا تھا۔ اس نے دراز میں سے ایک استرا نکالا اور حبشی کی پشت پر دونوں کندھوں کے درمیان دو تین انچ کا کٹ لگا دیا۔ خون رِسنے لگا۔ چودھری نے پرانے کپڑے سے خون پونچھا اور ایک دوسرے ملازم فخری کو آواز دی۔ چودھری کی ہدایت پر فخری ایک تھالی میں چولہے کی راکھ اور زخم پر باندھنے کے لیے کپڑے کی پٹی اور روئی وغیرہ لے آیا۔ راکھ سے خون کا رِساؤ بند کیا گیا۔ پھر روئی رکھ کر بغلوں کے نیچے سے پٹی باندھ دی گئی۔ اس کے بعد حبشی نے اپنی بنیان اور قمیص جو اوپر کندھوں پر چڑھائی ہوئی تھی، نیچے گرا دی۔

پانچ دس منٹ بعد حبشی اور چودھری مختار دوبارہ بیٹھک میں مہمانوں کے پاس موجود تھے۔ ''لیں جی یہ ہے فیروز۔ ہم پیار سے اسے حبشی کہتے ہیں۔'' چودھری مختار نے رانا سیٹھ سے کہا۔ پھر بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''چڑھائی کے مقابلے کا اصل ہیرو تو یہی ہے۔ وہ تو اس کی چوٹ کی وجہ سے مائی سکینہ کا پتر عادا آگے نکل گیا۔''

چودھری مختار حبشی کو سب کچھ سمجھا کر لایا تھا۔ دونوں مہمانوں نے حبشی سے بات چیت کی۔ حبشی نے مہمانوں کو اپنی کمر پر بندھی ہوئی پٹی بھی دکھائی اور اپنے آپ کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔

رانا سیٹھ اور کیمرا مین ابرار نے رات وہیں چودھری کے حویلی نما گھر میں گزاری۔ صبح وہ لالی گاؤں کے دو چار اور بندوں سے بھی ملے ان میں عادے کی ماں سکینہ بھی تھی۔ ان ملاقاتوں کے بعد رانا سیٹھ اور نادر کو یقین ہو گیا کہ عادا روزگار کے سلسلے میں لاہور یا کراچی جا چکا ہے اور فی الحال اس کا کوئی اتا پتا نہیں اور نہ اس کا کسی سے رابطہ ہے۔ وہ لوگ چودھری کے بندے، حبشی کو لاہور لے جانے پر رضامند ہو گئے۔

○....❖....○

کباڑ خانے میں کباڑ تولتے تولتے عادل کو بیس پچیس روز ہو چکے تھے اور یہ بات اچھی طرح اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ یہاں سے اسے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ قدیر کے رویے نے بھی اسے مایوس ہی کیا تھا۔ وہ اب سوچ رہا تھا کہ کوئی اور کام دیکھے۔ ان دنوں ابھی موبائل فون وغیرہ کا رواج زیادہ عام نہیں ہوا تھا۔ رابطے کا ذریعہ عام فون یا خط وغیرہ تھا۔ فون تو اس کے گاؤں میں تھا نہیں، آ جا کے خط کا ہی سہارا تھا۔ وہ خط لکھنا جانتا تھا۔ اس نے خود ہی خط لکھ کر گاؤں کے پتے پر پوسٹ کر دیا تھا اور ماں کو بتایا تھا کہ وہ خیر خیریت سے ہے۔ باغ میں مزدوری کرنے کے باوجود اس نے میٹرک پاس کیا تھا اور اسے آگے پڑھنے کا شوق بھی تھا۔ گاؤں کے لڑکوں میں وہ پڑھا لکھا سمجھا جاتا تھا۔ گاؤں میں جب مقامی ماسٹر صاحب نہیں ہوتے تھے، گاؤں کے لوگ عادل سے خط کے علاوہ ٹیلی گرام وغیرہ بھی پڑھوا لیتے تھے۔

کباڑ خانے میں ہی صادق نام کا ایک لڑکا اس کا دوست بن گیا تھا۔ وہ بھی یہاں کباڑ خانے میں اپنے کام سے مطمئن نہیں تھا اور مالک قدیر کے رویے سے بھی شاکی تھا۔ اس کی سوچ بھی یہی تھی کہ اسے کہیں اور قسمت آزمائی چاہیے۔ ایک دن جب وہ دونوں سارے دن کے تھکے ہارے، کباڑ خانے سے ملحقہ کوٹھڑی میں بیٹھے تھے اور کوڑے

کرکٹ کی بُو سونگھ رہے تھے۔ صادق نے آگ پر ہاتھ سینکتے ہوئے کہا۔ ''عادے! یہاں ایک نمائش لگی ہوئی ہے۔ وہی جسے وہ کیا کہتے ہیں...... صنعتی نمائش، یہاں بہت طرح کے سٹال لگے ہوتے ہیں، لوگ رنگ برنگی چیزیں بیچتے ہیں۔''

''تو وہاں جا کر کیا کریں گے۔ وہاں تو بھری ہوئی جیبوں والے لوگ جاتے ہیں۔''

''یار خریدنے نہیں جائیں گے۔ دیکھنے جائیں گے۔ کیا پتا کسی چھوٹے موٹے کاروبار کا آئیڈیا ہمارے دماغ میں بھی آ جائے۔''

اس روز تو پروگرام نہیں بن سکا لیکن اگلے روز شام سات بجے کے قریب وہ دونوں اس صنعتی نمائش میں گھوم رہے تھے۔ یہاں بچوں اور بڑوں کی تفریح کے بہت سے سامان بھی موجود تھے۔ جھولے، سرکس، جادو کے کھیل وغیرہ۔ گھومتے گھومتے صادق نے کہا۔ ''اوئے عادے...... باگڑ بلے! زور آزمائی کرنی ہے تُو نے؟''

''کیا مطلب؟''

''یہاں ایک جگہ کئی طرح کے مقابلے ہوتے ہیں۔ مکے کی طاقت دیکھنا، بھاری وزن اُٹھانا، بازو چھڑانا، بازو لڑانا، پانی میں دیر تک ڈبکی لگانا وغیرہ وغیرہ...... ایسے مقابلوں پر انعام شنام بھی ہوتے ہیں۔ یہاں کوئی رانا کلب ہے، وہاں ہوتا ہے یہ سب کچھ۔''

''لیکن اندر جانے کی ٹکٹ بھی تو ہوتی ہوگی۔''

''یار! اگر ٹکٹ ہوگی تو واپس آ جائیں گے۔ انہوں نے کوئی پکڑ کر تھوڑا ابٹھا لینا ہے ہمیں۔''

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں نمائش کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے رانا کلب کے وسیع احاطے کے سامنے پہنچ گئے۔ رانا کلب کے الفاظ ایک بڑے بورڈ پر روشنیوں کی شکل میں جگمگا رہے تھے۔ اندر بھی وافر لائٹنگ کی گئی تھی۔ احاطہ تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی عادل تھوڑا سا چونکا۔ احاطے کے بیچوں بیچ درخت کے دو بلند تنے سیدھے کھڑے تھے۔ یہ خشک کھجور کے ویسے ہی تنے تھے جو شاہ نوانہ کے میدان میں پرانے وقتوں سے گڑے ہوئے تھے۔

''یہ کیا چکر ہے بھئی؟'' عادل نے صادق علی سے پوچھا۔

صادق نے قریب کھڑے ایک نوجوان سے پوچھا۔ ''بھائی جان! یہ سوکھے درخت یہاں کیوں کھڑے کیے گئے تھے؟''

''بڑا زوردار مقابلہ ہوتا ہے بھئی یہاں۔ زیادہ لوگ یہاں اسی مقابلے کو دیکھنے کے لیے کھڑے ہیں۔''

''کس طرح کا مقابلہ ہے؟'' عادل نے پوچھا۔

''رانا کلب والوں نے تین لاکھ روپے کا نقد انعام رکھا ہوا ہے۔ ان کا بندہ صرف چودہ سیکنڈوں میں اس 36 فٹ اونچے درخت پر چڑھ کر دکھاتا ہے۔ جو اس سے کم وقت میں درخت پر چڑھے گا اسے فی الفور یہ انعام ملے گا۔ دو ہفتے ہو گئے ہیں، ابھی تک کوئی نہیں جیتا۔ بلکہ دُگنے وقت والا مقابلہ بھی بس چھ سات لڑکے ہی جیتے ہوں گے۔''

''دُگنے وقت والا مقابلہ؟'' عادل نے پوچھا۔

''ہاں، کلب والوں کا دوسرا چیلنج یہ ہے کہ جو بندہ دُگنے وقت یعنی 28 سیکنڈ میں چڑھ کر دکھائے گا اسے پانچ ہزار روپیہ دیا جائے گا۔''

عادل کے چہرے پر دبا دبا جوش لہر لینے لگا تھا۔ اس نے جواں سال شخص سے پوچھا۔ ''کوئی ٹکٹ بھی ہے مقابلے ں حصہ لینے کے لیے؟''

''تین سو روپیہ، کافی سارا روپیہ تو یہ لوگ ٹکٹوں پر ہی کما چکے ہوں گے۔ اس کے علاوہ شرطیں وغیرہ بھی لگتی ہوں گی۔ پرسوں ملتان سے دو لڑکے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے کافی سخت مقابلہ کیا ہے کلب کے لڑکے سے...... پر جیت ہیں سکے۔''

عادل اپنے دوست صادق کو ایک طرف لے گیا۔ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''صادق! مجھے لگتا ہے میں یہ کام کر سکتا وں۔ اُدھر ہمارے گاؤں کے پاس شاہ نوانہ میں بھی ایسی کھیڈ ہوتی ہے، پرانے وقتوں سے ہو رہی ہے۔ اس کو چڑھائی ہتے ہیں۔ ابھی کوئی ایک مہینہ پہلے میں نے میلے میں یہ مقابلہ جیتا ہے۔ پورے دو ہزار کا انعام ملا تھا مجھے۔''

''پر یہ تیرا گاؤں نہیں شہر ہے باگڑ بلے! کلب والوں کا کھلاڑی کوئی ایویں شیویں تو نہیں ہوگا نا۔ یہ نہ ہو کہ خوامخواہ ن سو روپیہ برباد ہو جائے ہمارا۔''

''نہیں ہوگا یار! تجھے کہا ہے نا میں جیت کر دکھا سکتا ہوں اور اگر نہ بھی ہوا تو...... دگنے وقت والا مقابلہ تو سمجھو اپنی ب میں ہے۔ دگنے وقت کا پانچ ہزار بتایا ہے نا اس بندے نے؟''

صادق نے اثبات میں سر ہلایا اور پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ''اچھا ایسے کر۔ پہلے ایک آدھ مقابلہ دیکھ لے۔ پھر تجھے ادازہ ہو جائے گا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ ویسے مجھے نہیں لگتا کہ یہ لوگ آسانی سے کسی کو جیتنے دیتے ہوں گے۔''

عادل اور صادق کچھ اور آگے چلے گئے۔ احاطے میں داخلے کے لیے کوئی ٹکٹ نہیں تھا...... لوگ باہر کھڑے ہو کر ی یہ تماشا دیکھ سکتے تھے۔ بہرحال یہ دونوں ہجوم میں گھس کر درختوں کے کچھ اور قریب ہو گئے۔ کلب کے احاطے میں ر آزمائی کے دیگر مظاہرے بھی جاری تھے۔ کچھ تنومند نوجوان ایک طرف ویٹ لفٹنگ میں مشغول تھے۔ کھلاڑیوں کے امی نعرے بازی کر رہے تھے۔ ایک جانب ہاتھ کی گرفت کا زور ناپنے والی بڑی سی مشین پڑی تھی اور نوجوانوں کی ایک لی اسے گھیرے ہوئے تھی۔ اس طرح کی دیگر مصروفیات بھی تھیں لیکن لوگوں کی اصل توجہ اسی کھجور کے تنوں والے کھیل ی طرف تھی۔ تنوں کے پیچھے دائیں طرف ایک بڑا کلاک تھا۔ یہ کلاک چودہ پندرہ فٹ اونچے پول پر نصب تھا اور اس پر اعشاریہ دس کا ہندسہ روشنیوں کی صورت میں جگمگا رہا تھا۔ یہ دراصل ایک ڈیجیٹل سٹاپ واچ تھی۔ اس سٹاپ واچ ر ریکارڈ ٹائم درج تھا جو کلب کے کھلاڑی نے 36 فٹ اونچے تنے پر چڑھنے میں صرف کیا تھا یعنی چودہ اعشاریہ دس نڈ۔

تھوڑی ہی دیر بعد ایک نوجوان قسمت آزمائی کے لیے میدان میں آ گیا۔ یہ کوئی کالج اسٹوڈنٹ تھا اور جمناسٹک تا تھا۔ بہرحال جمناسٹک ایک علیحدہ چیز ہے۔ کھجور کے کھردرے درخت پر ہاتھ پاؤں کی مدد سے چڑھنا ایک دیگر ۔ اس نوجوان نے پہلے آزمائش کے طور پر درخت پر تھوڑی سی چڑھائی کی، پھر اصل مقابلہ شروع ہوا۔ وہ تنے پر ں ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک گھڑیال پر چوٹ پڑی، اس کے ساتھ ہی نوجوان نے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ اسٹک کا کھلاڑی ہونے کے باوجود وہ دگنے وقت والا مقابلہ بھی نہیں جیت سکا۔ اس نے درخت کے آخری سرے تک ہنچ اور ہاتھ مار کر سرخ جھنڈی نیچے گرانے میں تقریباً تیس سیکنڈ لگائے۔

یہ منظر دیکھنے کے بعد عادل کا جوش سوا ہو گیا۔ اس نے صادق کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم اس مقابلے میں حصہ لیں گے۔ میرے پاس ڈھائی سو روپیہ ہے۔ پچاس روپے دو، ہم ٹکٹ لیتے ہیں۔''

کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد صادق نے پچاس روپے عادل کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ ان کے اردگرد موجود لوگ مختلف تبصروں میں مصروف تھے۔ بہت سے ایسے تھے جو نا قابلِ یقین نظروں سے چودہ اعشاریہ دس کے فِگر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ اپنی آنکھوں سے چودہ اعشاریہ دس والی کارکردگی دیکھنے کی خواہش رکھتے تھے۔ عادل نے تنے کی بلندی دیکھ لی تھی اور باقی ساری صورتِ حال بھی بھانپ لی تھی۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ یہ چودہ اعشاریہ دس سیکنڈ والا ریکارڈ توڑ لے گا۔ تو کیا واقعی اسے وعدے کے مطابق تین لاکھ روپیہ انعام دے دیا جائے گا؟ کیا کلب والے، حسبِ اندیشہ، کوئی گھپلا شپلا کر دیں گے؟ بہرحال اطمینان کی بات یہ تھی کہ یہاں کافی لوگ موجود تھے اور ایک دو فوٹوگرافرز پر بھی عادل کی نظر پڑی تھی۔ صادق نے بتایا تھا کہ یہ اخباری فوٹوگرافر ہیں۔

اچانک ایک ہاتھ عادل کے کندھے پر آیا اور وہ بُری طرح چونک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور بھونچکا رہ گیا۔ اس کے سامنے چودھری مختار کا بیٹا چھوٹا چودھری ناصر کھڑا تھا۔ ''چودھری ناصر! تم یہاں؟'' عادل نے حیران ہو کر کہا۔

''ہاں...... ہاں، آؤ میرے ساتھ۔'' دراز قد ناصر نے جواب دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ہجوم سے باہر نکلنا شروع کر دیا۔ عادل نے صادق کو بھی اشارہ کر دیا۔ وہ بھی اس کے ساتھ چل پڑا تھوڑی ہی دیر بعد وہ تینوں ایک بڑے شامیانے کے پیچھے نیم تاریکی میں کھڑے تھے۔

''تم یہاں کیسے عادے؟'' ناصر نے پوچھا۔

''بس نمائش دیکھنے کے لیے آ گیا۔ تمہیں بتایا تھا نا کہ یہاں بادامی باغ میں قدیر کے پاس ٹھہرنا ہے۔''

''ہاں بتایا تو تھا تُو نے......'' ناصر نے کہا۔ وہ کچھ گھبرایا اور سٹپٹایا سا نظر آ رہا تھا۔

عادل نے کہا۔ ''تم نے دیکھا ناصر بھائی! یہ ویسا ہی مقابلہ ہے جیسا ہمارے گاؤں میں ''چڑھائی مقابلہ'' ہوتا ہے۔ کیا پتا کسی نے وہیں میلے میں یہ سارا تماشا دیکھا ہو اور یہاں بھی شروع کر دیا ہو۔''

ناصر خاموش رہا۔

عادل نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''ناصر بھائی! یہاں پورے تین لاکھ کا انعام ہے...... اور...... اور مجھے لگتا ہے کہ میں کوشش کروں تو یہ جیت سکتا ہوں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟''

ناصر نے مسکرا کر کہا۔ ''خیال تو صحیح ہے لیکن اصل بات کا تمہیں پتا نہیں۔''

''کیا مطلب ناصر بھائی؟''

''یہاں یہ سارا بکھیڑا میں نے ہی پالا ہوا ہے۔ کلب کا مالک رانا سیٹھ یار ہے اپنا۔ وہی اُدھر گاؤں گیا تھا۔ اسے کھیڈ پسند آئی تھی۔ کوئی ویڈیو شیڈیو دیکھی تھی اُس نے۔''

عادل کے ہونٹ بے ساختہ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔ چودھری ناصر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''یہاں ہم حبشی سے کام لے رہے ہیں۔ اس نے رانا سیٹھ کی مرضی کے مطابق کام کیا ہے۔ رانا سیٹھ خوش ہے اس سے۔ لوگ بھی اس کے کام کو پسند کر رہے ہیں۔ وہ دیکھو پیچھے...... وہ تصویر لگی ہے اس کی۔ لوگ اسے دیکھنے کے لیے ہر روز دھڑا دھڑ

یہاں پہنچتے ہیں۔''

ایک طرف پندرہ بیس فٹ اونچے کھمبے پر فیروز عرف حبشی کی بڑی سی پینٹنگ لگی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی انگلیوں سے فتح کی ''وی'' بنائی ہوئی تھی اور چیلنج کرنے والے انداز میں کھڑا تھا۔ عادل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ناصر بھائی! تم تو جانتے ہو میں حبشی کو آسانی کے ساتھ ہرا چکا ہوں۔ میں یہاں کے لوگوں کو اور زیادہ حیران کر سکتا ہوں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو عادے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اب لوگ یہاں صرف حبشی کو دیکھنے کے لیے آ رہے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ اس کی مارکیٹ بن گئی ہے اب...... وہ جس طرح فلم ایکٹروں کی مارکیٹ نہیں بنتی؟ پھر وہ جیسے بھی ہوں لوگ ان کو ہی دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ہاں ایک کام ہو سکتا ہے۔'' آخر میں ناصر نے ذرا پُرسوچ انداز میں کہا۔

عادل سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

ناصر بولا۔ ''رانا صاحب نے دو ڈھائی مہینے بعد فیصل آباد کی نمائش میں بھی اپنا کلب لے کر جانا ہے۔ انہوں نے وہاں یہ آئٹم رکھا تو پھر تم اس میں حصہ لے لینا۔''

وہاں شامیانوں کے عقب میں کھڑے کھڑے ناصر اور عادل میں قریباً بیس پچیس منٹ بات ہوئی۔ اس گفتگو کا لب لباب یہی تھا کہ فی الوقت عادل سامنے نہیں آ سکتا۔ بلکہ آئندہ اسے یہاں نمائش میں ہی نہیں آنا چاہیے۔ ناصر نے اسے یہ عندیہ بھی دیا کہ وہ یہاں قدیر کباڑیے کی نوکری وغیرہ چھوڑ دے اور پسرور چلا جائے۔ وہاں اس کا کوئی دوست فٹ بال وغیرہ بنانے کا کام کرتا تھا اور ناصر کی سفارش پر عادے کو مناسب اور مستقل ملازمت مل سکتی تھی۔ آخر میں ناصر نے یہ بھی کہا۔ ''پھر اگر تم نے سیالکوٹ والی نمائش میں حصہ لینا ہوا تو تمہیں آسانی رہے گی۔ تم پسرور سے سیالکوٹ دو گھنٹے میں آ جا سکتے ہو۔''

عادل شہر میں نیا نیا ضرور آیا تھا مگر اتنا بھولا بھی نہیں تھا کہ ناصر کی باتوں کا مطلب نہ سمجھتا۔ ناصر فی الحال اسے اس نمائش اور کلب سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی پچھلے چند ماہ سے ناصر اسے بڑی کڑی نظروں سے دیکھتا تھا۔ عادل کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ تایا فراست کے گھرانے سے چودھری مختار کے بڑے پکے رابطے ہیں۔ کئی لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ چودھری مختار اپنے بیٹے ناصر کے لیے فراست کی بیٹی شہزادی کا رشتہ لینا چاہتا ہے۔ عین ممکن تھا کہ ناصر کو شہزادی اور عادل کے حوالے سے تھوڑا بہت شک بھی ہو چکا ہو۔ دبی دبی باتیں تو گاؤں میں گردش کرتی ہی رہتی تھیں۔

گفتگو ختم کرنے سے پہلے ناصر نے عادل سے کہا۔ ''اب کہاں جانا ہے تم نے؟''

''واپس بادامی باغ ہی جاؤں گا۔''

''چلو پھر میں رانا کے ڈرائیور سے کہتا ہوں، وہ تمہیں چھوڑ آئے۔ اُس نے بھی اُدھر یادگار کی طرف ہی جانا ہے...... ہاں...... مگر کل ہماری ملاقات ضرور ہونی چاہیے۔ ڈرائیور تمہارا ٹھکانا دیکھ لے گا۔ میں کل وہیں آ جاؤں گا۔ پسرور والی نوکری کے بارے میں تفصیل سے کل بات کر لیں گے۔''

اچانک سب کچھ اُلٹ پلٹ ہو گیا۔ ایک بندہ خیمے کی اوٹ سے نکل کر سامنے آ گیا۔ عادل نے پہچان لیا۔ یہ وہی کیمرہ مین تھا جو چند ہفتے پہلے شاہ نوانہ کے میلے میں آیا تھا اور کھیل تماشوں کی ویڈیو بناتا رہا تھا۔ عادل کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے ناصر اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو یا گفتگو کا کچھ حصہ سن لیا ہے۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔

وہ عادل سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے پہچان لیا ہے بھئی تمہیں۔ مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ یہاں اتنے بڑے شہر میں تم سے ایسے اچانک ملاقات ہو جائے گی۔ زبردست...... ونڈر فل۔''

عادل نے دیکھا، چودھری ناصر کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، کیمرا مین نے عادل کی کلائی پکڑی اور بولا۔ ''آؤ تمہیں رانا صاحب سے ملاؤں، بڑا خوش ہوں گے۔''

وہ عادل کو اپنے ساتھ لیتا چلا گیا۔ عادل نے سوالیہ نظروں سے ناصر کی طرف دیکھا۔ ناصر جیسے سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس موقع پر کیا کرے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے ہونٹوں کو حرکت دیتا، کیمرا مین اسے کھینچتا ہوا کلب کے عارضی دفتر کی طرف لے آیا۔

دو منٹ بعد عادل، شامیانے کے سجے سجائے دفتر کے اندر ایک فربہ اندام نیم گنجے شخص کے رُوبرو کھڑا تھا۔ کیمرا مین اس کا تعارف کراتے ہوئے نیم گنجے شخص سے کہہ رہا تھا۔ ''رانا صاحب! یہی ہے وہ لڑکا جسے آپ نے ویڈیو میں دیکھا تھا۔ یہ آج کل یہاں بادامی باغ میں کباڑیے کا کام کر رہا ہے۔ بس اتفاق ہی ہے کہ یہاں نمائش میں چلا آیا ہے۔''

رانا صاحب نے عادل کو سرتا پا دیکھا اور ان کی آنکھوں میں تعریف کی جھلک نظر آئی۔ عادے کا سراپا واقعی متاثر کرنے والا تھا۔ اس کی سب سے اہم جسمانی خصوصیت اس کا کشادہ سینہ اور غیر معمولی پتلی کمر تھی۔ کوئی بھی شخص اسے دیکھ کر ہی اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس کے جسم میں بہترین اتھلیٹس والی لچک اور سبک روی ہے۔ کیمرا مین چند قدم چل کر رانا سیٹھ کے قریب پہنچا پھر مؤدب انداز میں جھک کر ان کے کان میں ایک طویل سرگوشی کی۔ رانا سیٹھ اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ عادل کو اندازہ ہوا کہ اس سرگوشی کا تعلق شاید چودھری ناصر اور اس کے رویے سے ہے۔

رانا سیٹھ نے عادل کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ عادل جھجکتا ہوا بیٹھ گیا۔ رانا سیٹھ بولا۔ ''حبشی کو ہرا سکتے ہو تم؟''

''ہرانے کو تو...... ہرا سکتا ہوں...... لیکن...... وہ چودھری ناصر کہہ رہا تھا کہ......''

''چودھری ناصر کو چھوڑو تم...... جو میں کہہ رہا ہوں اس کا جواب دو۔ حبشی کو ہرا لو گے...... اس کا ٹائم وہاں سامنے لکھا ہوا ہے گھڑی پر تقریباً 14 سیکنڈ۔''

عادل نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''اگر یہ حبشی کا ٹائم ہی ہے تو میں اس سے کم وقت میں چڑھ کر دکھا دوں گا جی۔''

''ٹھیک ہے، دیکھ لیتے ہیں۔'' رانا سیٹھ نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد عادل کھلے میدان میں حبشی کا ریکارڈ توڑنے کے لیے تیار تھا۔ چھوٹا چودھری ناصر اور حبشی بھی وہاں موجود تھے۔ چھوٹے چودھری ناصر کی آنکھوں میں ناراضی تھی۔ حبشی بھی تیکھی نظروں سے عادل کو گھور رہا تھا۔ چودھری ناصر کے چہرے سے صاف عیاں تھا کہ وہ اندر سے کھول رہا ہے اور اگر اسے موقع ملے تو وہ کبھی بھی عادل کو اس مقابلے میں حصہ نہ لینے دے۔ بہرحال رانا سیٹھ کی موجودگی میں وہ چپ رہنے پر مجبور تھا۔

تین چار سو تماشائیوں اور میڈیا والوں کی موجودگی میں عادل نے چند منٹ کے لیے خود کو ''وارم اَپ'' کیا اور پھر چڑھائی کے لیے تیار ہو گیا۔ حسبِ معمول گھڑیال پر چوٹ پڑی اور عادل نے پھرتی سے درخت پر چڑھنا شروع کیا۔

اسٹاپ واچ کے ہندسے بھی تیزی سے متحرک ہو گئے۔ تماشائی حوصلہ افزائی میں مصروف تھے۔ جب عادل نے تقریباً 36 فٹ کی بلندی پر جا کر سرخ جھنڈی نیچے گرائی تو سٹاپ واچ بارہ اعشاریہ دس سیکنڈ پر رُک گئی۔ عادل نے حبشی کے ریکارڈ ٹائم سے پورے دو سیکنڈ کم وقت لیا تھا۔ قرب و جوار تالیوں اور حوصلہ افزائی کی آوازوں سے گونج اُٹھے۔ عادل نے نیچے اُترتے ہوئے دیکھا۔ اس کا ساتھی صادق خوشی سے چلاّ رہا تھا اور اُچھل رہا تھا۔ کیمرا مین ابرار اور رانا سیٹھ کے چہرے بھی جوش سے تمتمائے ہوئے تھے۔ وہ نیچے اُترا تو لوگوں نے اس پر شاباشی، تھپکیوں کی بارش کر دی۔ صادق نے دوسرے افراد کے ساتھ مل کر اسے کندھوں پر اُٹھا لیا۔

عادل نے اسی پر بس نہیں کیا۔ دس پندرہ منٹ بعد اس نے ایک بار پھر ٹرائی کیا۔ اس دفعہ اس کی رفتار مزید بہتر ہوئی۔ اس نے تقریباً ایک سیکنڈ مزید کم وقت لیا۔ اب اس کا ریکارڈ گیارہ اعشاریہ پندرہ سیکنڈ تھا۔ ہندسے جگمگا رہے تھے اور جیسے خاموشی کی زبان میں پکار رہے تھے ہاتھ کنگن کو آرسی نہیں۔ اگر کسی میں اس سے زیادہ دم ہے تو آئے اور کر کے دکھائے۔

عادل نے دیکھا۔ فیروز عرف حبشی واضح طور پر پژمردہ دکھائی دیتا تھا۔ ناصر کی ہلاشیری پر اس نے خود کو گرم کیا اور خود کو طیش میں لا کر اپنا وقت بہتر کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر اپنے ریکارڈ میں چوتھائی سیکنڈ کی معمولی سی بہتری ہی لا سکا۔ سیکڑوں لوگوں کے سامنے رانا سیٹھ نے عادل کی کلائی اپنے ہاتھ میں پکڑی اور اس کا بازو ہوا میں بلند کر کے اس کی فتح کا اعلان کیا۔

اس موقع پر بظاہر چھوٹا چودھری ناصر بھی خوش نظر آیا اور اس نے عادل کو مبارک باد دی لیکن عادل کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اندر سے چودھری ناصر بُری طرح تپا ہوا ہے۔

یہ دو تین گھنٹے عادل کے لیے ''کایا پلٹ'' ثابت ہوئے تھے۔ وہ جیب میں ڈھائی تین سو روپیہ لے کر نمائش دیکھنے کے لیے آیا تھا مگر اب اس کے کندھے پر آناً فاناً رانا سیٹھ کا ہاتھ آ گیا تھا۔ رانا کے ملازم اس کے آگے پیچھے پھر رہے تھے۔ رانا سیٹھ نے مسکراتے ہوئے عادل کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''ظاہر ہے بھئی اعلان شدہ انعام تو تمہیں نہیں ملے گا کیونکہ تم اپنی ہی فیلڈ کے بندے ہو لیکن میں اپنی طرف سے تمہیں تیس ہزار کا نقد انعام دیتا ہوں۔ اس کے علاوہ تمہیں فوری ملازمت کی بھی آفر ہے۔ بیس ہزار روپے ماہانہ۔ کھانا رہائش اور دیگر سہولتیں کلب کے ذمے۔ اس کے علاوہ ترقی کے بھی پورے پورے موقعے موجود ہیں۔''

''لیکن مجھے کرنا کیا ہوگا سیٹھ صاحب؟''

''یہی جو ابھی کر کے دکھایا ہے۔ اور یہ بھی روز تو نہیں۔ جب بھی ضرورت پڑے گی۔ آرام زیادہ کام کم......'' سیٹھ پھر مسکرایا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں کاروباری چمک تھی۔

عادل نے کن اکھیوں سے چھوٹے چودھری ناصر کی طرف دیکھا۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ بیٹھا تھا مگر عادل کو اندازہ ہو رہا تھا کہ اس سپاٹ چہرے کے پیچھے گہری کدورت موجود ہے۔ عادل کو خاموش پا کر صادق نے اسے پیچھے سے ٹہوکا دیا۔ مطلب یہی تھا کہ وہ کیا حماقت فرما رہا ہے فوراً آفر قبول کرے۔

عادل نے آفر قبول کر لی۔

''کب سے شروع کرو گے؟'' رانا سیٹھ نے پوچھا۔

''کل ہی حاضر ہو جاؤں گا جی۔ یہاں بادامی باغ میں میرا کچھ سامان پڑا ہے۔ وہ لانا ہے اور ایک دو دوستوں سے ملنا ہے۔''

''ٹھیک ہے کل شام تک پہنچ جاؤ۔'' سیٹھ نے کہا پھر حبشی اور چودھری ناصر کی طرف دیکھ کر ان کی اشک شوئی کے لیے بولا۔ ''چودھری ناصر! تمہارے بندے کی ملازمت بھی برقرار ہے بھئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں کی موجودگی سے مقابلے کا ماحول پیدا ہوگا اور مقابلے کا ماحول کسی بھی کام کے لیے بہت اچھا ہوتا ہے۔''

لیکن اگلے چند گھنٹے کے اندر ''مقابلے کا یہ ماحول'' کچھ اور ہی رنگ اختیار کر گیا۔ عادل اور صادق نمائش سے بادامی باغ واپس آ گئے۔ اپنے دوست کی کامیابی پر صادق بھی بہت خوش تھا۔ اسے یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ عادل کی اچھی ملازمت کی وجہ سے اسے بھی رانا سیٹھ کے پاس کوئی ڈھنگ کا کام مل جائے گا۔ اپنی کباڑ خانے والی کوٹھڑی میں بیٹھ کر دونوں دوست لوہے کی انگیٹھی پر ہاتھ سینکتے رہے اور اس حیران کن کایا پلٹ کے بارے میں بات چیت کرتے رہے۔ پھر صادق تو سو گیا لیکن عادل جاگتا رہا۔ رانا سیٹھ نے اسے تیس ہزار روپے نقد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ ماہانہ بیس ہزار کی نوکری تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ آناً فاناً یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ اسے ماں اور شہزادی دونوں شدت سے یاد آئیں۔ اس کا جی چاہا، شہزادی اس کے سامنے ہو۔ وہ اسے بتائے کہ اس نے سپنوں کی منزل کی طرف اپنا سفر شروع کر دیا ہے...... وہ اس سفر کو تیز سے تیز تر کرے گا اور اس کی محبت کی دی ہوئی طاقت سے منزل پر پہنچ کر دکھائے گا۔ اس نے تصور ہی تصور میں دیکھا کہ شہزادی نے یہ باتیں سنی ہیں...... وہ شرمائی ہے اور اس نے ذرا آگے جھک کر اپنی پیشانی اس کے سینے سے لگا دی ہے، اس نے شہزادی کو بانہوں میں لے لیا ہے۔

اچانک عادل کو اپنے تصورات سے باہر آنا پڑا۔ کوٹھڑی کے دروازے سے باہر آہٹیں سنائی دیں اور پھر زوردار دستک ہوئی۔ یہ رات قریباً دو بجے کا وقت تھا۔ ''کون ہے؟'' عادل نے لحاف سے سر نکالتے ہوئے پوچھا۔

''دروازہ کھول عادے۔'' باہر سے چھوٹے چودھری ناصر کی بھاری آواز سنائی دی۔

''یا اللہ خیر۔'' عادل نے دل ہی دل میں کہا اور چارپائی سے اُتر کر دروازہ کھول دیا۔ اس دوران میں صادق بھی جاگ گیا تھا۔ دراز قد چودھری ناصر تند بگولے کی طرح اندر داخل ہوا۔ حبشی کے علاوہ ایک اور ہٹا کٹا شخص بھی اس کے ساتھ تھا۔ یہ بھی ناصر کے پالتو ملازموں میں سے تھا۔ صادق نے لالٹین کی لَو اونچی کی۔ ناصر نے کینہ توز نظروں سے عادل کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تجھے کہا تھا نا عادے! اس معاملے میں نہ آ۔ تُو نے اپنی من مانی کی ہے۔ کیا چاہتا ہے تُو؟ ٹکر لے گا ہم سے؟''

''اللہ معاف کرے ناصر بھائی! میں اپنے چودھریوں سے ٹکر لینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ آپ نے دیکھا ہی ہے جو کچھ ہوا ہے میری مرضی کے بغیر ہوا ہے۔ سیٹھ صاحب نے مجھے بولنے ہی نہیں دیا۔''

''اچھا، سیٹھ صاحب نے تجھے بولنے ہی نہیں دیا لیکن اب تو سیٹھ یہاں نہیں ہے نا۔ اب تو تُو ''اپنی مرضی'' چلا سکتا ہے نا۔ بتا اب کیا کرنا ہے؟''

''میں کچھ سمجھا نہیں ناصر بھائی۔''

''دیکھ عادے! تُو اتنا کاکا نہیں ہے۔ سب کچھ سمجھ رہا ہے اور پہچان بھی رہا ہے۔ جس طرح تُو سوچ رہا ہے اس طرح کام چلے گا نہیں۔ حبشی کی ناکامی ہماری بدنامی ہے۔ تجھے پیچھے ہٹنا پڑے گا۔ میں نے تجھے کل ہی کہا تھا۔ چپ کر کے پسرور چلا جا۔ میں نے اُدھر اپنے دوست سے گل کر لی ہے۔ تجھے پکی نوکری مل جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر میں تجھے کوئی ٹھیکا شیکا بھی لے دوں۔ وہاں فٹ بال کا بہت زیادہ کام ہے۔ گیند اور بلا وغیرہ بھی بنتے ہیں۔''

عادل نے چند لمحے سوچا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''پر ناصر بھائی! اب تو سیٹھ صاحب سے بات ہو چکی ہے۔ میں تمہارے سامنے ہی زبان دے چکا ہوں ان کو۔''

''یعنی تُو نہیں جائے گا۔'' ناصر کی آنکھوں میں انگارے سے دہک اُٹھے۔

''ناصر بھائی! ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔ میں بھی تو تمہارے ہی پنڈ کا بندہ ہوں۔ اگر مجھے کچھ کامیابی ملے گی تو وہ بھی تمہاری ہی کامیابی ہے۔ چودھری مختار صاحب کی کامیابی ہے، بات تو ایک ہی ہے حبشی نہ سہی میں سہی۔''

''دیکھ عادے! زیادہ باتیں نہ بنا۔'' ناصر نے آنکھیں نکالیں۔ ''مجھ سے دو حرفی گل کر۔ تُو نے یہاں سے جانا ہے یا نہیں۔''

عادل ذرا سنبھل کر بولا۔ ''ناصر بھائی! تم کیوں مجھے پیچھے رکھنا چاہ رہے ہو۔ اُدھر سیٹھ کے بندے ابرار نے مجھے بتایا ہے کہ وہ لوگ میرا پوچھنے کے لیے پنڈ گئے تھے مگر تم نے اور بڑے چودھری جی نے میرا پتا دینے سے انکار کر دیا۔ کہہ دیا کہ عادا لاہور یا کراچی میں ہے اور اس کی کچھ خبر نہیں۔ حالانکہ میں تمہیں پورا پتا دے کر گیا تھا۔''

''وہ پتا گم ہو گیا تھا۔ چودھری صاحب سے۔'' حبشی نے آنکھیں نکال کر کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ ایسے نہیں مانے گا تُو؟'' ناصر کا لہجہ زہرناک ہو گیا۔ ''اپنی ماں کی طرح اڑیل ہے تُو...... پورا پورا اڑیل ہے۔''

عادل کے سینے میں شعلے بھڑک اُٹھے۔ ''دیکھو چودھری! میری ماں کے بارے میں کچھ نہ کہنا۔''

چودھری زہرخند لہجے میں گویا ہوا۔ ''لو بھئی، سلطان راہی جاگ گیا ہے اس کے اندر۔ اس کی ماں کے بارے میں کچھ نہ کہنا۔ اور بات ہے بھی ٹھیک۔ ایسی سچی کھری ماں ملتی بھی کہاں سے ہے۔ نہ ہی ایسا پتر کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ دونوں جھونپڑے میں بیٹھ کر حویلیوں اور جاگیروں کے سندر سپنے دیکھ رہے ہیں۔ ماں گُر سکھا رہی ہے اور پتر عشق پیچے لڑا کر تایا کے گھر میں سن (نقب) لگانے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ پر یہ گندی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوگی عادے پتر۔ خود بھی جوتے کھائے گا اور ماں کو بھی پڑوائے گا۔''

ناصر کی آنکھوں میں غضب کے شعلے تھے۔ اب عادل کے لیے مزید سہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ ایک چنگھاڑ کے ساتھ چودھری ناصر پر جا پڑا۔ وہ جیسے پہلے سے تیار تھا۔ اس نے کھڑے کھڑے ٹانگ رسید کی۔ وہ اچٹتی سی عادل کے سینے پر پڑی۔ مگر یہ ضرب عادل کو روکنے میں ناکام رہی۔ وہ سیدھا چودھری ناصر پر آیا اور اسے اپنے ساتھ لیتا ہوا چارپائی پر گرا۔ چارپائی ٹوٹ گئی۔ عادل کا بھرپور گھونسا چودھری ناصر کے منہ پر پڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرا گھونسا مارتا عقب سے حبشی نے اسے بازوؤں میں جکڑ لیا اور ایک دھاڑ کے ساتھ اسے ہوا میں اُٹھانے کی کوشش کی۔ عادل نے اپنی دونوں ٹانگیں جوڑ کر ناصر کے منہ پر ماریں اور اسے پھر سے زمین بوس کر دیا۔ حبشی اسے چھوڑنے پر ہرگز آمادہ نہیں تھا۔ عادل نے اپنے

سر کے عقبی حصے سے اس کی ناک پر ضرب رسید کی لیکن وہ سہہ گیا۔

عادل بچپن سے ہی لڑائی بھڑائی کا شوقین تھا۔ خالی ہاتھ دو تین بندوں سے نبٹ لینا اس کے لیے کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ اس کا انتہائی لچک دار اور سبک جسم بنا ہی مار دھاڑ کے لیے ہے، مگر یہاں صورت حال اچانک ہی گمبھیر ہوگئی تھی۔ حبشی کے ساتھ ہی ہٹا کٹا تاجا بھی عادل پر جھپٹ پڑا۔ اب عادل کے دوست صادق نے بھی اس لڑائی میں کودنا ضروری سمجھا۔ اس نے عادل کو حبشی سے چھڑانے کے لیے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالا اور پورے زور سے کھینچنے لگا۔ اس دوران میں تاجے نے اپنی کہنی کی ایسی شدید ضرب صادق کو لگائی کہ اس کا جبڑا ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دی۔ وہ نیم جان سا ہو کر انگیٹھی پر گرا اور ادھ بجھے انگارے چاروں طرف بکھر گئے۔ چودھری ناصر سمیت تینوں افراد نے اب عادے کو دبوچ لیا تھا۔ ''حرامزادے، کتے، ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والے۔'' چودھری ناصر پھنکارا اور عادل کے چہرے پر گھونسے رسید کرنے لگا۔ عادل نے ایک بار پھر زور مارا۔ وہ حبشی کی گرفت سے قریباً نکل ہی گیا تھا مگر تاجے نے چارپائی کے ٹوٹے ہوئے پائے سے اس کے سر کے پچھلے حصے پر ضرب لگائی، وہ اوندھے منہ گر گیا۔ چند ادھ بجھے انگارے اس کے سینے اور بازوؤں پر برچھیوں کی طرح چبھے۔ ''ہڈیاں توڑ دو حرامی کی۔'' چودھری ناصر دھاڑا۔ اس کی ساری اندرونی نفرت اور کدورت اب شیش ناگ کی طرح پھن پھیلا کر باہر نکل آئی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ عادل کو اپاہج کرنے کے چکر میں ہے۔

دھما چوکڑی کی آوازوں سے کباڑ خانے کے دو دیگر ملازم بھی جاگ گئے تھے۔ غالباً ان کی آوازوں نے ہی ڈھلائی کے کارخانے میں سوئے ورکروں کو بھی جگا دیا۔ کئی افراد بھرا مار کر اندر گھس آئے۔ وہ چودھری ناصر اور اس کے کارندوں کو عادل سے دور کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ عین ممکن تھا کہ ان میں سے کچھ ناصر وغیرہ پر ٹوٹ بھی پڑتے لیکن تب تک ہٹا کٹا بدمعاش تاجا اپنی قمیص کے نیچے سے بٹن سے کھلنے والا چاقو نکال چکا تھا۔ اس کا انداز گواہی دے رہا تھا کہ اگر اندر آنے والے افراد نے لڑائی میں شرکت کی کوشش کی تو وہ چاقو کا بے دریغ استعمال کرے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اندر آنے والے افراد صرف بیچ بچاؤ تک محدود رہے۔ گلی کا چوکیدار اور چند مزید افراد بھی اندر آگئے۔ کچھ لوگوں نے مضروب عادل کو گھیر لیا۔ کچھ چودھری ناصر اور اس کے کارندوں کو دھکیل دھکال کر کوٹھڑی سے باہر لے گئے۔ یہ لڑائی کسی بڑے سانحے میں تبدیل ہونے سے بچ گئی۔ صادق کا جبڑا ٹوٹ چکا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ دبائے کوٹھڑی کے نیم پختہ فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔

O.....❖.....O

معاملہ تھانے کچہری تک پہنچ سکتا تھا لیکن رانا سیٹھ بیچ میں کودا...... اس نے کوشش کر کے اس گرما گرمی کو ٹھنڈا کیا۔ عادل کے کباڑیے دوست نے بھی (جو اب کارخانے دار بھی تھا) بیچ بچاؤ میں کردار ادا کیا۔ یہ لوگ ایک دو معزز بندوں کے ساتھ لالی گاؤں بھی گئے اور چودھری مختار کے ساتھ مل کر صلح صفائی کرائی۔ عادل کا ساتھی صادق میو ہسپتال کے ہڈی وارڈ میں زیر علاج تھا۔ اس کے جبڑے کا علاج ہو رہا تھا۔

اس سارے واقعے کا نتیجہ یہ نکلا کہ حبشی، رانا سیٹھ کی ملازمت چھوڑ کر گاؤں واپس چلا گیا۔ چھوٹے چودھری ناصر اور رانا سیٹھ کے تعلقات بھی تقریباً ختم ہو گئے۔ بہرحال عادل اور چھوٹے چودھری ناصر کی دبی دبی دشمنی میں جو چنگاریاں بھڑکی تھیں وہ بدستور چمکتی رہیں۔ عادل کو بڑی اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ چنگاریاں جلد یا بدیر پھر سے شعلہ بنیں

گی اور ان کی تپش کسی نہ کسی شکل میں اس تک پہنچے گی۔

ایک دن رانا سیٹھ کے دفتر میں چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے عادل نے مؤدب انداز میں کہا۔ ''سیٹھ جی! میں سمجھتا ہوں کہ اب میری ماں کا وہاں گاؤں میں رہنا ٹھیک نہیں۔ چودھری اسے کسی نہ کسی طرح پریشان ضرور کریں گے۔ وہ بوڑھی جان ہے۔ پہلے ہی صدموں کی ماری ہوئی ہے۔''

''کیا چاہتے ہو؟''

''کیا کوئی ایسا انتظام ہو سکتا ہے کہ میں ماں کو یہاں لاہور لے آؤں۔ میرا مطلب ہے کہ کوئی چھوٹا موٹا گھر مل جائے۔''

رانا سیٹھ نے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور ناک سے دھواں چھوڑ کر بولا۔ ''اچھا، میں کوشش کروں گا کہ ایسا ہو سکے لیکن...... لیکن تمہاری ماں کو تو پھر بھی زیادہ تر اکیلا ہی رہنا پڑے گا کیونکہ ہم نے تو مختلف نمائشوں میں شرکت کرنی ہوتی ہے۔ اِدھر سے اُدھر سفر کرتے ہی رہنا ہوتا ہے ہم نے۔ کیا تمہارا کوئی اور ایسا رشتے دار نہیں جو کسی دوسرے گاؤں میں یا شہر میں تمہاری والدہ کو رکھ سکے؟''

عادل نے کہا۔ ''نہیں سیٹھ جی! میں نے آپ کو بتایا ہے نا، ہمارے سارے رشتے دار کھاتے پیتے لوگ ہیں اور...... غریب رشتے داروں سے میل جول رکھنا ذرا مشکل ہی ہوتا ہے۔''

''گھبراؤ نا۔ بہت جلد تم اتنے غریب نہیں رہو گے۔'' رانا سیٹھ نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔

''میں ہر طرح کی محنت کو تیار ہوں سیٹھ جی۔ کلب کا کام تو شام کے بعد ہی ہوتا ہے، سارا دن تو فارغ ہوتا ہوں۔ آپ بے شک کوئی اور کام بھی میرے ذمے لگا دیں۔''

''نہیں عادے! ابھی تم اپنا سارا دھیان اسی چڑھائی والے کھیل کی طرف ہی رکھو۔ لوگ تمہارے کام کو پسند کر رہے ہیں۔ ہم اس میں کچھ نئی چیزیں شامل کر کے اسے اور دلچسپ بنائیں گے۔ تم اس میں بہت آگے جا سکتے ہو۔ باقی، کھانے پینے کی کوئی پروا نہیں کرنی۔ جس چیز کی ضرورت ہو مجھ سے یا ابرار سے کہہ دیا کرو...... اور ہاں...... مجھے پتا چلا ہے کہ سندھ سے کوئی لڑکا آ رہا ہے۔ کسی وڈیرے کا ہاری ہے۔ کھجور کے باغوں میں کام کرتا ہے، لگتا ہے کہ وہ کافی سخت مقابلہ کرے گا تمہارا۔ ان لوگوں نے کہیں اخبار میں خبر پڑھی ہے، ہمارے اس چڑھائی والے آئٹم کی اور انعام کا بھی پتا چلا ہے ان کو۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ انعام اب چار لاکھ کر دیا ہے ہم نے۔ چار لاکھ کا معاملہ ہے اور عزت بے عزتی کا بھی۔'' سیٹھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ فکر نہ کریں جی۔ میں جان لڑا دوں گا۔'' عادل نے کہا۔

عادل نے واقعی اس مقابلے میں جان لڑا دی۔ یہ مقابلہ سات آٹھ روز بعد ہوا۔ سیکڑوں لوگ جمع تھے۔ اخباری نمائندے اور ٹی وی کے دو چار رپورٹرز بھی آئے ہوئے تھے۔ کھجور کے دونوں تنوں کے ارد گرد سیکڑوں تماشائی منتظر تھے۔ پورا احاطہ روشنیوں میں جگمگا رہا تھا۔ رانا سیٹھ نے عادل کو کھل کر تو نہیں بتایا تھا لیکن اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس مقابلے پر موٹی رقموں کی شرطیں وغیرہ بھی لگائی گئی ہیں۔ عادل کا مقابل لڑکا اپنے سائیں اور کچھ دیگر لوگوں کے ہمراہ یہاں پہنچا تھا۔ وہ گہری گندمی رنگت والا چھریرے بدن کا تھا۔ سنا تھا کہ وہ درخت پر چڑھنے کے علاوہ بلندی سے پکی زمین پر

چھلانگ لگانے اور تنے ہوئے رسے پر چلنے جیسے کاموں میں بھی ماہر ہے۔ اس لڑکے نے واقعی خوب مقابلہ کیا۔ پہلی چڑھائی میں تو اس نے عادل کو تقریباً ہرا ہی دیا تھا۔ مگر دوسری چڑھائی میں عادل نے حقیقی معنوں میں سرتوڑ کوشش کی۔ اس کی کھال نے کئی جگہ سے چھل کر خون اگلا اور اس کی سانس سینے میں خنجر کی طرح چلی مگر وہ کمان سے چھوٹے ہوئے تیر کی طرح اپنے ہدف کی طرف بڑھتا گیا اور اپنے مدِمقابل کو ایک واضح فرق سے ہرا دیا۔ اس چڑھائی میں عادل نے اپنا سابقہ ریکارڈ بھی آدھے سیکنڈ کے فرق سے بہتر کر لیا۔

یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ عادل کا خیال تھا کہ اسے کچھ انعامی رقم دی جائے گی لیکن اس بار بھی دس ہزار روپے کا صرف وعدہ ہی ہوا (ابھی پچھلا تیس ہزار والا انعام بھی اسے نہیں ملا تھا) ہاں اتنا ضرور ہوا کہ سیٹھ صاحب نے اسے ماہانہ تنخواہ مقررہ مدت سے تین روز پہلے ہی دے دی۔ یعنی بیس ہزار کے نوٹ اس کی جیب میں آ گئے۔ کلب کے احاطے میں اب حبشی کے بجائے اس کی پینٹنگ، بلند پول پر آویزاں تھی۔

O......❖......O

سیٹھ صاحب نے وعدے کے مطابق ابھی اس کی والدہ کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔ عادل نے سوچا چلو جتنی دیر تک لاہور میں کسی رہائش کا بندوبست نہیں ہوتا وہ والدہ کو گوجرانوالہ میں اپنے بڑے خالو عطا شاہ کے ہاں منتقل کر دے۔

وہ رات کو اندھیرا ہونے کے بعد اپنے گاؤں لالی پہنچا۔ وہ یہاں کسی کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا اور چودھریوں کے سامنے تو بالکل نہیں۔ چودھری کے بیٹے ناصر کے ساتھ اس کی لڑائی کی خبر پورے گاؤں کو مل چکی تھی۔ عادل نے راتوں رات ہی والدہ کو تیار کیا اور پھر منہ اندھیرے انہیں وہاں سے لے کر گوجرانوالہ کے لیے روانہ ہو گیا۔

گوجرانوالہ میں والدہ کا انتظام ہو گیا تو وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگا۔ اب وہ زیادہ یکسوئی سے اپنی مصروفیات کی طرف توجہ دے سکتا تھا۔ وہ کام تو کر رہا تھا مگر اپنی آمدن اور آگے بڑھنے کی رفتار سے مطمئن نہیں تھا۔ اس نے تایا کے ڈیرے پر کھڑے ہو کر دعویٰ بھی تو غیر معمولی کر لیا تھا۔ یہ کوئی پانچ دس لاکھ کی بات نہیں تھی، دو ڈھائی کروڑ کی بات تھی۔ تین سال میں ڈھائی کروڑ یہ جاگتی آنکھوں کا خواب ہی لگتا تھا۔

عادل کے پاس دن کے زیادہ تر حصے میں کوئی خاص مصروفیت نہیں ہوتی تھی۔ اس نے سوچا کیوں نہ وہ اپنے گاؤں کے عبدالقدیر کی طرح خود بھی کباڑ کا کام شروع کر دے۔ قدیر نے اسی کام سے پچھلے ڈھائی تین سال میں نہ صرف بہت سی مشینیں خرید لی تھیں بلکہ اپنا ایک پلاٹ بھی لے لیا تھا۔ اس پلاٹ سے بھی اسے کافی فائدہ ہوا تھا۔ یعنی وہ دو چار سالوں میں صفر سے پچاس ساٹھ لاکھ کی اسامی بن چکا تھا۔

بہر حال ایسا کوئی کام شروع کرنے سے پہلے ضروری تھا کہ رانا سیٹھ سے اجازت لے لی جائے۔ ایک دن اس نے رانا سیٹھ سے بات کی۔ سیٹھ نے کہا۔ ’’عادے! دیکھو اصل بات پھر تمہارے ذہن سے نکل رہی ہے۔ ہم نے لاہور میں مستقل نہیں ٹھہرنا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو ماہ بعد ہمیں سیالکوٹ جانا ہو گا اور پھر آگے کسی شہر میں۔ تم اپنے کباڑ کے اس کام کو ساتھ ساتھ تو لے کر نہیں پھر سکتے نا؟‘‘

’’سیٹھ جی! میں نے اس کا بھی سوچا ہے۔‘‘ عادل نے اعتماد سے جواب دیا۔ ’’میرا یار اب آپ کی دعا اور مدد سے صحت یاب ہے۔ میں یہ کام شروع کر کے اس کے حوالے کر دیتا ہوں۔ جب ہم لاہور میں نہیں ہوں گے، وہ دیکھ بھال

کرتا رہے گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی۔‘‘ رانا سیٹھ نے کہا۔

عادل کے اندر ایک عجیب سی بے قراری تھی جو ہر وقت اسے متحرک رکھتی تھی۔ ایک ترنگ ایک لہر، آگ کی ایک لپٹ سی...... اس کے سینے میں ہر پل کچھ سلگتا رہتا تھا جو اسے غیر معمولی توانائی فراہم کرتا تھا۔ دو تنخواہیں ا ل ہو چکی تھیں۔ وہ بڑی کفایت شعاری سے خرچ کرتا تھا۔ قریباً پینتیس ہزار روپیہ اس کے پاس موجود تھا، دس پندرہ ہزار کی بچت صادق کے پاس بھی تھی۔ انہوں نے ایک خالی پلاٹ کرائے پر لے لیا۔ اس پر ٹین کی بُری بھلی چھت ڈالی۔ بڑے سائز کا ترازو یعنی کنڈا خریدا اور کباڑ کا کام شروع کر دیا۔ سائیکلوں اور ریڑھیوں والے کباڑیئے ان کے پاس آنے لگے اور اپنا مال فروخت کرنے لگے۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ بندہ جب کسی کام میں پڑتا ہے تو پھر اس کی اصل مشکلات اور اونچ نیچ کا علم ہوتا ہے۔ عادل بالکل ایمانداری سے کام کرنا چاہتا تھا مگر دیگر کاموں کی طرح اس کام میں بھی کئی ہیر پھیر تھے۔ خاص طور سے وزن اور تول کی چکر بازی اس میں شامل تھی۔

عادل کا دوسرا کام بھی کامیابی سے جاری تھا۔ اس کی وجہ سے رانا سیٹھ کے کلب کی کافی شہرت ہوئی تھی۔ رانا سیٹھ کلب کے ساتھ ہی ایکسرسائز کی جدید مشینوں کا سٹال بھی لگاتا تھا۔ یہ سٹال بھی معمول سے زیادہ چل رہا تھا۔ ان دنوں ابھی ٹی وی چینل اتنے زیادہ تو نہیں تھے پھر بھی ایک چینل نے اس کے مظاہرے کو اپنی سکرین پر دکھایا اور تعریف کی۔ وقتاً فوقتاً سخت مدِمقابل بھی کلب میں آتے رہتے تھے مگر ابھی تک کوئی بھی عادل سے سبقت لے جانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ موقع پڑنے پر وہ بڑے اعتماد سے سٹارٹنگ پوائنٹ پر آتا۔ گھڑیال پر چوٹ پڑتے ہی بجلی کی رفتار سے 36 فٹ اونچے تنے پر چڑھتا اور دیکھنے والوں کو حیران کر دیتا۔ آج کل ڈیجیٹل سٹاپ واچ پر اس کا ریکارڈ ٹائم، گیارہ اعشاریہ پانچ سیکنڈ چمکتا تھا اور دیکھنے والوں کو چیلنج کرتا تھا۔

رانا سیٹھ نے اسے ابھی تک رہائش فراہم نہیں کی تھی۔ وہ اس خالی پلاٹ میں ہی رہ رہا تھا جہاں وہ اور صادق کباڑ کا سامان اکٹھا کرتے تھے۔ یہاں کچی چھت ڈال کر انہوں نے ایک اور نیم پختہ کمرا سا بنا لیا تھا۔ ایک روز گاؤں سے اس کے بچپن کا دوست شاہد عرف ڈاکٹر اس سے ملنے کے لیے آیا۔ وہ دونوں آپس میں ہر طرح کی بات کر لیا کرتے تھے۔ عادل اور شہزادی کی ہمراز ریحانہ جو لالی گاؤں میں عادل کی پڑوسن تھی، شاہد کی ماموں زاد بھی تھی۔ ریحانہ کے ذریعے تایا فراست علی کی حویلی کی باتیں شاہد کو معلوم ہوئیں اور اس نے یہ صورتِ حال آ کر عادل کو بتائی۔

شاہد نے کہا۔ ’’یار! وہاں اندر خانے کوئی کھچڑی شچڑی پک رہی ہے۔ پچھلے ہفتے چودھری مختار نے تمہارے تایا جی اور ان کے سارے گھر کی کافی بڑی دعوت کی ہے اپنے گھر میں۔ شہزادی بھی گئی ہوئی تھی۔ لمبے چوڑے انتظام تھے وہاں۔‘‘

’’لمبے چوڑے کیا مطلب؟‘‘

’’بڑے ٹھاٹ باٹ دکھائے ہیں چودھری مختار نے تمہارے تایا صاحب کو۔ گوجرانوالہ سے باورچی بلائے گئے تھے۔ کوئی بیس طرح کے کھانے تھے۔ مرغابی اور ہرن وغیرہ کا گوشت تھا۔ لوک پنجابی گیت گانے والے بھی آئے ہوئے تھے۔ سنا ہے چار پانچ لاکھ روپیہ تو ان گانے والوں کو ہی دیا گیا ہے۔‘‘

''دعوت کس سلسلے میں تھی؟''

''یار! یہ وڈے لوگ جب وڈے لوگوں کی دعوتیں کرتے ہیں تو اس کے لیے کسی وجہ کی لوڑ نہیں ہوتی۔ ویسے اس دعوت میں تو شاید تھوڑی بہت وجہ ہے بھی۔''

''کیا مطلب؟'' عادل نے پوچھا۔

''ریحانہ نے بتایا ہے کہ چودھری مختار تمہارے تایا سے جو میل جول بڑھا رہا ہے تو اس کے پیچھے شہزادی کا رشتہ ہی ہے۔ اس نے چھوٹے چودھری ناصر کے لیے سرسری طور پر شہزادی کا رشتہ مانگا ہے اور اندر خانے کی خبر یہ ہے کہ تمہارے تایا جی نے انکار نہیں کیا۔''

''کیا مطلب، اقرار کیا ہے؟'' عادل کی دھڑکن رُک سی گئی۔

''نہیں، اقرار بھی نہیں کیا۔ یعنی ابھی یہی کہا ہے کہ وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔ بچے ابھی چھوٹے ہیں۔ شاید ان کا مطلب یہ ہوگا کہ شہزادی ابھی چھوٹی ہے۔''

عادل ایک طویل ''ہوں'' کر کے خاموش ہوگیا۔ چند لمحے بعد پُر سوچ انداز میں بولا۔ ''ریحانہ نے کچھ اور بھی بتایا ہے؟''

''یہی کہ شہزادی آج کل بہت اُداس رہتی ہے۔ کبھی کبھی اس کی آنکھیں رونے سے سرخ نظر آتی ہیں لیکن اب وہ ریحانہ سے تمہارے بارے میں کسی طرح کی کوئی بات نہیں کرتی۔ شاید اس نے اس بارے میں کوئی قسم کھائی ہوئی ہے۔ ویسے تم نے شہزادی کو کوئی پیغام دینا ہے تو دے دو۔ ہوسکتا ہے کہ ریحانہ تمہاری بات شہزادی تک پہنچا دے۔''

''پیغام کیا دوں شاہد! میں نے جو کچھ اس سے کہنا تھا کہہ دیا ہے اور میں اس پر قائم ہوں۔ میں اس کو حاصل کرنے کے لیے وہ سب کچھ کروں گا جو میرے بس میں ہے۔ اگر کامیاب ہوگیا تو ایک دن اس کے پاس گاؤں پہنچ جاؤں گا اور اگر ناکام ہوگیا تو...... پھر کبھی اسے شکل نہیں دکھاؤں گا اور...... ہوسکتا ہے کہ خود کو مٹی کے نیچے ہی چھپا لوں۔''

عادل کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر شاہد بھی اُداس ہوگیا۔ بھرائی آواز میں بولا۔ ''ایسی باتیں نہ کر یار! تیرے ارادے نیک ہیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ سوہنا کوئی نہ کوئی راہ نکال دے گا۔ ویسے تُو کوئی پیغام شیغام بھیج دے شہزادی بہن کو۔ اس کو حوصلہ ملے گا۔''

''نہیں شاہد! میں نے تایا سے وعدہ کیا ہے۔ اب شہزادی سے کوئی تعلق واسطہ نہیں رکھوں گا۔ اگر کبھی ملوں گا تو ان کی اجازت سے ملوں گا۔''

شاہد اس کا بچپن کا یار تھا۔ سمجھ گیا کہ اب وہ اس معاملے میں کوئی بات نہیں کرے گا۔ موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

''تیرا یہ کباڑ والا کام کیسا جا رہا ہے؟''

''بس چل ہی پڑا تھا لیکن...... اب ایک مسئلہ ہوگیا ہے۔''

''وہ کیا؟''

''یہ کرائے کا پلاٹ ہے۔ مالک نے کہا ہے کہ اگلے مہینے خالی کر دو۔ اب پھر کوئی اور جگہ ڈھونڈنی پڑے گی۔ پتا نہیں کوئی ڈھنگ کا ٹھکانا ملتا بھی ہے یا نہیں۔'' عادل کے لہجے میں پریشانی کی جھلک تھی۔

اسی دوران میں پلاٹ سے باہر کوئی بڑی گاڑی رُکنے اور دروازے بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ ساتھ ہی گیٹ پر دستک ہوئی۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ موسم اَبر آلود تھا۔ کبھی ہلکی اور کبھی تیز بارش ہو رہی تھی۔ عادل، ایک پلاسٹک کا ٹکڑا سر پر اوڑھ کر پھاٹک تک گیا۔ باہر ایک کرولا کار کھڑی تھی۔ گیٹ پر پچپن ساٹھ سال کا ایک دراز قد شخص موجود تھا۔ اس کی کاٹھی مضبوط اور سر کے بال لمبے تھے۔ گھنی بھنوؤں اور چھوٹی چھوٹی سفیدی مائل ڈاڑھی نے اس کے سرخ و سپید چہرے کو ایک باوقار رنگ دے رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر نمایاں چیز اس کی بڑی بڑی پُر سوچ آنکھیں اور اس کے رُخساروں کی اُبھری ہوئی مضبوط ہڈیاں تھیں۔ یہ ہڈیاں اس کی سخت جانی اور جاں فشانی کو ظاہر کرتی تھیں۔ اس نے پینٹ کے اوپر سیاہ جیکٹ پہن رکھی تھی۔ ایک ملازم ٹائپ شخص اس کے سر پر چھتری تانے کھڑا تھا۔

''جی فرمائیں۔'' عادل نے ذرا حیرت سے کہا۔

''تمہارا نام ہی عادل ہے نا۔'' عادل نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کیا میں تمہارا تھوڑا سا وقت لے سکتا ہوں؟ دراصل میں تم سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

عادل نے کہا۔ ''یہاں آپ کے لائق بیٹھنے کی جگہ تو نہیں ہے۔ اگر...... آپ مناسب سمجھیں تو گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں۔''

''نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں...... جہاں تم بیٹھ سکتے ہو، وہاں میں بھی بیٹھ سکتا ہوں۔ ہم دونوں انسان ہی تو ہیں۔'' وہ ہولے سے مسکرایا اور اس کی آنکھوں کے گرد خوبصورت سلوٹیں نمودار ہوگئیں۔ اس کے لب و لہجے میں عجیب سا فلسفیانہ آہنگ تھا۔

''آیئے۔'' عادل نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔

بارش کچھ تیز ہوگئی تھی۔ وہ دونوں جلدی سے اس چھوٹے سے کمرے میں آگئے جہاں اینٹوں کے چولہے میں آگ روشن تھی۔ عادل کے اشارے پر صادق نے پلاسٹک کی ایک کرسی کو اچھی طرح جھاڑا۔ ''بیٹھیے جناب!'' عادل نے کہا۔

وہ شخص بڑی تمکنت سے بیٹھ گیا۔ نہ جانے کیوں اب عادل کو لگ رہا تھا کہ اس نے اس باوقار چہرے کی جھلک پہلے بھی کہیں دیکھی ہے۔ اس کا ملازم، جو ڈرائیور تھا، واپس گاڑی میں چلا گیا۔ عادل کے اشارے پر صادق بھی باہر نکل گیا اور ٹین کی چھت والے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔

ڈاڑھی والے شخص نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام سرمد ابدال ہے۔ بس گزر اوقات کے لیے یہاں لاہور میں ایک چھوٹی سی فیکٹری رکھی ہوئی ہے۔ وہاں ایکسرسائز کی مشینیں وغیرہ بنتی ہیں۔ ویسے میرا اصل شوق سیاحت ہے۔ اپنی حیثیت اور طاقت کے مطابق بہت سے سفر کیے ہیں۔ ملک کے اندر بھی اور باہر بھی۔ خیر یہ ایک علیحدہ موضوع ہے، ہم اس پر بعد میں بھی بات کر سکتے ہیں۔ فی الحال میں تمہیں یہاں اپنے آنے کی وجہ بتانا چاہتا ہوں اور یقیناً یہی سوال اس وقت تمہارے ذہن میں بھی شدت سے اُبھر رہا ہوگا۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

ڈاڑھی والے شخص نے اپنی چھوٹی سی ڈاڑھی میں انگلیاں چلائیں اور کہا۔ ''میں پچھلے دس پندرہ روز سے وہاں نمائش میں جا رہا ہوں...... اور تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ تم جو کچھ وہاں کر رہے ہو اس نے مجھے حیران کیا ہے اور...... کسی حد تک

مایوس بھی۔'' ایک لمحہ توقف کر کے اس شخص نے بغور عادل کا چہرہ دیکھا۔ عادل کو لگا کہ یہ شخص بندے کے اندر تک جھانک لیتا ہے۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''حیرانی کی وجہ تو یقیناً سامنے کی بات ہے اور یہ بات سب کو ہی معلوم ہے تم درخت پر چڑھنے کا جو مظاہرہ کرتے ہو وہ بے حد متاثر کرنے والا ہے۔ بے شک اس میں تمہاری بہت سی مشق بھی شامل ہے اور تجربہ بھی۔ بہرحال بجلی کی سی رفتار سے درخت کی چوٹی پر پہنچنا اور ہاتھ مار کر سرخ جھنڈی کو گرانا ایک قابلِ دید منظر ہوتا ہے۔ مجھے نظر نہیں آتا کہ کوئی جلد ہی تمہارے اس ریکارڈ کو توڑ سکے گا یہ بالکل گاڈ گفٹڈ ہے۔''

''بہت شکریہ۔'' عادل نے کہا۔

''اب اگر تم بُرا نہ مانو تو میں مایوسی والی بات کی طرف آتا ہوں۔''

''جی فرمائیں۔''

''مجھے لگا ہے کہ تم خود کو ضائع کر رہے ہو۔ بالکل ضائع کر رہے ہو۔ یہ کرکٹ، ہاکی یا جمناسٹک وغیرہ کی طرح کوئی ایسا کھیل نہیں، جس میں بندہ آگے بڑھ سکے، نام پیدا کر سکے، ملک میں اور ملک سے باہر کامیابیاں سمیٹ سکے۔ میں اپنے تجربے اور اپنے نالج کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں کہ قدرت نے تمہیں ایک زبردست صلاحیت دی ہے۔ اس صلاحیت کو اگر کوئی مناسب راستہ نہ ملا تو یہیں کھجور کے درختوں پر چڑھ چڑھ کر اور اُلٹے سیدھے کاموں میں حصہ لے کر ضائع ہو جائے گی۔''

''میں سمجھا نہیں جناب! آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟''

اس شخص نے کھڑکی سے باہر آسمان کی طرف دیکھا۔ سیاہ بادلوں نے عین دوپہر کے وقت ہی شام کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ اچانک کالے بادلوں میں بجلی کا ایک لہریا چمکا۔ اس لہریے کا عکس اس شخص کی سوئی سوئی خوبصورت آنکھوں میں نمایاں ہو کر اوجھل ہو گیا۔ دو تین سیکنڈ کے وقفے سے بادل دہاڑے اور یوں لگا کہ اس کمرے کے بلکہ پورے شہر کے درو دیوار لرز گئے ہیں۔ اس نے چولہے میں روشن آگ پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''تم مستقبل بینی کے بارے میں کیا جانتے ہو۔ میرا مطلب ہے آنے والے وقت کے بارے میں پہلے سے جان جانے کا علم؟''

''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں جی۔ میری تعلیم بہت کم ہے۔ بس اتنا پتا ہے کہ غیب کا علم صرف اوپر والے کو ہے۔ ہم تو صرف اندازے ہی لگا سکتے ہیں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ غیب کا علم صرف اوپر والے کو ہے۔ ہم تو صرف اندازے لگا سکتے ہیں۔ یہ اندازے ہم اس اوپر والے کی دی ہوئی عقل سمجھ سے ہی لگاتے ہیں۔ یہ کام بھی اوپر والے نے ہمارے اوپر ہی چھوڑ دیا ہے کہ ہم اپنی عقل کو کتنی توجہ اور یقین کے ساتھ کام میں لاتے ہیں۔ مستقبل کے بارے میں جاننے کا علم کیا ہے؟ یہ کوئی سفلی عمل یا جادو ٹونہ نہیں ہے۔ یہ سارا سمجھ بوجھ اور سوچ بچار کا کھیل ہے۔ اگر ہم اپنے خدا کی دی ہوئی عقل کو ٹھیک سے استعمال کریں اور چیزوں کو پوری باریک بینی سے پرکھ کر حالات پر غور کریں تو ہم مستقبل کے بارے میں پیش گوئیاں کر سکتے ہیں۔''

''لیکن جناب! یہ تو صرف اندازہ ہوا نا۔''

''اندازہ لگانے کی صلاحیت جب عروج پر پہنچتی ہے تو یہی پیش گوئی اور مستقبل بینی بن جاتی ہے۔ ہمارے اردگرد کے حالات اور مناظر میں بہت چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ہر وقت رُونما ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارا ذہن ان میں سے کچھ کو نوٹ

کرتا ہے اور اکثر کو نظر انداز کر دیتا ہے لیکن جو لوگ مستقبل میں جھانکتے ہیں وہ زیادہ کو نوٹ کرتے ہیں اور کم کو نظر انداز کرتے ہیں، دھیرے دھیرے وہ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ بدلنے والے حالات کے بارے میں پیشگی اندازے لگا لیتے ہیں۔ شاید تمہیں یہ جان کر حیرت ہو گی کہ آج کے سائنسدان اور دانشور یہی سمجھتے ہیں کہ انسان اپنی دماغی صلاحیت کا بالکل مختصر سا حصہ استعمال کرتا ہے، باقی سب کچھ ویسے کا ویسا ہی پڑا رہتا ہے اور لاش کے ساتھ قبر میں چلا جاتا ہے۔''

''آپ کی کچھ باتیں سمجھ میں آ رہی ہیں اور کچھ نہیں۔ پھر بھی آپ کی ساری باتیں دل پر اثر کر رہی ہیں۔'' عادل نے کہا۔

''دیکھو، میں اپنے خیال کی وضاحت ایک معمولی سی بات سے کرتا ہوں۔'' سرمد صاحب نے کہا اور اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی سیاہ نوٹ بک نکالی، پھر جیکٹ کی جیب سے ایک قلم نکالا اور اس پر کچھ لکھ کر میز پر رکھ دیا۔ عادل سمجھا کہ وہ اس بارے میں شاید کوئی بات کریں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ عادل کے والدین اور اس کے گھربار کے بارے میں عمومی سوالات کرتے رہے۔ چولہے میں آگ روشن تھی اور چند موٹی لکڑیوں کو لگنے کے بعد آگ مزید روشن ہو گئی تھی۔ عادل نے تپش سے بچنے کے لیے اپنی کرسی تھوڑی سی پیچھے کھسکائی۔ شیشے کے ایک گلاس میں کچھ چائے بچی ہوئی تھی وہ اُلٹ گئی۔ تاہم کچے فرش کی وجہ سے گلاس ٹوٹنے سے بچا رہا۔ عادل نے گلاس کو جلدی سے اُٹھا کر سیدھا کیا۔ ایسا کرنے کے لیے وہ جب نیچے جھکا تو اس کی قمیص کی سامنے والی جیب سے کئی کاغذات پھسل کر گر گئے اور اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ ان میں رسیدیں وغیرہ تھیں اور چالیس پچاس روپے کے کرنسی نوٹ ہوں گے۔ عادل نے انہیں جلدی جلدی سمیٹا۔

سرمد صاحب مسکرائے۔ ''لگتا ہے کہ میری موجودگی تمہیں نروس کر رہی ہے۔ میرا مطلب ہے پریشان ہو تم۔''

''نہیں سر! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ مجھے تو آپ کی باتیں اچھی لگ رہی ہیں۔''

''پتا ہے کیوں اچھی لگ رہی ہیں؟'' وہ سوالیہ نظروں سے سرمد صاحب کا چہرہ دیکھنے لگا۔ نیم تاریک کمرے میں آگ کی روشنی چہرے کو عجیب سا تاثر دے رہی تھی۔ لمبے بالوں کی ایک لٹ ان کی کشادہ پیشانی پر جھول رہی تھی۔ ہولے سے بولے۔ ''اس لیے کہ میں تمہیں بہت قریب سے دیکھ رہا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے تمہارے اندر کچھ نظر آ رہا ہے..... تمہارا مستقبل..... تمہاری آنے والی زندگی اور جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ بہت خوش کن ہے اور حیرت انگیز بھی۔ میں..... تمہیں..... ایک بہت اونچی جگہ پر دیکھ رہا ہوں عادل! ایک ایسے مقام پر جہاں کم ہی لوگ پہنچتے ہیں لیکن تمہارے اور اس مقام کے درمیان کوئی سیدھا راستہ نہیں ہے۔ ایک بڑا مشکل اور پُر پیچ سفر ہے۔ یہ آگ اور برف کے سات سمندر ہیں۔ کیا تم آگ اور برف کے سات سمندر پار کرنے کی ہمت رکھتے ہو؟'' وہ کھوئی کھوئی سی آواز میں بولتے چلے گئے۔

عادل ہونقوں کی طرح منہ کھولے بیٹھا تھا۔ انہوں نے اس کی پریشانی دیکھی اور بولے۔ ''میرا مطلب مشکلات سے ہے۔ میں تمہیں بہت اونچے مقام پر دیکھ رہا ہوں مگر بہت سی مشکلات کے بعد اور پتا نہیں کیوں..... پتا نہیں کیوں، مجھے لگتا ہے کہ تم مشکلات سے ٹکرانے کی ہمت رکھتے ہو۔ کوئی توانائی ہے تمہارے اندر جو تمہیں آگے بڑھا سکتی ہے، ایک بے قراری ہے، ایک ایسی بے چینی جو لوگوں میں شاذ و نادر ہی نظر آیا کرتی ہے۔ اس بے پناہ بے چینی اور توانائی کو اگر درست راستہ مل گیا تو تمہارا مشکل سفر آسان ہو سکتا ہے۔ کیا تم نے کسی سے پیار کیا ہے؟''

انہوں نے آخری الفاظ ایک ہی دم کہہ ڈالے تھے، عادل بھونچکا سا رہ گیا۔ ''جج...... جی...... میں سمجھا نہیں۔'' وہ
س یا۔

''کسی سے پیار کیا ہے تم نے...... کسی کو بہت شدت سے چاہا ہے۔ بہت زیادہ شدت سے۔'' اس مرتبہ سرمد صاحب کا لہجہ سوالیہ نہیں تھا، آگاہ کرنے والا تھا۔

وہ خاموش رہا۔ ''شرماؤ مت عادل! یہ سلسلہ تو آدم حوا سے چلا آ رہا ہے اور تمہاری عمر میں پیار نہیں ہوگا تو کب ہو گا۔ مجھے بتاؤ...... مجھے اپنے بارے میں کچھ بتاؤ، میں بھی تمہیں، تمہارے بارے میں بہت کچھ بتاؤں گا۔ میں نے بتایا ہے نا کہ میں پچھلے کافی دنوں سے نمائش پر جا رہا ہوں اور تمہیں وہاں دیکھ رہا ہوں۔ میں اگر یہاں پہنچا ہوں تو اس کے پیچھے کوئی وجہ ہے، بہت خاص وجہ۔ تم مجھے اپنے بارے میں معلومات دو عادل۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ باتیں بس میرے اور تمہارے درمیان رہیں گی۔ پلیز عادل! مجھے غیر نہ سمجھو اور...... اپنا بزرگ بھی نہ سمجھو۔ مجھے اپنا دوست سمجھو۔ میں جانتا ہوں، تم مشکل میں ہو۔ میں تمہیں اس مشکل سے نکال کر ایک بہت بڑی آسانی کی طرف لے جانا چاہتا ہوں۔''

پتا نہیں کیوں عادل کا دل اس مہربان شخص کی طرف جھکتا چلا جا رہا تھا۔ ایک گھنٹے کے ساتھ کے بعد ہی اسے لگنے لگا تھا کہ وہ انہیں مدتوں سے جانتا ہے...... اور وہ ایسے ہیں جن پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ خود کو اپنی تمام تر اُلجھنوں کے ساتھ ان کی غیر معمولی دانش کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔ ان کی ذات میں کئی باتیں انوکھی محسوس ہوتی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ عادل کو ان کے خوبصورت ہاتھوں پر کچھ گٹے سے نظر آ رہے تھے۔ سیاہی مائل سخت جلد...... جس کی وجہ عموماً کڑی محنت مشقت ہی ہوتی ہے۔

باہر بارش مسلسل جاری تھی۔ صادق نہ جانے کہاں سے صاف ستھرے برتنوں میں چائے لے آیا تھا۔ اس نے ایک پیالی باہر گاڑی میں ڈرائیور کو پہنچا دی تھی باقی سرمد صاحب اور عادل کے سامنے رکھ دی تھی...... عادل نے اپنے حالات ابتدا سے لے کر انتہا تک سرمد صاحب کے گوش گزار کر دیئے۔ اپنی یتیمی، بہنوں کی شادیاں، بیماری غربت اور پھر غربت میں شہزادیوں جیسی شہزادی سے محبت اور محبت بھی ایسی جس نے اسے بنیادوں تک ہلا دیا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح لالی گاؤں کے چُودھری اس کی محبت پر ڈاکا ڈالنے کی فکر میں ہیں اور کس طرح اس نے ڈھائی تین ماہ پہلے اپنے تایا کے ڈیرے پر کھڑے ہو کر ایک بلند بانگ دعویٰ کر لیا ہے اور اب اس دعوے کی لاج رکھنے کے لیے شب و روز انگاروں پر چل رہا ہے۔

عادل کی اس رُوداد کے دوران میں سرمد صاحب گاہے بگاہے اس سے سوالات بھی پوچھتے رہے۔ ان کی آنکھوں کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے عادل جو کچھ بھی بتا رہا ہے ان کی توقعات اور اندازوں کے مطابق ہی ہے۔ عادل کی بات اپنے اختتام کو پہنچی تو سرمد صاحب نے ایک سانس لے کر چولہے میں آگ درست کی اور بولے۔ ''بہت لمبا سفر ہے تمہارا۔ بہت تیز تیز چل رہے ہو۔ لیکن تمہارے قدم بہت چھوٹے ہیں۔ ان چھوٹے قدموں کے ساتھ بہت تیز چلو گے یا بھاگو گے تو گر پڑو گے۔ میں دیکھ رہا ہوں، بہت کچھ سمجھ رہا ہوں۔ کیا تم گرنا چاہتے ہو؟''

''میں پھر کہوں گا۔ مجھے آپ کی باتیں پوری طرح سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں سر! لیکن میں گرنا نہیں چاہتا۔ میں

شہزادی کو پانے کے اس سفر میں گرنا نہیں چاہتا۔''

''پورے ہوش و حواس اور ارادے سے کہہ رہے ہو؟''

''جی سر۔''

''تو پھر...... آج یہاں اس ''برستی بارش والی شام'' میں، اس آگ کے سامنے اور اس چھت کے نیچے، ایک فیصلہ کر لو۔''

''کیسا فیصلہ سر؟''

''جو میں کہوں گا مانو گے۔ تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن اس پر عمل کرو گے۔ اس کے بدلے، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں عادل! میں تمہیں منزل تک پہنچاؤں گا، وہ سب کچھ تمہیں حاصل ہوگا جس کا تم نے ارادہ کیا ہے۔ ہاں عادل! میں ایک حقیر سا بندہ ہوں لیکن قدرت نے مجھے تھوڑی سی باریک بینی عطا کی ہے۔ اس کی بخشی ہوئی عقل کا حق تو ہم میں سے کوئی ادا کر ہی نہیں سکتا، بس اس عقل میں سے تھوڑا سا حصہ میں استعمال کرنے کے قابل ہو سکا ہوں اور میری اتنی سی کامیابی نے مجھے کافی دور تک دیکھنے کے قابل بنا دیا ہے۔''

''یعنی آپ کا خیال ہے کہ آپ آنے والے وقت کے بارے میں جان جاتے ہیں؟''

سرمد صاحب نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور آنکھیں بند کر لیں۔ ''اللہ مجھے معاف کرے۔ شاید میں نے بے دھیانی میں کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جس سے تم نے یہ نتیجہ نکال لیا ہے۔ میں تو کسی اندھے کی طرح ٹامک ٹوئیاں مارتا ہوں۔ وہ اپنی قدرتِ کاملہ سے کسی وقت میرے ذہن کو درست سمت میں منتقل کر دیتا ہے۔ لیکن میں پھر کہوں گا کہ یہ کوئی جادوئی یا ماورائی علم نہیں۔ نوعِ انسان کو خدا کی بخشی ہوئی دانش ہے، جس کا کچھ حصہ مجھ جیسے لوگ استعمال کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔''

''ابھی آپ نے اس ڈائری میں کچھ لکھا تھا اور بتایا بھی نہیں کہ کیا لکھا تھا؟''

''ہاں...... میں بھول گیا۔ بس ایک چھوٹی سی بات تھی۔ تمہیں فقط یہ سمجھانے کے لیے کہ مستقبل کے بارے میں اندازے لگانے کی حِس کس طرح پروان چڑھتی ہے؟''

انہوں نے ڈائری کھولی اور لکھا ہوا صفحہ عادل کے سامنے کر دیا۔ یہ بس دو فقرے تھے۔ لکھا تھا۔ ''عادل! عین ممکن ہے کہ ابھی کچھ دیر میں تم اپنی کرسی کچھ پیچھے ہٹاؤ اور وہ گلاس گرا دو جس میں بچی ہوئی چائے ہے۔''

عادل دنگ رہ گیا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ یہ فقرے سرمد صاحب نے چائے گرنے والے واقعے سے پہلے لکھے تھے۔ شاید تین چار منٹ پہلے۔ ''یہ کیسے...... ہوا سر! آپ کو کیسے پتا چلا؟''

''بہت سادہ ہے۔ تمہاری کرسی آگ کے زیادہ قریب تھی۔ تم باتیں کرتے ہوئے بے دھیانی میں بار بار اپنی پنڈلی سہلا رہے تھے۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ تمہیں تپش محسوس ہو رہی تھی۔ چولہے میں مزید لکڑیاں ڈالی گئی تھیں۔ انہیں ایک دو منٹ میں مزید آگ پکڑنا تھی اور تپش کو بڑھانا تھا۔ یقینی بات تھی کہ تم اپنی کرسی کچھ پیچھے ہٹاؤ گے۔ کرسی کے پچھلے پائے کے بالکل ساتھ یہ گلاس رکھا تھا یہ تمہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے اُلٹنے کا امکان بہت زیادہ تھا اور دیکھو ایسا ہی ہوا۔ میں تھوڑا سا مزید غور کرتا تو اس پیش گوئی کو مزید حیران کن بنا سکتا تھا۔ تمہاری قمیص کی جیب میں کاغذات اوپر اُٹھے ہوئے

تھے۔ تمہارے جھکنے کے سبب پھسل کر نیچے گر سکتے تھے اور یہ گرے بھی۔ اگر میں یہ منظر بھی پیش گوئی میں شامل کر دیتا تو تم اور بھی ہکا بکا ہو جاتے۔ یہ سب ایک چھوٹی سی مثال ہے عادل! ہم اپنے اردگرد ہونے والی چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں سے لے کر بڑے بڑے عالمی واقعات تک پر غیر معمولی غور کرنا شروع کر دیں اور اپنے پچھلے تجربات کو خوبی سے استعمال کر پائیں تو حیران کن پیش گوئیاں کر سکتے ہیں۔ چہرے پڑھ سکتے ہیں۔ انسانوں کے اندر جھانک سکتے ہیں۔''

''نہیں سر! یہ اتنا سادہ نہیں۔ مجھے لگتا ہے، آپ ایک غیر معمولی شخص ہیں۔ کچھ ہے آپ کے پاس، خیر چھوڑیں اس بات کو۔ آپ مجھے بتائیں، آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

''ایک سفر۔'' سرمد صاحب نے ٹھہری آواز میں کہا۔ ''بہت لمبا نہیں، اور بہت چھوٹا بھی نہیں۔''

''کہاں کا سفر سر؟''

''وہاں کا'' سرمد صاحب نے عجیب انداز سے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ بارش کچھ ہلکی ہو گئی تھی لیکن لاہور کے آسمان پر تاریک بادل موجود تھے اور ان میں کبھی کبھی بجلی کا لہریا دوڑتا تھا۔ خستہ حال کمرے کی یہ کھڑکی شمال کی طرف کھلتی تھی اور سرمد صاحب کی نگاہ جیسے دور کہیں شمال میں دیکھ رہی تھی۔

''آپ اس طرف کیوں دیکھ رہے ہیں سر؟''

''اُس طرف پہاڑ ہیں۔ بلندیاں ہیں، برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں ہیں۔ ان چوٹیوں کے بالائی سرے گہرے بادلوں میں چھپے رہتے ہیں...... اور انہی چوٹیوں کے اوپر کہیں تمہارے لیے کچھ موجود ہے۔''

''مم...... میرے لیے؟''

''ہاں، تمہارے لیے اور ہر اس شخص کے لیے جو اپنے اندر ہمت رکھتا ہے اور تکلیفیں سہنے کا عزم رکھتا ہے...... یہ چوٹیاں دل والوں کا امتحان لیتی ہیں اور جو اس امتحان میں پورا اُترتے ہیں انہیں کچھ نہ کچھ دیتی بھی ہیں۔ اس لیے مجھے ہمیشہ ان سے پیار رہا ہے۔ یہاں کی یخ ہوائیں، یہاں کی برفیلی ڈھلوانیں، یہاں کی پُرخطر پگڈنڈیاں...... سب مجھے محبوب رہی ہیں۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ میری عمر کا زیادہ حصہ سیاحت میں گزرا ہے اور اس سیاحت کا ساٹھ ستر فیصد حصہ کوہ نوردی پر مشتمل ہے۔''

''لیکن آپ مجھے وہاں کیوں لے جانا چاہتے ہیں؟''

سرمد صاحب نے عادل کی آنکھوں میں جھانکا بہت اندر تک، پھر اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں بولے۔ ''تمہیں بتایا ہے نا کہ تمہارے لیے وہاں کچھ موجود ہے۔ ایک راستہ جو صرف تمہارے لیے بنا ہے۔ جسے بس تم جیسا شخص ہی طے کرے گا۔''

''آپ کی باتیں مجھے اُلجھا رہی ہیں سر! کیا آپ کھل کر کچھ بتانا پسند کریں گے؟''

''بتا دوں گا۔ بلکہ ضرور بتا دوں گا لیکن وقت آنے پر ہی ایسا ہو سکے گا۔ فی الحال یہ ایک غیر متعلق موضوع ہے۔ تم مجھے صرف بتاؤ، کیا تم اپنا ذہن بنانے میں کامیاب ہو گئے ہو۔ مجھے بہت جلدی بھی نہیں۔ میں تمہیں اچھی طرح سوچنے کے لیے مناسب وقت دے سکتا ہوں۔ کیا تم اس سلسلے میں مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہو؟''

''جی ہاں، سوال تو بہت سے ذہن میں آ رہے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگر میں آپ کے ساتھ کسی سفر پر جاتا ہوں تو یہ سفر

کتنے دن میں ختم ہو گا۔ اس دوران میں مجھے کیا کرنا ہو گا۔ مجھ پر میرے گھر کی کچھ ذمے داریاں بھی ہیں۔ میرے روزگار کا کیا ہو گا۔''

''میرے اندازے کے مطابق اس سفر کا دورانیہ تین سے چار ماہ ہو سکتا ہے۔ یہ کسی بھی طرح سے کوئی غیر قانونی کام نہیں ہو گا۔ ہاں مہم جُوئی اور کوہ پیمائی والے عام خطرات تو اس میں موجود ہوں گے۔ تم نے ابھی بتایا ہے کہ تم رانا سیٹھ کے پاس سے ماہانہ بیس ہزار روپیہ لے رہے ہو۔ تمہارا یہ بیس ہزار والا اعزازیہ برقرار رہے گا۔ اس کے علاوہ کچھ اضافی سہولتیں بھی ملیں گی۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے تمہیں بتا دوں کہ رانا سیٹھ تم سے ناجائز فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ اس درختوں پر چڑھائی والے کھیل پر درپردہ بھاری شرطیں لگائی جا رہی ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق زیادہ نہیں تو آٹھ دس لاکھ روپیہ ہفتے کا یہ شخص تمہارے ذریعے سے بنا رہا ہے۔''

ایک دم عادل کو وہ تیس ہزار روپیہ بھی یاد آ گیا جس کا وعدہ، رانا سیٹھ نے انعام کے طور پر کیا تھا اور ابھی تک وعدہ بس وعدہ ہی تھا۔ اسی طرح رہائش مہیا کرنے والے معاملے کو بھی وہ مسلسل ٹالتا چلا جا رہا تھا۔ سرمد صاحب نے کہا۔ ''میں کچھ زیادہ بتاؤں گا تو یہ چغلی ہو جائے گی لہٰذا تھوڑے کہے کو ہی زیادہ سمجھو۔ رانا سیٹھ تمہیں اور تمہاری خاص الخاص صلاحیتوں کو ضائع کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کرے گا۔ تمہیں اس کے گھیرے سے نکل کر آگے بڑھنا ہے۔ بہت اونچی پرواز کرنی ہے عادل! اور مجھے پتا ہے تم کر سکتے ہو۔''

''مجھے اس بات پر معاف کیجیے گا سر! مجھے شہرت، ناموری، عیش و عشرت کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ میری سب سے بڑی ضرورت روپیہ ہے۔ وہ روپیہ جو اس وقت میرے اور شہزادی کے کام آ سکے۔ میں کمانا چاہتا ہوں سر! بہت تیزی سے کمانا چاہتا ہوں۔''

''تم بہت تیزی سے کماؤ گے۔ ایک ہی چھلانگ میں اس جگہ تک پہنچو گے جہاں پہنچنے کا لوگ بس تصور ہی کرتے ہیں۔ جس سفر کی میں بات کر رہا ہوں اس کا اختتام تمہارے لیے ایک بہت ہی اچھی جگہ پر ہونے والا ہے۔''

''کوئی اشارہ دیں گے آپ۔''

''ابھی نہیں، لیکن کہا ہے نا وقت آنے پر سب کچھ بتا دوں گا۔''

آخر عادل نے کرسی پر پہلو بدلا اور مؤدب انداز میں بولا۔ ''مجھے فیصلہ کرنے کے لیے دو دن کا وقت چاہیے سر۔''

''میں تمہیں چار دن کا وقت دیتا ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ تم اچھا فیصلہ کرو گے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارا براہِ راست ملنا زیادہ مناسب نہیں۔ میں تمہیں اپنا موبائل فون نمبر دیتا ہوں۔ تم رات کے سات آٹھ گھنٹوں کو چھوڑ کر جب چاہو اس پر رابطہ کر سکتے ہو۔''

O......❖......O

یہ اگلے روز شام کی بات ہے۔ عادل نمائش گاہ میں تھا۔ معمول کے مطابق وہ ہر روز دو بار اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ایک دفعہ آٹھ بجے کے لگ بھگ پھر دس بجے کے لگ بھگ۔ آج اس کے گاؤں سے اس کے یار دوست اس سے ملنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ انہیں معلوم ہوا تھا کہ ان کے گاؤں کے عادے کا نام شہر میں مشہور ہے۔ اس کی تصویریں لگی ہوئی ہیں اور شہری لوگ اسے دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ آج عادل نے اپنا ایک ہاتھ پشت پر باندھ کر صرف ایک

ہاتھ سے درخت پر چڑھنے کا مظاہرہ کیا اور احاطہ دیر تک تالیوں سے گونجتا ہوا۔

عادل کے یار دوست گاؤں سے اس کے لیے کئی سوغاتیں لائے تھے۔ باداموں والا گڑ، شکر پارے اور پنجیری وغیرہ...... عادل کا جگری دوست شاہد بھی ساتھ آیا تھا۔ وہ بھی اطلاع کی صورت میں ایک سوغات لایا تھا اور اس سوغات نے عادل کا منہ کافی کڑوا کر دیا۔

وہ عادل کو ایک طرف لے جا کر بولا۔ ''یار عادل! تجھے پنڈ سے دور نہیں رہنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ آہستہ آہستہ شہزادی والی گیم تیرے ہاتھ سے نکل جائے۔''

''کیوں کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں، تُو خوامخواہ پریشان ہو گا لیکن جو سیانے کہتے ہیں کہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند بھی نہیں کرنی چاہئیں۔''

''اچھا چل بتا نا۔'' عادل نے تیوری چڑھا کر کہا۔

''تمہارے تایا اور چودھری مختار کا گھرانہ تیزی سے قریب آ رہا ہے۔ تمہارے تایا اور چودھری مختار نے مل کر وہاں پنڈ میں چاول صاف کرنے والی مشین لگائی ہے۔ کافی پیسہ خرچ ہوا ہے اس مشین پر۔ سمجھو اب وہ دونوں ساجھے دار بھی ہو گئے ہیں۔ صاف پتا چلتا ہے کہ چودھری مختار کے دماغ میں وہی رشتے داری والی بات ہے۔ اس لیے وہ اس طرح کی ساجھے داریاں بنا رہا ہے۔''

عادل کے سینے میں تیز چبھن سی تو ہوئی لیکن وہ نارمل لہجے میں بولا۔ ''شاہد! جب تک شہزادی میرے ساتھ ہے۔ مجھے کسی کی پروا نہیں۔ ہم سب کچھ اپنے حق میں کر لیں گے۔''

''پر یار! یہ بھی تو سوچ کہ کئی دفعہ دوری سے نقصان بھی ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ بندے کا ذہن بدلنا شروع ہو جاتا ہے۔ اب دیکھو پچھلی جمعرات کو راہ پورے میں بگے سائیں کا عرس تھا۔ پنڈ کے سارے لوگ سج دھج کر عرس پر گئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح تمہارے تایا کے گھر والوں نے پردے والے تانگے پر جانا تھا مگر چودھری مختار نے دو گڈوں (بیل گاڑیوں) کا انتظام کرایا۔ ان کو بڑی چنگی طرح سجایا سنوارا گیا۔ دونوں گھروں کی زنانیاں مل جل کر ان گڈوں پر بیٹھیں۔ مرد گھوڑیوں پر سوار ساتھ ساتھ تھے۔ خوب ڈھول ڈھمکا ہوتا رہا۔ عورتیں پردے کے اندر ہی ڈھولکی وغیرہ بجاتی رہیں۔ میں سارے راستے دیکھتا رہا وہ لمبو چودھری ناصر، شہزادی والی گڈ کے ساتھ ساتھ ہی رہا۔ عرس میں بھی وہ سیل ککڑ کی طرح ساری عورتوں کو ساتھ لے کر پھرتا رہا۔ مجھے لگتا ہے کہ ناصر کی چھوٹی بہن فاخرہ پوری کوشش کر رہی ہے شہزادی اور ناصر کو ایک دوجے کے قریب لانے کی۔ ریحانہ بتا رہی تھی کہ وہ کئی بار تمہارے تایا کی حویلی بھی آ جاتی ہے اور گھنٹوں باتیں کرتی رہتی ہے شہزادی سے۔ اس کی ضد پر ایک دو دفعہ شہزادی بھی چودھریوں کے گھر گئی ہے۔''

یہ سب کچھ عادل کے لیے دل سوز تھا مگر اس نے شاہد پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ شاہد نے ایک بار پھر کہا۔ ''کبھی کبھی تو لگتا ہے عادے! کہ تُو نے ماں جی کو گوجرانوالہ بھیج کر چنگا نہیں کیا۔ وہ ادھر ہوتیں تو ان سے ملنے کے بہانے تو پنڈ آتا جاتا رہتا۔ تجھے وہاں کی خیر خبر رہتی۔''

عادل تپ کر بولا۔ ''تو تمہارا کیا مطلب ہے۔ میں پنڈ آنے جانے کی خاطر ماں جی کو مصیبت میں ڈالے رکھتا۔ تجھے پتا ہی ہے چودھری ناصر سے جھگڑے کے بعد کتنی ٹینشن بن گئی تھی۔''

شاہد نے جلدی سے موضوع بدل کر کہا۔ ''اچھا، چل تُو کوئی پیغام وغیرہ ہی بھیج دے شہزادی بہن کو۔ اسے کچھ احساس تو ہو کہ تُو دن رات اس کے لیے سوچ رہا ہے۔''

عادل نے آہ کے انداز میں سانس لی۔ ''شاہد! کہہ کر احساس دلایا تو کیا دلایا۔ اسے خود ہی پتا ہونا چاہیے اور میں جانتا ہوں کہ اسے پتا ہے۔''

عادل نے اصرار کر کے گاؤں والوں کو رات اپنے پاس ٹھہرایا، کھانا وغیرہ کھلایا۔ صبح وہ لوگ چلے گئے تو وہ بیٹھا دیر تک سوچتا رہا۔ شاہد کی باتیں پریشان کن تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ عادل، شہزادی سے رابطہ رکھے اور کسی بہانے گاؤں میں آتا جاتا رہے۔ مگر وہ تو اب گاؤں جانے کے بجائے کہیں اور جانے کا سوچ رہا تھا۔ کہیں بہت دور نامعلوم راستوں پر۔ اس دھواں دھار برستی شام میں سرمد صاحب نے جیسے اس پر ایک جادو سا کر دیا تھا۔ وہ اسی طرح سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا جس طرح وہ چاہتے تھے کچھ خاص تھا ان میں۔ ان کے اردگرد جیسے ایک نظر نہ آنے والا کشش کا ہالہ تھا...... اور وہ اس ہالے میں سے اپنا ہاتھ نکال کر اس کی طرف بڑھا رہے تھے۔ کہہ رہے تھے...... یہ ہاتھ تھام لو۔ سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن تھام لو۔ جو کچھ تم چاہ رہے ہو اور جتنی جلدی چاہ رہے ہو، اسی طرح ممکن ہے کہ میرے کہنے پر چلو۔

عادل اور سرمد صاحب کی اگلی ملاقات سرمد صاحب کے گھر میں ہوئی۔ ان کا گھر لاہور کے مضافات میں ایک فارم ہاؤس کی شکل میں تھا۔ یہ گھر بھی سرمد صاحب کی طرح انوکھا اور ناقابلِ فہم تھا۔ تین ایکڑ کے فارم ہاؤس کے بیچوں بیچ یہ خوبصورت عمارت تھی۔ اس کے دو حصے تھے۔ ایک تو نہایت آرام دہ اور زندگی کی سہولتوں سے آراستہ تھا۔ تاہم دوسرا حصہ بالکل مختلف اور کسی درویش کا ڈیرا نظر آتا تھا۔ عادل یہ دیکھ کر حیران ہوا۔ یہاں گیس پانی اور بجلی جیسی سہولتیں بھی میسر نہیں تھیں۔ کمرے ہر طرح کے فرنیچر سے تقریباً عاری تھے۔ سونے کے لیے فرش پر چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ہاں ضرورت کے لیے الماریاں وغیرہ موجود تھیں۔ روشنی کے لیے لالٹینیں تھیں۔ جب بجلی ہی نہیں تھی تو اے سی اور پنکھے وغیرہ کا وجود کہاں ہو سکتا تھا۔ احاطے میں پانی کے لیے دو ہینڈ پمپ موجود تھے۔ عادل نے اندازہ لگایا کہ یہاں کھانا وغیرہ بھی لکڑی کی آگ سے پکایا جاتا ہو گا۔ سرمد صاحب عجیب ہیئت کذائی میں یہاں موجود تھے۔ عادل حیران رہ گیا۔ سخت سردی میں انہوں نے بس ایک نیکر پہن رکھی تھی جو ان کے گھٹنوں تک پہنچتی تھی۔ بنیان پسینے میں بھیگی ہوئی تھی، ہاتھ پاؤں مٹی میں لتھڑے تھے جیسے وہ کہیں کاشت کاری کرتے رہے ہیں (بعدازاں یہ کاشت کاری والا اندازہ بھی درست ثابت ہوا۔ عادل پر انکشاف ہوا کہ انہوں نے گھر کے پچھواڑے قریباً ڈیڑھ ایکڑ رقبے پر چاول گندم اور دو تین قسم کی دالیں کاشت کر رکھی ہیں ایک چھوٹا سا ٹریکٹر ہے جسے وہ خود ہی چلاتے ہیں۔ ایک چھوٹے پمپ کے ذریعے اس زمین کو پانی ملتا تھا۔ پمپ کو بجلی، گھر کے دوسرے حصے سے فراہم ہوتی تھی۔)

اپنے گھر میں جدید سہولتوں کی عدم موجودگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرمد صاحب مسکرائے اور بولے۔

''دیکھا نا عادل! کتنا آسان حل ہے بجلی گیس اور پانی کے بھاری بلوں کا۔ نہ ہو گا بانس نہ بجے گی بانسری۔''

عادل کس کس بات پر حیرت کا اظہار کرتا۔ وہ سرمد صاحب کے ساتھ گھر کے ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا۔ یہاں ایک کھردری چٹائی کے سوا اور کچھ نہیں تھا ایک طرف لکھنے پڑھنے کے لیے لکڑی کی چوکی پڑی تھی۔ چوکی کے قریب گیس لیمپ رکھا تھا۔ پیچھے ایک دیوار گیر الماری میں نیچے سے اوپر تک کتابیں چنی ہوئی تھیں۔ گھر کے اس حصے میں شاید ایک

آدھ ملازم بھی ہوگا لیکن اس وقت وہ بھی موجود نہیں تھا۔ عادل کے بہت منع کرنے کے باوجود سرمد صاحب نے خود ہی چائے بنائی اور خود ہی لے کر عادل کے پاس چٹائی پر آ بیٹھے۔ قریباً پچپن سال عمر کے باوجود ان کا جسم ورزشی اور تنا ہوا تھا۔

''آپ کا رہن سہن مجھے حیران کر رہا ہے سر۔''

وہ مسکرائے۔ ''یہ کوئی دکھاوا نہیں ہے۔ مجھے ہمیشہ سے ایسے ہی اچھا لگتا ہے۔ پھل پھول اُگانا اور کھیتی باڑی کرنا میرا شوق بھی ہے اور اس سے میری ضروریات بھی پوری ہوتی ہیں۔ بلکہ اس سے میں اوروں کی خاطر تواضع بھی کر سکتا ہوں۔ یہ جو پیچھے مرغی خانے کے ساتھ چاول کی فصل نظر آ رہی ہے۔ یہ میری ہی لگائی ہوئی ہے۔ میرے تین خاص ملازم ہیں۔ جو اس سارے کام میں میری مدد کرتے ہیں۔ جب میں یہاں نہیں ہوتا وہ سب کچھ اچھی طرح سنبھال لیتے ہیں۔''

''اور آپ کے...... بیوی...... بچے؟''

وہ پھر مسکرائے۔ ''ایک بچہ تو میرے سامنے بیٹھا ہے......اور بھی کچھ بچے ہیں۔''

''کیا مطلب سر؟''

''اللہ نے اولاد کی نعمت سے محروم رکھا ہوا ہے۔ ایک بیٹا تھا بہت کم سنی میں فوت ہو گیا۔''

''اور......آپ کی وائف؟''

''وہ بہت اچھی عورت ہے لیکن اتنی بھی نہیں کہ اس دیوانے پن میں میرا ساتھ دے سکے۔ وہ علیحدہ رہتی ہے ہم اکثر ملتے رہتے ہیں اور......اچھا وقت گزارتے ہیں۔ بہت مہربان اور نفیس خاتون ہے وہ۔''

عادل نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ''سر! اس دن جب میں نے آپ کے ہاتھوں کے گٹے دیکھے تھے تو میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ آپ جیسا خوشحال شخص اپنے ہاتھوں پر یہ نشان لیے کیوں پھر رہا ہے لیکن آج بہت کچھ سمجھ میں آ رہا ہے۔''

''محنت مشقت میں ہی زندگی کا حُسن ہے عادل ہے۔ سچی خوشی دراصل مشقت اور تکلیف کے اندر سے ہی پھوٹتی ہے۔ جو لوگ یہ رونا روتے ہیں کہ ان کی زندگی میں خوشیاں نہیں، وہ غور کریں تو انہیں پتا چلے گا کہ ان کی زندگی میں کڑی مشقت کی تکلیفیں بھی نہیں۔ بہر حال یہ بہت لمبا موضوع ہے۔ تم بتاؤ کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟''

عادل کچھ دیر توقف کرنے کے بعد بولا۔ ''سر! آپ اتنے مہربان ہیں کہ آپ کی ہر بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کرنے کو دل چاہتا ہے لیکن...... میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں اپنے دل میں کوئی اُلجھن لے کر آپ کے ساتھ چلوں گا تو شاید اس توجہ اور ذوق وشوق کا مظاہرہ نہ کر سکوں جو مجھے کرنا چاہیے۔''

''تو کیا چاہتے ہو تم؟'' سرمد صاحب نے نرم لہجے میں کہا۔

''سر! آپ مجھے تھوڑا بہت بتا دیجیے۔ تاکہ مجھے پتا ہو کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ میں اس حساب سے اپنے آپ کو تیار کروں اور خود میں حوصلہ پیدا کروں۔''

''تمہاری بات میں وزن ہے عادل! بس یہ سمجھ لو کہ میں تمہاری اس خاص جسمانی صلاحیت سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہوں جس کا مظاہرہ تم رانا کے کلب میں کرتے ہو۔''

''لیکن سر! معافی چاہتا ہوں، میرا سوال تو وہی ہے مجھے کرنا کیا ہوگا؟''

''اچھا ہم اس مسئلے کا ایک درمیانی حل نکالتے ہیں۔'' وہ ہولے سے مسکرائے اور پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہاں سے روانہ ہونے کے تین چار دن بعد میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ اس وقت ہم ایسی جگہ پر ہوں گے جہاں سے ہمارا اصل سفر شروع ہوتا ہے، اگر تم سب کچھ جاننے کے بعد واپس آنا چاہو گے تو باآسانی واپس آسکو گے۔ آٹھ دس گھنٹے کا پیدل سفر ہوگا۔ پھر تم پکی سڑک پر آ جاؤ گے۔ وہاں سے تمہیں کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی، جو تمہیں کسی قصبے یا پھر اسکردو تک پہنچا دے گی۔ دوسری صورت میں ہم آگے بڑھ جائیں گے۔'' اسکردو کے نام نے عادل کو تھوڑا سا ٹھٹکایا لیکن وہ خاموش رہا۔

''ہمارے ساتھ اور کون ہوگا؟'' اس نے پوچھا۔

''میرے خیال میں صرف دو بندے ہوں گے۔ ان میں ایک برٹش خاتون ہے جو بہت اچھی ہمسفر ثابت ہوگی۔ یعنی ہم چار ہوں گے۔''

عادل کچھ دیر سوچ میں رہنے کے بعد بولا۔ ''تو سر...... پھر میں ایسا کرتا ہوں کہ ابھی رانا سیٹھ سے آٹھ دس روز کی چھٹی لے لیتا ہوں میرا مطلب ہے لگی لگائی روزی ہے۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن اگر تم نے سفر آگے جاری رکھنا ہوا تو پھر؟''

''کیا وہاں سے فون وغیرہ پر رابطہ نہیں ہو سکے گا؟''

''نہیں...... یہ تو ممکن نہیں ہوگا۔''

''تو...... ٹھیک ہے، میں اسے کہہ دیتا ہوں کہ فی الحال دس پندرہ روز کی رخصت چاہتا ہوں۔ اگر کسی مجبوری کی وجہ سے نہ آسکا تو وہ دوسرا انتظام کر لے۔''

''اور تمہارے اس کباڑ والے کام کا کیا ہوگا؟''

''یہ کام تو ابھی پوری طرح جما ہی نہیں ہے سر! پلاٹ بھی خالی کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر کوئی نئی جگہ مل گئی تو صادق وہاں شفٹ ہو جائے گا۔ ورنہ پھر بعد میں دیکھا جائے گا۔''

کچھ دیگر تفصیلات طے کرنے کے بعد سفر کا فیصلہ ہوگا۔ عادل کے پیشِ نظر اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ وہ تھوڑے وقت میں زیادہ پیسہ کمانا چاہتا تھا۔ سرمد صاحب نے عادل سے کہا۔ ''عادل! ایک بات پھر ذہن نشین کر لو۔ اس سفر میں خطرے بھی ہیں اور یہ بات بھی ذہن نشین کر لو کہ خطروں کے بغیر کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔''

''میں سب کچھ سمجھ رہا ہوں سر!''

''تو درست ہے، کل گوجرانوالہ جا کر والدہ سے مل آؤ اور ان سے اجازت وغیرہ لے لو۔ ہم ان شاءاللہ پیر کے روز یہاں سے روانہ ہوں گے۔ صبح پانچ چھ بجے کے قریب اور یہ لو دو ماہ کا ایڈوانس۔ چالیس ہزار ہیں۔ تمہاری غیر موجودگی میں تمہاری والدہ کو ضرورت ہوگی۔'' انہوں نے کرنسی نوٹ عادل کی جیب میں ڈال دیئے۔

O......❖......O

عادل اور سرمد صاحب لاہور سے بذریعہ بس روانہ ہوئے۔ ان کے ہمسفروں میں ایک تو خوبرو انگلش لڑکی کرسٹل تھی...... دوسرا ایک چھبیس ستائیس سال کا نوجوان ہمایوں تھا۔ ہمایوں گو پاکستانی تھا لیکن بہت چھوٹی عمر میں والدین کے

ساتھ انگلینڈ چلا گیا اور وہیں پلا بڑھا تھا۔ وہ باکسنگ اور رومن اسٹائل کشتی کا بڑا اچھا کھلاڑی تھا۔ خوبصورت کسرتی جسم کا مالک، بال گھنگریالے اور آنکھیں ہلکی براؤن تھیں۔ کرسٹل جتنی چہکتی اور کھلکھلاتی ہوئی لڑکی تھی ہمایوں اتنا ہی خاموش طبع تھا۔ ان کا پہلا پڑاؤ ایبٹ آباد میں تھا۔ ڈائیوو کی بس کے ''لگیج کمپارٹمنٹ'' میں ان کا کافی سامان موجود تھا۔ جن میں دو درمیانے سائز کے خیمے اور ایک چھوٹا خیمہ تھا۔ اس کے علاوہ سفری تھیلے اور کوہ پیمائی کے جملہ لوازمات تھے۔ اس سارے سامان میں جس چیز نے عادل کو زیادہ حیران کیا وہ دو چھوٹے سائز کے پیراشوٹ تھے۔ دونوں پیراشوٹس کو پیک کر کے بالکل مختصر کر دیا گیا تھا۔ دیکھنے میں لگتا تھا جیسے کوئی چھوٹا سا تکیہ ہو۔

ایبٹ آباد کے ایک اچھے ہوٹل میں ان کے لیے کمرے بک تھے۔ یہ انگریزوں کے دَور کا لیکن بڑا صاف ستھرا ہوٹل تھا۔ سرمد صاحب نے کچھ سامان یہاں ایبٹ آباد سے بھی اپنے ساتھ لینا تھا۔ سرمد صاحب اور ہمایوں شاپنگ کے لیے نکل گئے۔ ہوٹل کی اونچی چھت والی نیم گول لابی میں بید کی کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ عادل اور کرسٹل وہاں بیٹھ گئے اور سفر کی گہما گہمی کا نظارہ کرنے لگے۔ کرسٹل اردو بھی بول لیتی تھی، تاہم یہ گلابی اردو تھی۔ ہم کو ''ہام'' اور تم کو ''توم'' کہتی تھی۔

''ہام کو پاکستان ہمیشہ سے بہت آچھا لگتا۔'' وہ اپنے خاص اسٹائل سے آنکھیں جھپک کر بولی۔

''آپ کتنی دفعہ پاکستان آچکی ہیں؟'' عادل نے پوچھا۔

''سب سے پہلے کوئی سات سال پہلے۔ تب ہام ڈاکٹری کے فورتھ ایئر میں تھا۔ ہام سے بالکل پڑھا ناہیں جا رہا تھا۔ ہام بالکل مایوس تھا۔ اس ٹائم سر سرمد نے ہام کو ہمت دلایا۔ ہمارے اندر بہت زیادہ انرجی پیدا کیا۔ سر نے ہام کو بتایا، کامیابی دینا گاڈ کا کام ہے۔ انسان کا کام ''اسٹرگل'' کرنا ہے، محنت کرنا ہے، جو محنت سے پیچھے ناہیں ہٹتا وہ ضرور کامیاب ہوتا۔ اور دیکھو مسٹر عادل! ہام نے ہمت نہ چھوڑا۔ ہام ڈاکٹر تو نہ بنا مگر ڈاکٹر سے بڑھ کر کامیاب ہو گیا۔ اب برمنگھم میں ڈاکٹر تو بہت سارا ہوئیں گا مگر کرسٹل ایک ہی ہے۔ شہر کا دی موسٹ پاپولر اور مہنگا فزیوتھراپسٹ ہے ہام۔'' اس نے کہا اور خود ہی کھلکھلا کر ہنس دی۔

وہ ہنستی تھی تو ساتھ ہی اس کا پورا جسم بھی ہنستا تھا۔ نہایت دلکش جسم جو ہر جگہ لباس سے برسرِ پیکار نظر آتا تھا۔ عادل نے کہا۔ ''راستے میں آپ نے بتایا تھا کہ آپ کو پہاڑوں سے عشق ہے لیکن میں نے سنا ہے کہ پہاڑ تو انگلینڈ میں بھی ہیں۔''

وہ بولی۔ ''انگلینڈ میں پہاڑ تو ہیں لیکن سر سرمد ناہیں ہیں۔ سر سرمد کے بغیر پہاڑوں کو دیکھنا ایسے ہی ہے جیسے پھولوں کے بغیر باغیچے کو دیکھا جائے یا مون کے بغیر مون لائٹ کا تصور کیا جائے۔''

''آپ تو شاعری...... میرا مطلب ہے پوئٹری بھی کرتی ہیں۔''

''مسٹر عادل! سر سرمد جیسا انسان دوسروں کو پوئٹ بنا دیتا ہے۔ ہی از اے گریٹ مین۔ ہام اپنے لفظوں میں اس کی ''گریٹ نیس'' کو بیان ناہیں کر سکتا۔ وہ ہام کے لیے ایک فرینڈ کی طرح بھی ہے، ایک ٹیچر کی طرح بھی اور شاید باپ کی طرح بھی۔ پتا ناہیں کہ آپ اس کو کب سے جانتا اور کتنا جانتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ ایک سینٹ (بزرگ) کی طرح ہے۔ اس کا پرسنالٹی آپ کو ہپناٹائز کر دیتا۔''

عادل نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ اسے اب تک جو معلوم ہوا تھا، اس کے مطابق کرسٹل کا تعلق وسطی انگلینڈ کے

ایک قدیم نوابی خاندان سے تھا۔ سات آٹھ سال پہلے انگلینڈ میں ہی اس کی ملاقات سرمد صاحب سے ہوئی اور وہ ایک طرح سے اُن کی مریدن بن گئی۔

ان کا دوسرا ہمسفر ہمایوں بھی سرمد صاحب کو کسی رہنما اور قائد کی حیثیت دیتا تھا۔ چند سال پہلے جب وہ پاکستان میں تھا لاہور آیا تھا۔ وہ سرمد صاحب کا ورزشی مشینوں والا کارخانہ دیکھنے گیا، وہیں اس کی ملاقات سرمد صاحب سے ہوئی اور چند ہی ماہ میں یہ ملاقات ایک نہایت قریبی روحانی تعلق میں بدل گئی۔

گفتگو کے دوران میں عادل نے کرسٹل سے تھوڑی بہت ٹوہ لینے کی کوشش کی۔ وہ اس سفر کا مقصد جاننا چاہتا تھا۔ اس کے اندیشے کے عین مطابق کرسٹل نے اس حوالے سے کچھ نہیں بتایا اور ہر بار خوبصورتی سے بات گول کر گئی۔ وہ بڑی بولڈ لڑکی تھی۔ ایبٹ آباد کی سردی اس کے بھرے پُرے جسم پر کوئی خاص اثر ڈالنے میں ناکام رہی تھی۔ اب بھی وہ بڑے سکون سے ایک شارٹ پینٹ اور ہاف سلیو شرٹ میں عادل کے سامنے بیٹھی تھی اور بار بار اپنے سنہری ریشمی بالوں میں انگلیاں چلاتی تھی۔ مئی کا آغاز ہو چکا تھا لیکن ایبٹ آباد میں کافی ٹھنڈ تھی۔

ہمایوں اور عادل ایک ہی ڈبل بیڈ کمرے میں تھے۔ ان کے ساتھ کرسٹل کا کمرا تھا۔ اس سے آگے ایک کمرا چھوڑ کر سرمد صاحب کا کمرا تھا۔ سرمد صاحب جلدی سونے اور جلدی اُٹھنے کے عادی تھے۔ وہ صبح سویرے تین چار کلومیٹر کی دوڑ لگاتے تھے اور یہی ان کی جسمانی چستی کا راز تھا۔ عادل اور ہمایوں بھی جلد ہی سو گئے کیونکہ کل انہیں پھر سفر پر روانہ ہونا تھا۔ رات کسی وقت پیاس کے سبب عادل کی آنکھ کھلی۔ منہ میں پیاز اور مچھلی کا ذائقہ تھا۔ اس نے اُٹھ کر پانی پیا۔ یہ کوئی رات ڈھائی بجے کا عمل تھا۔ اچانک اسے کھڑکی سے باہر ایک سایہ سا نظر آیا۔ چند لمحے بعد اسے یوں لگا جیسے کرسٹل والے کمرے کا دروازہ ہولے سے کھلا ہے اور کوئی اندر داخل ہوا ہے۔

یہ کون ہو سکتا ہے؟ ہمایوں تو ساتھ والے بیڈ پر سو رہا تھا۔ سرمد صاحب کا کمرا بائیں جانب تھا اور سایہ دائیں طرف سے آیا تھا۔ ویسے بھی سرمد صاحب کو اس وقت کرسٹل کے کمرے میں جانے کی کیا ضرورت ہو سکتی تھی۔ تجسس سے مجبور ہو کر عادل نے کمرے کا دروازہ بے آواز کھولا اور باہر کوریڈور میں آ گیا۔ کوریڈور میں نیم تاریکی تھی۔ ویسے بھی کوریڈور یہاں آ کر ختم ہو جاتا تھا۔ اس جانب کسی کے آنے جانے کا امکان نہیں تھا۔ پرانی عمارتوں کے انداز میں عمارت کی چھت اونچی تھی اور چھت سے ڈیڑھ دو فٹ نیچے مستطیل روشندان تھے۔ کرسٹل کے کمرے میں ہلکی روشنی تھی۔ عادل نے کچھ دیر سوچا پھر کھڑکی کے نچلے کنارے پر پاؤں رکھا اور اُچک کر روشندان کا نچلا کنارہ پکڑ لیا۔ انگلیوں اور کلائیوں کے زور پر اس نے خود کو اوپر اُٹھایا۔ ایسا کرنا اس کے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ جلد ہی وہ روشندان سے کمرے کے اندر جھانکنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے پاؤں کے پنجوں کو کھڑکی کی دو انچ چوڑی کارنس کا تھوڑا سا سہارا مل گیا تھا۔ روشندان کا شیشہ بند تھا لیکن نچلی جانب معمولی سی درز موجود تھی جس میں سے باریک آوازیں عادل کے کانوں میں پہنچ رہی تھیں۔ نیچے سات آٹھ فٹ کے فاصلے پر کرسٹل نظر آ رہی تھی۔ اس نے مہین سا گلابی سلیپنگ گاؤن پہن رکھا تھا جس میں سے اس کا توبہ شکن پیکر جیسے پھٹا پڑ رہا تھا۔ تاہم اس کے حسین چہرے پر ایک بے چینی سی تھی۔ کرسٹل کے عین سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ عادل کو نظر نہیں آیا۔ وہ بھی غیر ملکی تھا۔ اس نے جین، جیکٹ پہن رکھی تھی۔ جسم سڈول اور کسرتی دکھائی دیتا تھا۔ اس نے کرسٹل کو اس کے نیم عریاں کندھوں سے تھاما اور کھردرے لہجے میں کچھ بولا۔ وہ انگلش بول رہا

تھا۔ اس کا پہلا فقرہ تو عادل کی سمجھ میں نہیں آیا لیکن دوسرا فقرہ اس نے صاف سنا اور سمجھا بھی۔ ''ہاؤ لونگ آئی ہیو ٹو ویٹ...... ہاؤ لونگ (میں کب تک انتظار کروں گا...... کب تک؟)

کرسٹل نے انگریزی میں جواب دیتے ہوئے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ''زیادہ دیر نہیں اب۔''

''تم ہمیشہ یہی کہتی ہو۔'' نوجوان بولا۔ یہ جملہ ادا کرتے ہوئے وہ تھوڑا سا گھوما اور عادل نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ مخصوص انگلش ناک اور چہرے مہرے والا ایک پچیس چھبیس سالہ نوجوان تھا۔ قدرے چھوٹی اور اُٹھی ہوئی ناک کے قریب رُخسار پر ایک پُرانے زخم کا نشان تھا۔ اور نہ جانے کیوں اس نشان کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ وہ ایک تند خو، جھگڑالو نوجوان ہے۔ بہرحال یہ نشان اس کی مجموعی ''قبول صورتی'' کو متاثر نہیں کرتا تھا۔

اگلے دو چار منٹ میں ان دونوں کے درمیان کچھ اور جملوں کا تبادلہ بھی ہوا۔ ان میں سے کچھ تو عادل کو سنائی ہی نہیں دیئے۔ کچھ سنائی تو دیئے لیکن ان کی انگلش اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ جو تھوڑا بہت سمجھ میں آیا اس سے عادل کو اندازہ ہوا کہ کرسٹل اس نوجوان کی بہت قریبی گرل فرینڈ یا منگیتر ہے اور یہ نوجوان اس سے ملنے کے لیے اسلام آباد سے یہاں پہنچا ہے۔ کرسٹل واضح طور پر اس سے دبی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس کی ساری شوخی ایک طرح کے ہراس کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ وہ جیسے جلد از جلد نوجوان سے پیچھا چھڑا لینا چاہتی تھی مگر وہ اس کے ساتھ چپکا جا رہا تھا۔ اس نے اس کے رخساروں اور ہونٹوں پر انگلیاں چلائیں پھر اسے ذرا دھکیل کر دیوار سے لگا دیا۔ اس کے طویل بوسے کو کرسٹل نے خاموشی سے برداشت کیا۔ اس کی خاموشی نوجوان کے لیے مزید حوصلہ افزا ثابت ہوئی۔ اس نے کرسٹل کو کئی بار چوما اور اپنے ہاتھوں کو آزادانہ کرسٹل کے سراپے پر حرکت دی۔ آخر کرسٹل جز بز نظر آنے لگی۔ اس نے ناگوار لہجے میں نوجوان سے کچھ کہا۔ ان فقروں میں بس لیوپڈ...... ڈونٹ...... اور کریزی کے الفاظ ہی عادل کی سمجھ میں آ سکے۔ لیوپڈ غالباً اس نوجوان کا نام تھا۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی خاص قسم کا تنازعہ ہے۔

یوں لگتا تھا کہ اب یہ ''لیوپڈ'' کسی بھی وقت کمرے سے باہر آ سکتا تھا۔ عادل کے ذہن میں یہ اندیشہ بھی موجود تھا کہ کوئی اسے اس طرح روشندان سے چپکے ہوئے نہ دیکھ لے۔ وہ جلدی سے نیچے اُتر آیا اور بے آواز چلتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس کا یہ اقدام بالکل درست ثابت ہوا۔ صرف چند سیکنڈ بعد کرسٹل کے کمرے کا دروازہ کھلا اور مردانہ قدموں کی آواز سنائی دی۔ لیوپڈ کا سایہ کھڑکی کے سامنے سے گزر کر نیچے جانے والے زینوں کی طرف چلا گیا۔

عادل بستر پر لیٹ گیا اور دیر تک سوچتا رہا۔ یہ کیا ماجرا تھا؟ کرسٹل جیسی شوخ و شنگ لڑکی اس نوجوان کے سامنے بھیگی بلی کیوں بنی رہی تھی۔ اس فقرے کا کیا مطلب تھا کہ اب اس کے بوائے فرینڈ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا؟ کرسٹل اور لیوپڈ ایک مادر پدر آزاد معاشرے سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر وہ چوری چھپے کرسٹل سے ملنے کے لیے کیوں پہنچا تھا۔ یقیناً سرمد صاحب کو بھی اس ملاقات کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ انہی سوالوں میں اُلجھا اُلجھا عادل، نرم و گداز بستر پر سو گیا۔ وہ رات کچھ عجیب انداز میں گزری۔ عادل کے دل و دماغ کو نہ جانے کن سوچوں نے جکڑے رکھا تھا۔ آٹھ بجے کے قریب اسے ہمایوں نے جگایا۔ وہ ٹریک سوٹ میں تھا۔ لگتا تھا کہ کہیں سے لمبی دوڑ لگا کر آیا ہے۔ یقیناً وہ بھی صبح سویرے سرمد صاحب کے ساتھ ہی جاگنگ پر نکلا ہوا تھا۔ بعدازاں عادل کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ کرسٹل بھی ان کے ساتھ شامل تھی۔ وہ بھی ٹریک سوٹ میں تھی۔ اس کے بال پونی ٹیل میں بندھے ہوئے تھے۔ چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ رُخسار سرخ اس

جیسے اور نیلگوں آنکھوں میں ستاروں کی چمک، وہ حسبِ عادت چہک رہی تھی۔ اسے دیکھ کر ہرگز اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ چند گھنٹے پہلے اپنے کمرے میں وہ ایک نہایت ناگوار و ناپسندیدہ صورتِ حال سے دوچار رہی ہے۔

دو بڑی جیپیں ہوٹل کی پارکنگ میں پہنچ چکی تھیں۔ ان میں سے ایک میں تو صرف ان لوگوں کا ساز و سامان ہی آیا تھا۔ دوسری میں وہ چاروں سوار ہوئے۔ اس جیپ کا ڈرائیور مرجان خاں نام کا ایک قبائلی تھا۔ وقتِ رخصت سرمد صاحب نے عادل کو بس اتنا بتایا کہ وہ مانسہرہ سے بشام کی طرف جا رہے ہیں۔ ان کا اگلا پڑاؤ ''داسو'' میں ہوگا جو تقریباً نو گھنٹے کا سفر ہے۔ انہیں مسلسل شاہراہ قراقرم یعنی KKH پر چلنا تھا۔

پُر پیچ پہاڑی راستوں پر ان کا سفر جاری رہا۔ سورج نے ہلکے بادلوں کے پیچھے منہ چھپایا ہوا تھا۔ چوٹیوں پر برف تھی اور ٹنڈ منڈ پہاڑی درخت، یخ بستہ ہواؤں کی مار جھیل رہے تھے۔ ہمایوں بہت ہی کم بات کرتا تھا۔ کم گو لوگ ذرا پُراسرار نظر آتے ہیں ہمایوں بھی کچھ ایسا ہی دکھائی دیتا تھا۔ چہرے بشرے سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ نہایت سخت جان شخص ہے اور موقع پڑنے پر لڑائی بھڑائی بھی کر سکتا ہے۔ سخت جانی اور جفاکشی میں کرسٹل بھی کچھ کم نظر نہیں آتی تھی تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ دلکش اور خوش گفتار بھی تھی۔ وہ اپنی گلابی اردو میں گاہے بگاہے کوئی لطیفہ بھی سنا دیتی تھی۔ بہرحال سرمد صاحب سے براہِ راست بات کرتے ہوئے وہ ذرا مؤدب ہو جاتی تھی۔

عادل کے ذہن میں کئی سوال مسلسل کھلبلی مچا رہے تھے۔ یہ کرسٹل کون ہے؟ کیا وہ کسی بڑے لارڈ وغیرہ کی بیٹی ہے۔ وہ اتنے ذوق شوق سے سرمد صاحب کی ہمسفر کیوں ہے؟ وہ خود کو اتنا بے خبر کیوں محسوس کر رہا ہے۔ سرمد صاحب اسے اس سفر کا مقصد اور اس کی منزل کے بارے میں کیوں نہیں بتا رہے۔ وہ کون سا مقام ہوگا جہاں پہنچ کر وہ اسے فیصلہ کرنے کا اختیار دیں گے۔ عادل اپنی مرضی سے چلنے والا شخص تھا۔ وہ اپنا راستہ خود منتخب کرتا تھا۔ بہت سے سوالوں کے باوجود اگر وہ اب تک سفر کر رہا تھا تو اس کی وجہ صرف سرمد صاحب تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن پر آنکھیں بند کر کے یقین کرنے کو دل چاہتا تھا۔ لیکن وہ آنکھیں کہاں تک بند کر سکتا ہے، اس کا فیصلہ ابھی ایک دو دن میں ہو جانا تھا۔ عادل کا ایک قیافہ یہ بھی تھا کہ شاید سرمد صاحب اسے اس خاص مقام پر پہنچ کر کوئی خاص چیز دکھانا چاہتے ہیں۔

O......❖......O

ان کا سفر پروگرام کے مطابق جاری رہا۔ اس کا مختصر احوال یہی تھا کہ وہ پہلے داسو پہنچے۔ وہاں ایک ریسٹ ہاؤس میں رات گزاری اور کسی حد تک تھکن دور کی۔ چلاس تک انہوں نے مسلسل شاہراہ قراقرم یعنی KKH پر سفر کیا اور پھر اسکردو روڈ کی طرف مڑ گئے۔ جوں جوں وہ بلند پہاڑی سلسلوں میں داخل ہو رہے تھے، سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ بلند و بالا برفانی چوٹیاں جیسے انہیں اپنے گھیرے میں لیتی جا رہی تھیں۔ ان لامتناعی پہاڑی سلسلوں کو دیکھ کر یہی لگتا تھا جیسے رُوئے زمین پر برفانی چوٹیوں، ڈھلوانوں اور جمے ہوئے ندی نالوں کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ ایسے مناظر سے گزرتے ہوئے بہاولپور کا تصور کرنا اور بہاولپور سے آگے اپنی جنم بھومی ''لالی گاؤں'' کے کھیتوں کھلیانوں اور چلچلاتی دھوپوں کا تصور کرنا عادل کو بہت عجیب لگتا تھا۔ اس کا تصور پھسلا کر اسے اپنی ماں کے پاس لے گیا اور پھر شہزادی کے پاس لے گیا۔ اس نے سوچا شاید شہزادی اپنی حویلی کی ہوادار چھت پر ململ کا کڑھائی دار کُرتہ پہنے بیٹھی ہو۔ کوئی ملازمہ اس کے لمبے بالوں میں کنگھی کر رہی ہو۔ کرم داد کے باغ سے قلمی آموں کی پہلی ڈالی آ گئی ہو اور اس کی خوشبو سارے میں پھیلی ہوئی

ہو۔ ہوسکتا ہے کہ یہ خوشبو اسے عادل کی یاد دلا رہی ہو۔ وہ جب کرم داد کے باغ میں تھا انہوں نے ایک ہی آم کو باری باری چوسا تھا اور وہ آم دنیا کا سب سے خوشبودار اور میٹھا آم تھا۔ کیا یہ یاد اور اس طرح کی دوسری چھوٹی چھوٹی یادیں اس نے سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں؟ کیا وہ چاندی کے چھلّے کی طرح ان یادوں کو خود سے دور کرنے...... دور ہٹانے کی کوشش تو نہیں کر رہی۔ اور اگر کر رہی ہے تو کیا یہ کوشش کامیاب ہو جائے گی؟“

وہ سوچتا رہا اور لینڈ روور جیپ دشوار راستوں پر دندناتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ سرمد صاحب کی اجازت سے ڈرائیور مرجان خاں میٹھی آواز میں گنگنا رہا تھا۔ جانے والے میں تیرے قربان خدا حافظ۔ اے میرے حسین سپنوں کے مہمان خدا حافظ (وہ سپنوں کا لفظ اپنی طرف سے استعمال کر رہا تھا)

ان کا اگلا پڑاؤ اسکردو میں تھا۔ کنکورڈیا گلیشیئر اور کے ٹو وغیرہ کی طرف جانے والوں کے راستے میں آخری بڑی آبادی اسکردو ہی ہے۔ سرمد صاحب نے عادل کو بتایا تھا کہ سردیوں میں اسکردو کا درجہ حرارت منفی دس سے منفی پندرہ سولہ ڈگری تک پہنچ جاتا ہے۔ بہرحال اب بھی یہاں سردی کم نہیں تھی۔ ہاتھ پاؤں جمتے محسوس ہو رہے تھے تاہم عادل کے تینوں ہمسفروں بشمول کرسٹل پر یہ سردی کچھ زیادہ اثر نہیں کر رہی تھی۔ لگتا تھا کہ یہ لوگ کسی اور مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ یا پھر انہوں نے اپنے اندر غیر معمولی قوتِ برداشت پیدا کر لی تھی۔

اسکردو اور کنکورڈیا گلیشیئر کے درمیان ایک جگہ پر انہوں نے جیپیں چھوڑ دیں...... یہاں دو مقامی افراد کے ساتھ سرمد صاحب کے معاملات پہلے سے طے تھے۔ ان دونوں افراد کے پاس چار صحت مند ٹٹو موجود تھے۔ سامان اور ٹٹوؤں پر لادا گیا اور آگے کا سفر پاپیادہ شروع ہوا۔ عادل اس سے پہلے مری سے آگے نہیں گیا تھا۔ مری کی اونچائی چھ ہزار فٹ کے لگ بھگ بیان کی جاتی ہے۔ اب اس کے اردگرد اس سے چار گنا اور پانچ گنا اونچی چوٹیاں موجود تھیں۔ وہ خود کو ایک نہایت یخ بستہ لیکن طلسماتی ماحول میں محسوس کر رہا تھا...... ان کا اگلا پڑاؤ، برفانی پہاڑوں کی گود میں ایک نہایت حسین قطعۂ زمین پر تھا۔ یہاں کیمپ لگا دیئے گئے اور کھانے پینے کا انتظام ہونے لگا۔ کھانے پینے کا انتظام فی الحال انہی لوگوں کے ذمے تھا جنہوں نے ٹٹو فراہم کیے تھے۔ دیسی مرغیاں، دنبے کی دو روسٹ رانیں۔ تیز پشاوری قہوہ، ڈرائی فروٹ اور تھوڑا سا ٹن پیک فوڈ...... یہ تھا ڈنر کا مینو۔

○......❖......○

رات کے کوئی بارہ بجے کا عمل تھا۔ عادل اور سرمد صاحب، نیم گرم، جدید خیمے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ عادل کی دھڑکن تیز تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اہم گفتگو شروع ہونے والی ہے...... ہواؤں سے پھڑ پھڑاتے ہوئے خیمے سے باہر وہ عجیب منظر تھا۔ ٹھٹھری ہوئی چاندنی نے برفانی چوٹیوں کو روپہلی تاج پہنا رکھے تھے۔ سپید ڈھلوانوں پر یہ چاندنی منعکس ہوتی تھی تو یوں لگتا تھا کہ چاندی کے آبشار بڑی خاموشی سے بہہ رہے ہیں۔ فلک بوس پہاڑوں کے درمیان یہ وادی ایک عظیم الشان پیالے کی طرح تھی اور اس پر کسی ماورائی منظر کا گمان ہوتا تھا۔ کسی گاڑی کا شور، نہ کسی پرندے کی چہچہاہٹ، نہ کسی مشینی اُڑن کھٹولے کی آواز...... یہاں جو کچھ تھا بس خالص قدرت کے زمرے میں آتا تھا اور یہ جو کچھ بھی تھا، دل پر اثر کر رہا تھا۔ ایک ہیبت ناک لیکن دلکش اثر۔

سرمد صاحب نے خیمے کے مختصر روزن سے دور کنکورڈیا گلیشیئر اور گلیشیئر سے آگے کے ٹو کی عظیم الشان چوٹی کو دیکھا

اور ٹھہرے لہجے میں بولے۔ ”تمہیں پہاڑوں سے دوستی کرنے کا کہا جائے تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟“

”میں سمجھا نہیں سر؟“

”کیا تم پہاڑوں میں سفر کرنا، ان پر چڑھنا پسند کرو گے؟“

عادل نے ذرا توقف سے کہا۔ ”میں نے آپ سے سچ بولنے کا وعدہ کیا ہے سر! اور میں سچ ہی بولوں گا۔ جو کچھ آپ نے کہا، مجھے یہ پسند نہیں۔“

”لیکن تمہیں پیسہ حاصل کرنا تو پسند ہے، کیونکہ وہ تمہاری ضرورت ہے۔ تمہاری اور شہزادی کی ضرورت۔“

”جی سر۔“

”تو پھر اس کا مطلب یہی ہے کہ تم میرے پہلے سوال کا جواب ’’ہاں‘‘ میں دے رہے ہو۔ عادل! ہمیں چند ہفتے یہاں پہاڑوں میں گزارنے ہیں...... میں تمہیں اس قابل بنانا چاہتا ہوں کہ تم یہاں کے ٹو کے پہلو میں ایک خاص راستے پر سفر کر سکو۔ وہ اردگرد پھیلی ہوئی بیسیوں چوٹیوں میں سے ایک چوٹی ہے۔ وہ کے ٹو سے کافی چھوٹی ہے لیکن وہ اس لیے مشکل ہے کہ ہم اس پر اس جانب سے نہیں چڑھ سکتے جس جانب سے ہمیں چڑھنا چاہیے۔ ہمیں اس کے لیے ایک مشکل راستہ اختیار کرنا پڑے گا اور یہ ہماری مجبوری ہے اور یہی مسئلہ ہے۔“

”سر! میں کوہ پیمائی وغیرہ کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا لیکن...... اگر آپ کوئی ایسی مشکل چوٹی سر کرنا ہی چاہتے ہیں تو اس کے لیے آپ کو تجربہ کار کوہ پیما مل سکتے ہیں۔ باہر کو تو چھوڑیئے سر! ہمارے پاکستان میں ہی بڑے بڑے مہم جُو پڑے ہوئے ہیں اور...... آپ تو ماشاءاللہ خود بھی کوہ پیمائی کا بہت تجربہ رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کی نظر مجھ پر ہی کیوں پڑی ہے؟“

”بہت اچھا سوال ہے اور تمہیں کرنا بھی چاہیے تھا۔ اس سوال کا جواب یہ ہے عادل! کہ وہ ایک ایسی چوٹی ہے جسے صرف تم سر کر سکتے ہو۔ ایک ایسا راستہ جو شاید صرف تمہارے جیسے ہی کسی شخص کے لیے بنا ہے۔“

”میں کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا سرمد صاحب! میں جانتا ہوں کہ کچھ چوٹیاں چڑھائی کے لیے بڑی مشکل سمجھی جاتی ہیں لیکن شاید ہی کوئی ایسی چوٹی ہو جسے سر نہ کیا جا سکتا ہو۔ جب کے ٹو اور ماؤنٹ ایورسٹ جیسی چوٹیاں سر ہو چکی ہیں تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے۔ معاف کیجیے گا، مجھے آپ کی یہ دوسری بات بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ اس چوٹی پر آسان راستے سے چڑھا نہیں جا سکتا۔ آپ آسان کو چھوڑ کر مشکل راستہ کیوں اختیار کرنا چاہ رہے ہیں؟“

”ایک وجہ ہے۔ بہت ٹھوس وجہ۔ وہ بالکل بے آباد چوٹی نہیں ہے۔ اس کی برفیلی ڈھلوانوں کے دامن میں کچھ لوگ آباد ہیں۔ ایک کوہستانی برادری جو شاید مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے زمانے سے وہاں موجود ہے۔ یہ پاؤندوں کی نسل کے کچھ لوگ ہیں۔ سخت ترین موسموں میں زندگی گزار لیتے ہیں۔ یہ لوگ کسی بھی مہم جُو کو اس چوٹی کی طرف جانے نہیں دیتے۔“

”اس کی کوئی خاص وجہ؟“

”جس طرح کچھ لوگ نانگا پربت کو مقدس سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اسے پاؤں تلے روندنے والوں پر آفت نازل ہوتی ہے، اسی طرح اس چوٹی کے بارے میں بھی مقامی لوگوں کا ایک پختہ عقیدہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس

چوٹی پر انسانی قدموں کا پہنچنا بہت بڑی نحوست کا سبب ہوگا۔ وہ اس نحوست سے بچنے کے لیے کسی بھی ملکی یا غیر ملکی مہم جُو کو اس طرف کا رُخ نہیں کرنے دیتے۔ انہوں نے ایک ایسی فضا بنائی ہوئی ہے کہ مہم جوؤں کی توجہ بھی اس بظاہر غیر اہم چوٹی کی طرف سے ہٹ گئی ہے۔ وہ خود کو خوانخواہ مشکل میں ڈالنے کے بجائے نسبتاً بہتر چوٹیوں کی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔''

''یہ کون سی برادری ہے سر! میرا مطلب ہے ان کا مذہب......؟''

''مذہب کے بارے میں جاننے سے زیادہ اہم سوال ایک اور ہے اور وہ یہ کہ کیا یہ واقعی کوئی روحانی معاملہ ہے یا کچھ لوگوں نے اپنے کسی خاص مقصد کی وجہ سے اسے روحانی یا مذہبی رنگ دے رکھا ہے......اور چوٹی پر پہنچنے کو منحوس قرار دیتے ہیں۔''

''شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مجھے یہی سوال پوچھنا چاہیے تھا۔''

''اس کا جواب یہ ہے عادل! کہ اصل میں یہ کوئی روحانی معاملہ نہیں ہے۔ یہ کچھ خاص لوگوں کی سازش ہے، جنہوں نے اپنے مقصد کے لیے سادہ لوح لوگوں کو بیوقوف بنایا ہے اور وہ باہر سے آنے والے ٹریکرز اور کلائمبرز کو ''پیک'' کی طرح جانے سے روکتے ہیں۔''

''یہ کس طرح کا مقصد ہے سر؟''

''بہت خاص......اور بہت گہرا۔ ایک ناقابلِ یقین بھید۔''

O......❖......O

سرمد صاحب نے ایک طویل سانس لی اور ذرا ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ خیمے سے باہر برفانی ہوائیں سر پٹخ رہی تھیں۔ انہوں نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔ ''ہمیں اس بات کو سمجھنے کے لیے کافی پیچھے جانا پڑے گا قریباً ساڑھے چار سو سال پیچھے۔ یہ اکبر اعظم کے دور کی بات ہے۔ جن راستوں سے گزر کر ہم آئے ہیں، وہیں پر کہیں ایک راجپوت قبیلہ بھی آباد تھا۔ یہ کوئی ایک ہزار نفوس پر مشتمل آبادی ہوگی۔ یہ لوگ روزمرہ کی لڑائیوں سے تنگ آ کر اس طرف نکل آئے تھے اور اسی ویرانے میں آباد ہو گئے تھے۔ یہ علاقہ ایک ہندو سالار وشوانا تھ کے زیر نگرانی تھا۔ یہ سالار مقامی صوبیدار کا منہ چڑھا تھا اور اکثر من مانیاں کرتا تھا۔ وشوانا تھ کو قبیلے کی ایک خوبرو لڑکی پسند آ گئی تھی اور وہ اس سے بیاہ رچانے پر بضد تھا۔ قبیلے والوں نے وشوانا تھ کی بھرپور مزاحمت کی لیکن ان کی ایک نہ چلی۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ وشوانا تھ نے راجپوت قبیلے کو لڑائی کی دھمکی دے دی۔

''جب قبیلے والوں نے دیکھا کہ لڑائی ناگزیر ہوگئی ہے تو انہوں نے تیاری شروع کر دی۔ تیاری کی ان کارروائیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ انہوں نے اپنا قیمتی سامان ایک جگہ جمع کیا اور اسے محفوظ بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس سامان میں زیادہ تر ان کی عورتوں کے زیور تھے۔ قیمتی دھاتوں والے کچھ برتن تھے۔ اس کے علاوہ کچھ خاندانی پتھر جن میں نیلم اور زمرد وغیرہ شامل تھے۔ ان لوگوں نے اس سامان کی فہرست بنائی اور جن جن لوگوں کی یہ چیزیں تھیں، ان کے نام وغیرہ لکھے پھر ان چیزوں کو دو پوٹلیوں کی شکل دے دی۔ قبیلے کے دو ماہر بندے جو مشکل چڑھائیاں چڑھنے میں تاک تھے، ان پوٹلیوں کے ساتھ اس بلند چوٹی کی طرف روانہ ہوئے جس کا ذکر میں نے ابھی تم سے کیا ہے۔ چوٹی کے عین اوپر بہت

قدیم زمانے سے کسی پتھریلی عمارت کا کھنڈر موجود ہے۔ جہاں تک میں نے پڑھا ہے، کچھ لوگ اس کا ناتا سکندر اعظم کے دور سے جوڑتے ہیں۔ لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ جو شخص کسی مصیبت سے یا اپنے کسی دشمن سے بچنے کے لیے اس کھنڈر میں پناہ لے لیتا ہے، وہ محفوظ ہو جاتا ہے۔ ''بلندی کا دیوتا'' اس کی حفاظت کرتا ہے۔ یہ لوگ بھی اسی سینہ بہ سینہ روایت کو نظر میں رکھتے ہوئے اس چوٹی کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اس مال و اسباب کو کھنڈر میں کہیں چھپا دیں گے اور وہ لٹیرے سالار سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے گا۔ وہ سالار وشوانا تھ کو لٹیرا سالار ہی کہتے تھے۔ ان دونوں افراد نے وہ سامان کھنڈر کے آس پاس ایک تہ خانے میں چھپایا اور ایک بڑے برفانی طوفان کی آمد سے پہلے پہلے نیچے لوٹ آئے لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ راجپوتوں کے اندازوں سے بالکل مختلف تھا۔ لڑائی فوراً شروع نہیں ہوئی۔ تین چار ماہ تک امن رہا۔ راجپوت اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے لگے کہ شاید بلا ٹل گئی ہے۔ اسی دوران میں قبیلے ہی کے ایک نوجوان سے اس لڑکی کی شادی بھی کر دی گئی تھی جس کی وجہ سے یہ سارا فساد شروع ہوا تھا۔ بظاہر سب ٹھیک نظر آ رہا تھا لیکن حقیقت مختلف تھی۔ سالار وشوانا تھ اپنی توہین بھولنے والا نہیں تھا، اس کے اندر انتقام کی آگ جل رہی تھی۔ وہ راجپوت قبیلے پر چڑھائی کے لیے تیاری کر رہا تھا۔ اس کی تیاری دو طرح کی تھی۔ ایک طرف تو وہ اپنے اعلیٰ حکام کے ذہنوں میں مسلسل یہ بات بٹھا رہا تھا کہ راجپوت قبیلے کی بغاوت ایک بڑی بغاوت میں بدل سکتی ہے لہٰذا ان کو کچلنا ضروری ہے۔ دوسری وہ راجپوت قبیلے کے حمایتی گھکڑ برادری کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ پہاڑی لوگ موسم کی سختی اور اپنی تنگ دستی کے درمیان بُری طرح پس رہے تھے۔ سالار نے گھکڑ برادری کے سرکردہ لوگوں کو تحفے تحائف دیئے۔ ان کے لیے سہولتوں کا اعلان کیا۔ ان کے علاقے میں دو بڑے بڑے گودام بنوائے اور اناج سے بھر دیئے۔ بڑی خاموشی اور مہارت سے اس نے ''گھکڑ'' برادری کو غیر جانبدار رہنے پر آمادہ کر لیا۔''

عادل بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ سرمد صاحب کھوئی کھوئی سی آواز میں بول رہے تھے۔ ساڑھے چار سو سال پہلے کے وہ سارے مناظر جیسے ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے تھرماس میں سے گرما گرم چائے دو ڈسپوزیبل کپس میں اُنڈیلی۔ ایک کپ عادل کے سامنے رکھا اور دوسرے میں سے خود گھونٹ لیتے ہوئے بولے۔ ''وہ بہار کا موسم تھا۔ برف پگھل رہی تھی۔ جھرنے بہہ رہے تھے اور شگوفے کھل رہے تھے۔ یہ راجپوت قبیلے کے لیے کھیتی باڑی کا موسم تھا۔ وہ روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھے۔ اچانک ان کے مخبروں نے اطلاع دی کہ سالار وشوانا تھ کی طرف سے ان پر حملے کی پوری تیاری ہو چکی ہے اور کسی بھی وقت حملہ ہو سکتا ہے۔ قبیلے والوں نے اپنے گھڑ سوار گھکڑوں کی طرف دوڑائے تاکہ انہیں بھی ہوشیار کیا جا سکے لیکن وہاں تو صورتِ حال بالکل بدل چکی تھی۔ وہاں سے یہ مایوس کن اطلاعات ملیں کہ گھکڑ ان کی مدد کے لیے میدان میں نہیں آئیں گے۔ ایک دو دن کے اندر ہی یہ بات پوری طرح سامنے آ گئی کہ اب جو کرنا ہے، راجپوتوں کو اکیلے ہی کرنا ہے۔ وہ بُری طرح پھنس چکے تھے۔ دوسری طرف یہ خبریں بھی مل رہی تھیں کہ سالار وشوانا تھ کی قیادت میں حملہ آور ہونے والا لشکر توقع سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔ بستی کی طرف آنے والا راستہ ایک تنگ گھاٹی میں سے گزرتا تھا۔ اس گھاٹی نے ایک قدرتی فصیل کی سی شکل اختیار کر لی تھی۔ راجپوتوں نے اس گھاٹی کے دفاع کے لیے مورچے بنا لیے اور جم کر بیٹھ گئے۔ دو دن بعد سالار وشوانا تھ کا لشکر آ دھمکا۔ گھاٹی پر زوردار مقابلہ ہوا تاہم راجپوت حملہ آوروں کو روکنے میں کامیاب رہے۔ تین چار دن تک تو یہ صورتِ حال برقرار رہی پھر حملہ آور لشکر کے

دستے پہاڑوں میں گھس گئے اور بستی تک پہنچنے کے لیے دوسرے راستے تلاش کرنے لگے۔ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ظاہر تھا کہ انہیں زیادہ دیر بستی سے دور نہیں رکھا جا سکتا تھا۔

''جب راجپوتوں نے محسوس کیا کہ اب لڑ مرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تو انہوں نے ایک بہت مشکل لیکن اہم فیصلہ کیا۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ سالار وشواناتھ کے لشکر سے شکست کھانے کے بعد سب سے زیادہ مصیبت ان کی عورتوں پر ہی آئے گی۔ سالار وشواناتھ کے ''شرابی لشکری'' اسی طرح بستی میں گھسیں گے جس طرح بھوکے بھیڑیئے بکریوں کے ریوڑ میں گھستے ہیں۔ اس طرح کی ایک دو دردناک مثالیں ماضی میں ان کے سامنے تھیں۔ انہوں نے اپنی ساری عورتوں کو مارنے کا فیصلہ کر لیا۔ بڑے سردار کے گھر کے وسیع احاطے میں ایک بہت بڑی چتا جلائی گئی۔ جواں سال بچیوں سے لے کر درمیانی عمر کی عورتوں تک سب نے اس چتا میں کودنے کی ہامی بھر لی۔ ان میں بال بچوں والی بیاہتا بھی تھی، نو بیاہتا بھی اور کنواریاں بھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے مناظر بڑے دردناک ہوتے ہیں۔ وہ منظر بھی بڑا دردناک رہا ہوگا۔ روتی سسکتی عورتوں نے اپنے مردوں کو الوداع کہا ہوگا۔ بہنیں بھائیوں سے ملی ہوں گی، بیویاں شوہروں سے۔ باپوں نے بیٹیوں کی پیشانیاں چومی ہوں گی اور انہیں آگ کے سپرد کر دیا ہوگا۔ یہ سب غلط تھا یا صحیح ...... یہ ایک علیحدہ بحث ہے لیکن یہ سب تھا تو دلخراش اور ایسا واقعہ جب کہیں بھی ہوتا ہے، جہاں کہیں بھی ہوتا ہے...... انسانیت کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیتا ہے...... تمہارا کیا خیال ہے عادل؟'' آخر میں سرمد صاحب نے پوچھا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر۔'' عادل نے جیسے چونکتے ہوئے کہا۔

انہوں نے سلیپنگ بیگ اپنے گھٹنوں پر درست کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ''دو سو کے قریب عورتیں اس چتا میں زندہ جل مریں۔ عورتوں کی جس ٹولی نے سب سے پہلے شعلوں میں چھلانگ لگائی، ان میں وہ نو بیاہتا بھی شامل تھی جس کی بدنصیبی اسے سالار کی نظروں میں لائی تھی اور جس کی وجہ سے جنگ تک نوبت پہنچی تھی۔

''ظاہر ہے کہ اپنی عورتوں کو اپنے ہاتھوں سے زندہ جلانے کے بعد اور ان کی آخری کربناک آوازیں سننے کے بعد مردوں کے سینوں میں غیظ و غضب کے شعلے پھنکارنے لگے ہوں گے۔ انہوں نے تلواریں سونت لیں اور اپنے سر ہتھیلی پر رکھ کر سالار وشواناتھ کے لشکر سے ٹکرا گئے۔ اب ان کے سامنے دو ہی راستے تھے، گھیرا توڑ کر نکل جائیں یا پھر لڑ مریں اور وہ سب کے سب لڑ مرے۔ انہوں نے بہت سوں کو مارا اور خود بھی مر گئے۔ بستی کا کوئی فرد بھی زندہ نہ بچ سکا۔''

سرمد صاحب نے کچھ دیر توقف کر کے کپ میں تازہ چائے اُنڈیلی اور گہری سانس لے کر بولے۔ ''خیر یہ واقعہ تو ضمنی طور پر سنانا پڑا ہے۔ ہمارا اصل موضوع یہ نہیں ہے عادل! میں تمہیں ان قیمتی اشیا کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں جن کا ذکر اس واقعے میں آیا ہے۔ موجودہ دور کے وزن کے حساب سے یہ قریباً دس بارہ کلو سونا اور سات آٹھ کلو چاندی تھی۔ قیمتی پتھر اس کے علاوہ تھے۔ موٹا حساب لگایا جائے تو ان چیزوں کی مالیت آج کل چھ سات کروڑ سے کم نہیں ہوگی۔ اور عادل! جو کچھ میں نے پڑھا ہے اور جو تحقیق میں نے کی ہے، اس کے مطابق یہ اشیا اب بھی ...... ہاں اب بھی...... اس چوٹی کے کھنڈر میں کسی تہ خانے کے اندر موجود ہیں۔ اسی طرح جس طرح راجپوتوں نے مرنے سے پہلے اسے چھوڑا تھا۔ اگر کوئی ہمت سے انہیں تلاش کر سکے تو وہ مل سکتی ہیں۔ وہ جگہ اتنی بڑی نہیں ہے، چوٹی کے اوپر بس چند ٹوٹی پھوٹی دیواریں ہیں۔ یہ دیواریں مشکل سے کوئی دس مرلہ جگہ میں ہوں گی۔ اتنی سی جگہ میں ان اشیا کا کھوج لگا لینا کوئی بہت دشوار کام نہیں

ہوگا عادل۔ دشوار کام ایک ہی ہے اور وہ ہے چوٹی تک پہنچنا...... بلکہ......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئے۔

''آپ...... کچھ کہنے لگے؟'' عادل نے کہا۔ وہ مکمل طور پر اس رُوداد میں جذب ہو چکا تھا۔

سرمد صاحب نے کہا۔ ''وہی بات جو میں نے پہلے بھی کہی ہے۔ چوٹی پر پہنچنا بھی کوئی بہت زیادہ کٹھن کام نہیں تھا، اگر ہم مناسب راستے سے اس پر جا سکتے۔ دشواری یہی ہے کہ ہمیں ایک مشکل راستے سے اس پر جانا ہوگا۔ درست راستے سے جانے والوں کے لیے پاؤندے رکاوٹ بن جاتے ہیں۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ...... پاؤندے، اس قیمتی سامان کے بارے میں جانتے ہیں جو وہاں اوپر کھنڈر میں موجود ہے؟''

سرمد صاحب نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔ ''نہیں، ایسا کچھ نہیں ہے۔ ان لوگوں کو پتا ہوتا تو شاید یہ بہت پہلے اس سامان کو ڈھونڈنے کی کوشش کر چکے ہوتے بلکہ یہ خبر بہت سے دوسرے مہم جوؤں تک بھی پھیل چکی ہوتی۔ یہ پاؤندے صرف اس لیے چوٹی تک جانے میں رکاوٹ بنتے ہیں کہ انہیں چڑ ہو چکی ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ جب کوئی کوہ پیما پارٹی ان پہاڑوں کی طرف آتی ہے تو ان کی رہائشی زندگی درہم برہم ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ بالکل الگ تھلگ اور سکون سے رہنا پسند کرتے ہیں۔ لوگوں کو چوٹی کی طرف جانے سے روکنے کے لیے ان کے کچھ بڑوں نے یہ بات گھڑ لی ہوئی ہے کہ چوٹی پر موجود کھنڈر دراصل کسی عبادت گاہ کا کھنڈر ہے اور جب بھی کوئی انسانی قدم اس کھنڈر تک پہنچتا ہے، ارد گرد کے علاقوں پر سخت آفت نازل ہوتی ہے۔''

عادل نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تو سر! آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم پاؤندوں کو چوکنا کیے بغیر ایک مشکل راستے سے چوٹی پر پہنچ جائیں اور اس کھنڈر میں سے وہ زیورات تلاش کریں؟''

اس معاملے میں عادل کی دلچسپی بڑھ چکی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ذہن میں سوال بھی پیدا ہو رہے تھے۔ وہ بولا۔ ''میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی جناب کہ آپ مجھے اپنے ساتھ لے جانا اتنا ضروری کیوں سمجھ رہے ہیں؟ آپ تینوں خود اچھے کوہ پیما ہیں...... اور اگر آپ پھر بھی پُر یقین نہیں ہیں تو کسی بہت اچھے کوہ پیما کو اپنے ساتھ ملا سکتے ہیں۔''

سرمد صاحب عجیب انداز میں مسکرائے اور بولے۔ ''بات صرف مہارت اور تجربے کی نہیں ہے عادل۔ بات قسمت کی ہے اور بات اس خاص صلاحیت کی ہے جو مجھے صرف تم میں نظر آ رہی ہے۔''

''کیسی صلاحیت جناب!''

''بلندی کی طرف جانے کی صلاحیت۔ امید کرتا ہوں کہ اب تم مزید سوالات نہیں پوچھو گے۔ اگر تم مزید کچھ جاننا چاہتے ہو تو میں وقت آنے پر بتا دوں گا۔''

دونوں کے درمیان قریباً ایک منٹ تک خاموشی رہی۔ وہ دونوں جیسے اپنی اپنی سوچ میں گم تھے۔ آخر عادل نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ ''آپ جانتے ہیں مجھے صرف درختوں پر چڑھنا آتا ہے۔ ہائیکنگ اور کوہ پیمائی وغیرہ کا مجھے کوئی تجربہ نہیں۔''

''تجربہ ہو جائے گا۔'' سرمد صاحب نے اعتماد سے کہا۔ ''اسی لیے تو ہم وقت سے پہلے یہاں پہنچ گئے ہیں۔ ہمارے پاس ابھی کئی ہفتے ہیں۔ اگر تم آمادہ ہو جاتے ہو تو ہم پرسوں سے اپنی ٹریننگ شروع کر دیں گے۔ مجھے یقین ہے،

تم خداداد صلاحیت رکھتے ہو۔ ایک ڈیڑھ ماہ کے اندر ہی تم بہت کچھ جان جاؤ گے اور بہت کچھ کر بھی لو گے۔ شرط صرف محنت ہے...... اَن تھک محنت اور مصمم ارادہ۔''

عادل نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''میں آپ کی باتیں پوری طرح سمجھ تو نہیں پا رہا لیکن پھر بھی آپ پر یقین کرنے کو دل چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سوال بھی ذہن میں اُٹھتے ہیں...... آپ کو کتنے فیصد یقین ہے کہ ساڑھے چار سو سال پہلے کے واقعات کے بارے میں آپ نے جو معلومات حاصل کی ہیں، وہ درست ہیں اور ہم چوٹی کے کھنڈر میں سے اپنی مطلوبہ چیزیں ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟ دراصل...... مجھے یہ سب کچھ...... ایک کہانی کی طرح لگ رہا ہے۔ مہم جُو لوگ دور دراز سفر کرتے ہیں اور دفن شدہ قیمتی چیزیں ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر یہ کہانیاں سچی ہوں تو اکثر ان میں ناکامی ہی حصے میں آتی ہے۔''

''یہاں ناکامی حصے میں نہیں آئے گی۔ شرط یہی ہے کہ ہم پاؤندوں کو خبردار کیے بغیر چوٹی تک پہنچ جائیں۔''

''قریباً نائنٹی نائن پرسنٹ۔'' انہوں نے عجیب لہجے میں کہا۔ ''اور جہاں تک اوپر پہنچ جانے کا تعلق ہے، اس سلسلے میں بھی میں بہت زیادہ پُرامید ہوں اور اس کی وجہ وہ قدرتی صلاحیت ہی ہے جو مجھے تم میں نظر آئی ہے۔''

''میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا سر؟''

انہوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی میں انگلیاں چلائیں اور بولے۔ ''میں نے تمہیں بتایا تھا نا عادل کہ اگر ہم اپنے خدا کی بخشی ہوئی عقل کا بہت تھوڑا سا حصہ بھی ٹھیک طرح سے استعمال کرنے کے قابل ہو جائیں تو پیشین گوئیاں کر سکتے ہیں۔''

''ہاں آپ نے کہا تھا۔''

وہ پھر مسکرائے۔ ''تو سمجھو کہ یہ میری پیشین گوئی ہی ہے کہ تم کامیابی سے اس راستے پر سفر کر سکتے ہو اور تمہارے پیچھے ہم بھی کر سکتے ہیں۔''

اس یخ بستہ رات میں، اس پھڑپھڑاتے خیمے میں، اس عظیم الشان کے ٹو کے دامن میں عادل اور سر سرمد کے درمیان کافی طویل گفتگو ہوئی۔ بے شک اب بھی عادل کے ذہن میں کئی سوال موجود رہے لیکن وہ ذہنی طور پر سرمد صاحب کی بات ماننے کو تیار ہو گیا۔ اس کے اندر ایک یقین سا بیٹھتا چلا جا رہا تھا کہ جو کچھ سرمد صاحب کہہ رہے ہیں، وہ کر دکھائیں گے۔ ان کی معلومات بہت وسیع تھیں اور ان کا ارادہ اس سے بھی وسیع اور پختہ محسوس ہوتا تھا۔ عادل نے خیمے کے روزن سے کپڑا ہٹا کر دور شمال مغرب کی سمت دیکھا۔ برفیلی چوٹیوں پر چاندنی کا پڑاؤ تھا۔ ہوا کچھ ساکن سی محسوس ہوئی تھی اور پہاڑوں کی خاموشی میں اَن گنت دلفریب نغمے تھے۔ انہی پہاڑوں میں سے کسی ایک پہاڑ پر دو چند ٹوٹی پھوٹی دیواریں موجود تھیں اور ان دیواروں کے درمیان کہیں وہ نادر قیمتی سامان بھی موجود تھا جو پچھلے ساڑھے چار سو سال سے شاید سر سرمد جیسے ہی کسی مہم جُو کا انتظار کر رہا تھا۔

سر سرمد نے یقیناً بڑی ذہانت دکھائی تھی۔ اگر وہ یہ ساری باتیں لاہور کے کسی ریسٹورنٹ میں عادل کو بتاتے تو شاید وہ اس طرح ان کا اثر قبول نہ کرتا۔ اب یہ سارا جادوئی ماحول اس پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ وہ چوٹی بھی اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی جو اس ساری رُوداد میں مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ اس چوٹی نے جیسے عادل کو اپنی طرف بلانا شروع کر دیا تھا۔

شہزادی کا ملیح چہرہ عادل کی نگاہوں میں آ گیا۔ وہ جیسے بڑی خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور کہہ رہی تھی......

مجھے بھول نہ جانا عادل! میں انتظار کر رہی ہوں۔

O......❖......O

یہ عجیب دن تھے اور عجیب تر راتیں تھیں۔ عادل کو ایک نئی زندگی کا تجربہ ہو رہا تھا۔ نہایت کٹھن اور مشقت سے بھرپور زندگی۔ چند دن تک تو عادل کو ایسا لگا جیسے سرمد صاحب، کرسٹل اور ہمایوں گوشت پوست کے نہیں لوہے کے انسان ہیں۔ ان پر موسم کی بے رحمی اثر انداز ہوتی تھی اور نہ جان توڑ بھاگ دوڑ۔ لگتا تھا کہ سرمد صاحب کے ساتھ رہ رہ کر کرسٹل اور ہمایوں نے بھی خود کو ایک مختلف سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ دھیرے دھیرے عادل خود بھی اس بے پناہ مشقت کا عادی ہونے لگا۔ وہ لوگ صبح سویرے اُٹھتے، بلند و بالا پہاڑوں کے دامن میں ترائی کے ساتھ ساتھ چار پانچ میل کی دوڑ لگاتے۔ شروع میں برفانی ہوا ان کے جسم کے کھلے حصوں پر برچھیاں چلاتی لیکن پھر پورا جسم گرم ہو جاتا اور ٹھنڈ کی مار بے اثر ہو جاتی۔ ان کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگتی۔ بلندی کی وجہ سے غالباً آکسیجن کی کمی بھی متاثر کرتی تھی۔ ٹن پیک اشیا سے ناشتے کے بعد چڑھائی کی تربیت شروع ہوتی۔ ایک بلند و بالا چٹان جس کی صرف بالائی سطح پر برف تھی، مشق کے لیے چنی گئی تھی۔ یہ چٹان کہیں کہیں سے عمودی تھی، کہیں کہیں سے ستر اسی درجے کا زاویہ بناتی تھی۔ قریباً ایک ہزار فٹ بلند اس چٹان پر رسوں کے ذریعے چڑھنا شروع میں تو عادل کو نہایت خطرناک لگا لیکن جب اس نے اس کام کو سمجھنا شروع کیا تو اسے اندازہ ہوا کہ اگر کوہ پیمائی اور کلائمبنگ کے لوازمات پورے ہوں تو یہ کام خطرناک نہیں رہتا۔ ان لوازمات میں سب سے اہم چیز مضبوط رسے تھے۔ اس کے بعد ہتھوڑی اور میخوں یعنی بولٹس کی باری آتی تھی۔ پھر وہ آہنی کڑے تھے جنہیں...... کاربینرز اور گیئر کہا جاتا تھا۔ خطرناک بلندی کی طرف جانے والا، پتھر میں ڈرل کر کے سوراخ کرتا تھا اور ان میں بولٹس کستا تھا یا پھر میخوں کی طرح انہیں ہتھوڑی سے ٹھونکتا تھا۔ وہ نائلون کے مضبوط رسے کو بولٹس کے حلقوں میں سے اس طرح گزارتا چلا جاتا تھا کہ گرنے کی صورت میں وہ رسوں کے ساتھ جھول جائے۔ کوہ پیما خود کو رسوں اور بیلٹس کے دو حلقوں میں سے گزارتا تھا اور یہ حلقے اس کی رانوں کے بالائی حصے کو اپنی گرفت میں رکھتے تھے۔ اس گرفت کو ''بارنیس'' کا نام دیا جاتا تھا۔

نویں دسویں دن کی بات ہے جب عادل بغیر کسی مدد کے ازخود ایک ہزار فٹ اونچی چٹان پر پہنچا۔ بلندی پر کھڑے ہو کر اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور اسے عجیب سے فخر کا احساس ہوا۔ سرمد صاحب نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ ''تم نے میرے اندازے سے دو تین دن پہلے یہ کامیابی حاصل کر لی ہے۔ لیکن ابھی صرف شروعات ہے۔ ابھی اس سے کہیں مشکل چڑھائیاں آئیں گی۔''

''آپ کا مطلب ہے، اب کسی اور جگہ مشق ہو گی۔''

''ہاں...... وہ دیکھو...... وہ دائیں طرف۔ کل ہم اس چڑھائی پر کام کریں گے۔''

''لیکن سر! وہ تو بالکل سیدھی ہے کسی دیوار کی طرح۔ اسے دیکھ کر ہی خوف آ رہا ہے۔''

''جہاں چڑھ کر بیٹھے ہوئے ہو، شروع میں اسے دیکھ کر بھی تو خوف آیا تھا۔'' وہ مسکرائے۔

وہ چپ رہا۔ کرسٹل نے کہا۔ ''یہ 'راکس' دور سے زیادہ ڈینجرس نظر آتا۔ جب ہام ان پر چڑھنا شروع کرتا تو یہ

ایک دم دوست کی طرح لگتا۔ بالکل اپنا اپنا سا۔''

سرمد صاحب نے کہا۔''زندگی کی ہر دشواری چٹان کی طرح ہی ہوتی ہے۔ دور سے بہت دشوار لیکن جب اس پر کمند پھینکتے ہیں اور لمبی سانس لے کر چڑھنے کا پختہ ارادہ کر لیتے ہیں تو وہ قدموں کے نیچے بچھنا شروع ہو جاتی ہے۔''

اچانک کرسٹل کی نظر عادل کی بائیں کہنی پر پڑی۔ وہ بولی۔''تو م کو تو یہاں چوٹ لگا۔ تم نے میڈیسن کیوں نا ئیں لگایا؟''

عادل نے کہا۔''پرسوں ہمایوں بھائی کو چوٹ لگی تھی، انہوں نے بھی تو کچھ نہیں لگایا تھا۔''

''بھئی! ہم تو عادی ہو چکے ہیں۔ تمہیں زیادہ احتیاط کرنی چاہیے۔''اس نے اپنے فرسٹ ایڈ پاؤچ کی زپ کھولنی چاہی مگر عادل نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

''نہیں ہمایوں بھائی! وہ کیا کہتے ہیں، ہمہ یاراں دوزخ...... ہمہ یاراں جنت۔ مجھے بھی ایسے ہی چلنے دیں۔''

''اچھی سوچ ہے۔'' سرمد صاحب نے تائید کی۔''طبی امداد ہمیں کبھی کبھی سہل پسند بھی بناتی ہے۔ ہم جتنا زیادہ نیچر کے قریب رہیں، اتنا ہی سخت جان ہوتے ہیں۔ میں کئی ایسے مشہور کھلاڑیوں کو جانتا ہوں جنہوں نے کبھی اپنی کسی تکلیف کے لیے پین کلر نہیں کھائی اور اگر کبھی کسی زخم پر ٹانکوں کی ضرورت پڑی تو انہوں نے بغیر سن کرنے والے انجکشن کے ٹانکے لگوائے۔ شاید تمہیں یہ عجیب لگے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں مارشل آرٹ کے ایک ایسے کھلاڑی کو جانتا ہوں جس نے اپنے بازو کی ہڈی کا آپریشن بغیر بے ہوش ہوئے یا لوکل انستھیسیا لیے کرایا۔ ساری تکلیف جھیلی اور پورے ہوش و حواس میں جھیلی۔ ایسی چیزیں برداشت اور حوصلہ تعمیر کرتی ہیں اور یہی برداشت اور حوصلہ آگے چل کر بڑی بڑی کامیابیوں کا سبب بنتا ہے۔''

قریباً ایک ہزار اونچی اس چٹان پر تند و تیز برفانی ہوا میں کھڑے ہو کر سرمد صاحب نے جو باتیں کہیں، وہ عادل کو دل میں اُترتی محسوس ہوئیں۔

اگلے روز معمولات سے فارغ ہونے کے بعد وہ لوگ اپنے ساز و سامان کے ساتھ اس دوسری اونچائی کی طرف روانہ ہوئے جو دو تین سو فٹ تک تو مناسب تھی، اس کے بعد قریباً آٹھ نو سو فٹ تک بالکل عمودی دیوار کی طرح چلی گئی تھی۔ یہاں وہ دراڑیں اور اُبھار بھی بہت کم تھے جو کوہ پیما کو ہاتھ پاؤں جمانے اور آگے بڑھنے میں مدد دیتے ہیں۔

''پہلے کون جائے گا؟'' سرمد صاحب نے پوچھا۔

''میں جاؤں گا۔'' خاموش طبع ہمایوں نے اعتماد سے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ سامان سے پوری طرح لیس ہو کر مخصوص میخیں ٹھونکتا ہوا اور رسا جھلاتا ہوا اوپر جا رہا تھا۔

سرمد صاحب نے عادل کو اشارہ کیا کہ وہ ہمایوں کے پیچھے پیچھے جائے۔ عادل نے دیکھ لیا تھا کہ پیچھے جانے والوں کے لیے کام کافی آسان ہو جاتا ہے۔ انہیں بولٹنگ نہیں کرنا پڑتی تھی اور رسے کی سپورٹ پہلے سے موجود ہوتی تھی۔ عادل کے پیچھے کرسٹل نے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ سرمد صاحب نیچے رہے اور ان تینوں کو مختلف ہدایات دیتے رہے۔ انہیں اگر کسی بولٹ کی مضبوطی پر شک ہوتا تو اسے مزید مضبوط کرواتے۔ ان کی ہدایات عادل کے لیے بھی بہت حوصلہ افزا ثابت ہو رہی تھیں۔ وہ قریباً چھ سو فٹ کی بلندی پر پہنچ چکے تھے جب اچانک عادل کا پاؤں پھسلا۔ جھٹکا لگنے سے رسے پر

سے اس کے ہاتھ کی گرفت بھی ختم ہو گئی۔ وہ تیزی سے نیچے آیا۔ حفاظتی رسا اس کی کمر سے پرویا ہوا تھا ورنہ وہ چند سیکنڈ کے اندر نکیلی چٹانوں پر گر کر راہی عدم ہو جاتا۔ پھر بھی گرنے کا احساس بڑا دل دہلا دینے والا تھا۔ وہ نیچے نہ بھی گرتا تو شدید زخمی ہو سکتا تھا۔ اچانک اس نے خود کو ایک نرم گداز لمس کے گھیرے میں پایا۔ یہ کرسٹل تھی جو آٹھ دس فٹ نیچے آ رہی تھی۔ اس نے بڑی مہارت سے عادل کو مزید نیچے پھسلنے سے روک لیا۔ اب وہ اس کی بانہوں میں تھا۔ وہ عقب سے اسے سہارا دیئے ہوئے تھی۔

''اوکے...... یو آر او کے۔ کوئی پرابلم نائیں۔'' اس نے ہانپتی ہوئی آواز میں عادل کو تسلی دی۔ ساتھ ساتھ وہ یہ کوشش بھی کر رہی تھی کہ عادل دوبارہ رسے پر گرفت مضبوط کر سکے۔ ان پریشان کن لمحوں میں بھی عادل کو احساس ہوا کہ کرسٹل کی نرم گرم سانسیں اس کے چہرے سے ٹکرا رہی ہیں اور وہ پوری طرح اس کی بانہوں میں ہے۔ چند سیکنڈ بعد وہ دوبارہ درست پوزیشن میں آ گیا۔ وہ ہنسی۔''تھوڑی دیر...... سانس لینے کا یہ اچھا بہانا ڈھونڈا ہے تو م نے۔''

''''تمہارا مطلب ہے، میں جان بوجھ کر گرا ہوں؟''

وہ بولی۔''یہ تو ٹھیک سے پتا نائیں مگر تو م گرے اچھے ہو۔ گڈ فالنگ۔''

وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں عادل کو بتا رہی تھی کہ اس کا یوں گرنا اور اس کی بانہوں میں آنا اسے اچھا لگا ہے۔

عادل کا اسٹیمنا اتنا زیادہ نہیں تھا۔ اسے راستے میں تین بار سانس لینا پڑی۔ بالآخر وہ منزل پر پہنچ گئے۔ تیز ہواؤں نے ان کا استقبال کیا۔ کرسٹل نے اپنا ہیلمٹ اُتار دیا۔ اس کے بال دیوانہ وار لہرانے لگے۔ پھر اس نے سن گلاسز بھی اتار دیئے۔ اس کی آنکھوں میں شوق تھا اور خوشی کی چمک تھی۔ نہ جانے کیوں عادل کو ہوٹل کی وہ رات یاد آ گئی جب لیوپڈ نامی نوجوان نے اسے کمرے میں گھیرا تھا اور بدتمیزی کی تھی۔ اس وقت وہ ایک مجبور بے کس لڑکی کی طرح نظر آئی تھی۔ اس لڑکی سے بہت مختلف جواب ہوا میں اپنے بازو لہرا رہی تھی اور منہ کھول کر تازہ سانسیں اپنے سینے میں بھر رہی تھی۔ ہمایوں ہمیشہ کی طرح گم صم تھا اور قدرتی نظاروں میں کھویا ہوا تھا۔ عادل نے اس سے پوچھا۔''کیا دیکھ رہے ہو ہمایوں بھائی؟''

وہ بولا۔''یہاں سے ایک بہت اہم جگہ کافی صاف نظر آ رہی ہے۔''

''کون سی جگہ؟''

اس نے انگلی سے شمال مغرب کی طرف اشارہ کیا۔''یہ ہے وہ چوٹی جس پر ہمیں جانا ہے۔'' وہ بولا۔

عادل کی اوپر کی سانس جیسے اوپر ہی رہ گئی۔ وہ حیرت سے دیکھنے لگا۔ یہ چوٹی کئی دوسری چوٹیوں کی طرح عظیم الشان کے ٹو کے پہلو میں واقع تھی۔ یہ نیچے سے تو شاید کچھ ڈھلوان تھی لیکن جوں جوں بلند ہوتی تھی، سیدھی ہوتی چلی جاتی تھی۔ اس کا بالائی حصہ بالکل ایک سیدھی دیوار کی طرح تھا بلکہ کہیں کہیں تو یہ لگتا تھا کہ یہ سفید دیوار زمین کے ساتھ نوے درجے سے بھی زیادہ کا زاویہ بناتی ہے یعنی باہر کی طرف جھکاؤ رکھتی ہے۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' ہمایوں نے اپنی بھاری آواز میں پوچھا۔

''بہت مشکل پہاڑ ہے یہ، لیکن...... اس پر پاؤنڈوں کے آثار تو کہیں نظر نہیں آتے۔''

''پاؤنڈے پہاڑ کی دوسری طرف ہیں۔ سمجھو، ان کی بستیاں پہاڑ کے دامن میں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس

طرف آنا پڑا ہے۔''

چٹان پر کھڑا عادل اس فلک بوس چوٹی کو دیکھ رہا تھا۔ قدرت کی اس عظیم الشان و ہیبت ناک تخلیق کے مقابلے میں اس نے خود کو بہت چھوٹا اور ناچیز محسوس کیا۔ کرسٹل اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''توم پریشان کیوں ہوتا۔ کیا توم کو سر سرمد کا بات یاد نائیں۔ یہ ہائٹس دور سے زیادہ ڈینجرس لگتا۔ جب ہام اپنے ارادے کو اسٹرانگ کر لے گا تو یہ سب کچھ ایزی ہو جائے گا۔ آپ کی زبان میں بالکل حلاوے کی طرح۔''

''حلاوا؟ یہ کیا ہوتا ہے؟'' عادل نے پوچھا۔

ہمایوں بولا۔ ''یہ حلوا کہہ رہی ہے۔ یعنی حلوے کی طرح آسان۔'' وہ مسکرائی اور اثبات میں سر ہلایا۔

حلوے کے ذکر نے عادل کو ایک دم کہیں دور پہنچا دیا۔ ان برفانی چٹانوں سے بہت آگے، پنجاب کے میدانوں میں اور پھر بہاولپور کی چلچلاتی دھوپ میں...... جہاں لالی کے کھیتوں میں کسان اپنا پسینہ بو رہے تھے۔ اسے اپنے گاؤں لالی کی پچھلی عید یاد آئی۔ ریحانہ تایا فراست کی حویلی میں کام کر کے واپس آئی تو سیدھی عادل کے پاس چھت پر آئی تھی اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی سی تھی۔ ''یہ کیا ہے؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''حلوا...... تمہارے لیے کسی نے بھیجا ہے۔''

اس نے پوٹلی کھولی تو شیشے کی خوبصورت پیالی نما پلیٹ میں سوجی اور انڈے کا حلوا تھا۔ اس پر اوپر سے کشمش تھی اور باداموں کا چورا ڈالا گیا تھا۔ یہ اس کے لیے شہزادی نے بھیجا تھا۔ عادل نے حلوا لینا چاہا تو ریحانہ چہک کر بولی۔ ''یہ سارا تمہارا نہیں عادے بھائی۔ آدھا کسی اور کا ہے اور واپس جائے گا۔'' وہ سمجھ گیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ وہ نیچے سے چھوٹا چمچ لایا اور کچھ حلوا کھا کر باقی ریحانہ کو واپس کر دیا۔

وہ بولی۔ ''نہیں عادے بھائی۔ یہ چمچ بھی یہیں رکھو جس سے حلوا کھایا ہے۔ مجھے یہی آرڈر ہے۔''

عادل نے مسکراتے ہوئے چمچ بھی پلیٹ میں رکھ دیا وہ دن ایسی ہی چھوٹی چھوٹی شوخیوں سے لبریز تھے۔ اس وقت ان دونوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ حالات اتنی جلدی بدلیں گے اور جدائی کا موڑ یوں اچانک سامنے آ جائے گا۔

''عادل! توم کس سوچ میں کھو گیا؟'' کرسٹل نے ادا سے کہا۔

''کچھ نہیں۔ ویسے ہی کچھ یاد آ گیا تھا۔''

''شاید حلاوا یاد آ گیا ہوئیں گا۔'' وہ بولی اور خود ہی ہنس دی۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دلکش پیکر بھی ہنستا ہوا محسوس ہوا۔ وہ اکثر پاکستان آتی رہتی تھی اور اس نے بڑی دلچسپی سے اردو سیکھی تھی۔

وہ نیچے اُتر آئے اور پھر دیگر مشقوں میں مصروف ہو گئے۔ عادل کبھی کبھی سرمد صاحب کی سخت جانی دیکھ کر حیران رہ جاتا تھا۔ اتنی عمر میں ان سے ایسی جفاکشی کی توقع اسے ہرگز نہیں تھی۔ وہ کچھ کھائے پیئے بغیر گھنٹوں ان کے ساتھ ٹریننگ میں مصروف رہتے اور کبھی کبھی بس دودھ کا ایک ٹن پی کر سو جاتے۔ وہ زندگی کی بہت سی لذتوں سے دور تھے۔ میٹھا وہ نہیں کھاتے تھے، نمک نہ ہونے کے برابر...... آرام کم، کام زیادہ...... اور جہاں تک ازدواجی خوشیوں کی بات تھی، وہ بھی ان کے کچھ زیادہ قریب نہیں تھیں۔ لگتا تھا کہ انہوں نے کڑی مشقت کو محبوبہ بنا رکھا ہے اور مشکلات ان کے بچے ہیں جنہیں

وہ بڑے پیار سے گلے لگاتے ہیں اور ان کی آمد پر پریشان ہونے کے بجائے اپنا سینہ ان کے لیے کھول دیتے ہیں۔ وہ دوسروں سے بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ مشکلات اور تکلیفوں سے بھاگنے کے بجائے ان کے پیچھے بھاگیں۔ انہیں گود میں اُٹھائیں، ان سے کھیلیں۔ ان کے اندر سے زندگی کا پیار کشید کریں۔

وہ رات بھی عادل نے پہاڑی ڈھلوان پر لگے ہوئے جدید انگلش کیمپ میں گزاری۔ یہ تین آدمیوں کے لیے کافی تھا تاہم اس میں ہمایوں اور عادل ہی ہوتے تھے۔ ایسی جگہوں پر ایوالانچ (برفانی ریلے) کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ بہرحال اپنے تجربے کی بنیاد پر سرمد صاحب نے یہ خیمے بڑی مناسب جگہ پر لگوائے تھے۔ رات میں عادل دیر تک جاگتا رہا۔ شہزادی کا تصور بار بار ذہن میں آتا رہا۔ وہاں کیا ہو رہا ہوگا؟ کیسے ہو رہا ہوگا؟ اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ وہ بس دعا ہی کر سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اب اس کے دل میں یہ امنگ بھی پیدا ہو رہی تھی کہ یہاں جو کچھ ہونا ہے، جلد سے جلد ہو جائے۔ اگر اس مہم جوئی کے سلسلے میں واقعی ان کے ہاتھ میں ایک بڑی رقم آنے والی ہے تو پھر یہ رقم جلد سے جلد اس تک پہنچے۔ اس نے تہیہ کیا کہ وہ ٹریننگ میں پہلے سے زیادہ جان مارے گا اور سرمد صاحب کو بھی حیران کر دے گا۔

اگلے روز عادل بہت چاق و چوبند تھا۔ صبح سب سے پہلے تین چار کلومیٹر کی دوڑ ہوئی تھی۔ اس کے بعد فزیکل فٹنس کی ورزش اور ناشتا۔ ناشتے کے فوراً بعد وہ لوگ کلائمبنگ کے ساز و سامان کے ساتھ کل والی چٹان کے دامن میں پہنچ گئے۔ سرمد صاحب کے ہاتھ میں سٹاپ واچ تھی۔ انہوں نے ان تینوں کو ایک بار پھر چڑھائی کا حکم دیا۔ آج کام اس لحاظ سے نسبتاً آسان تھا کہ میخیں پہلے سے گڑی ہوئی تھیں اور طویل رسا بھی جھول رہا تھا۔ انہوں نے آغاز کیا۔ آج کرسٹل سب سے آگے تھی۔ اس کے پیچھے عادل اور آخر میں ہمایوں۔ وہ تقریباً ایک ہزار فٹ کی بلندی پر تھے جب کرسٹل نے کہا۔

''عادل! کل ہام نے توم کو سنبھالا، اگر آج ہام پھسلا تو توم ہام کو سنبھالے گا۔''

''تم نہ ہی پھسلو تو اچھا ہے۔'' عادل نے کہا۔

''ہام صرف فرض کر رہا ہے۔''

عادل نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ پھر ہم دونوں کو ہمایوں بھائی ہی سنبھالے گا۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ آج کہیں سانس لینے کا موقع بھی نہیں تھا۔ وہ مسلسل چڑھ رہا تھا۔ دو تین بار کرسٹل نے اور ایک بار ہمایوں نے بھی اس سے کہا کہ وہ سانس لینا چاہتا ہے تو لے لے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر کرسٹل لڑکی ہو کر وقفہ نہیں لے رہی تو وہ کیوں لے۔ ایک جاں گسل کوشش کے بعد وہ لوگ بغیر کہیں رُکے چٹان کی بلندی پر پہنچ گئے۔ سخت سردی کے باوجود وہ لباس کے اندر پسینے سے شرابور تھے اور ان کے بازو جیسے شل ہو چکے تھے۔ سرمد صاحب کا آرڈر تھا کہ چوٹی پر تین منٹ سے زیادہ نہیں رُکنا۔

انہوں نے اس ہدایت پر عمل کیا اور ایک بار پھر ہانپتے ہوئے نیچے اُترنے لگے۔ اُترتے ہوئے بھی عادل نے کہیں وقفہ نہیں لیا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اور بازو سن ہوتے جا رہے تھے۔ بہرحال وہ کافی تیزی سے نیچے اُترنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے داد طلب نظروں سے سرمد صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ مطمئن تو نظر آئے لیکن ایسی کوئی داد ان کی آنکھوں میں دکھائی نہیں دی۔ چند سیکنڈ بعد انہوں نے جو فقرہ کہا، وہ بجلی بن کر عادل کی سماعت سے ٹکرایا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ''پانچ منٹ کا وقفہ کر کے دوسری بار چڑھائی شروع کریں گے۔''

"دوسری چڑھائی۔" عادل نے دل ہی دل میں دہرایا اور اس کا کلیجا منہ کو آنے لگا۔

"کیا تم تیار ہو عادل؟" سرمد صاحب نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"جج..... جی..... آپ کہتے ہیں تو تیار ہوں۔" وہ مری مری آواز میں بولا۔

"شاید..... تم زیادہ تھک گئے ہو۔" انہوں نے کہا۔ "چلو ٹھیک ہے، دوسری چڑھائی کینسل کرتے ہیں..... یا پھر..... ایسے کرتے ہیں کہ جو جانا چاہے چلا جائے۔ جو رُکنا چاہے رُک جائے۔"

کرسٹل فوراً ہاتھ اُٹھا کر بولی۔ "ہام جائے گا سر! ابھی جائے گا۔ جسٹ ناؤ۔" اس نے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر ہی دوڑتی ہوئی واپس چٹان کی طرف چلی گئی۔

سرمد صاحب نے مسکراتے ہوئے ہمایوں کو مخاطب کیا اور بولے۔ "چلو ہمایوں! تم ذرا عادل کو ایکسر سائز وغیرہ کراؤ۔"

ہمایوں، عادل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کرسٹل نے رسوں کے ذریعے اوپر چڑھنا شروع کر دیا تھا۔ پندرہ بیس منٹ میں ہی وہ کافی اوپر چلی گئی۔ چٹان کے ساتھ چپکی ہوئی وہ بالکل چھوٹی سی نظر آنے لگی۔ اس کا سرخ ہیلمٹ جیسے ایک نقطے کی طرح تھا۔ وہ لڑکی ہو کر عادل سے کہیں زیادہ برداشت اور اسٹیمنا کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ عادل جو شاہ نوانہ کے میلے میں خود کو چڑھائی کا چمپئن سمجھتا تھا، ایک دم خود کو خجل محسوس کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے سرمد صاحب پر تھوڑا سا غصہ بھی آ رہا تھا۔

اس روز اس نے پکا تہیہ کیا کہ وہ اپنے اسٹیمنا کو بہتر کرے گا اور کم از کم اس معاملے میں تو کرسٹل اور ہمایوں کو نیچا دکھائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ اگلے روز جب وہ صبح سویرے ترائی کے ساتھ ساتھ ہموار ٹریک پر جاگنگ کے لیے نکلے تو واپسی کے بعد عادل دوسرا راؤنڈ لگانے کے لیے نکل گیا۔ قریباً چار کلومیٹر کی دوڑ تو وہ پہلے ہی لگا چکے تھے۔ اب اگر وہ یہ دوسرا راؤنڈ بھی مکمل کرتا تو یہ آٹھ کلومیٹر سے زائد ہو جاتا۔ وہ دوڑتا رہا اور ہانپتا رہا۔ اس پر کچھ ایسی ہی کیفیت طاری تھی جو کبھی کبھی گاؤں میں ہو جاتی تھی۔ ایسے ہی موڈ کے زیرِ اثر وہ نوری نت کے پتلے پر پل پڑتا تھا۔ مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیتا تھا۔ برف سے گھرے ہوئے اس ٹریک پر اندھا دھند بھاگتے ہوئے بھی اسے یہی لگا جیسے ایک نوری نت اس کے قریب ہے۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا ہے۔ اسے نیچا دکھانا چاہتا ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر یہ نوری نت کیوں اس کے سامنے آ جاتا تھا..... کیوں آ جاتا تھا؟ اس نے اپنی رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ اس کی ٹانگیں شل ہونے لگیں۔ کبھی کبھی لگتا کہ وہ بس گرنے ہی والا ہے۔ لیکن وہ بھاگتا رہا..... اور دوسرا راؤنڈ بھی مکمل کر لیا۔ اسے کرسٹل کی آنکھوں میں تھوڑی سی حیرت نظر آئی۔ اس حیرت نے اسے محظوظ کیا لیکن رات تک عادل کو بخار ہو گیا۔ کھانے کے دوران میں اس کا تمتمایا ہوا چہرہ دیکھ کر کرسٹل نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور بولی۔ "او گاڈ! توم کو تو بخارا ہے۔"

"بخارا نہیں بخار ہوتا ہے۔" سرمد صاحب نے کہا اور عادل کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ پھر بولے۔ "واقعی بھئی! تم کو تو بخار ہے۔ کافی زیادہ لگتا ہے۔" وہ کچھ دیر چپ رہ کر کہنے لگے۔ "میرا خیال ہے کہ تم کوئی دوا لے لو۔"

"نہیں سر! میں دوا نہیں لوں گا۔ آپ نے ہی تو کہا تھا کہ دوا کے بغیر تکلیف کا سامنا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

سرمد صاحب نے اصرار نہیں کیا اور خاموش ہو گئے۔ عادل بھی خاموش ہو گیا۔

رات دس بجے تک بخار تیز ہو گیا۔ عادل اپنے خیمے میں آ کر لیٹ گیا۔ اس کے منہ میں کڑواہٹ گھلی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی سرمد صاحب کا رویہ عجیب لگتا تھا۔ اگر وہ اصرار کرتے تو وہ دوا لے لیتا لیکن انہوں نے تو دوسری بار کہنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ اب بھی وہ اطمینان سے باہر ہمایوں اور کرسٹل کے ساتھ بیٹھے تھے۔ الاؤ دہک رہا تھا اور وہ اپنے طاقتور ٹرانزسٹر ریڈیو پر کوئی پروگرام سننے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسی دوران میں کرسٹل اندر چلی آئی۔ اس نے اپنا ٹھنڈا ہاتھ عادل کے تپتے ہاتھ پر رکھا۔ "عادل! توم نے اپنے ساتھ خود زیادتی کیا۔ ایکسر سائز کو اسٹیپ بائی اسٹیپ آہستہ آہستہ بڑھایا جاتا ہے توم نے ایک دم چار میل کے بجائے آٹھ میل کا راؤنڈ لگایا اور توم کو بخارا ہوا۔ سر سرمد نے توم کو کہا بھی تھا کہ ہوا بہت "کول" چل رہا ہے۔"

"ہمدردی کا شکریہ۔ تھینک یو..... صبح تک ٹھیک ہو جاؤں گا۔" اُس نے کہا اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

اس کا خیال تھا کہ کرسٹل چلی جائے گی لیکن وہ وہیں بیٹھی رہی۔ تمہارے شولڈر دباؤں؟ اس سے پوری باڈی کا پین کم ہوتا۔" اس نے کہا۔

"نو تھینکس۔"

وہ پھر بھی بیٹھی رہی اور اس کے کندھے دبانے لگی۔ وہ فزیوتھراپسٹ تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو ایسے انداز سے حرکت دی کہ واقعی عادل کی گردن اور کمر کا درد کم ہونے لگا لیکن اسے یہ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ "رہنے دو کرسٹل! میں ٹھیک ہوں۔" اس نے اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر کرسٹل نے اپنے ہاتھ کے دباؤ سے اسے لیٹے رہنے پر مجبور کر دیا۔ "دیکھو عادل! توم ناشکری کرتا۔ برمنگھم کی سب سے اچھی فزیوتھراپسٹ تمہارا ٹریٹمنٹ کرتا اور توم انکار کرتا۔"

اس نے عادل کو اوندھا لیٹنے پر مجبور کیا اور اس کی ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ ساتھ مخصوص پٹھوں پر دباؤ ڈالنے لگی۔ واقعی وہ اپنے ہاتھوں میں ایک طرح کا جادو رکھتی تھی۔ اس کا لمس، اس کی سانسوں کی سرسراہٹ، عادل اپنے بالکل قریب محسوس کر رہا تھا۔ پچھلے کئی روز سے اسے لگ رہا تھا کہ کرسٹل اشاروں کنایوں میں اس کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔ آج یہ اشارے مزید واضح ہو گئے تھے۔ "توم نے کسی سے پیار کیا؟" اس نے مساج کرتے کرتے اچانک عادل سے پوچھا۔

وہ گڑبڑا گیا پھر سنبھل کر بولا۔ "نہیں۔"

"اور سیکس؟" اس نے بڑی روانی سے پوچھا۔

یہ سوال عادل کے لیے دھماکا خیز ثابت ہوا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ قدرے بیزاری سے بولا۔ "یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

"ہام نے کون سا ایسا غلط بات کیا؟" وہ اپنی نیلگوں آنکھیں جھپک کر بولی۔

"جو تم کہہ رہی ہو، یہ ہمارے لیے غلط ہی ہے بلکہ بہت غلط ہے۔"

"سوری، اگر ایسا ہے تو ہام معافی مانگتا، ایک دم معافی مانگتا..... ویسے یہ سب تو نیچر ہے اور....."

"پلیز، اپنی یہ نیچر اپنے پاس رکھو۔ میں اس سلسلے میں بات کرنا نہیں چاہتا۔"

"او کے، ٹھیک ہے۔ ہام نائیں بات کریں گا۔ لیکن توم لیٹ جاؤ۔ تمہارا اور ٹریٹمنٹ کریں گا۔"

"نہیں، اتنا کافی ہے۔ میں اب سونا چاہتا ہوں۔" عادل نے ذرا دھیمے لہجے میں کہا۔

"یور آر سو نائس اینڈ ہینڈسم۔ ہام توم کو لائیک کرتا۔ اگر کسی بھی طرح ہام کا ضرورت ہو تو ہام حاضر۔"

"او کے۔ تھینک یو۔" عادل نے کہا۔

وہ نیچی چھت والے خیمے میں جھک کر کھڑی ہوگئی اور پھر اسے لگاوٹ کی نظروں سے دیکھتی ہوئی باہر چلی گئی۔

عادل اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ وہ سرتاپا شعلہ تھی۔ اس کا آتشیں بدن کھچی ہوئی کمان کی طرح تھا اور نگاہیں تیر کی طرح دل و دماغ میں گھسنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ پتا نہیں کہ سرمد صاحب نے یہ کیا چیز پال رکھی تھی؟ اور کیوں؟ وہ تو بالکل اور طرح کے بندے تھے۔

عادل پیار کی ایک ناقابلِ شکست زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید وہ خود کو اس آتشیں لڑکی کی لپیٹ میں محسوس کرتا۔ اس کا معنی خیز فقرہ اب بھی عادل کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ "اگر کسی بھی طرح ہام کا ضرورت ہو تو ہام حاضر۔"

اس نے اپنے بیہودہ خیالات کی یورش سے دھیان ہٹانے کے لیے اپنے ذہن میں شہزادی کا تصور بسایا اور اپنے تصور سے باتیں کرتے کرتے سو گیا۔

اگلے روز بھی عادل کا بخار موجود تھا۔ اسے یقین تھا کہ آج سرمد صاحب اسے ٹریننگ سے چھٹی دیں گے۔ لیکن یہ جان کر اسے سخت حیرانی ہوئی کہ وہ اسے باہر بلا رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "ہم دوڑ کے لیے جا رہے ہیں، آج تم دوڑ نہیں لگاؤ گے...... لیکن چڑھائی کی مشق تمہیں کرنا ہوگی۔ اگر کوئی دوا وغیرہ کھانی ہے تو کھا لو...... پیراسٹامول ٹائپ کی۔"

"نہیں سر! دوا کی ضرورت نہیں۔" عادل نے بظاہر عام سے لہجے میں کہا لیکن لہجے کے نیچے کہیں ہلکی سی تلخی بھی موجود تھی۔

ناشتے کے نام پر عادل نے پاؤڈر ملک سے بنایا گیا تھوڑا سا دودھ پیا اور ایک انرجی بار کھائی۔ اس کے بعد گروپ کے ساتھ چٹان کی طرف روانہ ہوگیا۔ بخار سے بدن دُکھ رہا تھا اور سراپا میں نقاہت سی بھری ہوئی تھی۔ آج پھر انہوں نے نائلون کے طویل رسوں کی مدد سے قریباً ڈیڑھ ہزار فٹ اونچی چٹان پر چڑھنا تھا اور پھر رسوں کے ہی ذریعے پھسلتے ہوئے نیچے اُترنا تھا۔ اگلے قریباً دو گھنٹے عادل کے لیے سخت اذیت ناک ثابت ہوئے۔ بخار کی حالت میں ایسی سخت مشقت اس کا انجر پنجر ہلانے کے لیے کافی تھی لیکن اسے کسی نہ کسی طور گزارہ کرنا تھا۔ اسے اُکسانے میں کرسٹل کی اس بات نے بھی اہم کردار ادا کیا کہ پچھلی مرتبہ سرمد صاحب نے بھی تیز بخار کی حالت میں قریباً تین ہزار فٹ تک کلائمبنگ کی تھی اور غیر ملکیوں کی ایک ٹیم کو حیران کر دیا تھا۔

مشق ختم ہوئی تو عادل کا جسم پسینے میں شرابور تھا اور بخار بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے صبح کے مقابلے میں خود کو کافی چاق و چوبند محسوس کیا۔ رات تک وہ تقریباً ٹھیک ہو چکا تھا۔ وہ بستر پر لیٹا تو یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ اگر وہ دوا کھا لیتا اور لیٹ جاتا تو شاید اس وقت بھی خود کو بیمار ہی تصور کر رہا ہوتا۔

اگلے روز سرمد صاحب نے عادل کو چھٹی دی بلکہ عادل کے ساتھ ساتھ کرسٹل اور ہمایوں کو بھی چھٹی سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیا۔ صبح سویرے کی طویل دوڑ کے بجائے وہ لوگ مزے سے اپنے کیمپ میں چائے وغیرہ پیتے رہے اور

گپ شپ کرتے رہے۔ سرمد صاحب کی باتیں کبھی کبھی سمجھ سے بالاتر ہوتی تھیں۔ اسے چھٹی کی ضرورت کل تھی لیکن یہ اسے آج ملی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ سرمد صاحب کو آج اپنے کیمپ کے آس پاس رہنا ہی اچھا لگ رہا تھا۔ اس دن سب نے خوب انجوائے کیا۔ دھوپ بھی چمک رہی تھی اور کے ٹو سمیت اردگرد کی سب چوٹیوں نے سنہری تاج پہن رکھے تھے۔ سرمد صاحب نے عادل کو ایک طویل لیکچر بھی دیا۔ ایک طرح سے یہ کلائمبنگ کا ٹیچنگ کورس تھا۔ اس طرح کے دو تین لیکچر وہ پہلے بھی بڑی خوبی سے عادل کو دے چکے تھے۔ پتا نہیں کیوں اس لیکچر کے دوران میں بھی سرمد صاحب، عادل کو کچھ پریشان نظر آئے یا شاید یہ صرف اس کا وہم تھا۔

اگلے روز چھٹی تو نہیں تھی لیکن صبح سویرے کی طویل دوڑ سرمد صاحب نے "معاف" کر دی۔ کرسٹل نے کہا۔ "سر! کیا کوئی پرابلم؟"

"نہیں، پرابلم تو نہیں لیکن ابھی مجھے نکلنا کچھ مناسب نہیں لگ رہا۔ شاید کل سے پھر شروع کریں گے۔"

ناشتے کے بعد وہ کلائمبنگ کے سارے ساز و سامان کے ساتھ ایک بار پھر چٹان پر چڑھائی کے لیے تیار ہوگئے۔ آج سر سرمد بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس عمر میں ان کی ہمت اور توانائی کی داد دینے کو دل چاہتا تھا۔ ان کا اسٹیمنا بھی قابلِ داد تھا۔ واپسی سے پہلے انہوں نے ان تینوں کو اور خاص طور سے عادل کو سمجھایا۔ "چڑھائی کو مشکل سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت میں چڑھائی سے زیادہ اُترائی مشکل ہوتی ہے۔ زیادہ تر حادثات بھی اُترائی کے دوران میں ہی پیش آتے ہیں۔ اُترتے ہوئے کوہ پیما کو بے حد صبر اور سوجھ بوجھ سے کام لینا چاہیے۔"

اُترتے ہوئے انہوں نے عادل کو اپنے بالکل ساتھ رکھا اور ہر ہر مرحلے میں ہدایات دیتے رہے۔ کاربینرز کی ترتیب، رسے پر گرفت کو ڈھیلا اور مضبوط کرنا، پاؤں کا درست استعمال، وہ جیسے عادل کو انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ چلا رہے تھے۔ نیچے اُترنے کے بعد انہوں نے چند گہری سانسیں لیں۔ اپنا ہیلمٹ اُتارا۔ آنکھوں سے سن گلاسز ہٹائے اور عادل سے مخاطب ہو کر بولے۔ "آج کیسا محسوس ہوا؟"

"آج تو بہت اچھا لگا اور بہت سہل بھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ آپ دوسری بار چڑھنے کا کہیں گے تو شاید وہ بھی آسانی سے ہو جائے گا۔"

"ایسا کیوں محسوس کیا تم نے؟"

"شاید اس لیے کہ آپ ساتھ تھے۔"

"نہیں، اس کی وجہ اور ہے۔ کل تم نے زیادہ ہمت اور برداشت کا مظاہرہ کیا۔ بخار اور نقاہت کے باوجود اپنی ٹریننگ مکمل کی۔ آج تمہاری طبیعت بہتر تھی اس لیے تمہیں ہر چیز آسان لگی۔ ہم اپنی برداشت کی حد کو جوں جوں بڑھاتے ہیں، ہمیں مشکل کام آسان محسوس ہونے لگتے ہیں۔ ایک شخص جو غیر فعال ہے اور زیادہ وقت گھر میں ہی بیٹھا رہتا ہے، اس کو بجلی کا ایک بل ہی ٹھیک کرانا پڑ جائے تو اسے ایک معرکے کی طرح لگتا ہے لیکن ایک شخص جو ایک بڑی فرم کو سنبھالے ہوئے ہے اور اس کے مسائل کو بھگت رہا ہے، اس کے لیے عدالت میں پیشی بھی کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ یہی مثال ہم کئی جگہ لاگو کر سکتے ہیں عادل...... ہمارا حوصلہ بڑھتا ہے تو ہمارے مسائل چھوٹے ہونے لگتے ہیں۔"

سرمد صاحب کی باتیں اکثر عادل کے دل پر اثر کرتی تھیں۔ اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ کل اسے سرمد صاحب کی سختی

پر جو تھوڑا سا غصہ آیا تھا، وہ بے معنی محسوس ہوا۔

لنچ کے بعد وہ سب لوگ آرام کرتے تھے۔ قریباً دو ڈھائی گھنٹے سوتے تھے۔ سخت ورزش کے بعد یہ آرام انہیں ایک دم چاق و چوبند کر دیتا تھا لیکن اس روز عادل کا دل لیٹنے کو نہیں چاہا۔ اس کا دل ذرا گھومنے پھرنے کو چاہ رہا تھا۔ وہ جوگرز کے تسمے باندھ رہا تھا جب کرسٹل نے اسے دیکھ لیا۔ ''ویئر آر یو گوئنگ؟'' اس نے پوچھا۔

''یونہی تھوڑی سی جاگنگ کروں گا۔ کچھ کمی سی محسوس ہو رہی ہے۔''

''سر سرمد سے پرمیشن لیا؟''

''ہوں۔'' عادل نے گول مول جواب دیا۔

''کہاں تک جائیں گا؟''

''زیادہ دور نہیں۔''

''تو ٹھیک...... ہام بھی توم کو جوائن کریں گا۔''

اس نے بھی فٹافٹ جوگرز پہن لیے۔ سورج کی تیز شعاعیں برفیلی ڈھلوانوں پر منعکس ہو کر اور بھی چکا چوند پیدا کر رہی تھیں۔ رات کو منفی سے کہیں نیچے چلا جانے والا درجہ حرارت اب اوپر محسوس ہو رہا تھا۔ تاہم دور بلند چوٹیوں پر گہرا پن دکھائی دیتا تھا کرسٹل نے چست نیکر پہن رکھی تھی۔ ہاں بالائی جسم پر کوہ پیمائی کا پرتوں والا لباس تھا۔ وہ ڈھلوان کے ساتھ ساتھ ہموار راستے پر دوڑتے رہے اور ساتھ ساتھ ہلکی پھلکی باتیں بھی کرتے رہے۔ سورج اچانک ہی غائب ہو گیا تھا اور چوٹیوں سے کالے بادلوں کے قافلے تیزی سے نیچے اُترنے لگے تھے۔

''ہام کا خیال ہے موسم خراب ہو جائیں گا۔ ناؤ وی ہیو ٹو گو بیک۔''

''بادلوں سے ڈر رہی ہو۔''

''تھوڑا تھوڑا۔ یہاں موسم ایک دم چینج ہوتا۔ توم کو مالوم۔ فرائی ڈے کو سر نے کیا لیکچر دیا تھا۔ کلائمبر کو اتنی ہی دور جانا چاہیے جہاں سے...... جہاں سے۔'' اس کی اردو جواب دینے لگی۔

عادل نے اس کا فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''جہاں سے وہ موسم خراب ہونے سے پہلے واپس آسکے۔''

''ہاں، ہام یہی کہنا مانگتا۔''

''چلو، بس دس پندرہ منٹ اور۔'' عادل نے کہا۔

وہ تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر مزید آگے گئے پھر واپسی کا سفر شروع کیا لیکن بمشکل آدھ کلومیٹر ہی طے کیا ہوگا کہ نہایت تیز برفانی ہوا نے انہیں آ لیا۔ یہ بالکل Twister جیسے بگولے تھے۔ انہیں لگا کہ وہ کہیں رُکے نہیں تو یہ بگولے انہیں اُٹھا کر گہرائی میں پھینک دیں گے۔ ایک دم ہی تاریکی سی چھا گئی تھی۔ کرسٹل، عادل کو ایک اُبھری ہوئی چٹان کی اوٹ میں لے آئی۔ یہاں چاروں طرف برف ہی برف تھی۔ وہ اپنے کیمپ سے قریباً پانچ کلومیٹر آگے نکل آئے تھے۔

''ہام کو اتنی دور نائیں آنا چاہیے تھا۔ ہام کو تو یہ ''سنوا سٹرام'' لگتا۔''

واقعی یہ سب کچھ ایک طوفان کی طرح تھا اور اس نے انہیں آناً فاناً ہی آدبوچا تھا۔ اس کی شدت گھٹنے کے بجائے دم بہ دم بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر ایک عجیب سی گونج سنائی دی۔ جیسے ایک گرج سی ہو۔ عادل کو اپنے پاؤں کے نیچے تھرتھراہٹ

محسوس ہوئی۔ ''او مائی گاڈ۔'' کرسٹل کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

''کیا ہوا؟''

''ہام کو تو یہ...... ایوالانچ لگتا۔'' کرسٹل نے کہا۔

ایوالانچ کا لفظ اب عادل کے لیے نیا نہیں تھا۔ اسے اردو میں برفانی ریلا کہا جا سکتا ہے جو بلندیوں سے نیچے کی طرف آتا ہے اور جوں جوں نیچے آتا ہے، اپنا حجم اور اپنی تباہ کاری بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ گرج دم بہ دم بڑھتی چلی گئی۔ پھر انہوں نے برفیلی چٹان کی اوٹ سے اس ریلے کو آتے دیکھا۔ یہ ایک خوفناک منظر تھا۔ برف کی کوئی تیس چالیس فٹ اونچی دیوار سی تھی جو گونج پیدا کرتی اور دھند اُڑاتی ان کی طرف جھپٹ رہی تھی۔ کرسٹل نے اسے کھینچا اور خود بھی چٹان کی دیوار کے ساتھ چپک گئی۔ ''ہیڈ ڈاؤن...... ہیڈ ڈاؤن۔'' وہ چلائی۔

عادل نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور لیٹ کر اپنا چہرہ اپنے دونوں بازوؤں میں چھپا کر سر جھکا لیا۔ قرب و جوار تھرا گئے۔ ایوالانچ ان تک پہنچی اور انہیں روندتی ہوئی چلی گئی۔ ہزاروں لاکھوں ٹن برف تھی جو آٹھ دس سیکنڈ کے اندر ان کے اوپر سے گزر گئی۔ اگر وہ اس مضبوط چٹان کی اوٹ میں نہ ہوتے تو نہ جانے برف کے اس سیلاب میں بہہ کر کہاں کے کہاں پہنچ چکے ہوتے اور برف کا کتنا بڑا انبار انہیں اپنے نیچے زندہ دفن کر چکا ہوتا۔

سردی میں ایک دم ہی بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ چٹان کی اوٹ میں ہونے کے باوجود عادل اور کرسٹل اپنے کندھوں تک برف میں دھنس گئے تھے۔ برف کی حرکت رُک گئی تو وہ دونوں زور لگا کر باہر نکل آئے۔ اردگرد کے منظر نے عادل کو دنگ کر دیا، اسے لگا کہ یہ وہ جگہ ہی نہیں ہے جہاں وہ موجود تھے۔ پورا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ جس تنگ گھاٹی میں بھاگتے ہوئے وہ آئے تھے اور اب واپس جا رہے تھے، وہ برف گرنے سے مکمل طور پر بند ہو گئی تھی۔ لگتا تھا کہ یہاں کبھی کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ اب ان کی دونوں جانب بلند چٹانی دیواریں تھیں اور سامنے راستہ مسدود تھا۔ کوہ پیمائی کے مکمل سامان کے بغیر ان دیواروں پر چڑھ کر دوسری طرف جانا تقریباً ناممکن تھا۔

''اب کیا ہوگا؟'' عادل نے کپڑوں سے برف جھاڑتے ہوئے پوچھا۔

''اندھیرا ہوتا جا رہا ہے۔ چڑھ کر اوپر جانے میں بہت بڑا رسک ہوئیں گا۔ ہام کو بیک جانا ہوئیں گا اور ایک چکر کاٹنا ہوئیں گا۔''

''تمہارا مطلب ہے چکر یعنی راؤنڈ؟''

''یس...... یس راؤنڈ......'' اس نے کہا اور اپنی نیکر کی بیک پاکٹ میں سے ایک نقشہ نکال لیا۔ اس کے بیک پاکٹ میں کچھ دیگر اشیا کے علاوہ پنسل ٹارچ بھی موجود تھی۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں کانپتے ہاتھوں کے ساتھ نقشے کا جائزہ لیا۔ چند سیکنڈ بعد بولی۔ ''یس، ہام کو واپس جانا ہوئیں گا۔''

ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر وہ واپس مڑے۔ یہ وہی راستہ تھا جہاں سے وہ بھاگتے ہوئے آئے تھے۔ اس طرف ایوالانچ نے کوئی تبدیلی رُونما نہیں کی تھی۔ وہ کبھی چلتے اور کبھی بھاگتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ انہیں معلوم تھا کہ کیمپ میں سرمد صاحب پریشانی کی انتہا کو چھو رہے ہوں گے۔ وہ قریباً دو کلومیٹر تک اس رُخ پر چلتے رہے۔ اب انہیں یہاں سے گھومتے ہوئے واپس اپنے کیمپ کی طرف جانا تھا۔ یعنی ایک طرح کا یوٹرن لینا تھا لیکن عادل کو اندازہ ہوا کہ کرسٹل

کچھ بھول رہی ہے۔ وہ ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کہاں سے ٹرن لینا ہے اور اپنا رُخ پھر سے کیمپ کی طرف کرنا ہے۔

موسم بدستور ابر آلود تھا اور تیز برفانی ہوا بھی چل رہی تھی۔ ابھی شام نہیں ہوئی تھی لیکن تاریکی شام والی ہی تھی۔ کرسٹل نے ایک بار پھر نقشہ نکالا۔ عادل نے ٹارچ پکڑی۔ وہ دونوں اس جگہ کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ ''آئی تھنک......تھوڑا سا اور آگے جانا ہوئیں گا۔'' کرسٹل نے اپنی گلابی اردو میں کہا۔

مطلوبہ موڑ ڈھونڈنے کے لیے وہ ایک بار پھر چل دیئے۔ عادل نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ ہمارے پاس ٹائم کم ہے۔ اندھیرا زیادہ ہو گیا تو راستہ ڈھونڈنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ ٹارچ کی بیٹری بھی ڈاؤن ہو رہی ہے۔''

کرسٹل نے پھر سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس کی ساری توجہ مطلوبہ موڑ ڈھونڈنے پر لگی ہوئی تھی۔ ایک جگہ وہ ٹھٹک کر رُک گئی۔ ''کیا ہوا؟'' عادل نے پوچھا۔

''ہام کافی آگے نکل آیا۔ اِٹ اِز ڈینجرس۔''

''کیا مطلب؟''

کرسٹل نے پریشان کن انداز میں دور ایک چوٹی کی طرف اشارہ کیا۔ غالباً یہ وہی چوٹی تھی جس پر چڑھنے کا وہ ارادہ رکھتے تھے۔ اب یہ عظیم الشان پہاڑ ذرا مختلف زاویے سے نظر آ رہا تھا۔ کرسٹل نے کہا۔ ''عادل! ہام کو اتنا دور نائیں آنا چاہیے۔ پاؤنڈوں کا ٹیرے ٹوری (علاقہ) یہاں سے زیادہ دور نائیں ہوئیں گا۔''

''تو پھر؟ تمہیں تو وہ جگہ نظر نہیں آ رہی جہاں سے مڑنا ہے۔''

''ہام......اندازے سے......ٹرن لے لیتا۔ یہ آگے بڑھنے سے زیادہ آچھا۔''

وہ بائیں طرف مڑ گئے۔ یہاں برف تھی اور راستہ دشوار تھا۔ انہوں نے چونکہ برف پر چلنے والے بوٹس نہیں پہن رکھے تھے۔ اس لیے دشواری ہو رہی تھی۔ ایک بار کرسٹل دوبارہ چونکی۔ اس نے ٹارچ کی مدھم روشنی راستے کی برف پر مرکوز کر رکھی تھی۔ اس بار عادل کو بھی چونکنا پڑا۔ برف پر ان کے سامنے انسانی قدموں کے مدھم نشان موجود تھے۔ یہ تازہ نشان تھے۔ ''او مائی گاڈ...... یہاں کوئی ہے۔'' کرسٹل نے کہا اور اس کے ساتھ ہی ٹارچ بجھا دی۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر حتیٰ الامکان تیزی سے قدم اُٹھانے لگے۔ دفعتاً عادل کو ایک عجیب سا احساس ہوا اور اس کے ساتھ ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اسے لگا کہ نشیب میں کوئی ان کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے بلکہ وہ ایک سے زیادہ لوگ لگتے تھے۔ ان کے قدموں کی ''شپ شپ'' واضح سنائی دیتی تھی۔ یہ آواز یقیناً کرسٹل نے بھی سن لی تھی۔ اس کے قدموں میں کچھ اور تیزی آ گئی۔ پھر اس نے ایک دم بھاگنا شروع کر دیا۔ عادل نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ یہی وقت تھا جب نشیب سے تین چار سائے برآمد ہوئے اور ان کے پیچھے بھاگے۔ ''رُک جاؤ......رُک جاؤ'' کسی نے بھاری آواز میں پکارا۔

''رن عادل......رن۔'' کرسٹل چلائی۔

ان دونوں نے رفتار کچھ اور تیز کر دی۔ پیچھے والے بھی اندھا دھند دوڑے۔ اچانک کرسٹل کا پاؤں پھسلا اور وہ اوندھے منہ گری۔ عادل آٹھ دس قدم تو بھاگتا چلا گیا پھر رُکا۔ تب تک سائے کرسٹل تک پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے اسے

دبوچا۔ وہ بُری طرح چلا رہی تھی، پھر یکا یک اس نے خود کو چھڑایا......اور دوبارہ بھاگنا چاہا۔ ایک دراز قد شخص نے اسے دھکا دے کر گرا دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے دوبارہ دبوچتا، عادل اس کے اور کرسٹل کے درمیان آ گیا۔ ''رُک جاؤ۔'' اس نے دراز قد شخص کو روکنا چاہا پھر یکا یک ایک ٹکر اس کے سینے پر ماری۔ وہ ایسی جگہ کھڑا تھا کہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑھکتا ہوا نشیب میں چلا گیا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر دراز قد کے ساتھی عادل پر پل پڑے۔ ایک نے اس کے سر پر لاٹھی کی ضرب لگانا چاہی۔ عادل نے جھک کر خود کو اس کاری وار سے بچایا اور ایک طوفانی گھونسے سے اس کا جبڑا ہلا دیا۔ دوسرے کے سینے پر عادل کی ٹانگ کی شدید ضرب لگی اور وہ برف پر دور تک پھسل گیا لیکن اس سے ایک نقصان بھی ہوا، یہ شخص کرسٹل کے بالکل قریب گرا تھا۔ کرسٹل جو اب اُٹھ کر ایک بار پھر بھاگنے کا سوچ رہی تھی، اس شخص کی پکڑ میں آ گئی۔ اس نے پہلے کرسٹل کو ٹانگوں سے پکڑ کر گرایا، پھر اس کے اوپر چڑھ بیٹھا۔ وہ مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ اگلے پانچ دس سیکنڈ میں عادل نے اپنے دونوں حریفوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ گاؤں میں درختوں کے جھنڈ کے اندر وہ نوری نت کے پتلے کے ساتھ جو اندھا دھند مارا ماری کیا کرتا تھا، اس نے اسے لڑائی بھڑائی میں کافی تاک کر دیا تھا۔

چند سیکنڈ کے لیے تو یہی محسوس ہوا کہ شاید وہ اپنے حریفوں پر غالب آنے میں کامیاب ہو جائے گا لیکن پھر اچانک بازی پلٹ گئی۔ نشیب میں لڑھک جانے والا دراز قد شخص، نشیب سے برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹے دستے کی کلہاڑی تھی۔ اس نے کلہاڑی کی زوردار ضرب عادل کے سر کے پچھلے حصے پر لگائی۔ یہ اُلٹی کلہاڑی کی ضرب تھی۔ اس نے عادل کے سر پر زخم تو نہیں لگایا مگر چوٹ اتنی سخت تھی کہ عادل کی آنکھوں کے سامنے اَن گنت رنگ برنگے ستارے ناچ گئے۔ اس کے ذہن میں آخری احساس یہ تھا کہ وہ اور کرسٹل ایک بڑی مصیبت میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ اس کے سر کے پیچھے ایک شدید ضرب لگی ہے اور وہ منہ کے بل سخت برف پر گر رہا ہے۔

O......❖......O

عادل کے حواس دوبارہ بحال ہوئے تو اس نے خود کو کسی نرم اور نیم گرم جگہ پر پایا۔ سب سے پہلے اس کی نظر ایک لالٹین پر پڑی جو چھت سے جھول رہی تھی۔ یہ مخروطی چھت یقیناً کسی خیمے کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے کانوں میں باتوں کی مدھم آواز آئی اور نتھنوں نے بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو محسوس کی۔ ایک دم اسے یاد آیا کہ اس کے سر پر کسی وزنی شے کی ضرب لگی تھی اور جس وقت وہ منہ کے بل گر رہا تھا، کرسٹل چلا رہی تھی۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس طرح بیٹھنے سے اس کے سر کے پچھلے حصے میں درد کی شدید ٹیسیں اُٹھیں۔ اس نے دیکھا وہ ایک جدید لیکن خستہ حال خیمے میں ہے۔ خیمے میں تین افراد موجود تھے اور ان میں وہ دراز قد شخص بھی شامل تھا جس کے سینے پر ٹکر مار کر عادل نے نشیب میں گرایا تھا۔ اس کی ایک کنپٹی اور کہنی پر چوٹیں آئی تھیں جہاں پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ کرخت نقوش والا ایک تیس پینتیس سالہ شخص تھا اور کینہ توز نظروں سے عادل کو گھور رہا تھا۔ عادل کو پاوندوں کے لباس اور حلیے کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا تھا ان کے مطابق یہ شخص یقیناً پاوندہ ہی تھا۔ اس کے ساتھیوں کا حلیہ بھی یہی تھا۔

ایک چپٹی ناک والا شخص جس کی کمر سے چھوٹے دستے والی کلہاڑی بندھی ہوئی تھی، عادل کو شاید تھپڑ رسید کرنے کے لیے اس کی طرف جھپٹا لیکن دراز قد شخص نے اسے ہاتھ سے روک دیا۔ ”نہیں...... داخون...... ابھی نہیں۔“ وہ بھاری آواز میں بولا۔

تب عادل کو اچانک احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ پشت پر کسی کپڑے وغیرہ سے بندھے ہوئے ہیں۔ بندش بہت مضبوط تھی۔ ہاتھ سن ہو رہے تھے۔ وہ ٹھیک سے اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا کہ کتنی دیر بیہوش رہا ہے۔ لگتا تھا کہ زیادہ ٹائم نہیں گزرا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ تب اس کو اندازہ ہوا کہ خیمے میں اس کی طرح ایک اور قیدی بھی موجود ہے۔ یہ بھی کوئی پاوندہ ہی تھا۔ دوسروں کی طرح اس کے جسم پر بھی بھاری گرم لباس تھا۔ سر پر اونی ٹوپی تھی جس نے آنکھوں اور ناک کے سوا اس کے چہرے کو بھی ڈھانپا ہوا تھا۔ اس شخص کی عمر پچیس سال کے قریب ہوگی۔ اس کی ناک سے خون رِس رہا تھا اور اونی صدری بھی کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ عادل کی طرح اس کے ہاتھ بھی پشت پر بندھے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے پاؤں کو بھی رسی سے باندھا گیا تھا۔ وہ ایک گٹھری کی طرح خیمے کے ایک کونے میں پڑا تھا۔ کرسٹل اس خیمے میں کہیں نہیں تھی۔

”وہ کہاں ہے؟“ عادل دراز قد شخص سے مخاطب ہو کر پھنکارا۔

”یہیں ہے وہ فرنگن اور بڑے آرام سے ہے۔“ دراز قد نے زہر خند لہجے میں کہا۔

عادل کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ گرج کر بولا۔ ”اسے کہاں رکھا ہے تم نے؟ اسے یہاں لاؤ۔ اگر اسے کچھ ہوا تو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا تمہیں۔“

”لگتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ گرمی ہے تمہارے اندر۔ ام تمہارا یہ گرمی بڑی اچھی طرح ٹھنڈا کرے گا، ایک دم ؎شمے کے پانی کے مافق ہو جاؤ گے۔“

ایک غیرت مند جوان کی ساری تپش عادل کے اندر بیدار ہو چکی تھی۔ وہ چنگھاڑا۔ ”میں پوچھتا ہوں کہاں ہے ؎ہ؟“ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی جگہ سے اُٹھنے کی کوشش کی۔

چپٹی ناک والے داخون نے اسے دھکا دے کر پھر پشت کے بل گرا دیا۔ شاید وہ عادل پر چڑھ ہی دوڑتا لیکن دراز قد والے نے ایک بار پھر ہاتھ کے دھکے سے اسے روکا۔ وہ چند لمحے تک عادل کو جلتی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ ”یہیں پر ہے تمہارا وہ ہمشیرہ۔ امارا بیوی اس کے پاس ہے۔ جب تک تم ٹھیک رہو گے اس کو کچھ نہیں ہوگا۔“ اس نے ؎یے کی زپ کھینچ کر خیمے کا در کھولا۔ پھر اس کی جالی ہٹائی۔ یخ بستہ ہوا کا جھونکا اندر آیا۔

عادل نے دیکھا، خیمے سے آٹھ دس قدم کے فاصلے پر ایک دوسرا خیمہ لگا تھا۔ یہ بھی جدید لیکن پرانا خیمہ تھا۔ اس کو ؎ین چار جگہ سے مرمت کیا گیا تھا۔ عادل نے سوچا شاید ان پاوندوں نے یہ خیمے، چوٹی کی طرف جانے والے کوہ پیماؤں ؎ے چھینے ہوں گے۔ بعد ازاں اس کا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ اس خیمے کے عین سامنے برف پر پتھروں سے ؎یک کیاری سی بنائی گئی تھی۔ اس کیاری میں الاؤ روشن تھا۔ الاؤ کے قریب کرسٹل سر جھکائے بیٹھی تھی۔ شعلے اس کے سرخ و ؎پید چہرے پر اپنا عکس ڈال رہے تھے۔ کرسٹل کے قریب ہی ایک اور عورت بیٹھی آگ تاپ رہی تھی۔ یہ درمیانی عمر کی ؎قامی عورت تھی۔ یقیناً یہی دراز قد شخص کی بیوی تھی۔

اگلے پانچ دس منٹ میں خیمے کے اندر عادل اور دیگر افراد میں جو گفتگو ہوئی، اس سے پتا چلا کہ دراز قد شخص کا نام ؎ابے خاں ہے۔ رابے خاں اور اس کے ساتھی اپنے کسی دشمن کا پیچھا کرتے ہوئے اس علاقے میں پہنچے ہیں...... اور یہ ؎ن وہی تھا جو بندھا ہوا خیمے کے ایک کونے میں پڑا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، اس کا ایک ساتھی بھی تھا جو ابھی تک ؎مرور تھا۔ اب یہ اتفاق کی بات تھی کہ رابے خاں اور اس کے ساتھیوں کی نظر عادل اور کرسٹل پر پڑ گئی اور انہوں نے انہیں ؎مر لیا۔

رابے خاں نے عادل کو قہرناک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا باقی ساتھی کدھر ہے؟“

”ہم دونوں ہی ہیں۔“

”یہ بکواس تم نے پہلے بھی کیا ہے لیکن یہ ماننے والا بکواس نہیں ہے۔ سچ بتاؤ گے تو تمہارا خانہ خراب نہیں ہوگا۔ ورنہ ؎موند تو ام نے ان کو ویسے بھی لینا ہے۔“

”ہم لوگ گروپ کی شکل میں آئے تھے لیکن باقی لوگ کافی پیچھے ہی ہمت ہار گئے تھے۔ شگر کے آس پاس کہیں ؎ل گئے تھے۔ ہم دونوں ہی یہاں تک آئے۔“ عادل نے جواب تراشا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی غلطی کا خمیازہ سرمد ؎ار ہمایوں وغیرہ کو بھی بھگتنا پڑے۔

”تمہارا کیمپ کدھر ہے؟“ چپٹی ناک والے داخون نے نفرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''کیمپ نہیں ہے، کیمپ تو تب ہوتا جب ہم نے یہاں کسی چوٹی پر چڑھنا ہوتا۔ ہم تو بس یونہی گھومتے گھومتے آگے نکل آئے اور پھر راستہ بھول گئے۔ ہمارا باقی سامان جنگلوٹ میں ایک مقامی پورٹر کے ڈیرے پر پڑا ہے۔''

''اور تم کیا سمجھتا ہے؟ ام تمہاری اس ہزار داستان پر یقین کر لے گا...... اور تمہارا ماتھا چوم کر تمہیں چھوڑ دے گا۔ کیا ام تم کو ایسا ہی گدھا نظر آتا ہے۔ ام تمہارے سامنے تمہاری اس فرنگن سہیلی کا چمڑی اُدھیڑے گا اور ساتھ ہی تمہارا بھی۔''

''تم غیر قانونی کام کرو گے اور اس کے نتیجے میں بچ نہیں سکو گے۔ اس لڑکی کی تلاش بڑے زور و شور سے شروع ہو جائے گی۔ تم لوگ تو...... پھنسو گے ہی، تمہارے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ پھنسیں گے۔''

دراز قد شخص نے ایک ہاتھ گھما کر عادل کے چہرے پر مارا۔ اس زوردار گھونسے نے عادل کا سر گھما کر رکھ دیا اور اس کے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھل گیا۔ وہ پہلو کے بل گر گیا تھا۔ دراز قد رابے خاں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''ام کو دھمکاتا ہے۔ قانون سے ڈراتا ہے۔ تم بہت دور نکل آیا ہے بچے! یہاں ام خود ہی قانون ہے۔ یہاں وہی ہوتا ہے جو ام چاہتا ہے۔ تمہارے جیسے دس لوگوں کو یہیں پر خلاص کر کے برف میں گاڑ دے تو کوئی ام کو پوچھنے والا نہیں۔ اور اگر تم نے کوئی اڑی مڑی کیا تو ام یہی کرے گا۔''

''لیکن کیوں؟ کیا جرم کیا ہے ہم نے؟''

''تمہارا جرم بہت بڑا ہے اور تم اسے اچھی طرح جانتا بھی ہے۔ تم چوری چھپے بانگڑی کی چوٹی کی طرف جانا چاہتا ہے۔ تم کو مالوم ہوگا کہ سامنے والے راستے سے تم کو چڑھنے نہیں دیا جائے گا۔ اس لیے تم پیچھے کی طرف آیا ہے۔ ام سب جانتا ہے۔ ام گدھے کا بچہ نہیں ہے۔''

ایک دم چلانے کی آواز سنائی دی۔ یہ کرسٹل ہی تھی۔ عادل نے چونک کر خیمے سے باہر دیکھا۔ پاؤندہ عورت نے غالباً غصے میں کرسٹل کے بال نوچے تھے۔ وہ اسے کچھ کھانے کے لیے کہہ رہی تھی مگر وہ انکار کر رہی تھی۔ وہ مسلسل انگلش بول رہی تھی۔ ایک طرح سے اس نے اچھا ہی کیا تھا۔ اس نے ان لوگوں پر یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ انگلش کے علاوہ کچھ نہیں جانتی۔

داخون نے عادل کا جبڑا اپنے ہاتھ میں دبوچا اور پھنکارا۔ ''دیکھ بیٹا! ام نے تمہارے ساتھیوں کو ڈھونڈ تو ویسے بھی لینا ہے، بس تھوڑا سا ٹائم لگے گا ام کو...... لیکن اگر تم خود بتا دے گا تو ام بھی تم سے تھوڑا نرمی کرے گا ورنہ......''

''ورنہ تیری اس فرنگن کا مزہ تو ام ابھی چکھ لے گا تیرے سامنے۔'' رابے خاں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ وہ ان لمحوں میں بالکل بے رحم نظر آنے لگا تھا۔

یہ بات تو اب عادل کی سمجھ میں آ رہی تھی کہ وہ ان لوگوں کو سرسرمد اور ہمایوں سے زیادہ دیر تک دور نہیں رکھ سکتا۔ اب دوسرا راستہ یہی تھا کہ وہ ان سے ایک دو یقین دہانیاں لے کر انہیں کیمپ تک لے جائے۔ عین ممکن تھا کہ سر سرمد اس صورتِ حال سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ وہ کسی طرح کوئی راستہ نکال لیں۔

اب عادل کے ذہن میں رہ رہ کر پچھلے دو دن کی صورتِ حال بھی آ رہی تھی۔ اس نے سرمد صاحب کو کچھ پریشان اور اُلجھا ہوا پایا تھا۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ کیمپ کے آس پاس ہی رہا جائے، زیادہ دور نہ جایا جائے۔ شاید ان کی چھٹی حس جو بہت تیز بھی تھی، انہیں خطرے سے خبردار کر رہی تھی اور یہ خطرہ اب ٹھوس حقیقت کی صورت میں ان کے سامنے

تھا۔ وہ پاؤندوں کے ہتھے چڑھ چکے تھے۔

اچانک کرسٹل ایک بار پھر چلائی۔ عادل نے روزن میں سے دیکھا۔ چپٹی ناک والا داخون کرسٹل کو کھینچتا ہوا خیمے کی طرف لا رہا تھا۔ اس نے کرسٹل کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ کرسٹل نے داخون کے پیٹ میں لات رسید کی اور زور لگا کر خود کو چھڑانا چاہا۔ عقب سے ایک دوسرا شخص آیا۔ اس نے کرسٹل کو عقب سے دبوچا اور اُٹھا کر برف پر پٹخ دیا۔ کھینچا تانی میں کرسٹل کی شرٹ کا گریبان پھٹ گیا تھا اور وہ نیم عریاں ہونے لگی تھی۔ داخون وحشی انداز میں اس پر جھپٹا۔ اندر خیمے میں دراز قد رابے نے اپنی موٹی صدری کے نیچے سے پستول نکال لیا تھا اور عادل کے بال مٹھی میں جکڑ لیے تھے۔ کرسٹل کی وہی حالت ہونے والی تھی جو عقاب کے پنجوں میں چڑیا کی ہوتی ہے۔ عادل زور سے چلایا۔ ''رُک جاؤ...... رُک جاؤ۔ میں بتاتا ہوں۔''

رابے خاں نے ہاتھ کے اشارے سے داخون کو روک دیا۔ دونوں افراد نے نیم عریاں کرسٹل کو پکڑا اور کھینچتے ہوئے خیمے میں لے آئے۔ کرسٹل کی نیکر برف سے لتھڑی ہوئی تھی اور گرنے سے ایک گھٹنے پر تازہ خراشیں آئی تھیں۔ کھینچا تانی میں اس کا ایک جوگر بھی اُتر گیا تھا جو ایک پاؤندے نے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ عادل کو دیکھ کر کرسٹل کو ذرا حوصلہ ہوا۔ وہ اٹک بار لہجے میں بولی۔ ''عادل! تو م'' لیکن پھر یکایک ٹھٹک کر چپ ہو گئی۔ وہ یہاں اردو بولنے کی غلطی نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے انگریزی میں ہی ایک دو فقرے بولے۔ جو مفہوم عادل کی سمجھ میں آیا۔ وہ یہی تھا کہ یہ بہت بُرے لوگ ہیں۔ ان کو سرسرمد کے بارے میں بتا دینا چاہیے۔ شاید وہ ان سے کوئی ڈیل کر سکیں۔

وہ رات جیسے تیسے گزر گئی۔ داخون نے تھوڑی دیر کے لیے عادل کے ہاتھ کھول دیئے اور اسے کھانا کھلایا۔ یہ گوشت اور چاول پر مشتمل تھا۔ ساتھ میں الائچی والا قہوہ تھا۔ عادل کے کہنے پر کرسٹل نے بھی چاولوں کے دو چار لقمے لیے۔ رابے کی بیوی کا نام سمونہ معلوم ہوا۔ اس نے خیمے میں آ کر کرسٹل کے گھٹنے اور کہنیوں کی تھوڑی سی مرہم پٹی کی۔ یہ مرہم پٹی اسی سامان سے کی گئی جو کرسٹل کے ''بیک پیک'' سے برآمد ہوا تھا۔ سرخ ریگزین کے اس ''بیک پیک'' میں کچھ دیگر سامان بھی موجود تھا۔ عادل کو اس نقشے کا خیال آیا جو کرسٹل اپنی نیکر کی پچھلی پاکٹ میں اڑسے پھرتی تھی۔ اس نقشے میں کیمپ کی جگہ کی نشاندہی بڑی وضاحت سے کی گئی تھی۔ اگر وہ نقشہ ان پاؤندوں کے ہاتھ لگتا تو انہیں کیمپ کے بارے میں ان دونوں سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ یقیناً پاؤندوں کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ شاید کرسٹل نے اسے کہیں چھپا دیا تھا۔ جیسا کہ عادل کو بعد میں معلوم ہوا جب وہ یہاں سے قریباً ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر پکڑے گئے تھے تو کرسٹل نے ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ نقشہ پاکٹ سے نکال کر اندھیرے میں پھینک دیا تھا۔

رات گزر گئی۔ ابھی اُجالا پوری طرح پھیلا نہیں تھا کہ رابے خاں اور اس کے دو ساتھی عادل اور کرسٹل کو لے کر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ رابے خاں کے تیسرے ساتھی اور رابے کی بیوی کو اس بندے کے پاس ہی رہنا تھا جسے باندھ کر خیمے کے گوشے میں ڈالا گیا تھا۔ وہ لوگ پیدل روانہ ہوئے۔ عادل کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ہاں کرسٹل کو باندھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ داخون کے پاس چھوٹی نال کی بھری ہوئی رائفل موجود تھی۔ آٹومیٹک رائفل اس نے کندھے سے لٹکا رکھی تھی تاہم اپنا ہاتھ ٹریگر کے آس پاس ہی رکھا ہوا تھا۔

قریباً آدھ پون گھنٹے بعد وہ اس ہزاروں ٹن برف کے پاس سے گزرے جو کل سہ پہر ایوالانچ نے بلندیوں سے لا

کر دامن میں بکھیری تھی۔ اس برف کی وجہ سے عادل اور کرسٹل کا راستہ بند ہوا تھا اور انہیں کیمپ کی مخالف سمت میں سفر کرنا پڑا تھا۔ عادل کا دل اب بے طرح دھڑک رہا تھا۔ کیمپ پر جا کر نہ جانے کیا صورتِ حال پیش آنا تھی۔ وہاں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ پاؤندوں کے پاس اسلحہ موجود تھا اور جہاں تک عادل کا اندازہ تھا، ہمایوں کے سامان میں بھی ایک لائسنس یافتہ پستول موجود تھا۔ یہ پستول یقیناً ذاتی دفاع کے لیے ہی تھا۔ اگر وہاں کوئی خطرناک سچویشن پیدا ہوتی تو سب سے زیادہ رسک کرسٹل اور خود عادل کے لیے ہی تھا۔

کیمپ سے قریباً ایک کلومیٹر پہلے ہی ان کو سر سرمد اور ہمایوں کی جھلک نظر آ گئی۔ جونہی رابے اور عادل ایک تنگ گھاٹی کے سرے سے باہر نکلے، دور نیچے نشیب میں سر سرمد اور ہمایوں کے ہیولے نظر آئے۔ یقیناً وہ ان دونوں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ وہ چونکہ نشیب میں تھے اس لیے رابے خاں اور اس کے ساتھیوں کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ رابے خاں کے ساتھی نے رائفل اب کندھے سے اُتار کر اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس کا سیفٹی کیچ ہٹا لیا۔ برف پوش چٹانوں کے درمیان بڑی احتیاط سے آگے بڑھتے وہ لوگ سر سرمد اور ہمایوں کے کافی قریب پہنچ گئے۔ عادل نے رابے کے پوچھنے پر اسے بتایا کہ اس کے دونوں ساتھیوں کے پاس آتشیں اسلحہ نہیں ہے پھر بھی رابے ''ایزی'' ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے عادل کو مجبور کیا کہ وہ اوٹ سے نکل کر بلندی پر کھڑا ہو اور اپنے ساتھیوں کو آواز دے۔ عادل کے لیے یہ بڑا مشکل اور دل گرفتہ کر دینے والا مرحلہ تھا۔ رابے نے مزید تاکید کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی چالاکی مالا کی نہ دکھانا ورنہ ام گولی چلانے میں دیر نہیں کرے گا۔''

عادل نشیب سے نکل کر بلندی پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے آواز دینے سے پہلے ہی سرمد صاحب نے اسے دیکھ لیا۔ سرمد صاحب اور ہمایوں دونوں بُری طرح چونک گئے۔

شاید انہیں ٹھیک سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ ''کون ہے؟'' انہوں نے تصدیق کے لیے بلند آواز میں پوچھا۔

''میں ہوں سر...... عادل۔'' عادل نے بھی پکار کر جواب دیا۔

وہ دونوں تقریباً دوڑنے والے انداز میں عادل کی طرف آئے۔ یکا یک سرمد صاحب رُک گئے۔ شاید انہیں کسی گڑبڑ کا احساس ہوا تھا لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ وہ دونوں داخون کی رائفل کی رینج میں تھے۔ رابے خاں اور اس کے ساتھی ایک ساتھ نشیب سے نکلے اور سامنے آ گئے۔ ''خبردار! کوئی حرکت کیا تو ام گولی چلا دے گا۔'' داخون نے گرج کر کہا۔

سرمد صاحب اور ہمایوں ہکا بکا کھڑے تھے۔ ان کی ساری خوشی چند سیکنڈ کے اندر شدید پریشانی میں ڈھل گئی تھی۔ عادل کے سینے میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

پاؤندوں نے انہیں گھیرے میں لے لیا اور انہیں ہاتھ کھڑے کرنے کے لیے کہا۔ بڑی احتیاط سے ان کی تلاشی لی گئی۔ سرمد صاحب کے لباس میں سے ایک واکی ٹاکی کے علاوہ ایک نقشہ اور چند سو روپے کی کرنسی نکلی ایک واکی ٹاکی ہمایوں کے لباس میں سے بھی نکلا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک کولٹ پستول بھی برآمد ہوا۔ پستول کی برآمدگی کے بعد رابے خاں نے کھا جانے والی نظروں سے عادل کو گھورا۔

عادل ہی کی طرح سرمد صاحب اور ہمایوں کے ہاتھ بھی پشت پر باندھ دیئے گئے تھے۔ اس کام کے لیے نائلون کی

رسیاں پہلے سے ان لوگوں کے پاس موجود تھیں۔ وہ لوگ انہیں چلا کر کیمپ میں لے آئے۔ عادل نے دیکھا، سرمد صاحب کا چہرہ یوں تو پُرسکون تھا لیکن آنکھوں میں گہری پریشانی منجمد تھی۔ عادل خود کو بہت خجل سا محسوس کر رہا تھا۔ درحقیقت یہ جو کچھ بھی ہوا، اسی کی وجہ سے ہوا تھا۔

اگلے دس پندرہ منٹ بڑے تکلیف دہ تھے۔ ان لوگوں نے کرسٹل اور سرمد صاحب سمیت ان چاروں کو ایک طرف زمین پر بٹھا دیا۔ داخون رائفل بدست ان کے سر پر کھڑا ہو گیا۔ باقی افراد ندیدوں کی طرح ان کے کیمپ میں گھس گئے۔ جس کے ہاتھ جو آیا اس نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کھانے پینے والی چیزوں پر بھی ہاتھ صاف کر رہے تھے۔ کھاتے جا رہے تھے اور ساتھ ساتھ تھیلوں میں بھی ٹھونس رہے تھے۔ ٹن فوڈ اور چاکلیٹس ان کے لیے زیادہ کشش کی چیز تھے۔ تیسری اہم چیز کرنسی تھی۔ پھر رابے خاں کے ہاتھ میں ایک نقشہ آ گیا۔ وہ دھیان سے اسے دیکھنے لگا۔ اس نقشے پر ہمایوں نے مختلف نشانات لگا رکھے تھے۔ ان نشانات سے یہ واضح ہوتا تھا کہ وہ کس راستے سے کس چوٹی پر جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یعنی وہی ''بانگڑی'' نامی چوٹی۔

رابے خاں نے نقشہ عادل کی آنکھوں کے سامنے لہرایا اور زہر خند لہجے میں بولا۔ ''کیا تم اب بھی یہی کہے گا کہ صرف سیر سپاٹے کے لیے یہاں گھوم رہا تھا۔''

عادل بولا۔ ''یہ نقشہ ویسے ہی ہمارے سامان میں پڑا ہے۔ اس طرف جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔''

''چور اپنی چوری کبھی نہیں مانتا۔ تم بھی نہیں مانے گا لیکن اس کو اس سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں۔ امارے لیے خوشی کا بات ہے کہ تمہارے ساتھ امارا ملاقات ہو گیا۔''

''یہ کیسی خوشی کی بات ہے کہ اس کے لیے تمہیں ہم پر رائفل تاننے کی ضرورت پڑی ہوئی ہے۔'' سرمد صاحب نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا۔

رابے خاں نے داخون کو ہاتھ کا اشارہ کیا اور بولا۔ ''رائفل نیچے کر لو۔ یہ ٹھیک کہہ رہا ہے، یہ امارا مہمان ہے...... بلکہ پکا مہمان ہے۔''

رابے خاں نے ''پکا مہمان'' عجیب سے انداز میں کہا تھا۔ عادل چونک گیا اور اس نے ہمایوں کو بھی چونکا ہوا محسوس کیا۔ داخون نے رمزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے رائفل نیچے کر لی۔ اس سے کوئی ایسا فرق بھی پڑنے والا نہیں تھا۔ ان کے ہاتھ تو بندھے ہوئے تھے۔

اب یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ یہ لوگ ان کو پکڑ کر پہاڑ کی دوسری طرف اپنی پاؤندہ بستی میں لے جانا چاہتے ہیں۔ یقیناً ان لوگوں کی ہمتیں اب بہت بڑھ چکی تھیں۔ پہلے وہ چوٹی کی طرف جانے والوں کو صرف روکتے ہوں گے، اب پکڑنے کی ہمت بھی رکھتے تھے۔ کرسٹل نے دبے لفظوں اور دھیمی آواز میں سرمد صاحب کو بتا دیا تھا کہ کس طرح کل سہ پہر وہ جاگنگ کرتے ہوئے ذرا آگے نکل گئے اور کیسے ایوالانچ کی وجہ سے انہیں راستہ بدلنا پڑا جس کا نتیجہ پاؤندوں سے مڈبھیڑ کی صورت میں نکل آیا۔

سرمد صاحب جس طرح جسمانی تکلیف برداشت کرنے کا بے پناہ حوصلہ رکھتے تھے، اسی طرح غالباً ذہنی دباؤ اور پریشانی کو بھی جھیل لیتے تھے۔ ان کا چہرہ بدستور پُرسکون رہا۔ ہاں آنکھوں میں اب بھی تفکر کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ وہ

جیسے تیزی سے کچھ سوچ رہے تھے۔

انہوں نے بلند آواز میں رابے خاں کو مخاطب کیا اور بولے۔ ''میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''یہاں کوئی پردہ نہیں ہے برادر! تم سب کے سامنے اپنی الف لیلہ کہہ سکتا ہے۔'' وہ سخت تمسخر کے لہجے میں بولا۔

''میرے خیال میں اکیلے میں بات کرنا زیادہ اچھا رہے گا۔''

ساڑھے چھ فٹ قد کا رابے خاں کچھ دیر گہری نظروں سے سرمد صاحب کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے بھاڑ جیسے منہ میں خشک گوشت کا نوالہ تھا۔ نوالے کو اپنے منہ میں گھماتے ہوئے بولا۔ ''اچھا اگر ایسا ہے تو کر لو اکیلے میں بات۔ آ جاؤ۔''

سرمد صاحب کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے تھے۔ وہ اُٹھ کر خیمے میں چلے گئے۔ رابے خاں بھی ان کے ساتھ گیا۔ وہ وہاں قریباً ایک گھنٹہ مصروفِ گفتگو رہے۔ اس دوران میں ایک دو بار رابے خاں باہر بھی آیا اور اس نے داخون سے سرگوشیوں میں کوئی مشورہ بھی کیا۔ پھر ایک بار انہوں نے خیمے کے اندر نقشہ بھی منگوایا۔ رابے خاں کے تاثرات بھی اب کچھ بدلے ہوئے نظر آتے تھے۔ بہرحال داخون مسلسل ان کے سروں پر رائفل بدست موجود تھا۔ وہ گاہے بگاہے کرسٹل کو بھی حریص نظروں سے گھور لیتا تھا۔ کرسٹل بدستور رات والے لباس میں تھی۔ چمکیلی دھوپ میں اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور یوں لگتا تھا کہ ابھی رُخساروں سے خون ٹپک پڑے گا۔ عادل کو اندازہ ہوا کہ خیمے کے اندر رابے خاں نے سرمد صاحب کے ہاتھ کھول دیئے ہیں اور وہ زیادہ بے تکلفی کے ماحول میں گفتگو کر رہے ہیں۔

دوپہر کوئی گیارہ بجے قریب رابے خاں اور سرمد صاحب کی گفتگو اختتام کو پہنچی۔ عادل نے دیکھا کہ اس کے فوراً بعد رابے خاں کہیں جانے کے لیے تیار نظر آنے لگا۔ اس کے باقی دونوں ساتھی جن میں سے ایک داخون تھا، وہیں پر رہے۔

عادل نے سرمد صاحب سے کہا۔ ''یہ رابے خاں کہاں گیا ہے؟''

''اپنے کسی کام سے۔ ایک دو گھنٹے میں واپس آ جائے گا۔''

عادل نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''سر! مجھے اس داخون کی طرف سے خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں کمینگی ہے۔ کہیں یہ کرسٹل کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے۔''

''نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ رابے خاں سے ساری بات ہو گئی ہے۔''

کرسٹل نے پوچھا۔ ''کیا یہ ہام کو جانے دیں گا؟''

کرسٹل کو بولتے دیکھ کر داخون بھڑک اُٹھا۔ گرج کر بولا۔ ''او میم! اپنا آواز بند کرو۔ سب چپ ہو جاؤ۔ ورنہ امارا میٹر گھوم جائے گا۔''

وہ سب چپ ہو گئے۔

رابے خاں کی واپسی کافی تاخیر سے ہوئی۔ وہ قریباً چار بجے واپس آیا۔ اس کے ساتھ اس کی جواں سال بیوی بھی تھی جس کا نام سمونہ معلوم ہوا تھا۔ وہ اور رابے خاں اپنے ساتھ دونوں خیمے بھی لے آئے تھے۔ یہ خیمے پیک ہونے کے بعد بالکل مختصر سے ہو جاتے تھے۔ عادل کو اندازہ ہوا کہ وہاں خیمے میں موجود بندھے ہوئے شخص کو بستی کی طرف روانہ کر دیا گیا ہے اور رابے بیوی کو لے کر یہاں آ گیا ہے۔

شام تک خیمے لگا دیئے گئے۔ موسم اتنا اچھا نہیں تھا اس لیے کھانا کھانے کے فوراً بعد وہ لوگ خیموں میں چلے گئے۔ جانے سے پہلے رابے خاں نے سرمد صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''یہ انگریز چھوکری امارے ساتھ رہے گا، امارا بیوی کے پاس۔ امارے پاس کوئی ضمانت تو ہونا چاہیے نا۔''

سرمد صاحب بولے۔ ''میرے خیال میں اس کی کوئی ضرورت نہیں لیکن اگر تم سمجھتے ہو کہ ضرورت ہے تو پھر ہم میں سے کوئی تمہارے خیمے میں چلا جاتا ہے۔''

تھوڑی سی گفت و شنید کے بعد ہمایوں ان کے ساتھ چلا گیا۔ خیمے میں اب سرمد صاحب، کرسٹل اور عادل رہ گئے۔ سرمد صاحب اور کرسٹل کے ہاتھ تو پہلے ہی کھلے ہوئے تھے، اب عادل کے بھی کھول دیئے گئے۔ رابے خاں نے اچھی طرح تسلی کر لی تھی کہ خیمے میں کوئی ایسی شے موجود نہیں تھی جسے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ اس ساری احتیاط کے باوجود ایک مسلح شخص خیمے سے باہر پہرے پر موجود تھا۔

وہ سب بہت تھکے ہوئے تھے۔ نو دس بجے کے قریب ہی سونے کے لیے لیٹ گئے۔ باہر برفانی ہوا کا زور تھا اور خیمہ ہوا کے بہاؤ سے ہلتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ کرسٹل، عادل اور سرمد صاحب بہت دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مسلح پہریدار خیمے کے بالکل قریب موجود ہے اور ان کی آواز سن سکتا ہے۔

سب سے پہلے تو عادل نے اپنی غلطی پر سرمد صاحب سے معافی مانگی، وہ بولا۔ ''سر! میں بہت زیادہ شرمندہ ہوں۔ میں نے سب کو مصیبت میں ڈالا ہے۔''

''جو ہونا ہوتا ہے، وہ ہو کر رہتا ہے عادل! تمہیں احساس ہو گیا، یہی بڑی بات ہے۔ اب ہمیں یہ سب بھول کر آگے کا سوچنا ہے۔''

''لیکن سر! میری وجہ سے سب پر اتنی بڑی مصیبت تو آئی نا۔''

''مصیبتیں اور مشکلات تو زندگی کا حصہ ہوتی ہیں بلکہ میرا تو خیال ہے کہ راحتوں اور خوشیوں کی طرح یہ بھی زندگی کا حسن ہیں۔ ان مشکلات کے اندر سے ہی تو خوشی کے سوتے پھوٹتے ہیں دُکھ نہیں تو سکھ نہیں۔ بس اوپر والے سے دُکھ جھیلنے کا حوصلہ مانگنا چاہیے۔ اور ایک بات یاد رکھو، کوئی مصیبت چھوٹی یا بڑی نہیں ہوتی، بس انسان کا حوصلہ چھوٹا یا بڑا ہوتا ہے۔ بڑا حوصلہ ہر مصیبت کو چھوٹا کر دیتا ہے اور چھوٹا، ہر مصیبت کو بڑا۔'' وہ فلسفیانہ انداز میں بولتے تھے اور ان کی بات دل پر اثر کرتی تھی۔

کرسٹل نے ایک ''رک سیک'' سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ مدھم آواز میں بولی۔ ''سر! آپ کچھ بتانا لائیک کریں گے۔ اس رابے خاں سے کیا ڈیل ہوا؟ یہ تو ہام سب کو ادھر اپنے ولیج میں لے جانا مانگتا تھا۔''

''نہیں، اب اس نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔'' سرمد صاحب نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''اب یہ لوگ ہمارے ساتھ جائیں گے، بانگڑی چوٹی پر۔''

عادل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے سر آپ نے انہیں کھنڈر کے تہ خانے کے بارے میں اور زیورات کے بارے میں بتا دیا ہے؟''

''ہاں، کچھ کچھ...... اگر سارا بتا دیتے تو پھر تو ہم شاید کسی کام کے ہی نہ رہتے۔ وہ خود ہی چوٹی کا رُخ کر لیتے۔''

''لیکن سر! بعد کی بھی کیا گارنٹی ہے...... اگر وہ زیورات مل جاتے ہیں تو پھر کیا ہوگا؟''

''ایسے معاملوں میں رسک تو پھر لینا ہی پڑتا ہے عادل! بہرحال رابے خاں سے کچھ باتیں طے ہوئی ہیں اور ان کے مطابق وہ ہمیں تمام اشیاء میں سے معقول حصہ دیں گے۔ ہمارا سامان بھی واپس کریں گے اور ہمیں محفوظ علاقے تک چھوڑ کر بھی آئیں گے۔ اس کے بدلے میں انہیں اس خاص مقام تک پہنچاؤں گا جہاں زیورات اور برتن محفوظ کیے گئے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے سر آپ نے انہیں چوٹی کا تو بتایا ہے لیکن تہ خانے وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟''

''ہاں، ایسا ہی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ہم اب آسان راستے سے چوٹی کی طرف جائیں گے؟'' عادل نے دریافت کیا۔

''نہیں، راستہ تو یہی رہے گا۔ رابے خاں اور اس کے ساتھیوں نے یہ سارا معاملہ بس اپنے تک ہی رکھا ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ پاؤندہ بستی کے باقی لوگوں کو کچھ نہیں بتایا گیا؟''

''نہیں، ایک طرح سے رابے خاں نے اپنے لوگوں سے دغا کیا ہے لیکن ہمارے لیے تو یہ فائدہ مند ہی ہے۔ اگر ہمیں بستی میں پہنچا دیا جاتا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔''

''کیا ایسا ہو سکتا ہے سر کہ ہم موقع دیکھ کر ان سے اسلحہ چھیننے کی کوشش کریں یہ چار لوگ ہیں اور چار ہی ہم ہیں۔''

''میرے خیال میں یہ خطرناک ہوگا۔ یہ لوگ لڑائی بھڑائی کے ماہر ہوتے ہیں اور بڑی حد تک خونخوار بھی ہیں۔ اس کے علاوہ میرا اندازہ یہ ہے کہ یہ تعداد میں بھی چار نہیں رہیں گے۔ ابھی کچھ دیر میں یا صبح تک ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی شامل ہو جائیں گے۔ یہ نئے آنے والے بھی رابے خاں کے قریبی ساتھیوں میں سے ہیں...... قریبی بھی اور ہمراز بھی۔''

باہر سے داخون کی کرخت آواز اُبھری۔ ''اوئے خدائی خوار! یہ تم نے کیا بھڑ بھڑ لگا رکھا ہے۔ یہاں تمہاری والدہ کا مہندی نہیں ہے۔ سو جاؤ چپ کر کے۔''

عادل کا خون کھول کر رہ گیا۔ اس کا جی چاہا ہر اندیشے کو بالائے طاق رکھ کر خیمے سے نکلے اور چپٹی ناک والے اس داخون کی ناک کو بالکل ہی برابر کر ڈالے۔ یہ بندہ اسے زہر لگنے لگا تھا۔ خاص طور سے اس نے جس طرح سب کے سامنے کرسٹل کے کپڑے پھاڑنے کی کوشش کی تھی، عادل کے دل میں گرہ سی بیٹھ گئی تھی۔

سرمد صاحب نے ان دونوں کو اشارہ کیا کہ وہ خاموش ہو جائیں اور لیٹ جائیں۔ سرمد صاحب نے خیمے کی چھت سے لٹکتی ہوئی ''ٹینٹ لالٹین'' کی روشنی بہت دھیمی کر دی۔ سرمد صاحب بائیں جانب لیٹے تھے، کرسٹل دائیں جانب عادل ایسے لیٹا تھا کہ اس کا سر سرمد صاحب کے پاؤں کی طرف تھا اور پاؤں کرسٹل کی طرف۔

سرمد صاحب جلد ہی سو گئے مگر عادل جاگ رہا تھا۔ کرسٹل نے کروٹ بدلی اور اپنے ریشمی بالوں کو اس طرح پھینکا کہ عادل کے پاؤں پر پھسل گئے۔ شاید وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہی تھی۔ عادل نے اپنے پاؤں سمیٹ لیے اور انہیں کرسٹل کے سنہری مائل بالوں سے کچھ دور ہٹا لیا۔ کچھ دیر بعد کرسٹل نے اپنا ہاتھ اس کی پنڈلی پر رکھ دیا اور آہستہ آہستہ اس پر انگلی چلانے لگی۔ وہ اپنی دلچسپی اور لگاؤ کے واضح اشارے دے رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ نیم تاریکی میں ایک بھرپور انگڑائی لی پھر اپنی پاکٹ میں سے چیونگم نکال کر چبانے لگی۔ ''عاڈل! اگر توم کہے تو ہام تمہارا لوتیں دبا سکتا ہیں۔'' وہ سرگوشی میں بولی۔

''لوتیں؟ یہ کیا ہوتا ہے؟'' عادل سٹپٹایا۔

''Legs'' اس نے ٹانگوں کی طرف اشارہ کیا۔

وہ اپنی طرف سے لاتیں کہہ رہی تھی۔ ''نو تھینک یو۔'' عادل نے بُرا سا منہ بنا کر سرگوشی کی۔ ''ہم لوگ عورتوں سے خدمت نہیں کراتے۔''

''لیکن عاڈل! توم نے بھی تو ہام کے لیے اتنا کچھ کیا۔ ہام کی انسلٹ پر توم نے رابے خاں کے لوگوں پر اٹیک کیا۔ ان کو حیران کیا۔ یو آر اے بریو مین۔''

عادل نے کن اکھیوں سے سرمد صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ سو رہے تھے لیکن کسی بھی وقت جاگ سکتے تھے۔ عادل نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کرسٹل کے سامنے ہاتھ جوڑے اور سرگوشی کی۔ ''فار گاڈ سیک...... مجھے معاف کر دو۔ آئندہ میں ایسی حرکت نہیں کروں گا۔''

''آئی نو ویل، توم ضرور کریں گا۔ توم بہادر پاکستانی...... ہام کا فادر بتاتا توم نے 65ء کی وار میں انڈیا کو مارا۔ اس کا حلاوا بنا دیا۔''

اس کی بات پر عادل نے سوچا اور اس کے بعد ہمارے سیاستدانوں نے ہمارا ''حلاوا'' بنا دیا لیکن وہ یہ بات کرسٹل سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس نے توبہ شکن نظروں سے عادل کو دیکھا۔ ''ہام بہت اچھا فزیوتھراپسٹ۔ توم کو جب بھی امارا ضرورت ہو ہام کو ضرور بتاؤ۔''

''ٹھیک ہے۔'' عادل نے کہا اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

پتا نہیں کیا بات تھی جب بھی کرسٹل کوئی ایسی ویسی بات کرتی تھی، عادل کے ذہن میں فوراً شہزادی کا خیال آ جاتا تھا۔ شہزادی جیسے اپنے بازو پھیلا کر اس انگلش لڑکی اور عادل کے درمیان کھڑی ہو جاتی تھی اور وہ اکیلی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ لالی گاؤں کے سارے سنہرے کھیت آتے تھے، سارے جانے پہچانے درخت، ساری پگڈنڈیاں، پرندوں کی ساری چہکاریں، نیم گرم ہواؤں کی ساری مہکار۔ آج بھی عادل نے اپنی آنکھیں بند کیں تو وہ اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ مجھے بھول تو نہیں گئے عادل! میں دن رات تمہارا انتظار کر رہی ہوں تمہاری کامیابیوں کے لیے دعائیں مانگ رہی ہوں۔ یاد رکھنا، میری نگاہیں آخری دم تک تمہارا راستہ دیکھیں گی...... اور اگر...... مجھے چودھری ناصر یا کسی اور کی ڈولی میں بیٹھنا پڑ گیا تو میں تمہارا نام لے کر موت کو گلے لگا لوں گی۔ وہ خیالوں میں بولا ''نہیں شہزادی! ایسا نہیں ہو گا۔ میں اپنی جان پر کھیل کر بھی اپنا وعدہ نبھاؤں گا۔ اگر کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ تم کو پیسے میں تولا جائے تو میں تمہیں پیسے میں تول کر اپنا بنا لوں گا۔ میں غریب ضرور ہوں لیکن تمہاری محبت نے میرے بازوؤں میں وہ توانائی بھر دی ہے جو پتھروں کا سینہ چیر کر ان میں سے دودھ کی نہر نکالتی ہے اور میں یہ کر کے دکھاؤں گا۔ بس تم ہمت نہ ہارنا۔ میرا انتظار کرنا...... ہاں میرا انتظار کرنا...... اور ماں کو بھی حوصلہ دینا۔'' لیٹے لیٹے جب کافی دیر تک عادل کو نیند نہیں آئی تو اس نے باہر کی آوازوں کی سن گن لینی شروع کر دی۔ اس الاؤ کی لکڑیاں ابھی تک چٹخ رہی تھیں جس کے قریب داخون رائفل

بدست بیٹھا ہوا تھا۔ دوسرے خیموں سے کوئی آواز برآمد نہیں ہو رہی تھی۔ یقیناً تھکے ماندے افراد سو گئے تھے۔ عادل کے اپنے خیمے میں بھی کرسٹل اور سرمد صاحب دونوں سوئے ہوئے تھے۔ عادل نے یونہی خیمے کی زپ تھوڑی سی نیچے گرائی۔ دو انچ کے خلا میں وہ داخون کو دیکھنے کے قابل ہو گیا۔ الاؤ کی روشنی میں اس کا بس ایک پہلو نظر آ رہا تھا۔ وہ بڑے خیمے کے بالکل پہلو میں تھا اس لیے ہوا کی کاٹ سے بالکل محفوظ تھا۔ اس کے قریب ہی عادل کو وہسکی کی کوارٹر بوتل نظر آئی۔ کوئی انگلش برانڈ تھا۔ غالباً یہ شراب بھی لوٹ مار کی ان اشیا میں سے تھی جو یہ لوگ کوہ پیما پارٹیوں کے ساتھ کرتے رہتے تھے۔

عادلؔ کے دل میں ایک عجیب سا خیال آیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ابھی سرمد صاحب نے بتایا تھا کہ رابے خاں کے کچھ اور ساتھی بھی یہاں پہنچنے والے ہیں۔ وہ آج رات یا کل صبح کسی بھی وقت قدم رنجہ فرما سکتے تھے۔ اگر وہ پہنچ جاتے تو پھر عادل اور اس کے ساتھیوں نے مزید ''بے دست و پا'' ہو جانا تھا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کے پہنچنے سے پہلے پہلے وہ رابے خاں وغیرہ سے چھٹکارے کی ایک کوشش کر لیں؟ یہ بڑا مناسب موقع تھا اور اگر واقعی وہ کچھ کرنا چاہتے تھے تو پھر شاید اس سے بہتر چانس بعد میں نہیں مل سکتا تھا۔

داخون اس سے قریباً پچیس فٹ کے فاصلے پر موجود تھا۔ یقیناً اس نے زیادہ نہیں پی تھی لیکن جتنی بھی پی تھی، اس نے اسے تھوڑا سا غنودہ کر رکھا تھا۔ اگر عادل خیمے سے باہر رینگ جاتا اور تاریکی میں خاموشی سے آگے بڑھ کر اور آخری آٹھ دس قدم کا فاصلہ بھاگ کر طے کرتا ہوا داخون پر جا پڑتا تو اسے رائفل چھیننے میں ایک سیکنڈ بھی نہ لگتا۔ داخون کی ٹانگ وغیرہ پر گولی مار کر وہ اس خیمے کی طرف لپک سکتا تھا جہاں رابے اور اس کی بیوی وغیرہ موجود تھے۔ ان کے اُٹھنے سے پہلے ان پر رائفل تان کر بے بس کرنا زیادہ مشکل ثابت نہ ہوتا۔ یقیناً انہیں جاگتے جاگتے بھی آٹھ دس سیکنڈ تو لگ ہی جانا تھے۔

عادل نے سارا حساب کتاب لگایا اور اس کے جسم میں میٹھا میٹھا جوش لہر لینے لگا۔ وہ حالات سے گھبرانے والا نہیں تھا اور اس داخون کے لیے تو وہ خاص طور سے نفرت محسوس کر رہا تھا۔

عادل جانتا تھا کہ اگر اس نے سرمد صاحب سے اس کارروائی کی اجازت لینے کی کوشش کی تو وہ ہرگز نہیں دی گے۔ اگر اسے کچھ کرنا تھا تو اپنے طور پر ہی کرنا تھا لیکن اگر خدانخواستہ وہ کسی وجہ سے ناکام ہو جاتا تو پھر؟ ایسی صورت میں مصیبت تو سب پر ہی آنی تھی اور یہ پہلی مصیبت نہ ہوتی بلکہ دوسری ہوتی۔ اس سے پہلے بھی جو صورتِ حال تھی وہ عادل کی ہی تو پیدا کی ہوئی تھی۔

اس نے ایک بار پھر سارا حساب کتاب جوڑا۔ تاریکی کو دیکھا۔ فاصلے کو بھانپا، اپنے اندر کی توانائی کو جانچا اور اس کے دل نے گواہی دی کہ وہ یہ کر سکتا ہے۔ رسک تو بے شک تھا لیکن ابھی کچھ دیر پہلے سرمد صاحب نے خود ہی تو کہا تھا کہ رسک کبھی کبھی لینا پڑتا ہے اور یہی رسک کامیابی کا دروازہ بنتا ہے۔

قریباً پانچ منٹ بعد عادل نے آہستہ سے خیمے کی ڈبل زپ کھولی اور پھر باہر کی یخ بستہ سردی میں رینگ گیا۔ اس کا دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اپنی ذمے داری پر ایک بہت بڑا کام کرنے جا رہا ہے۔ وہ برفیلی زمین پر اوندھا لیٹا دھیرے دھیرے آگے کھسکنے لگا۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتا گیا، اس کا حوصلہ بھی بڑھتا گیا۔ داخون اسی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ شعلے اس کے تمتمائے چہرے پر منعکس ہو رہے تھے۔ گوشت کی نچی ہوئی ہڈیاں اس کے آس

پاس پڑی تھیں۔ بالآخر عادل اس فاصلے تک پہنچ گیا جہاں سے وہ بھاگ کر داخون پر حملہ آور ہو سکتا تھا۔ ان لمحوں میں وہ اسے ''نوری نت'' ہی لگا اور اس نے اپنے اندر وہی توانائی محسوس کی جو نوری نت جیسے لوگوں کو زیر کرنے کے لیے درکار ہوتی ہے..... وہ اُٹھا اور کسی شکاری جانور کی طرح داخون پر جا پڑا۔ اس نے سب سے پہلے داخون کی رائفل پر ہی گرفت بنائی۔

داخون اس کے نیچے تھا ''اوئے خنزیر کی اولاد'' داخون پھنکارا اور عادل کو ٹانگوں سے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی۔

عادل نے دو تباہ کن ٹکریں داخون کے چہرے پر لگائیں اور ایک جھٹکا دے کر رائفل اس کے ہاتھ سے نکال لی۔ رائفل نوے فیصد تک اس کے ہاتھ سے نکل گئی لیکن دستے پر داخون کی تھوڑی سی گرفت موجود رہی۔ اس سے پہلے کہ عادل دوسرا جھٹکا دے کر رائفل آزاد کرا لیتا۔ داخون کا وار چل گیا۔ اس نے عادل کی ٹانگوں کے درمیان اپنے بوٹ کی ضرب لگائی اور تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ عادل سراپا قہر بن گیا تھا۔ اس نے گھٹنے کی ایک شدید ضرب داخون کی ناف میں رسید کی اور پھر ایک برق پاش گھونسے سے اسے پیچھے اُلٹا دیا۔

اب رائفل اس کے ہاتھ سے نکل جانی چاہیے تھی لیکن اس منحوس نے پھر بھی کسی نہ کسی طرح رائفل پر گرفت بنائے رکھی۔ عادل نے اسے دیوانہ وار جھٹکے دیئے اور اسے رائفل سمیت گھسیٹتا ہوا کئی قدم آگے لے گیا۔ شدید ترین ضربیں کھانے کے باوجود وہ بدبخت جیسے رائفل سے چپک کر رہ گیا تھا۔ عادل کو اس کی امید ہرگز نہیں تھی۔ ساری ٹائمنگ خراب ہو چکی تھی۔ عادل نے دیکھا رابے خاں کے خیمے میں ہلچل ہوئی پھر دیو ہیکل رابے خاں کسی بگولے کی طرح باہر آیا۔

''کون ہے..... خبردار۔'' وہ چنگھاڑا۔

عادل والے خیمے سے بھی کوئی باہر نکل آیا تھا۔ عادل کو پہچاننے کے بعد رابے خاں نے بے دریغ اس پر پسٹل کا فائر کیا۔ گولی عادل کے سر پر سے گزرتی ہوئی عقب میں سرمد صاحب کو لگی۔ وہ لڑکھڑا کر پہلو کے بل گرے۔ اس کے ساتھ ہی کرسٹل کے چلّانے کی دل دوز آواز آئی۔ رابے دوسری گولی چلاتا تو وہ یقیناً عادل کو لگتی لیکن اس نے دوسرا فائر نہیں کیا اور ویسے ہی عادل پر جھپٹا۔ اس کے ایک ساتھی نے دائیں سے عادل پر حملہ کیا۔ عادل نے اس کے سینے پر ٹانگ رسید کر کے اسے دور پھینک دیا۔ تاہم اسی دوران میں رابے خاں نے پستول کا آہنی دستہ گھما کر عادل کے سر کے پچھلے حصے پر مارا۔ یہ چوٹ تقریباً وہیں لگی تھی جہاں کل شام اُلٹی کلہاڑی کی چوٹ آئی تھی۔ عادل گھٹنوں کے بل گرا، داخون کی رائفل پر عادل کی گرفت اب بھی موجود تھی مگر اب اس گرفت میں زیادہ دم خم نہیں رہا تھا۔ تین افراد عادل سے لپٹ گئے اور اسے بُری طرح پیٹنے لگے۔ عادل نے خود کو بے رحم ٹھوکروں اور گھونسوں کی زد میں پایا۔ تب عادل نے رابے کی بیوی سمونہ کو دیکھا۔ وہ کسی چڑیل کی طرح چلاتی ہوئی کرسٹل پر جھپٹی اور اسے مارنے لگی۔ کرسٹل بھی کوئی چھوٹی موٹی نہیں تھی۔ اس نے سمونہ کی مزاحمت کی۔ مگر جب پاؤں پھسل جانے کی وجہ سے کرسٹل کا سر ایک پتھر میں لگا تو سمونہ اس پر غالب آ گئی وہ چنگھاڑ رہی تھی۔ ''زندہ نہیں چھوڑوں گی..... حرامزادی..... فرنگن۔''

عادل کو اپنی چوٹیں تقریباً بھول گئی تھیں۔ ٹھوکروں اور گھونسوں کی برسات کے دوران بھی وہ سرمد صاحب ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ الاؤ کے بالکل قریب گرے تھے اور ان کے جسم سے بہنے والا خون سفید برف پر صاف دکھائی دے

رہا تھا۔ گالیاں بکتے ہوئے پاؤندوں نے عادل کو اُلٹا کیا اور اس کے ہاتھ بے رحمی سے پشت پر باندھ دیئے۔ عادل کے سینے میں آگ سی بھڑک رہی تھی۔ وہ پاؤندوں کے ہاتھوں میں مچل مچل جا رہا تھا اور دھاڑ رہا تھا۔ ''میں جان لے لوں گا۔ میں ماردوں گا۔ سرمد صاحب! سرمد صاحب۔'' وہ بے قرار ہوکر پکارنے لگا۔

تب اسے اندازہ ہوا کہ گولی سرمد صاحب کے سینے پر نہیں بلکہ بائیں کندھے کے قریب لگی ہے۔ وہ اُٹھ بیٹھے تھے اور انہوں نے دائیں ہاتھ سے بایاں کندھا دبا رکھا تھا اور یہی وقت تھا، جب عادل کو یہ بھی پتا چلا کہ وہ پوری کوشش کے باوجود داخون سے رائفل کیوں نہیں چھین سکا۔ ٹارچوں کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ خبیث نے چمڑے کے ایک چوڑے تسمے کے ساتھ رائفل کے دستے کو اپنی کلائی سے باندھ رکھا ہے، ہتھیار کی حفاظت کے لیے اس طرح کا انتظام عادل نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ حیران رہ گیا۔

دو افراد نے عادل کو اُٹھا کر خیمے میں پٹخ دیا۔ رابے خاں نے اب کرسٹل اور سمونہ کو بھی ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا تھا۔ کرسٹل کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور نچلا ہونٹ بھی پھٹ گیا تھا۔ سمونہ اسے آتشیں نظروں سے دیکھ رہی تھی اور مسلسل گالیاں دے رہی تھی۔

اعشاریہ تین آٹھ کے پستول کی گولی سرمد صاحب کے کندھے سے ذرا نیچے بازو کے گوشت میں گھسی تھی اور اندر ہی تھی۔ ان کے چہرے پر تکلیف کے آثار تو تھے لیکن اس سے زیادہ پریشانی کے آثار تھے۔ عادل اپنے آپ کو بے حد شرمندہ اور قصوروار محسوس کر رہا تھا اور واقعی ایسا ہی تھا۔ یہ دوسری بار تھا کہ عادل کی وجہ سے اس کے ساتھی سخت مصیبت میں پڑے تھے۔ بے شک اس نے ابھی جو کیا پوری نیک نیتی سے کیا اور سمجھ بُوجھ حوصلے کا ثبوت بھی دیا مگر جو نتیجہ نکلا، وہ بالکل مختلف تھا۔

ہمایوں ابھی تک دوسرے خیمے میں تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ اسے باہر کی صورتِ حال کی پوری خبر نہیں۔ بہرحال گولی چلنے کی آواز تو یقیناً اس نے بھی سن لی تھی۔ اب سب سے اہم مسئلہ سرمد صاحب کے زخمی بازو کا تھا۔ خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ رابے خان نے شکاری چاقو کی مدد سے ان کی قمیص کندھے پر سے پھاڑ دی۔ یقیناً سرمد صاحب سخت تکلیف میں تھے۔ ان کی پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا تھا۔ اس کے باوجود ان کے چہرے پر اذیت کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ نہ ہی عادل نے ان کی کراہ سنی تھی۔

''تمہارا گولی نکالنا بہت ضروری ہے۔ کیا تمہارے پاس کوئی اس طرح کا سامان ہے۔'' رابے خاں نے سرمد صاحب سے پوچھا۔

سرمد صاحب نے کرسٹل کو اشارہ کیا۔ سمونہ سے مارا ماری کے دوران میں کرسٹل کے منہ سے خون رسنے لگا تھا اور ایک کہنی بھی بُری طرح چھل گئی تھی۔ وہ اُٹھی اور خیمے کے گوشے میں پہنچی۔ ان کے سامان کا بیشتر حصہ تو پاؤندوں کے قبضے میں جا چکا تھا۔ تاہم کچھ چیزیں انہوں نے بے قیمت جان کر چھوڑ دی تھیں۔ ان میں سے ہی ایک نیلے بیگ میں فرسٹ ایڈ کا سامان موجود تھا۔ اس کے علاوہ میڈیسنز، چھوٹی موٹی جراحی میں استعمال ہونے والی اشیا اور آکسیجن کے چھوٹے چھوٹے سلنڈر بھی تھے۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ کرسٹل فزیوتھراپسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ میڈیکل کی بھی تھوڑی بہت سمجھ بوجھ رکھتی ہے۔ اس

نے باقی سامان میں سے چند اوزار علیحدہ کیے۔ سرمد صاحب سے مشورے کے بعد پہلے ایک انجکشن ان کے بازو میں لگایا۔ یہ ''سن'' کرنے والا انجکشن تھا لیکن یہ بات عادل بھی جانتا تھا کہ ایسے انجکشن جسم کو عام طور پر گہرائی تک سن نہیں کرتے۔ اگر ''ڈیپ سرجری'' ہو تو مریض کو شدید تکلیف جھیلنا پڑتی ہے اور عادل دیکھ رہا تھا کہ سرمد صاحب یہ تکلیف جھیلنے کے لیے تیار تھے۔

کرسٹل نے رابے خاں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ہام کو گولی نکالنے کے لیے اپنے ساتھی عاڈل کا تھوڑا ہیلپ چاہیے۔''

داخون زہر خند لہجے میں بولا۔ ''فرنگن تُو بہت بڑا فراڈن بھی ہے۔ پہلے تو تجھے انگریزی کے سوا اور کچھ آتا ہی نہیں تھا۔ اب تیرے منہ میں یہ اردو کس نے گھسا دیا۔''

''ہام تھوڑا تھوڑا سمجھتا۔''

''تم تھوڑا تھوڑا سمجھتا لیکن ام وہ سارا سمجھتا جو تمہارے کھوپڑے میں ہے۔ ام اس خبیث کے ہاتھ نہیں کھول سکتا۔ اب ام اس کو اسی طرح مرغی کے مافق باندھ کر رکھے گا۔'' داخون کا اشارہ عادل کی طرف تھا۔

''چلو ام تمہارا مدد کرتا ہے۔'' رابے خاں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

اگلے پندرہ بیس منٹ عادل کے لیے دل ہلا دینے والے تھے۔ اس نے کبھی اس طرح کا براہِ راست آپریشن نہیں دیکھا تھا۔ کرسٹل کی ہمت اور مہارت کی بھی داد دینا پڑتی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، اس نے اس سلسلے میں کچھ کورس بھی کر رہے تھے۔ ان میں فریکچر ہو جانے والی ہڈیوں کو بغیر آپریشن کے ٹریٹ کرنے کا کورس بھی تھا۔ کرسٹل کے ہاتھ خون میں لت پت ہو گئے۔ اسے کٹ لگاتے ہوئے سرمد صاحب کے بازو کی گہرائی تک جانا پڑا۔ گولی کندھے کے سخت پٹھوں کے اندر پھنسی ہوئی تھی۔ سرمد صاحب کی بے مثال قوتِ برداشت کا ایک اور مظاہرہ سامنے آ رہا تھا۔ وہ لیٹے ہوئے تھے اور انہوں نے اپنا بازو موڑ کر آنکھوں پر رکھا ہوا تھا۔ ان کے چہرے سے ٹپ ٹپ پسینہ گرتا رہا لیکن کرب و بے قراری کا کوئی اظہار ان کی طرف سے نہیں ہوا۔ اور تو اور سخت جان پاؤندے بھی سرمد صاحب کی ہمت اور برداشت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔

آخر گولی نکل آئی اور کرسٹل نے زخم میں چند اسٹیچز لگا کر بینڈیج کر دی۔ عادل کی شرمندگی عروج پر تھی۔ سرمد صاحب کو یہ ساری تکلیف اسی کی وجہ سے سہنا پڑی تھی۔ مزید پریشانی کے جو حالات پیدا ہو رہے تھے، ان کا سبب بھی وہ ہی تھا۔ پاؤندے جو کل شام تک کافی حد تک دوستانہ موڈ میں نظر آتے تھے۔ اب ان کی نظریں بدلی ہوئی تھیں۔ خاص طور سے داخون اور سمونہ کی آنکھوں میں تو خون کی سرخی تھی اس دوران میں چند لمحوں کے لیے تو عادل کو یوں لگا تھا کہ داخون ایک بار پھر اس کو پیٹنا شروع کر دے گا مگر رابے خاں جو نسبتاً ٹھنڈا اور گہرا شخص تھا، آڑے آیا اور اس نے داخون کو روک دیا۔ اس سارے عمل میں کافی وقت لگا تھا۔ اب صبح کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ رابے خاں نے عادل کے سامنے بیٹھ کر اس کی طرف اُنگلی اُٹھائی اور خطرناک لہجے میں بولا۔ ''دیکھو، یہ ام تم کو آخری موقع دے رہا ہے۔ اس کے بعد نہیں دے گا۔ یہ سب لوگ گواہ ہے اگر اب تم نے کوئی حرامزدگی دکھایا تو ام سیدھا تمہارے دل پر گولی مارے گا اور یہاں برف کی قبر میں دفن کر دے گا۔''

سرمد صاحب کی قوتِ برداشت نے عادل کو بے حد متاثر کیا۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ زبان سے کہے گئے الفاظ کے بجائے عملی نمونہ دل پر کہیں زیادہ اثر کرتا ہے۔ آپریشن کے دورانیے کا وہ قریباً ایک گھنٹہ سرمد صاحب نے جس طرح سے گزارا تھا، وہ عادل کے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ سب کچھ آگے چل کر اس کے بہت کام آیا۔

اگلے روز دوپہر سے پہلے ہی رابے خاں کے پانچ اور ساتھی بھی موقع پر پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک نوجوان تھا، باقی درمیانی عمر کے لوگ تھے۔ ان کے ساتھ کھانے پینے کا سامان تھا اور خیمے وغیرہ تھے۔ عادل نے اندازہ لگایا کہ نئے آنے والوں کے پاس کم از کم دو رائفلیں موجود ہیں۔ دو افراد چھوٹے دستے کی کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔ یہ لوگ رابے خاں کو صرف ''خاناں'' کہہ کر بلاتے تھے اور اس کی بات بڑی توجہ سے سنتے تھے۔ یہ سب کے سب اپنے چہرے بشرے سے خطرناک لوگ دکھائی دیتے تھے۔

اگلے دو تین روز میں عادل کو اندازہ ہو گیا کہ ان پاؤندوں کے ساتھ سرمد صاحب نے کچھ معاملات طے کر لیے ہیں اور اب آئندہ جو کچھ ہوگا، طے شدہ شرائط کے مطابق ہوگا۔ سرمد صاحب کی ہدایت کے مطابق روزمرہ کے معمولات دوبارہ شروع ہو گئے۔ یہ معمولات شروع کرنے کے لیے ضروری تھا کہ سب سے پہلے تو عادل کے ہاتھ کھولے جاتے اور ہمایوں کو بھی آزاد کیا جاتا۔ یہ دونوں کام اب رابے خاں کے لیے یقیناً آسان ہو گئے تھے۔ مزید مسلح ساتھی آنے کے بعد اس کے اعتماد میں اضافہ ہوا تھا۔ اس نے ایک دو شرائط کے ساتھ عادل کے ہاتھ کھلوا دیئے اور ہمایوں کو بھی ایک مخصوص ایریا میں گھومنے پھرنے کی اجازت دے دی۔ بہرحال کم از کم دو مسلح گن مین ہر وقت ان سے کچھ فاصلے پر موجود رہتے تھے اور ان کی نگرانی کرتے تھے رابے خاں نے عادل اور ہمایوں کو باور کرا دیا تھا کہ ان کے یہ ساتھی بہترین نشانے باز ہیں اور ٹھیک پیشانی پر گولی مارتے ہیں۔

سرمد صاحب کی ہدایت کے مطابق تیسرے روز ہمایوں نے ایک بار پھر عادل کے ساتھ چٹان پر کلائمبنگ شروع کر دی۔ کسی وقت کرسٹل بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتی تھی۔ ویسے اب وہ زیادہ وقت خیمے میں ہی سرمد صاحب کے پاس گزارتی تھی۔ وہ اگر گھومتی پھرتی تھی تو پاؤندوں کی چبھتی ہوئی نظریں اس کا تعاقب کرتی تھیں اور وہ گندی ہنسی ہنستے ہوئے سرگوشیاں کرتے تھے۔ یہ مناظر کرسٹل کو بے چین کر دیتے تھے۔ ویسے بھی خیمے میں سرمد صاحب کو ایک تیماردار کی ضرورت تھی۔ ابھی زخم کچا تھا اور وہ کسی وقت سخت درد محسوس کرنے لگتے تھے۔

ایک دو بار عادل کے ذہن میں آیا کہ وہ کرسٹل سے ہوٹل والی رات کے بارے میں پوچھے جب ایک انگلش لڑکا دندناتا ہوا اس کے کمرے میں گھس آیا تھا اور اس سے بدتمیزی کی تھی لیکن یہ بات اس کی زبان پر آتے آتے رہ گئی۔ یقیناً ہر شخص کے ذاتی معاملات ہوتے ہیں اور یہ بھی کوئی ایسا ہی معاملہ تھا۔ پتا نہیں کبھی کبھی عادل کو ایسا لگتا کہ کرسٹل کی یہاں ان برف زاروں میں موجودگی اور اس لڑکے کی آمد میں بھی کوئی تعلق ہے۔ بہرحال اس تعلق کی نوعیت کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

چٹان پر کلائمبنگ کرنے میں عادل کو شروع میں تو کچھ دشواری پیش آئی تھی لیکن اب اسے کام کی سمجھ آ گئی تھی اور اس نے تیز رفتاری سے سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ کسی وقت اسے ہمایوں کی آنکھوں میں حیرت بھی دکھائی دیتی تھی۔ ہمایوں کئی سال سے کوہ پیمائی کر رہا تھا اور اچھا کلائمبر تھا، اس کے باوجود پچھلے دو تین ہفتوں میں ہی عادل اس سے آگے نکلتا ہوا

محسوس ہوتا...... ایک دن جب وہ چٹان کی سب سے مشکل سائیڈ سے چڑھ کر چٹان کی چوٹی پر پہنچے تو ہمایوں نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم بہت اچھے جا رہے ہو عادل! امید ہے کہ سر سرمد نے تم سے جو توقعات لگائی ہیں، وہ پوری ہوں گی۔''

''اور وہ توقعات کیا ہیں؟ یہ سوال میرے لیے ابھی تک اُلجھن کا سبب ہے۔'' عادل نے کہا۔

''سر سرمد نے تم کو بتایا تو ہے، وہاں بانگڑی پہاڑ کی چوٹی تک چند سو میٹر کی کلائمبنگ ایسی ہے، جو ان کے خیال میں صرف تم ہی کر سکتے ہو۔''

''لیکن ہمایوں بھائی! یہ بات میری کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ کوئی الٰہ دین کا چراغ تو نہیں ہے جسے صرف میں ہی غار میں گھس کر نکال سکتا ہوں۔ وہ چڑھائی مشکل ہوگی لیکن تجربہ کار کوہ پیما مشکل سے مشکل کلائمبنگ کر لیتے ہیں۔ پھر میرا چناؤ ہی کیوں کیا گیا ہے؟''

''سر سرمد کی کئی باتوں کو سمجھنا کافی مشکل ہوتا ہے عادل۔ شاید وہ کوئی ایسی دشواری دیکھ رہے ہیں جو ہمیں نظر نہیں آ رہی اور اسی دشواری کو سامنے رکھتے ہوئے وہ تم جیسے نیچرل کلائمبر کو ٹرینڈ کر رہے ہیں۔''

''نیچرل کلائمبر...... اس کا مطلب بھی پوری طرح میری سمجھ دانی میں نہیں آتا۔'' عادل نے کہا۔

''کچھ لوگ کسی خاص کام کے لیے خاص طور سے بنائے گئے ہوتے ہیں۔ ان کو ''گاڈ گفٹڈ'' کہا جاتا ہے۔ ایسے لوگ اگر اپنی خداداد صلاحیتوں پر تھوڑی سی بھی محنت کریں تو بہت تیزی سے بہت آگے نکل جاتے ہیں اور اس کا ثبوت تمہارے سلسلے میں مل بھی رہا ہے۔ تم بے انتہا تیزی سے سیکھ رہے ہو، ممکن ہے کہ تمہارے سامنے سر سرمد نے تمہاری تعریف نہ کی ہو لیکن میں جانتا ہوں، وہ تمہاری طرف سے بہت مطمئن ہیں۔''

عادل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے ہمایوں بھائی! کیا بانگڑی کی چوٹی پر واقعی کچھ موجود ہوگا اور کیا ان ت پاؤندوں کی موجودگی میں ہم واقعی اس میں سے کچھ حاصل کر سکیں گے؟''

''اس کا پتا تو سر سرمد کو ہی ہوگا عادل! اور میرا تم کو ایک برادرانہ مشورہ ہے۔ سر سرمد کی باتوں پر زیادہ مت سوچا کرو۔ میرا ذاتی تجربہ تو یہی ہے کہ سر کی باتوں پر آنکھیں بند کر کے یقین کرنے اور عمل کرنے میں فائدہ رہتا ہے۔''

عادل نے پھر موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''ہمایوں بھائی! کیا تم اور کرسٹل صرف کوہ پیمائی کے لیے سر کے ساتھ ہو یا اس کا کوئی اور بھی مقصد ہے؟''

''ہمارا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ ہمیں سر کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع مل جائے۔ انہیں جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ ایک سورج کی طرح ہیں اور ان سے اردگرد کی ہر شے کو روشنی ملتی ہے۔ پاکستان ہی نہیں، پاکستان سے باہر بھی ان کے بہت سے چاہنے والے ہیں۔ ان میں کئی مشہور کھلاڑی اور نامور لوگ شامل ہیں۔ تم نے باروندا جیکی کا نام سنا ہوا ہے؟''

عادل نے ذہن پر زور دیا۔ اسے نام کچھ سنا سنا سا لگا۔ ''کوئی پہلوان ہے شاید۔'' عادل نے کہا۔

''پہلوان نہیں، مارشل آرٹ کا زبردست کھلاڑی ہے۔ اس کا تعلق نیپال سے ہے۔ اپنے میدان میں اس نے حیران کن تیزی سے ترقی کی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اپنے بہت سے ہم عصروں کو پچھاڑ دیا ہے۔ اب سے تین چار سال

پہلے وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ بس فلموں میں چھوٹے موٹے رول کیا کرتا تھا۔ پھر جس طرح سرمد صاحب کی نظر تم پر پڑی تھی، اسی طرح ایک دن اس پر بھی پڑ گئی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا۔ ابھی وہ اور بہت آگے جائے گا۔"

"ہمایوں بھائی! تمہارا مطلب ہے کہ سرمد صاحب کو وہ پیائی کی طرح مارشل آرٹ بھی جانتے ہیں؟"

"نہیں...... وہ نہیں جانتے...... اور بہت سے ایسے شعبے ہیں جن کے بارے میں وہ کچھ خاص مہارت نہیں رکھتے لیکن ان شعبوں میں بھی انہوں نے بہت سے نوجوانوں کی بے مثال مدد کی ہے اور انہیں کامیابیاں دلائی ہیں۔ دراصل سرمد صاحب کا اصل ہتھیار ان کے سوچنے کا انداز...... اور ان کا فلسفہ ہے۔ وہ اپنے نظریے کی طاقت سے بندے میں ایسی توانائی بھر دیتے ہیں کہ اس کے لیے کسی بھی میدان میں آگے بڑھنا سہل ہو جاتا ہے۔"

ہمایوں کی باتیں کچھ ایسی غلط نہیں تھیں۔ یقیناً یہ سرمد صاحب کی کرشماتی شخصیت ہی تھی جو اسے لاہور میں کباڑ خانے کے کام سے اُٹھا کر یہاں کے ٹو کی فلک بوس چوٹی کے دامن میں لے آئی تھی اور وہ واقعی خود کو بڑی تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔

مگر اگلے ہی روز کچھ ایسا ہوا جس نے عادل کے تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے قدم روک دیئے اور اس نے خود کو مایوسی کے ریلے میں بہتا ہوا پایا۔ جب چند روز پہلے کیمپ کے چند کلومیٹر کے فاصلے پر پاؤنڈوں نے اسے اور کرسٹل کو پکڑا تھا تو عادل کے سر کے عقبی حصے پر زوردار چوٹ لگائی گئی تھی بعدازاں جب یہاں کیمپ میں آنے کے بعد عادل نے رات کے وقت داخون سے رائفل چھیننے کی ناکام کوشش کی تو تب بھی اس کے سر کے پچھلے حصے پر شدید ضرب آئی۔ اب اس بات کو بھی پانچ دن گزر چکے تھے اور ان چوٹوں کے حوالے سے عادل خود کو کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔ مگر آج اچانک سر کے پچھلے حصے اور گردن میں ٹیسیں اُٹھنے لگیں۔ اس وقت عادل اور ہمایوں "مشق والی چٹان" پر چڑھنے کے بعد واپس آئے تھے اور عادل، ہمایوں سے قریباً پانچ منٹ پہلے اُترنے میں کامیاب ہوا تھا۔ عادل کی اس کامیابی پر کرسٹل کا چہرہ خوشی سے سرخ نظر آنے لگا۔ ہمایوں نے بھی عادل کی غیر معمولی کارکردگی کی تعریف کی۔ سرمد صاحب عموماً تعریف میں احتیاط سے کام لیتے تھے پھر بھی انہوں نے عادل کی ستائش میں چند فقرے بولے اور کہا۔ "میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہم شیڈول سے ایک ہفتہ پہلے ہی چوٹی کی طرف روانہ ہو سکیں گے۔ تمہاری پرفارمنس اطمینان بخش ہے عادل۔"

ان کلمات پر عادل یقیناً بہت خوش ہوتا لیکن اس کے اندر تو کچھ اور ہی طرح کی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ اس کی گردن میں شدید ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں اور سر گھمانا مشکل ہو رہا تھا۔ شاید ہمایوں پر اپنی برتری بڑھانے کے لیے وہ کچھ زیادہ ہی زور لگا بیٹھا تھا۔ وہ بات چیت مختصر کرتا ہوا دوسرے خیمے میں چلا گیا اور لیٹ گیا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ شاید کل پریکٹس میں حصہ نہیں لے سکے گا...... بلکہ ہو سکتا ہے کہ اگلے کئی روز تک چڑھائی نہ کر سکے۔ یہ مایوس کن صورتِ حال تھی۔ باہر سر سرمد، رابے خاں سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کے اُڑتے اُڑتے ہوئے سے فقرے عادل کے کانوں تک بھی پہنچ رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "عادل بہت ٹھیک جا رہا ہے، تم نے خود بھی دیکھا ہوگا۔ ہم دو چار دن پہلے ہی یہاں سے روانہ ہو سکتے ہیں۔"

رابے بولا۔ "خو لڑکے میں کرنٹ تو بہت نظر آتا ہے، اللہ کرے یہ کرنٹ ایسا ہی رہے۔"

"داخون کی سمجھ میں بھی کوئی بات آئی ہے یا نہیں؟" سر سرمد نے پوچھا۔

"ہاں، اب وہ زیادہ بولتا تو نہیں۔ اس کو دماغ ٹھنڈا رکھنے کا ضرورت ہے۔ تم بھی اپنی میم صاحب کو بولو کہ وہ اس کے ساتھ منہ ماری نہ کیا کرے۔"

ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں اور خیمے میں عادل پریشانی کے ریلے میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ سر سرمد اور کرسٹل، ہمایوں سمیت سب کو مایوس کرنے والا ہے۔ یہ لوگ اس سے کچھ زیادہ ہی توقعات لگا بیٹھے تھے اور یہاں وہ شاید اپنے اضافی جوش کی وجہ سے مشکل میں گرفتار ہو چکا تھا۔

کرسٹل اکثر بہانے بہانے سے روزانہ ایک آدھ چکر عادل کے خیمے کا لگا لیتی تھی۔ خاص طور سے جب ہمایوں خیمے میں موجود نہیں ہوتا تھا۔ آج بھی وہ چلی آئی اور حسبِ معمول پوچھا۔ "ہیلو عاڈل! ہام کے لائق کوئی سروس۔ ہام کا مطلب ہے کوئی خدمت۔"

عموماً عادل نفی میں سر ہلا دیا کرتا تھا لیکن آج اس نے ایسا نہیں کیا۔ "اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو گردن کے پچھلے حصے پر تھوڑا سا آئل مل دو۔" اس نے کہا۔

وہ تو جیسے پہلے ہی کسی ایسی درخواست کی منتظر تھی۔ فوراً زیتون کا امپورٹڈ تیل لیے ہوئے عادل کے پاس آن بیٹھی۔ عادل نے اس پر اپنی اصل تکلیف اور تکلیف کی شدت ظاہر نہیں ہونے دی لیکن جب اس نے مساج کرتے ہوئے عادل کے سر اور گردن پر دباؤ بڑھانا شروع کیا تو عادل کے لیے کراہیں روکنا مشکل ہو گئیں۔ وہ بھی ایک کائیاں تھی اور یقیناً اپنے کام میں اس کو غیر معمولی مہارت بھی تھی۔ بولی۔ "ہام کو لگتا عاڈل کہ تمہارے ہیڈ کی انجری کی وجہ سے تمہاری گردن میں بھی چین آ گیا۔ تو م نے آج زور بھی تو بہت زیادہ لگایا ہائیں۔"

عادل ہونٹ بھینچ کر چپ رہا اور اوندھا پڑا رہا۔ وہ بولی۔ "کہیں تو م کا پریکٹس تو خراب نائیں ہو جائیں گا؟"

"نہیں...... نہیں، اب اتنا بھی مسئلہ نہیں۔" اس نے کہا لیکن دل میں وہ سوچ رہا تھا کہ مسئلہ اس سے کہیں زیادہ خراب ہے۔

کرسٹل نے قریباً آدھ گھنٹے تک عادل کو تیل ملا اور اس کو کسی حد تک بہتر کر دیا۔ اس دوران میں ایک بار ہمایوں نے بھی خیمے میں جھانکا اور خاموشی سے واپس چلا گیا۔ ہمایوں بہت خاموش طبع تھا لیکن نہ جانے کیوں کبھی کبھی عادل کو لگتا تھا کہ وہ کرسٹل میں دلچسپی رکھتا ہے مگر کرسٹل کی طرف سے ایسی کوئی صورتِ حال نظر نہیں آتی تھی۔

کرسٹل اس کے مساج کے لیے قمیص اور ٹراؤزر بھی اُتروانا چاہ رہی تھی مگر عادل اسے کسی بھی طرح کا بڑھاوا دینا نہیں چاہتا تھا اور اس وقت تو ویسے بھی درد کے شکنجے میں تھا۔ کرسٹل نے اپنے نرم گرم ہاتھوں اور کلائیوں کے زور سے عادل کے درد میں کچھ کمی تو کر دی تھی مگر مکمل چھٹکارا نہیں ملا تھا۔ اس نے شرارت سے اس کے کان میں انگلی گھمائی اور اُٹھ کر چلی گئی۔

صرف آدھ پون گھنٹے بعد درد پھر شروع ہو گیا۔ رات کو بھی وہ دیر تک جاگتا رہا۔ اس نے ساتھیوں سے اس صورتِ حال کو چھپائے رکھا۔ اسے کچھ شرمندگی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے فالتو جوش کا مظاہرہ کیا تھا اور "اَن فٹ" ہو گیا تھا۔ اب پتا نہیں کہ اسے سنبھلنے میں کتنی دیر درکار تھی۔ سرمد صاحب کے جفاکش فلسفے کے مطابق وہ درد کو بخوشی جھیلنے اور اس پر غالب آنے کی کوشش کرتا رہا تاہم اسے لگا کہ کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ رات کوئی ڈھائی تین بجے کا عمل

ہوگا۔ سب سو رہے تھے، ایک خیمے میں عادل اور ہمایوں تھے۔ دوسرے میں سرمد صاحب اور کرسٹل۔ اس سے اگلا خیمہ رابے خاں کا تھا۔ تین خیمے اور بھی تھے جن میں رابے خاں کے ساتھی تھے۔ آج شاید ان پاؤندوں کا کوئی خاص دن تھا۔ انہوں نے جی بھر کر کھانا کھایا تھا...... اس ضیافت میں بہت سا ٹن پیک کھانا ان کے معدوں میں اُتر گیا تھا۔ بھیڑ کے خشک گوشت سے کوئی پلاؤ قسم کی چیز بھی تیار کی گئی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے مقامی طور پر تیار کردہ شراب بھی پی تھی۔ وہ دو پہرے دار جو آج رات ڈیوٹی پر تھے، بہت سُست نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو جلد ہی سو گیا، دوسرا بھی اونگھتا ہوا محسوس ہوا۔

اچانک عادل کے دل میں عجیب خیال سر اُٹھانے لگا۔ اس نے سوچا، کیوں نہ وہ اس ساری صورتِ حال پر لعنت بھیج کر خاموشی کے ساتھ یہاں سے نکل جائے۔ ایک تو اس کا دھیان ہر وقت شہزادی کی طرف لگا رہتا تھا۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ خیال اُٹھتا تھا کہ شہزادی سے دوری اور اس کے حالات سے مکمل بے خبری کہیں اس کے لیے کسی ناقابلِ تلافی نقصان کا باعث نہ بن جائے۔ اگر اس کی غیر موجودگی میں اسے کسی طرح شادی پر مجبور کر دیا جاتا تو پھر باقی کیا رہ جانا تھا اور وہ یہ جانتا تھا کہ چودھری مختار اور اس کا بیٹا ناصر اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہر ہتھکنڈا آزمائیں گے۔ عادل کی اس سوچ کی دوسری وجہ آج سہ پہر پیدا ہوئی تھی۔ یعنی اس کے سر اور گردن کا درد...... پتا نہیں کیوں اسے لگ رہا تھا کہ اس درد کی وجہ سے وہ سرمد صاحب کو بہت مایوس کرے گا اور کرسٹل، ہمایوں وغیرہ بھی مایوس ہوں گے اور اگر اس نے اپنی ہمت سے زیادہ جان مار کر پریکٹس جاری رکھنے کی کوشش کی تو ہو سکتا ہے کہ جسمانی طور پر زیادہ نقصان اُٹھائے۔ اگر وہ کسی طرح خاموشی کے ساتھ یہاں سے نکل جاتا تو اس ساری صورتِ حال سے بچا جا سکتا تھا۔

سرہانے کی طرف ایک بیگ پڑا تھا۔ اس میں کھانے پینے کی اشیا موجود تھیں۔ باہر کی پاکٹ میں ایک چھوٹا نقشہ بھی موجود تھا۔ عادل نے مکمل گرم لباس پہن رکھا تھا، باہر موسم بھی ٹھیک تھا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ہمایوں کروٹ بدلے سو رہا تھا۔ خیمے میں اس کی بھاری سانسیں گونج رہی تھیں۔ عادل نے خاموشی سے جوتے پہنے اور اونی ٹوپی سر پر اوڑھ لی جو سر کے ساتھ ساتھ چہرے کو بھی چھپا لیتی تھی۔ وہ جانے کے لیے تیار تھا۔ اس نے بہت آہستگی سے خیمے کے دروازے کی زپ کھولی۔ اس کے بعد باہر والے "کور" کی زپ تھی۔ دوسری زپ کھلتے ہی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آئے۔ صبح ابھی دور تھی مگر ہلکی ہلکی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔

باہر نکلنے سے پہلے اس نے ایک بار پھر سوچا۔ جیسے اس کے اندر سے آواز آئی۔ "عادل! ایک بار اچھی طرح سوچ لو۔ یہاں سے نکل جاؤ گے تو پھر کیا کرو گے؟ پھر تمہیں اسی گالی کا سامنا ہوگا جو تمہارے تایا فراست نے تم پر چڑھا رکھی ہے۔ کہاں سے لاؤ گے اتنا روپیہ؟ کیسے کماؤ گے؟"

"کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔" اس نے جیسے اپنے آپ کو سمجھایا۔

"موقعے بار بار نہیں ملتے عادل!" اندر کی آواز نے کہا۔ "تم کباڑ بیچ بیچ کر کہاں تک جمع کرو گے؟ ڈھائی کروڑ کی رقم معمولی نہیں ہوتی۔ اگر تمہیں ایک سنہری موقع مل رہا ہے تو اس سے فائدہ اُٹھاؤ۔ سرمد صاحب کی زبان پر بھروسہ رکھو۔ اگر وہ کہہ رہے ہیں کہ کچھ ہوگا...... تو پھر کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔"

"لیکن یہ سختی مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی۔ اس مشقت نے مجھے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ اور اب یہ درد...... اس درد

نے رہی سہی کسر بھی نکال دی ہے۔ اس درد کی وجہ سے مجھے بہت شرمندگی کا سامنا ہونے والا ہے۔" مخالف آواز نے کہا۔

"اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ مشق کے دوران میں کھلاڑی اَن فٹ ہوتے ہیں اور پھر سے ٹھیک بھی ہو جاتے ہیں۔ سرمد صاحب کے پاس کافی طبی سہولتیں موجود ہیں اور پھر کرسٹل جیسی فزیوتھراپسٹ ہے۔ بہت جلد سب اچھا ہو جائے گا۔ اور ایک بات تمہیں اور یاد رکھنی چاہیے۔ تمہاری وجہ سے تمہارے ساتھیوں کو پہلے بھی دو بار سخت مصیبت اُٹھانا پڑی ہے۔ اب اگر پھر کچھ ایسا ہو گیا تو کیا ہوگا؟"

وہ وہیں دروازے کے قریب بیٹھا کتنی ہی دیر تک متضاد سوچوں کے درمیان گھرا رہا۔ سب سے اہم بات یہی تھی کہ اگر وہ یہاں سے نکلنے اور شگر یا اسکردو وغیرہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو بھی جاتا ہے تو پھر کیا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ گاؤں جا کر وہ شہزادی کی ایک جھلک دیکھ لے گا اور وہاں کے حالات سے آگاہی حاصل کر لے گا۔ اس کے بعد تو پھر وہی سوال منہ پھاڑ کر کھڑے ہو جائیں گے جن کا جواب ڈھونڈنے کے لیے اس نے کمرِ ہمت باندھی تھی اور لاہور کا رُخ کیا تھا۔

وہ دروازے کے سامنے بیٹھا تھا اور یہ دروازہ ایک دوراہے کے سامنے کھل رہا تھا۔ آخر وہ فیصلے پر پہنچ گیا۔ اس نے اپنی کمر پر سے بیگ اُتار کر ایک طرف رکھ دیا اور گہری سانسیں لے کر جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔

کچھ دیر بعد جب وہ خیمے کے باہر والے غلاف کی "زپ" بند کر رہا تھا، اس کی نگاہ کچھ فاصلے پر ایک ہیولے پر پڑی۔ ملگجی تاریکی میں یہ ہیولا التحیات کے انداز میں خاموش و ساکت بیٹھا تھا۔ پہریداروں کا سائبان اس سے دس پندرہ قدم کی دوری پر تھا۔ یہ کون ہے جو اتنی سردی میں کھلے آسمان کے نیچے ایسے بے حرکت بیٹھا ہے؟ بالکل پتھر یا برف کے مجسمے کی طرح۔ آخری پہر کی ہوائیں جیسے اسے چھوئے بغیر گزر رہی تھیں۔ وہ اسے پہچان نہیں پا رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد عادل کی مشکل خود بخود آسان ہو گئی۔ ایک پاؤندہ پہریدار نے معمول کے مطابق اپنی ٹارچ کا روشن دائرہ دائیں بائیں گھمایا۔ یہ دائرہ ایک دو سیکنڈ کے لیے ہیولے پر رُکا۔ عادل ششدر رہ گیا۔ یہ سرمد صاحب تھے۔ وہ ہڈیوں میں گودا جما دینے والی سردی میں کھلے آسمان تلے بیٹھے تھے۔ ان کے بالائی جسم پر کپڑے کا ایک تار نہیں تھا۔ ان کی جینز کی نیلی پتلون پر برف کی دھول سی جمی ہوئی تھی۔ زخمی کندھے کی سفید بینڈیج ٹارچ کی روشنی میں نمایاں نظر آئی۔

عادل کو معلوم تھا کہ سرمد صاحب جواں عمری سے شدید ترین مشقت کے عادی رہے ہیں اور اکثر نفس کشی کی مشقیں بھی کرتے ہیں۔ ہر موسم میں صبح منہ اندھیرے اُٹھ کر میلوں کی دوڑ لگانا بھی تو نفس کشی کے زمرے میں ہی آتا تھا مگر اس وقت وہ جو کچھ کر رہے تھے، وہ تو ششدر کر دینے والا تھا...... بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیا یہ کسی قسم کا کوئی چلہ تھا یا پھر قوتِ برداشت بڑھانے کے لیے کسی طرح کی کوئی مشق تھی، یا کوئی اور معاملہ۔ چند لمحے کے لیے عادل کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ وہ باہر نکلے اور سرمد صاحب کو اس عمل سے روکے لیکن وہ اس پوزیشن میں نہیں تھا اور نہ ہی اس کی یہ حیثیت تھی۔

اس نے ہولے سے غلاف کی زپ بند کر دی۔ پھر اندرونی زپ بھی بند کی اور جوتے اُتار کر سلیپنگ بیگ میں گھس گیا۔ ہلنے جلنے سے ہلکا ہلکا درد پھر شروع ہو گیا۔ سلیپنگ بیگ میں منہ گھسا کر وہ سوچنے لگا، اگر وہ واقعی باہر نکل جاتا تو کیا

ہوتا؟ پہریدار کا رُخ تو ذرا دوسری طرف تھا لیکن سرمد صاحب تو اسے یقیناً دیکھ لیتے۔ وہ اسے روکتے، اور وہ سب کے نزدیک بھگوڑا ٹھہرتا۔ وہ اتنی جلدی کیوں اُٹھے ہوئے تھے؟ وہ تو صبح ساڑھے چار، پانچ بجے کے قریب بیدار ہوتے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ انہوں نے اس کے ارادے کو پہلے سے بھانپ لیا ہو، وہ زبردست قسم کے قیافہ شناس تھے اور شاید چہرہ شناس بھی......

اگلے روز مشق کی چھٹی تھی۔ ایک طرح سے یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا۔ شاید عادل کو اپنی جسمانی صورتِ حال بہتر کرنے میں مدد ملتی۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں اس کے سر اور گردن کا درد کم ہو سکتا تھا۔

O......❖......O

بہر حال اگلے چوبیس گھنٹے بھی گزر گئے۔ عادل پر وہ مثال صادق آ رہی تھی کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ گیارہ بجے کے لگ بھگ سرمد صاحب کا نادر شاہی حکم آ گیا کہ وہ اور کرسٹل چٹان پر چڑھائی کریں گے۔ ہمایوں کو آج فلو تھا اس لیے وہ ان کے ساتھ نہیں جا رہا تھا۔ چار و ناچار عادل کو سرمد صاحب کی ہدایت کے مطابق عمل کرنا پڑا۔ وہ دونوں معمول کے مطابق روانہ ہوئے۔ کرسٹل اب نیکر کے بجائے شارٹس پہنتی تھی۔ اس کے باوجود پاؤنڈوں کی نگاہیں اس کا تعاقب کرتی رہتی تھیں۔ کرسٹل آگے تھی، عادل اس کے پیچھے پیچھے چڑھ رہا تھا۔ شروع میں عادل کو کافی دقت ہوئی لیکن جب جسم گرم ہو گیا تو وہ نسبتاً آسانی محسوس کرنے لگا۔ پروگرام کے مطابق انہوں نے ایک دو جگہ ''اینکر'' کے ذریعے چڑھائی کی پریکٹس بھی کی۔ اینکر کوہ پیمائی کے سامان کا حصہ تھا۔ یہ ایک طرح کی کمند تھی۔ اسٹین لیس اسٹیل کا بنا ہوا یہ کوئی نو مربع انچ کا آلہ تھا۔ اس میں کئی طرح کے اسپرنگ اور کمانیاں سی لگی ہوئی تھیں۔ یہ آلہ چٹان کی دراڑوں میں اس طرح سے پھنس جاتا تھا کہ ایک مضبوط کمند کی صورت بن جاتی تھی۔ اس پر جتنا بوجھ پڑتا تھا، یہ چٹان کی دراڑ میں اپنی پکڑ اتنی ہی مضبوط کرتا جاتا تھا۔ اس میں ایک ایسا جدید سسٹم بھی موجود تھا جو خطرے کی صورت میں زوردار الارم دیتا تھا۔ یعنی اگر کمند کی پکڑ پتھروں کے اندر کمزور پڑ رہی ہو تو وہ مختلف الارمز کی صورت میں اس کا اعلان کرتا تھا۔ یہ اینکر کی ایک جدید ترین شکل تھی۔

محنتِ شاقہ کے بعد عادل اور کرسٹل چٹان کی بلندی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ آج عادل کی ٹائمنگ کافی خراب رہی تھی تاہم یہ بھی غنیمت تھا کہ اس نے چڑھائی مکمل کر لی تھی۔ اس کے لیے اسے خود پر خاصا جبر کرنا پڑا تھا۔ کرسٹل گاہے بگاہے بغور اس کا چہرہ دیکھتی رہی تھی اور اندازہ لگانے کی کوشش کرتی رہی تھی کہ اس کی تکلیف کی صورتِ حال کیا ہے۔

چٹان کی بلندی پر بھی انہوں نے اپنا تھوڑا بہت سامان رکھا ہوا تھا۔ یہ سامان ایک چھوٹے سے خیمے میں تھا۔ اس سامان میں ایک شاندار تھری ڈی کیمرا بھی تھا۔ آج موسم بالکل صاف تھا۔ اس لیے سرمد صاحب نے انہیں ہدایت کی تھی کہ وہ بانگڑی چوٹی کی کچھ تصویریں اُتاریں۔ خاص طور سے اس راستے کی جہاں سے وہ بانگڑی چوٹی پر چڑھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ کرسٹل طاقتور لینس والا کیمرا نکال لائی۔ انہوں نے تصویر کشی شروع کر دی۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ سورج کی ترچھی شعاعیں برفیلی چوٹیوں اور ڈھلوانوں کو منور کر رہی تھیں۔ یہ مبہوت کر دینے والے مناظر تھے۔ دور پیچھے راکاپوشی اور براڈ پیک کی فلک بوس بلندیاں دکھائی دیتی تھیں۔

ایک تصویر لیتے لیتے کرسٹل تھوڑا سا پیچھے ہٹی۔ ''اوہ گاڈ!'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس کے ساتھ ہی کھڑکھڑاہٹ کی تیز آواز اُبھری۔

''کیا ہوا؟'' عادل نے چونک کر پوچھا۔

وہ اپنے پاؤں کے قریب موجود ایک دراڑ کو دیکھ رہی تھی۔

''وہ اندر گر گیا۔'' وہ بوکھلائی ہوئی آواز میں بولی۔

''کیا گر گیا؟'' عادل نے پریشان ہو کر پوچھا۔

اچانک بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ جہاں تھوڑی دیر پہلے ان کا اینکر پڑا تھا، وہ جگہ اب خالی تھی۔ عادل بھی سر تھام کر رہ گیا۔ پیچھے ہٹتے ہوئے کرسٹل کے پاؤں کی ٹھوکر اینکر کو لگی تھی اور وہ دراڑ میں گر گیا تھا۔

تصویر کشی بھول کر وہ دونوں گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور دراڑ میں جھانکنا شروع کر دیا۔ یہ دراڑ بمشکل نو دس انچ چوڑی ہو گی، نیچے جا کر یہ شاید اور تنگ ہو گئی تھی۔ اندر بالکل اندھیرا تھا۔ کرسٹل خیمے میں سے بڑی ٹارچ لے آئی۔ انہوں نے ٹارچ کی روشنی دراڑ میں پھینکی۔ جلد ہی انہیں اپنا ڈیجیٹل اینکر نظر آ گیا۔ وہ ترچھے رخ پر آٹھ دس میٹر نیچے پڑا تھا۔ انہیں کسی قدر اطمینان ہوا۔ یہ قیمتی آلہ ہزاروں فٹ نیچے بھی جا سکتا تھا۔ نیچے ان کے سامان میں دو تین اینکرز اور بھی تھے لیکن جدید ڈیجیٹل اینکر یہ ایک ہی تھا۔

''اسے نکالنا ہوئیں گا۔ ورنہ سر سرمد ہام کا حلوا بنا دیں گا۔'' کرسٹل بولی۔

وہ دونوں رسے کی مدد سے اینکر کو نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ انہیں ایک آہنی ہک کی ضرورت تھی۔ ہک ان کے پاس نہیں تھا۔ انہوں نے ایک کاربینر کو ہی ہتھوڑی سے ٹیڑھا کر کے ہک کی شکل دی اور رسے کی مدد سے اس ہک کو اینکر میں پھنسانے کی کوشش کرنے لگے۔ حسبِ توقع جلدی واکی ٹاکی جاگ اُٹھا۔ کرسٹل نے اپنی بیلٹ میں سے واکی ٹاکی نکال کر کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سرمد صاحب ہی تھے۔

''کیا بات ہے، واپسی میں دیر کیوں کر رہے ہو؟'' انہوں نے انگلش میں کرسٹل سے پوچھا۔

''بس جناب نکل رہے ہیں۔'' کرسٹل نے بھی انگلش میں جواب دیا۔

''دیکھو مجھے لگ رہا ہے کہ موسم خراب ہونے والا ہے جلدی واپس آ جاؤ۔''

''او کے سر۔'' کرسٹل نے کہا۔

وہ دونوں مزید تندہی سے اینکر نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ عادل نے ٹارچ تھام رکھی تھی کرسٹل رسے کی مدد سے کوشش کر رہی تھی۔ ایک دو بار اینکر گرفت میں آتے آتے رہ گیا۔

اسی دوران میں سرمد صاحب کی کال پھر آ گئی۔ اس مرتبہ ان کی آواز میں نمایاں جھنجلاہٹ تھی۔ ''کیا بات ہے کرسٹل...... کیا کر رہے ہو تم؟''

''وہ سر...... وہ ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔ اینکر نیچے ایک دراڑ میں چلا گیا ہے۔ اسے نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' کرسٹل نے شستہ انگلش میں کہا۔

سرمد صاحب کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا یقیناً یہ ان کے لیے ایک گمبھیر مسئلہ تھا۔ انہوں نے تیز لہجے میں کرسٹل سے

تفصیل پوچھی۔ پھر جھلائے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''جلدی کرو۔ پانچ دس منٹ کے اندر اسے نکالو۔ تم دیکھ رہے ہو موسم کتنا بگڑ گیا ہے۔''

''اوکے سر۔'' کرسٹل کے لہجے میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔

عادل نے اطراف میں نگاہ دوڑائی۔ نہایت شاندار موسم، نہایت تیزی سے تبدیل ہوا تھا۔ شمال کے کسی نشیب سے اچانک ہی سیاہ بادلوں کے مرغولے برآمد ہوئے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے قرب وجوار کو ڈھانپ لیا تھا۔ کے ٹو کی عظیم الشان بلندیوں کی طرف سے نہایت تند وتیز ہوائیں سیاہ گھٹاؤں کو دھکیل دھکیل کر نشیب میں پہنچا رہی تھیں اور ان میں ہی رات کا سماں پیدا ہونے لگا تھا۔ یہ موسم چٹان سے اُترنے کے لیے ہرگز موزوں نہیں رہا تھا۔ کچھ دیر تک ایک شور کے ساتھ واکی ٹاکی پھر جاگا۔ اس کے ساتھ ہی بارش کے زوردار تریڑے پڑنے لگے۔ عادل اور کرسٹل بھاگ کر مختصر خیمے میں چلے گئے۔ واکی ٹاکی پر سرمد صاحب کی آواز اُبھری۔ اب آواز میں قدرے ٹھہراؤ تھا۔ ''کہاں ہو تم؟'' انہوں نے انگلش میں پوچھا۔

''ابھی اوپر ہی ہیں سر!'' کرسٹل نے جواب دیا۔

''اب ادھر ہی رُکو۔ نیچے آنے کی کوشش نہیں کرنا۔ یہ خطرناک ہوگا۔''

''اوکے سر! ہم خیمے میں ہیں۔ موسم ٹھیک ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔'' کرسٹل بولی۔

''اب یہ جلدی ٹھیک ہوتا نظر نہیں آتا۔ بہرحال جب تک میں نہ کہوں، اب تم خیمے میں ہی رہو۔''

موسم بگڑا تو پھر ایسا بگڑا کہ اس نے ٹھیک ہونے کا نام نہیں لیا۔ چنگھاڑتی ہواؤں کا شور تھا اور تیز بارش ہو رہی تھی۔ وہ دونوں جس خیمے میں تھے، وہ خاصا مختصر تھا۔ دو افراد ہی اس میں سما سکتے تھے۔ تھوڑا بہت سامان بھی تھا جس نے جگہ گھیری ہوئی تھی۔ بہرحال عادل اور کرسٹل کو اس بات کی تسلی تھی کہ بیرونی غلاف کی میخیں نہایت مضبوطی سے پتھریلی زمین میں گڑی ہوئی ہیں اور وہ اس طوفانی موسم میں بھی خیمے کو سنبھالے رکھیں گی۔

انسانی عقل نے کیا کیا تخلیق نہیں کیا؟ عادل نے سوچا، اگر اس خیمے پر ہی غور کیا جائے تو دماغ چکرا جاتا ہے۔ منفی پچاس درجہ حرارت اور ہزاروں میٹر کی بلندی پر نہایت سخت موسم میں بھی ایسے خیمے اپنے مکینوں کو اطمینان بخش ٹمپریچر فراہم کرتے ہیں اور ہر قسم کی موسمی یلغار سے محفوظ رکھتے ہیں۔

باہر موسم دھاڑ رہا تھا۔ دیوہیکل چوٹیوں کے درمیان وہ قریباً ڈیڑھ ہزار فٹ اونچی ایک خطرناک چٹان پر موجود تھے۔ ایک چھوٹا سا خیمہ جو اس وسیع وعریض بیکراں منظر میں ایک ذرے کی طرح حقیر نظر آتا تھا۔ بجلیاں کوند رہی تھیں، بادل گرج رہے تھے اور طوفانی بارش جیسے سب کچھ بہالے جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ انہوں نے ٹارچ روشن کر کے خیمے کی چھت سے آویزاں کی اور موسم کے تیور دیکھنے میں مصروف ہوگئے۔ جو کچھ بھی تھا لیکن اس چٹان کے اوپر وہ ایوالانچ سے محفوظ تھے اور ایوالانچ کے برفانی بہاؤ کے سوا اس خیمے کو اور کسی آفت سے خطرہ بھی نہیں تھا۔

شام کے بعد طوفان نے مزید شدت پکڑ لی۔ انہوں نے ٹن پیک فوڈ استعمال کیا۔ فوڈ کو بیٹری کے ذریعے گرم کرنے کا سسٹم بھی ان کے پاس موجود تھا۔ اس برفانی ویرانے میں اس شدید موسم کے اندر انہیں گھر جیسا کھانا ملا۔ گرم چکن قورما جیسے ابھی ہانڈی سے نکلا ہو اور چاول۔ یہ سب جدید ایجادات کے ثمرات ہی تو تھے۔ ٹن پیک کا طریقہ کار

''جادو'' کی طرح کام کرتا تھا۔

نہایت خراب موسم کی وجہ سے واکی ٹاکی بھی ٹھیک سے کام نہیں کر رہا تھا۔ شور زیادہ تھا، آواز کم سنائی دیتی تھی۔ سرمد صاحب نے کرسٹل اور عادل کو رات گزارنے کے حوالے سے کچھ ضروری ہدایات دیں، ان میں سب سے اہم ہدایت خیمے کی آہنی میخوں کی پڑتال کے متعلق ہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ سلیپنگ بیگز میں گھس کر لیٹ گئے۔

''تم کو زیادہ پین تو نائیں؟'' کرسٹل نے شیریں لہجے میں پوچھا۔

''نہیں، زیادہ تو نہیں۔''

''مطلب یہ کہ کچھ نہ کچھ ہے، چلو ہام تمہارا ٹریٹمنٹ کرتا۔''

عادل نے انکار کیا لیکن وہ اصرار کرتی رہی اور سلیپنگ بیگ میں سے نکل کر اس کے کندھے دبانے لگی۔ اس کے ہاتھوں میں واقعی جادو سا تھا۔ وہ جہاں جہاں ہاتھ رکھتی تھی درد جیسے نچوڑ کر نکال لیتی تھی۔ عادل کو راحت محسوس ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ بولا۔ ''بس اب رہنے دو۔ تم تھک گئی ہوگی۔''

''تم بھول رہا کہ ہام پروفیشنل ہے۔ یہ ہام کے کام کا حصہ، ہام نائیں تھکتا۔''

عادل کو اس کی قربت خطرناک لگ رہی تھی۔ اس کا لمس عادل کے جسم میں سنسناہٹ سی جگا رہا تھا۔ ہزاروں فٹ اونچی اس چٹان پر اس تنگ خیمے میں وہ بالکل تنہا تھے اور باہر طوفانی موسم رنگ دکھا رہا تھا۔ درد سے چھٹکارا محسوس ہوا تو عادل کو اونگھ آنے لگی۔ اسے لگا کہ وہ ایک بہت بڑے آسمانی جھولے میں ہلکورے لے رہا ہے۔ شہزادی اس کے بالکل قریب ہے، اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی ہے لیکن نہیں...... یہ شہزادی تو نہیں تھی، یہ تو کرسٹل تھی۔ وہ اپنی نرم پوروں کو اس کے بالوں میں حرکت دے رہی تھی، پھر اس نے اپنے ہونٹوں کو اس کے کان کے بالکل قریب لا کر سرگوشی کی۔ ''عادل! تم سو گئے؟''

''ہوں۔'' عادل نے غنودگی میں جواب دیا۔

کچھ دیر بعد عادل کو لگا کہ وہ اپنی انگلی اس کے کان میں گھما رہی ہے۔ پھر اس نے اپنے گرم ہونٹوں سے اس کے کان کو چھوا۔ ''نہ کرو کرسٹل......'' عادل نے کروٹ بدلی۔ وہ عقب سے پوری کی پوری اس کے ساتھ پیوست ہوگئی۔ عادل نے اسے دور ہٹانے کی کوشش کی۔ وہ ذرا فاصلے پر چلی گئی لیکن کچھ دیر بعد پھر قریب آگئی۔ اس کے انداز میں عجیب سی شوخی اور حرارت تھی۔ عادل کے اندر ایک آگ سی سلگنے لگی اور اس آگ سے اسے اندیشے محسوس ہونے لگے۔ اسے لگا کہ یہ تنہائی، یہ موسم اور یہ منہ زور قربت اسے کمزور کر رہی ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ خیمے سے نکلے اور باہر کے یخ بستہ موسم میں جا کھڑا ہو۔ کرسٹل کی پیش قدمی اب اور واضح ہوگئی تھی۔ وہ مغربی تہذیب کی پروردہ تھی۔ مرد وزن کی قربت اس کے لیے ایک کھیل سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتی تھی لیکن عادل کے لیے اس کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔ کسی کو کھونے یا پانے کا سوال تھا۔ زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ اس نے سوچا تو کیا آج وہ ہار جائے گا؟ یہاں اس جگہ شہزادی کی محبت کو ہار جائے گا؟

عادل کے اندر کمزوری محسوس کرنے کے بعد کرسٹل کا حوصلہ اب بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ چت لیٹا تھا۔ اس نے اسے باقاعدہ بانہوں میں لے لیا اور اپنے ہونٹوں کو اس کے چہرے سے ہم کلام کرنے لگی۔ اچانک ایک نیا خیال عادل کے

ذہن میں آیا۔ اس نے کرسٹل کو ذرا دھکیل کر خود سے پیچھے ہٹایا۔ ٹینٹ لیمپ کی مدھم روشنی میں اس کے تمتمائے چہرے کو دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ''کرسٹل! مجھے ایک بات سچ بتانا۔ جھوٹ نہ بولنا۔''

''کیسا بات؟''

''اینکر اتفاقاً دراڑ میں گرا تھا...... یا تم نے جان بوجھ کر......'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں اُبھرا۔ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''توم ہام پر شک کرتا؟''

''تم نے شک کرنے کی ٹھوس وجہ سامنے رکھ دی ہے۔ ایسا کیوں کر رہی ہو تم؟ اگر یہاں ایسا کچھ ہوا تو یہ میرے لیے...... بہت بُرا ہو گا...... بہت زیادہ۔''

اس نے تیزی سے ایک بار پھر عادل کے رُخسار کو چوما اور بولی۔ ''توم کا مطلب اگر ہام دونوں ''تو نائٹ'' ایک دوسرے کے کلوز آ جاتا تو یہ توم کے لیے ہارم فل ہوئیں گا۔''

''بالکل۔'' عادل نے بمشکل اس کے آتشیں بدن سے نظر چراتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟ ایسا کیوں ہوئیں گا؟''

''اس لیے کہ میں ایک لڑکی سے پیار کرتا ہوں۔ دل و جان سے اس کو چاہتا ہوں۔''

''تو اس سے کیا فرق پڑتا؟'' وہ آنکھیں جھپک کر بولی۔

''تم لوگوں کے لیے شاید نہ ہو لیکن ہمارے لیے یہ بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ ہم جب کسی سے پیار کرتے ہیں تو خود کو اس کی امانت سمجھتے ہیں اور وہ بھی خود کو ہماری امانت سمجھتا ہے۔ ایک دوسرے کا خیال دل میں بسائے اپنی منزل کو پانے کی خواہش دل میں پالتے ہیں۔ دوری سہتے ہیں، دُکھ جھیلتے ہیں، اندر ہی اندر ٹوٹتے بکھرتے ہیں لیکن ایک امید کے سہارے چلتے رہتے ہیں۔ اور یہ امید...... اور یہ طاقت کہاں سے پیدا ہوتی ہے؟ یہ اس احساس سے پیدا ہوتی ہے کہ ہم وفا کر رہے ہیں۔ ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کی آرزو کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔''

وہ غور سے عادل کا چہرہ دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''پلیز ڈونٹ مائنڈ...... اس کے باوجود بھی اکثر آپ لوگ ناکام ہی ہوتے ہیں۔''

''ہم اس ناکامی کو بھی کامیابی ہی کی طرح گلے سے لگاتے ہیں کرسٹل! بس ہم ایسے ہی ہیں، ہمیشہ سے ایسے ہی ہیں۔''

وہ انگریزی میں بولی۔ ''زندگی بس آہیں بھرنے کا نام ہی تو نہیں عاڈل! زندگی تو وہی ہے بس...... جو ہم جی لیتے ہیں۔ خوشیاں وہی ہوتی ہیں جو حقیقی زندگی میں ہمیں مل جائیں۔ باقی تو سب وہی ہے نا جسے ہندی میں ''سندر سپنا'' کہا جاتا ہے اور اردو میں شاید ایسا ہی کوئی اور لفظ ہے۔''

''مشرق اور مغرب میں یہ فرق تو ہمیشہ ہی رہے گا۔''

وہ اس سے بغل گیر ہو گئی اور اس کا رخسار چوم کر بولی۔ ''ہام کا خیال توم کے خیال سے بہت مختلف ہائیں لیکن ہام توم پر زبردستی کچھ نائیں ٹھونسے گا۔ ہاں توم کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرتا رہیں گا۔''

باہر بارش مسلسل جاری تھی۔ وادیوں اور چوٹیوں پر بادل دھاڑ رہے تھے، ان کی چمک خیمے کے اندر تک آتی تھی۔

عادل کا خیال تھا کہ شاید وہ شہزادی کے بارے میں اور کچھ پوچھے گی لیکن اس نے یہ موضوع نہیں چھیڑا۔ وہ پہلو بہ پہلو لیٹے رہے اور موسم کی جولانیاں دیکھتے رہے۔ کرسٹل جیسی شعلہ صفت اور آزاد خیال لڑکی کے اتنا قریب رہ کر اس سے دور رہنا کافی صبر آزما بلکہ تکلیف دہ تھا لیکن عادل یہ تکلیف جھیلتا رہا۔ بہر حال یہ سنسنی خیز رات گزر گئی اور صبح ہو گئی۔

بارش ختم ہو چکی تھی لیکن دور گہری وادیوں میں ابھی تک بادلوں کے لشکر خیمہ زن تھے جیسے رات بھر کے معرکے کے بعد اب ستا رہے ہوں۔ عادل نے خیمے سے باہر نکل کر دیکھا۔ نیچے اپنا پڑاؤ اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ پڑاؤ دیکھنے کے لیے اسے تھوڑا آگے جانا پڑا۔ نیچے گہرائی میں خیمے دکھائی دے رہے تھے مگر بہت واضح نہیں تھے۔ بادلوں کے پرے خیموں کے اردگرد لوگ موجود تھے۔ اسے لگا کہ جیسے سرمد صاحب خیمے سے باہر ہیں اور چٹان کی چوٹی کی طرف ہی دیکھ رہے ہیں۔ یہاں سامان میں ٹیلی سکوپ موجود نہیں تھی۔ عادل نے اندازاً ہی ان کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ چند سیکنڈ بعد ہیولا، جو یقیناً سرمد صاحب کا ہی تھا، دُھند نما بادلوں میں چھپ گیا۔ کرسٹل نے واکی ٹاکی پر سرمد صاحب سے رابطہ کیا۔

''سر! ہام نیچے آنے کے لیے ریڈی ہے لیکن پہلے ہام اینکر باہر نکالنے کی ٹرائی کریں گا۔''

''ٹھیک ہے...... کوشش کرو کہ وہ کسی طرح نکل آئے۔''

''او کے سر۔'' کرسٹل نے ادب سے کہا۔

ان دونوں نے قریباً ایک گھنٹہ مزید کوشش کی۔ ایک بار تو اینکر آہنی کنڈے میں پھنس بھی گیا لیکن دس پندرہ فٹ اوپر آ کر دوبارہ پھسل گیا۔ تھک ہار کر گیارہ بجے کے لگ بھگ کرسٹل اور عادل طے شدہ طریقے کے مطابق نیچے اُتر آئے۔ کاربینرز کے اندر نائلون کے مخصوص رسے پھسلتے چلے گئے اور وہ چھوٹی چھوٹی جستوں کے ذریعے نیچے اُترتے گئے۔ اس سے پہلے عادل یہ عمل اندازاً دس منٹ میں مکمل کر رہا تھا لیکن کندھوں اور گردن کی تکلیف کے سبب اس نے کرسٹل جتنا وقت ہی لیا۔ یعنی قریباً پندرہ منٹ۔

○......❖......○

پاؤندوں نے ایک بار پھر کرسٹل کو دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ ان کا انداز بڑا تاؤ دلانے والا ہوتا تھا۔ ہمایوں کو انفلوئنزا تھا اور وہ شدید بخار بھی محسوس کر رہا تھا۔ تاہم سرمد صاحب کی روایت پر چلتے ہوئے اس نے بھی کوئی دوا نہیں کھائی تھی اور روزمرہ کے چھوٹے موٹے کام بھی انجام دے رہا تھا۔ پاؤندے اپنے ساتھ تین بڑے بڑے خچر بھی لائے تھے۔ ان میں سے ایک خچر پر بہت سی خشک لکڑیاں لدی ہوئی تھیں۔ رات کے وقت پہریدار کبھی کبھی آگ بھی روشن کر لیتے تھے۔ سرمد صاحب کو مکمل رپورٹ دینے کے بعد عادل اپنے خیمے میں چلا گیا۔ وہ ایک بار پھر درد محسوس کرنے لگا تھا۔ خیمہ خالی تھا۔ انفلوئنزا کی وجہ سے ہمایوں کو سرمد صاحب نے علیحدہ خیمہ دیا ہوا تھا۔ اپنے درد سے لڑتے لڑتے عادل جلد ہی اونگھنے لگا اور پھر سو گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو رات ہو چکی تھی۔ کرسٹل اس کے خیمے میں موجود تھی۔ آج اس نے بال سنوارے ہوئے تھے اور خوب نکھری ہوئی نظر آتی تھی۔ وہ اس کے سر اور گردن کا مساج کرنا چاہتی تھی لیکن اب عادل کو اس عمل میں شدید خطرات نظر آتے تھے۔ وہ آناً فاناً جذبات کی ہر حد تک چلی جانے والی لڑکی تھی۔ آج عادل نے اس کو خود سے دور ہی رکھا۔ کرسٹل نے اپنے سامنے عادل کو کھانا کھلایا۔ اپنی شوخیِ حسن اور اداؤں سے عادل کے دفاع کی پتھریلی دیوار میں

شگاف ڈالنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر باقی کا کام شاید آئندہ پر چھوڑ کر چلی گئی۔

رات کو پھر تیز بارش ہوتی رہی۔ صبح بارش تو رُک گئی لیکن بادلوں کے پرے قرب و جوار میں منڈلاتے رہے۔ کے ٹو کی فلک بوس چوٹی بھی سیاہی مائل بادلوں میں چھپی ہوئی تھی۔ ناشتے کے فوراً بعد سرمد صاحب، عادل کے خیمے میں داخل ہوئے۔ ان کا زخمی کندھا ابھی تک پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا۔ ''عادل! رات بھر بارش ہوتی رہی ہے اور لگتا ہے کہ آج پھر دوپہر کے بعد یہ سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اگر وہ اینکر وہیں اوپر بارش میں پڑا رہا تو خراب ہو جائے گا۔ اس میں ''ڈیجیٹل سینسر'' لگے ہوئے ہیں جو زیادہ دیر پانی میں رہنے سے ڈسٹرب ہو جائیں گے۔ یہ کافی قیمتی آلہ ہے۔ سب سے اہم یہ کہ یہ آگے چل کر ہمیں کام دینے والا ہے۔ ہمیں آج کوشش کر کے اسے اُتار لینا چاہیے۔''

''جج...... جی سر۔''

''ہمایوں تو ابھی تک بخار میں پڑا ہے۔ تمہیں اور کرسٹل کو ہی تھوڑی ہمت کرنا پڑے گی۔ میں نے تین چار طرح کی ہکس تیار کر دی ہیں، ان میں ایک مقناطیسی ہک بھی ہے۔ مجھے امید ہے تم لوگوں کو رسی کے ذریعے اینکر نکالنے میں زیادہ دقت نہیں ہو گی۔''

عادل کو دل ہی دل میں کچھ جھلاہٹ محسوس ہوئی لیکن اس نے اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اس کے سر اور گردن کے درد میں تھوڑا سا افاقہ ہوا تھا۔ اگر آج پھر وہ مشقت کرتا تو بات دوبارہ وہیں پر آ جاتی۔

''تم چپ ہو گئے ہو۔'' سرمد صاحب نے استفسار کیا۔

''نن...... نہیں...... جیسے آپ کہتے ہیں۔'' عادل نے کہا۔

اسے اندازہ ہوا کہ سرمد صاحب نے شاید اس کی اندرونی کیفیت کو محسوس کر لیا ہے۔ اس دوران میں رابے خاں کے گرجنے برسنے کی آواز آنے لگی۔ وہ اپنی بیوی سمونہ سے کسی بات پر جھگڑ رہا تھا۔ وہ بھی بلند آواز میں بول رہی تھی۔ رابے خاں نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ برف پر جا گری۔ داخون ان کے درمیان بیچ بچاؤ کی کوشش کرنے لگا۔ سرمد صاحب بھی باہر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد یہ معاملہ ٹھنڈا ہو گیا...... اور سمونہ کی چنگھاڑتی ہوئی آواز دھیرے دھیرے ایک بھنبھناہٹ میں بدل گئی۔

عادل خیمے میں گم صم لیٹا تھا۔ کسی وقت سرمد صاحب کا رویہ اسے پریشان کر دیتا تھا۔ وہ جانتے بھی تھے کہ وہ پوری طرح فٹ نہیں ہے اس کے باوجود اسے ریسٹ نہیں دے رہے تھے۔ حوصلے اور برداشت کا مظاہرہ دوسری بات ہے، اپنی ہمت سے بڑھ کر تکلیف جھیلنا اور خود کو بیمار کر لینا دوسری بات۔ وہ دیر تک اپنے آپ میں اُلجھا رہا۔ وہ خود تو سرمد صاحب سے کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ کرسٹل کے ذریعے اپنے دل کی بات سرمد صاحب تک پہنچا دے۔ مگر کچھ دیر بعد اس نے ایک منظر دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ خیمے کے روزن میں سے اسے وہی مشق والی بلند و بالا چٹان نظر آئی جو ایک مستطیل بلاک کی طرح ڈیڑھ دو ہزار فٹ کی بلندی تک چلی گئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ کرسٹل اس پر چڑھائی کر رہی ہے اور اس کے ساتھ خود سرمد صاحب ہیں...... ہاں، وہ سرمد صاحب ہی تھے۔ ان کے کندھے کا زخم ابھی کچا تھا۔ اس میں ٹانکے لگے ہوئے تھے۔ بازو ہلانے جلانے میں بھی انہیں دقت ہوتی تھی لیکن وہ رسوں کے ذریعے کلائمبنگ کر رہے تھے۔ یہ تو دیوانہ پن تھا۔ عادل بیتاب ہو کر خیمے سے نکل آیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ دوڑ کر جائے اور آواز دے کر سرمد

صاحب کو اوپر جانے سے روک لے لیکن وہ اب کافی بلندی پر جا چکے تھے۔ تین چار سو فٹ کی کلائمبنگ ہو چکی تھی۔ وہ صم بکم وہیں کھڑا رہا۔

اسے خود پر افسوس ہونے لگا۔ اس نے سرمد صاحب کے سامنے تذبذب کا رویہ کیوں دکھایا۔ اسے کرسٹل پر بھی افسوس ہوا کہ اس نے اسے بے خبر رکھا۔ بہرحال اب کیا ہو سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

سرمد صاحب اور کرسٹل کی واپسی قریباً دو گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ اینکر واپس لانے میں کامیاب رہے تھے۔ عادل نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ سرمد صاحب کے کندھے کی ڈریسنگ خون آلود ہو رہی تھی۔ مگر ان کا چہرہ...... اس پر کرب یا کسی طرح کی ناراضی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ بالکل نارمل انداز میں عادل کی طرف آئے اور مسکراتے لہجے میں بولے۔ ''بہت اچھا ہوا کہ میں خود چلا گیا، ورنہ تم دونوں کو شاید دقت ہوتی۔''

عادل دل گرفتہ انداز میں بولا۔ ''لیکن سر! آپ کو اپنے زخم کا خیال کرنا چاہیے تھا۔ دیکھیں ساری پٹی بھیگ رہی ہے۔''

''نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ابھی دوسری ڈریسنگ کر لیتا ہوں۔'' انہوں نے کہا اور عادل کا کندھا تھپکتے ہوئے اپنے ٹینٹ کی طرف چلے گئے۔

عادل نے کرسٹل کو گھورا۔ ''بہت افسوس ہے کرسٹل! تمہیں سر کو روکنا چاہیے تھا۔''

''وہ جب کوئی فیصلہ کرتا تو پھر نائیں رُکتا۔ ان کے لیے یہ سب کچھ نارمل...... تو م ان کو آچھی طرح نائیں جانتا، مگر ہام جانتا۔''

سرمد صاحب کے زخم کے دو تین ٹانکے ٹوٹ گئے تھے۔ کافی بلیڈنگ بھی ہوئی تھی۔ کرسٹل کے مطابق ٹانکے دوبارہ لگانا مناسب نہیں تھا۔ بہرحال اس نے اچھی طرح ڈریسنگ کر دی۔ اس نے بہت اصرار کر کے سرمد صاحب کو اینٹی بایوٹک ڈوز بھی دی۔ وہ حسبِ معمول خوش دلی کے ساتھ کرسٹل اور عادل سے باتیں کرتے رہے۔

سچ کہتے ہیں کہ کسی اچھی بات کی زبانی تلقین کے بجائے اس کا عملی مظاہرہ زیادہ اثر رکھتا ہے۔ سرمد صاحب نے جو کچھ کیا تھا، وہ عادل کے ذہن میں جیسے بہت گہرائی تک اُتر گیا تھا۔ وہ دیر تک اس بارے میں سوچتا رہا۔ شام کو اس نے سرمد صاحب کو بالکل خوش و خرم پایا۔ وہ اپنے بازو کو بھی معمول کے مطابق حرکت دے رہے تھے۔ کچھ دیر بعد جب وہ خیمے میں اکیلے تھے، عادل ان کے پاس جا بیٹھا۔ ''سر! میں اپنے صبح والے رویے پر بہت شرمندہ ہوں۔ میری سُستی کی وجہ سے آپ کو زخمی حالت میں کرسٹل کے ساتھ جانا پڑا۔''

''نہیں، تم نے تو ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی۔ مجھے خود ہی لگا کہ مجھے خود کو تھوڑا سا ایکٹیو کرنا چاہیے۔ اور دیکھو، اس کا نتیجہ اچھا ہی نکلا ہے۔ زخم میں جو تھوڑا بہت ''پس'' تھا، وہ بھی نکل گیا ہے اور میں خود کو ہلکا محسوس کر رہا ہوں۔''

''لیکن سر! آپ نے بہت تکلیف تو برداشت کی نا......''

''تکلیف تو ہوتی ہی برداشت کرنے کے لیے ہے اور اسی کے اندر سے تو خوشی پھوٹتی ہے۔'' انہوں نے اتنے یقین سے کہا جیسے ''تکلیف'' کسی ٹھوس شے کا نام ہو اور وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اس میں سے خوشی کو پھوٹتے دیکھ رہے ہوں۔

عادل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''سر! آپ نے یہ تکلیف اور برداشت والی بات پہلے بھی ایک دو دفعہ کی ہے مجھے معاف کیجیے گا، سننے میں تو یہ باتیں اچھی لگتی ہیں لیکن جب ہم واقعی شدید تکلیف کا سامنا کرتے ہیں تو پھر ہمت جواب دینے لگتی ہے۔''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''میرا خیال ہے تم جسمانی تکلیف کی بات کر رہے ہو...... جسمانی تکلیف دراصل اتنی ہوتی نہیں جتنی ہم اسے محسوس کرتے ہیں۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کا پیٹ تیز دھار آلے سے چیر دیا جائے اور انتڑیاں وغیرہ نکال کر باہر رکھ دی جائیں تو اس کی حقیقی تکلیف بس کٹ لگنے کی ایک ٹیس ہوتی ہے۔ جو آسانی سے برداشت کی جاسکتی ہے لیکن اگر مریض ہوش وحواس میں ہو اور یہ سارا عمل اپنی آنکھوں سے دیکھے تو درد کی وجہ سے بدحال ہو جائے۔ تو یہ سارا درد دراصل ہماری اپنی سوچ اور پچھلے تجربات کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اٹلی کے ایک ایسے ڈاکٹر کو دیکھا ہے جس کے بازو کی ہڈی کار ایکسیڈنٹ میں بُری طرح ٹوٹ گئی تھی۔ اسے بیہوش کرنا مناسب نہیں تھا۔ سرجن نے اس کے سامنے اس کی ہڈی ''مشینی آری'' سے کاٹی اور وہ سکون سے بیٹھا دیکھتا رہا۔ اسے پتا تھا کہ ہڈی میں اعصاب نہیں ہوتے لہٰذا اس میں درد بھی نہیں ہوتا۔ کوئی اور شخص ہوتا تو وہ شاید بے پناہ درد محسوس کرتا۔ دراصل جب ہم اپنے درد میں ڈوب جائیں اور اس کی اصل شدت کو جانچیں تو وہ اپنی ظاہری شدت سے کہیں کم نکلتی ہے۔''

''اور جناب جو ذہنی اذیت یا پریشانیاں ہیں ان کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔''

''سب سے اہم بات تو یہی ہے جو آج کل نفسیات دان اور سوشیالوجسٹ پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں اور وہ یہ کہ ہمارے زیادہ تر فکر اور اندیشے دراصل فکر اور اندیشے ہی ہوتے ہیں۔ قریباً نوے فیصد اندیشے کبھی بھی حقیقت کا روپ نہیں دھارتے۔ اس لیے مستقبل کے بارے میں پریشان ہونے کے بجائے ہمیں حال پر نظر رکھنی چاہیے اور حال کے مسئلوں کو حل کرنا چاہیے۔ لیکن یہ ایک طویل موضوع ہے پھر کبھی سہی۔ اس وقت میں تم سے ایک اہم سوال پوچھنا چاہ رہا ہوں۔''

''جی پوچھیں۔'' عادل نے ادب سے کہا۔

''کیا تم شہزادی کو واقعی بہت زیادہ چاہتے ہو؟''

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''اس میں کوئی شک نہیں جناب! اس کو حاصل کرنے کے لیے میں سر دھڑ کی بازی لگا سکتا ہوں۔''

''تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم اسے حاصل کر لو گے۔ جب بندہ کسی منزل کو اپنے ذہن میں رکھ کر شدید جسمانی اور ذہنی تکلیف جھیلتا ہے اور اپنے قدم روکتا نہیں تو وہ ضرور منزل پر پہنچتا ہے...... اور مجھے لگتا ہے کہ تم ایسا کر رہے ہو۔ شرط صرف ایک ہی ہے، مایوس ہو کر اپنے قدموں کو روکنا نہیں۔''

''سر! کسی وقت میں بہت پریشان ہو جاتا ہوں، سوچتا ہوں کہ میں تو اپنے گاؤں سے اتنی دور یہاں ان برفوں میں نکل آیا ہوں۔ وہاں پتا نہیں کیا ہو رہا ہو گا۔''

''کچھ نہیں ہو گا ان شاء اللہ۔ تم نے جو کچھ مجھے بتایا ہے، اس سے یہی پتا چلتا ہے کہ تمہارے تایا جان اپنا وعدہ

نبھائیں گے۔ انہوں نے یہی کہا ہے نا کہ اگر تم نے کچھ کرنا ہے تو ڈھائی تین سال کے اندر کر کے دکھاؤ۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کے دل کا حال بھی بہت حد تک جانتے ہیں۔''

''لیکن سر! میں اپنے دل کا کیا کروں؟ یہ ہر وقت اسی طرف لگا رہتا ہے۔''

''یہی تو وہ ذہنی کوفت ہے جس کا میں نے تمہیں ابھی بتایا ہے۔ ہم جس منزل کے لیے جسم کو دُکھ دیتے ہیں اور اپنے دل و دماغ کو دُکھ دیتے ہیں وہ ہمارے قریب آنا شروع ہو جاتی ہے۔ شرط صرف اور صرف ایک ہی ہے، ہم حوصلہ نہ ہاریں۔''

عادل بولا۔ ''آپ نے ذہنی کوفت کی بات کی ہے اور یہ کوفت تو میں محسوس کرتا ہوں سر! اور کئی طرح سے کرتا ہوں۔ پتا نہیں کہ مجھے آپ کو بتانا چاہیے یا نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ کبھی کبھی یہ کرسٹل بھی میرے لیے بہت بڑی کوفت بن جاتی ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے یہ امتحان لے رہی ہے میرا۔''

سرمد صاحب گہری نظروں سے عادل کی طرف دیکھنے لگے۔ بالکل خاموش اور کھوئے ہوئے سے۔ پھر ان کے ہونٹوں پر مدھم سا تبسم اُبھرا اور بولے۔ ''میرا خیال ہے کہ جو تم کہنا چاہتے ہو، میں وہ سمجھ رہا ہوں۔ یہ کرسٹل فطری طور پر بُری لڑکی نہیں ہے لیکن اس کا پرابلم یہ ہے کہ یہ ایک آزاد معاشرے میں پلی بڑھی ہے۔ ان لوگوں کے نیکی بدی کے اپنے پیمانے ہیں۔ مجھے کئی دن پہلے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ تمہاری طرف جھکاؤ رکھتی ہے۔ اگر میں اسے منع کرتا تو یہ منع ہو جاتی لیکن پتا نہیں کیوں، میں نے اس حوالے سے اس کے ساتھ کوئی بات نہیں کی۔''

''آپ کے ذہن میں کیا تھا سر؟''

''اگر اب میں تمہیں بتاؤں گا تو شاید تم یقین نہ کرو یا میرا مذاق اُڑانے لگو گے لیکن میرے کچھ اپنے خیالات ہیں اور ان خیالات پر مجھے بے پناہ یقین ہے، عام لوگ شاید ان کو بیوقوفی سمجھیں اور شاید تم بھی یہی سمجھو۔''

''نہیں سر! مجھے تو لگتا ہے کہ آپ عام لوگوں سے آگے سوچ لیتے ہیں۔ مجھے اپنی سوچ آپ کے سامنے کبھی کبھی بہت چھوٹی محسوس ہونے لگتی ہے۔''

وہ طویل سانس لے کر بولے۔ ''یہ بات پھر وہیں پر آتی ہے عادل! کسی کے لیے جسمانی اور ذہنی تکلیف سہنا۔ یہ جو کسی کی خاطر اپنے آپ کو دنیاوی لذتوں اور بُرائیوں سے بچانا ہوتا ہے، یہ بھی ذہنی تکلیف کی ایک قسم ہی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ تم یہ تکلیف جھیل رہے ہو۔ میرا مطلب ہے کہ کرسٹل کی قربت سے خود کو بچایا ہے تم نے۔ اس بات پر پورا بھروسہ رکھو عادل! تکلیفیں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں۔ یہ ہماری منزلوں کو ہمارے قدموں کی طرف کھینچتی ہیں۔ اس عمل میں دیر تو ہو سکتی ہے اندھیر نہیں۔''

وہ سرمد صاحب کی بات کی گہرائی میں اُترنے کی کوشش کرنے لگا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ جب وہ کرسٹل کی پیش قدمی کو رَد کرتا تھا اور کامیاب ہوتا تھا تو اس کے اندر ایک عجیب سا یقین اُبھرنے لگتا تھا۔ اس کے رگ و پے میں ایک اضافی توانائی پیدا ہوتی تھی اور یہ توانائی کہتی تھی، تم وفا کر رہے ہو اور وفا رائیگاں نہیں جاتی۔

O......❖......O

اگلے روز عادل نے نہ صرف ہمایوں کے ساتھ مل کر ڈیڑھ دو ہزار فٹ تک کلائمبنگ کی بلکہ زبردست رزلٹ بھی

دیا۔ رابے خاں اور اس کے ساتھی بھی عادل کی کارکردگی پر حیران ہوئے۔ وہ منجھے ہوئے کوہ پیماؤں کی طرح پرفارمنس دے رہا تھا بلکہ کہیں کہیں تو چونکا دینے والی تیزی دکھا جاتا تھا۔ یہ سب اس توانائی کا کرشمہ تھا جو کل سرمد صاحب کی برداشت اور ہمت نے اس کے اندر پیدا کی تھی۔ عادل کی اس دلیرانہ جدوجہد کا نتیجہ اچھا ہی نکلا۔ ایک تو اس کا یہ وہم دور ہوا کہ وہ مشقت کرے گا تو اس کی گردن اور کندھوں کا درد بڑھ جائے گا۔ دوسرے سہ پہر تک اس نے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنا شروع کر دیا۔ اس کے سر کا درد تو تقریباً معدوم ہو چکا تھا۔

تیسرے روز وہ لوگ ٹریکنگ کے لیے بانگڑی پہاڑ کی طرف نکلے۔ اب چوٹی پر چڑھائی کے دن قریب آ رہے تھے اور ضروری تھا کہ وہ اس پہاڑ اور اس کے راستوں کو نسبتاً قریب سے دیکھیں۔ ہمایوں اب بالکل ٹھیک تھا مگر سرمد صاحب انفلوئنزا میں مبتلا ہو گئے تھے۔ وہ اس حالت میں بھی 'بانگڑی' کی طرف جانے کو بخوشی تیار تھے لیکن کرسٹل اور ہمایوں نے اصرار کر کے انہیں آرام کرنے کے لیے کہا۔ کرسٹل، ہمایوں اور عادل کے ساتھ رابے خاں کے دو ساتھی بھی تھے۔ ان میں سے ایک کا نام رمزی خاں تھا۔ رمزی خاں علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا اور پاؤندہ بستی میں اسے ''راستوں کا کیڑا'' کہا جاتا تھا۔ چوٹی کے اردگرد کے تمام معروف اور غیر معروف راستے اسے ازبر تھے۔ یہ لوگ صبح سات بجے کے لگ بھگ ناشتے کے فوراً بعد روانہ ہوئے۔ ایسی ٹریکنگ میں کسی برف پوش دراڑ میں گرنے کا خطرہ موجود رہتا ہے، اس لیے ان سب نے خود کو ایک رسے سے منسلک کر رکھا تھا۔ سروں پر ہیلمٹ تھے۔ رمزی خاں کے پاس پستول موجود تھی اور یہ اس نے کندھے پر لٹکانے کے بجائے ہاتھ میں لے رکھی تھی۔ یہ موچھیل بہت چوکس شخص تھا اور کیمپ میں بھی ہر وقت سرمد صاحب اور ان کے ساتھیوں پر عقابی نظر رکھتا تھا۔

موسم ٹھیک تھا۔ برفیلی چوٹیاں رُوپہلی کرنوں میں چمک رہی تھیں۔ ان سب نے کانٹے دار جوتے Crampons پہن رکھے تھے۔ اپنی واکنگ اسٹکس کے سہارے وہ برف پوش راستوں پر چلتے آگے بڑھتے رہے۔ یوں تو بانگڑی چوٹی کیمپ سے قریب ہی نظر آتی تھی لیکن جب انہوں نے چلنا شروع کیا تو وہ جیسے دور ہٹتی گئی۔ عادل نے کہا۔ ''ہمایوں بھائی! تمہارا کہا درست ہی تھا۔ پہاڑ کے دامن تک کم از کم سات آٹھ کلومیٹر کا سفر تو ہے۔''

ہمایوں نے حسبِ معمول اثبات میں سر ہلا کر ''ہاں'' میں جواب دیا۔ دوپہر بارہ بجے تک چلنے کے باوجود وہ پہاڑ کے دامن سے تین کلومیٹر دور تھے۔ پہاڑ اب بہت واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ یقیناً اس جانب سے چڑھائی کے لیے یہ ایک ہیبت ناک پہاڑ تھا۔ لگتا تھا کہ آٹھ دس ہزار فٹ اوپر جانے کے بعد چڑھائی کا کچھ پورشن بہت دشوار ہو جائے گا۔ شاید یہی وہ مشکل پورشن تھا جس کے لیے سرمد صاحب کو عادل کی خصوصی مہارت کی ضرورت تھی۔

رمزی نے کہا۔ ''اب کیا چاہتا ہے تم لوگ...... اور آگے جایا جائے یا واپس چلیں؟''

ہمایوں نے کہا۔ ''اب اتنی دور آ گئے ہیں تو کچھ اور پاس چلے جاتے ہیں۔''

''خو تو پھر جلدی کرو۔ ام کو شام سے پہلے کیمپ میں واپس بھی پہنچنا ہے۔''

کرسٹل اردگرد کے منظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ یہ جگہ اسے بہت اچھی لگی تھی۔ یہاں ہر طرف برف تھی اور ایک چھوٹا سا گلیشیر دھوپ کی تمازت سے ڈھلوان پر سرک سرک کر نیچے گر رہا تھا۔ وقفے وقفے سے پُرشور گونج پیدا ہوتی تھی۔ برف نے پگھل پگھل کر عجیب و غریب مجسموں کی شکلیں دھار رکھی تھیں۔ کرسٹل کا دل فوٹو گرافی کو چاہ رہا تھا۔ اس

کے اپنے گال بھی دھوپ اور مشقت سے سرخ شہابی ہو رہے تھے۔ وہ بولی۔ ''ہام یہاں بیٹھتا ہے ہمایوں! تم لوگ آگے کا راؤنڈ لگا آؤ۔''

''کیا آپ تھک گئی ہیں؟'' ہمایوں نے پوچھا۔

''نائیں، ایسا بات نائیں۔ بس ہام کو یہاں بیٹھنا اچھا لگ رہا۔''

''ٹھیک ہے، ہم ایک گھنٹے کے اندر واپس آ جاتے ہیں۔ آپ نے یہیں پر رہنا ہے۔'' ہمایوں نے کہا۔

''او کے!'' وہ بولی اور اپنا کیمرا درست کرنے میں مصروف ہو گئی۔

وہ لوگ آگے روانہ ہو گئے۔ آگے راستہ نسبتاً آسان تھا۔ بہر حال برف اور نیلے آسمان کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بانگڑی کے کافی نزدیک پہنچ کر انہوں نے تصویریں کھینچیں اور ایک ویڈیو بھی بنائی۔ رمزی اور ہمایوں کلائمبنگ کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ عادل اردگرد کے ہوشربا مناظر میں کھویا رہا۔

جلد ہی وہ لوگ واپس روانہ ہو گئے۔ جب وہ ''سرکتے ہوئے گلیشیر'' کے پاس پہنچے تو ایک حیرت ان کی منتظر تھی۔ کرسٹل کہیں نظر نہیں آئی۔ عادل نے سمجھا شاید وہ کسی نشیب میں اُتری ہوئی ہے۔ ہمایوں اور عادل نے کرسٹل کو آوازیں دیں لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ اچانک عادل کی نگاہ ایک چیز پر پڑی اور اس کو اپنا سارا خون سر کو چڑھتا محسوس ہوا۔ ''وہ دیکھو ہمایوں بھائی!'' عادل نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

ہمایوں نے بھی گھوم کر دیکھا۔ کرسٹل کے کیمرے کا اسٹینڈ برف پر پڑا تھا اور پاس ہی کیمرے کا ڈھکن بھی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دونوں دوڑ کر وہاں پہنچے۔ یہاں ایک نشیب تھا۔ ذہن میں آیا کہ شاید وہ پھسل کر نیچے گر گئی ہے لیکن وہ وہاں بھی نہیں گئی تھی۔ اب رمزی خاں اور اس کا ساتھی بھی فکرمند نظر آ رہے تھے۔ رمزی خاں نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھو۔''

وہ چند قدم آگے گئے۔ یہاں قدرے نرم برف پر گھسیٹے جانے کے نشان صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ان نشانوں کے اردگرد کرسٹل کے قدموں کے نشان تھے اور اس کے علاوہ کسی اور کے قدموں کے نشان بھی تھے۔ یہ کسی مرد کے قدم تھے۔ ہمایوں نے عادل سے مخاطب ہو کر تیز سرگوشی میں کہا۔ ''مجھے لگتا ہے یہ کسی پاؤندے کے قدم ہیں۔ شاید...... کرسٹل کو زبردستی یہاں سے لے جایا گیا ہے۔''

ایک دم عادل کے ذہن میں داخون کا منحوس چہرہ گھوم گیا۔ ویسے تو تقریباً سارے پاؤندے ہی کرسٹل کو جلتی نظروں سے دیکھتے تھے مگر داخون کی ہوسناک نظریں سب سے جدا تھیں۔ وہ تو شاید اسی دن کرسٹل کے ساتھ کچھ کر گزرتا جس دن عادل نے رابے خان وغیرہ کے سوالوں کا جواب دینے سے انکار کیا تھا اور اپنے ساتھیوں کی یہاں موجودگی کے بارے میں چھپایا تھا۔

''کہیں ایسا تو نہیں...... ہمایوں بھائی کہ...... داخون یا کوئی دوسرا ہمارے پیچھے پیچھے یہاں آیا ہو؟''

''کیا کہا جا سکتا ہے۔'' ہمایوں کی آواز پریشانی کی شدت سے ٹوٹ رہی تھی۔

انہوں نے ایک بار پھر کرسٹل کو پکارنا شروع کیا۔ ویران برفستان میں جیسے ان کی صدائیں بس ہواؤں میں ہی گونج کر رہ جاتی تھیں۔ ''واکی ٹاکی پر سرمد صاحب سے رابطہ کرو ہمایوں بھائی۔'' عادل نے مشورہ دیا۔

ہمایوں نے واکی ٹاکی آن کیا مگر سگنل ٹھیک نہیں آ رہے تھے۔ شور کے سوا کچھ سنائی نہیں دیا۔ ہمایوں کافی دیر تک ''سر...... سر'' پکارتا رہا لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ واکی ٹاکی بند کر کے وہ مختلف اطراف میں پھیل گئے اور کرسٹل کو تلاش کرنے لگے۔ کوئی چالیس پچاس میٹر آگے عادل کو برف پر ایک براؤن سی چیز دکھائی دی۔ یہ کرسٹل کی ٹوپی تھی۔ یہاں بھی قدموں کے نشان موجود تھے مگر صرف ایک شخص کے۔ یوں لگتا تھا کہ کرسٹل کے ساتھ زبردستی کرنے والے نے اسے اُٹھا لیا ہے...... شاید بیہوش کر کے یا پھر ویسے ہی۔ صورتِ حال اب بالکل واضح ہوتی جا رہی تھی۔ کرسٹل کے ساتھ کچھ ہو چکا تھا۔ زمینی شہادتیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ وہ لوگ ان شہادتوں کا پیچھا کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ موچھیل پاؤندے نے تو اپنی رائفل پہلے ہی ہاتھ میں تھامی ہوئی تھی، رمزی خاں نے بھی اپنا پستول نکال لیا۔ وہ سب کرسٹل کی طرف سے شدید خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں اپنی طرف سے بھی خطرہ تھا۔ کوئی شخص کسی اوٹ میں موجود ہو سکتا تھا اور ان پر فائر کر سکتا تھا۔ ایک سنگین واقعہ رُونما ہو گیا تھا اور اس کے نتیجے میں مزید سنگینیاں رُونما ہو سکتی تھیں۔

''کرسٹل کے پاس تو شاید واکی ٹاکی بھی نہیں ہے؟'' عادل نے ہمایوں سے پوچھا۔ ہمایوں نے نفی میں سر ہلایا۔

''ہم سے غلطی ہوئی، ہمیں اسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ میرا دل تو یہی کہتا ہے کہ ان پاؤندوں میں سے کسی نے اس کا پیچھا کیا ہے اور تنہا دیکھ کر پکڑ لیا ہے۔''

اب سہ پہر ہو رہی تھی۔ سورج کی کرنوں کا زاویہ بدل رہا تھا۔ انہیں قدموں کے نشان مسلسل نظر آ رہے تھے اور وہ چوکنے انداز میں ان نشانوں کا پیچھا کر رہے تھے۔ کہیں کہیں وہ رُک کر کرسٹل کو آواز بھی دے لیتے تھے۔

''یہ دیکھو ہمایوں بھائی! یہ ادھر کیسے نشان ہیں؟'' عادل نے ایک طرف اشارہ کیا۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ یہاں برف پر دھینگا مشتی ہوئی ہے۔ شاید یہاں پہنچ کر کرسٹل ہوش میں آ گئی تھی یا وہ پہلے ہی ہوش میں تھی اور یہاں آ کر اس نے مزاحمت کا فیصلہ کیا تھا۔ یہاں ایک جگہ برف پر تھوڑا سا خون بھی دکھائی دیا۔ عادل کی آنکھوں میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ اس کا دل چاہا کہ وہ شخص سامنے ہو اور وہ نتائج سے بے پروا ہو کر اس کا بھرتا ما ڈالے۔

''لگتا ہے کہ یہاں کرسٹل کے ہاتھ پاؤں باندھے گئے ہیں۔'' ہمایوں نے رسی کے دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ ان ٹکڑوں کے پاس ہی کرسٹل کے سن گلاسز کا ٹوٹا ہوا ٹکڑا بھی ملا۔ یہ ثبوت دیکھنے کے بعد وہ لوگ مزید تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ اسی دوران میں ہمایوں نے ایک بار پھر سرمد صاحب سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی...... رمزی خاں اور اس کا ساتھی اس صورتِ حال کے حوالے سے کوئی واضح تبصرہ نہیں کر رہے تھے۔ آخر عادل نے تپے ہوئے لہجے میں رمزی خاں سے پوچھا۔ ''تمہیں کچھ نہ کچھ تو اندازہ ہو رہا ہوگا کہ یہ تمہارے ساتھیوں میں سے کس کا کام ہے؟''

''ام کو الہام نہیں ہوتا۔ پیروں کے نشان دیکھ کر کون خدائی خوار بتا سکتا ہے کہ یہ کس کے ہیں۔ اس چھوکری کو یہاں رُکنا ہی نہیں چاہیے تھا لیکن یہ فرنگی لوگ اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے۔'' رمزی نے جلے بھنے لہجے میں جواب دیا۔

عادل سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اگر کرسٹل اور اسے اُٹھا کر لے جانے والا مل بھی جاتے ہیں تو معلوم نہیں کہ رمزی اور اس کے ساتھی کا رویہ کیا ہوگا۔ کیا وہ اسے چھڑائیں گے یا اپنے ساتھی کے ساتھ ہی مل جائیں گے۔ عادل اور ہمایوں

بالکل خالی ہاتھ تھے۔ یہ لوگ مسلح تھے۔ انسان کو انسان سے جانور بنتے ہوئے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ عادل نے سوچنا شروع کر دیا کہ اگر کوئی اس طرح کی صورتِ حال پیدا ہوئی تو وہ کیا کردار ادا کر سکے گا۔ پھر اس کا دھیان کئی سو سال پہلے کے اس واقعے کی طرف چلا گیا جو سر سرمد نے اسے سنایا تھا۔ راجپوت عورتوں کی ہلاکت کا واقعہ۔ وہ سوچنے لگا ہر طرح کے تنازعات میں آخر عورت ہی کیوں ظلم کا نشانہ بنتی ہے۔ دشمنی کسی بھی طرح کی ہو، پامال عورت ہی ہوتی ہے۔

وہ ہلکے سے خم دار راستے پر چلتے جا رہے تھے۔ عادل نے ہمایوں کے کان کے پاس سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''کہیں ہم زیادہ دور نہ نکل جائیں، میرا مطلب ہے کہ پاؤندہ بستی کے پاس پہنچ جائیں۔''

''ہاں، رُخ تو اسی طرف ہے لیکن اپنی بستی میں تو رمزی وغیرہ بھی جانا نہیں چاہیں گے۔ بستی والوں کو بالکل معلوم نہیں کہ یہ لوگ آج کل ہمارے ساتھ رہ رہے ہیں۔ رابے خاں نے یہ سب کچھ بستی والوں سے چھپا رکھا ہے۔''

وہ قریباً نصف کلومیٹر مزید آگے گئے ہوں گے جب ایک مدھم آواز نے انہیں بُری طرح چونکا دیا۔ یہ آواز انہیں بائیں جانب ذرا نشیب سے آئی تھی۔ جیسے کسی کا منہ بند ہو اور چلانے کی کوشش کر رہا ہو۔ آواز دوسری بار اُبھری اور اس مرتبہ یہ کافی واضح تھی۔ صاف طور پر یہ نسوانی آواز تھی۔ رمزی اور اس کا موچھیل ساتھی ایک دم چوکس ہو گئے...... رمزی نے تیز سرگوشی میں ان سب سے کہا۔ ''تم یہیں رُکو، ام آگے جاتا ہے۔''

اس نے اپنا پستول موچھیل کو دے دیا اور خود اس کی رائفل لیتا ہوا آگے بڑھا۔ چھوٹے چھوٹے برفیلے تودوں سے گزرتا ہوا وہ نشیب کی طرف آگے بڑھ گیا۔ اب وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ عادل کے ذہن میں پھر وہی اندیشے سر اُٹھانے لگے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ ان پاؤندوں کا آئندہ رویہ کیا ہوگا۔ کچھ دیر بعد تودوں عقب سے بلند آوازیں سنائی دینے لگیں۔ رمزی خاں اور دوسرے شخص میں جملوں کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ وہ تینوں تھوڑا سا آگے آ گئے۔ آوازیں مزید واضح ہو گئیں۔ عادل اور ہمایوں کے اندازے درست نکلے تھے۔ جو دوسری آواز اُبھر رہی تھی، وہ جانی پہچانی تھی۔ یہ داخون کی بھرائی ہوئی سی آواز تھی۔ وہ دونوں مقامی زبان میں بول رہے تھے لیکن کہیں کہیں الفاظ سمجھ میں آ رہے تھے اور مفہوم سمجھنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ داخون کچھ اس طرح کی بات کہہ رہا تھا کہ کوئی اس کے قریب نہ آئے ورنہ فرنگن یعنی کرسٹل کو گولی سے اُڑا دے گا۔

داخون کے لہجے سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ شراب کے نشے میں ہے۔

جواب میں رمزی نے بھی کرخت لہجے میں بات کی۔ اس کے جملے میں ''رابے خاں'' کا نام آیا۔ غالباً وہ داخون کو بتا رہا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے، اس کے نتائج بہت بُرے نکلیں گے۔ رابے خاں اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔

دو تین منٹ تند و تیز جملوں کا تبادلہ ہوا۔ اس دوران میں کرسٹل کی گھٹی گھٹی آوازیں بھی سنائی دیتی رہیں۔ سو فیصد یہ کرسٹل ہی تھی۔ رمزی کے موچھیل ساتھی نے سرگوشی میں عادل کو بتایا۔ ''رمزی خاں اسے باہر آنے کو بول رہا ہے۔ اس کے دماغ کو لال پری چڑھا ہوا ہے۔ وہ باہر نہیں آ رہا، کہتا ہے کہ چھوکری کو گولی مار دے گا۔''

صورتِ حال تشویش ناک تھی۔ بہرحال عادل کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا تھا کہ شاید رمزی خاں منفی رویہ اپنائے گا۔ داخون اس کا قریبی ساتھی تھا لیکن فی الوقت رمزی خاں اسے صرف ایک اغوا کار کی حیثیت سے دیکھ رہا تھا اور اسے کرسٹل کو چھوڑنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

یکا یک گولی چلنے کی آواز آئی۔ ٹھیک سے پتا نہیں چلا کہ یہ فائر کس کی طرف سے ہوا تھا اور آیا یہ صرف ہوائی فائر تھا یا کسی کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ عادل تیزی سے چند قدم اوپر گیا اور اس نے نشیب میں جھانکا۔ اسے رمزی نظر آیا۔ وہ اپنے ایک کندھے کو دبا کر گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا اور دور سے سفید برف پر خون کے چھینٹے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اسے گولی لگ گئی تھی۔

عادل جلدی سے واپس پلٹا۔ اس نے موچھیل سے کہا۔ ''تمہارے ساتھی کو گولی لگ گئی ہے۔ وہ زخمی ہے، اگر تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے تو مجھے دو۔ میں آگے جا کر دیکھتا ہوں۔''

''نہیں، امارے پاس اور ہتھیار نہیں ہے۔'' موچھیل نے جھوٹ بولا اور اپنی سیون ایم ایم رائفل پر گرفت اور مضبوط کر لی۔ عادل جانتا تھا کہ اس کے پاس ایک چھوٹا پسٹل اور بھی موجود ہے، مگر وہ دینے کو تیار نہیں تھا۔

عادل خالی ہاتھ ہی بائیں جانب لپکا۔ ہمایوں بھی اس کے پیچھے آنا چاہتا تھا مگر موچھیل نے گرج کر اسے روک لیا۔ شاید وہ عادل کو بھی روکتا لیکن تب تک عادل کافی آگے نکل چکا تھا۔ وہ نیم دائرے کی شکل میں دوڑتا ہوا ایک کلاوا کاٹ کر اس مقام کے عقب میں پہنچ گیا جہاں سے داخون کی شرابی آواز اُبھر رہی تھی۔ یہ دو برفیلے تودوں کے درمیان ایک رخنہ سا تھا، جیسے ایک بغیر چھت کا چھوٹا سا غار تھا، اس نے اسے سرتاپا ہلا دیا۔ رگوں میں خون کی جگہ سیال آگ سی بہہ نکلی۔ اسے سب سے پہلے کرسٹل ہی نظر آئی۔ وہ پہلو کے بل برف پر پڑی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے تھے، یقیناً پاؤں بھی بندھے تھے لیکن عادل کو دکھائی نہیں دیئے۔ اس کے سر پر ٹوپی نہیں تھی اور سنہری مائل بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے بالائی لباس کو اس طرح پھاڑا گیا تھا کہ وہ اس کے جسم پر بس دھجیوں کی صورت باقی تھا۔ بدن پر نوچنے کھسوٹنے کے نشان فاصلے سے بھی دیکھے جا سکتے تھے۔ داخون کا رُخ دوسری طرف تھا اور وہ رائفل سونتے کھڑا تھا۔ کرسٹل چونکہ لیٹی تھی اس لیے اس کی نظر سیدھی عادل پر پڑی۔ عادل نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا...... اور تب اسے یہ بھی پتا چلا کہ کرسٹل کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس کی آواز بند کی گئی ہے۔

عادل کو اپنے سامنے وہی نوری نت نظر آیا جو تشدد اور بے رحمی کی علامت تھا۔ جس نے ہر جگہ اور ہر روپ میں انسانیت کے سینے میں جبر کا چھرا گھونپ رکھا تھا اور عادل کو نفرت تھی اس سے اور اس جیسے سارے تاریک کرداروں سے۔

سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ عادل نے ڈھلوان برف پر اسی طرح سلائیڈ لی جیسے بچے چلڈرن پارک میں سلائیڈ پر پھسلتے ہیں۔ وہ تیزی سے نیچے آیا۔ اس کا نشانہ داخون تھا۔ عادل اور داخون کے درمیان شاید سیکنڈ کا چوتھائی فاصلہ باقی تھا، جب داخون کو خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے پلٹنا چاہا مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ عادل توپ سے نکلے گولے کی طرح داخون کے کندھوں سے ٹکرایا۔ اس کے دونوں پاؤں نے بڑی قوت کے ساتھ داخون کو ضرب لگائی۔ بھاری بھرکم ہونے کے باوجود داخون کسی ہلکی پھلکی شے کی طرح کئی قلابازیاں کھا گیا۔ تاہم اس ساری ہلچل کے باوجود غیر متوقع طور پر رائفل اس کمبخت کے ہاتھوں میں ہی رہی۔ یہاں پھر وہی صورتِ حال تھی۔ چرمی تسمے کی مدد سے رائفل کو کلائی کے ساتھ اٹیچ کر لیا گیا تھا۔ اب یہ بڑی نازک سچویشن تھی۔ رائفل داخون کے ہاتھوں میں تھی اور وہ کسی بھی وقت عادل کی جانب فائر کر سکتا تھا۔ داخون اور عادل کے درمیان کم و بیش چالیس فٹ کی دوری تھی۔ عادل کے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ نتائج سے بے پروا ہو کر داخون کی طرف لپکا۔ داخون نے بے دریغ فائر کیا۔ گولی سنسناتی ہوئی عادل کے کان کے پاس

سے گزری۔ عادل کو موت اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آئی۔ پھر دوسرا فائر ہوا اور یہ گولی عین نشانے پر لگی۔ یعنی سینے میں دل کے مقام پر مگر یہ دل عادل کا نہیں تھا، داخون کا تھا۔ یہ فائر سامنے سے رمزی خاں نے کیا تھا اور داخون کے سینے پر لگا تھا۔ وہ رائفل سمیت مردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے برف پر گرا۔ عادل بھاگتا ہوا اس کے سر پر پہنچا اور رائفل اس سے دور ہٹا دی۔ رمزی خاں بھی موقع پر پہنچ گیا۔ اس کی آنکھیں طیش سے انگارہ ہو رہی تھیں۔ پہلے اس نے داخون پر ایک اور فائر کرنے کا سوچا لیکن پھر جب دیکھا کہ وہ آخری سانس لے رہا ہے تو رُک گیا۔

موچھیل اور ہمایوں بھی موقع پر پہنچ گئے تھے۔ ہمایوں دوڑ کر کرسٹل کی طرف گیا اور اس کے منہ سے کپڑا نکالا۔ عادل نے اس کے ہاتھ کھولے، ہمایوں نے پاؤں آزاد کرائے۔ رمزی خاں نے ایک چادر اس کے بالائی جسم پر ڈال دی تاکہ وہ اپنی برہنگی چھپا سکے۔ ایک دوسری چادر داخون پر ڈال دی گئی۔ وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس کے کردار کی طرح اس کا خون بھی سیاہی مائل تھا اور سفید برف پر دور تک پھیلا ہوا تھا۔ کرسٹل سسکنے لگی۔

داخون نے کرسٹل کو بُری طرح نوچا کھسوٹا تھا۔ وہ مسلسل شراب بھی پی رہا تھا۔ یقیناً وہ آخری حد تک چلا جاتا لیکن اس سے پہلے ہی وہ لوگ یہاں پہنچ گئے تھے۔ کرسٹل کی کنپٹی پر ایک گومڑ سا تھا اور یہاں سے خون رس رہا تھا۔ یہی خون تھا جو پیچھے راستے میں ایک جگہ ان کو نظر آیا تھا۔

عادل کے پوچھنے پر کرسٹل نے کہا۔ ''وہ ایک دم پیچھے سے آیا۔ اس نے ہام کو گن پوائنٹ پر اپنے ساتھ لے جانے کا کوشش کیا۔ ہام نے Resist کیا تو اس نے ہام کو رائفل کے بٹ سے یہاں سر پر ہٹ کیا۔ ہام کچھ دیر کے لیے سینس لیس ہو گیا تھا۔ بعد میں جب ہام کو ہوش ہوا تو اس نے ہام کا ہاتھ پاؤں باندھ دیا اور یہاں لے آیا۔ یہ ہام کو ریپ کرنا مانگتا لیکن تھینکس گاڈ آپ لوگ......'' اس کی آواز بھرا گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

جب وہ یہ سب کچھ کہہ رہی تھی، عادل نے دیکھا کہ موچھیل شخص رمزی خاں کے کان میں سرگوشیاں کر رہا ہے۔ ان سرگوشیوں کے بعد رمزی کے چہرے پر تفکر کے سائے پھیل گئے تھے۔ اس نے دائیں ہاتھ سے اپنا زخمی کندھا بھی دبایا ہوا تھا۔ گولی غالباً اس کے گوشت کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔

''کیا بات ہے رمزی؟'' ہمایوں نے پوچھا۔

جواب دینے کے بجائے رمزی اطراف میں دیکھ رہا تھا۔

''کیا کوئی اور بھی ہے یہاں؟'' اس بار عادل نے پوچھا۔

رمزی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں...... اور ام کو فوراً اسے دیکھنا پڑے گا۔ ورنہ سارا معاملہ گڑبڑی میں جا سکتا ہے۔ خراب ہو سکتا ہے۔''

عادل نے بھی کچھ محسوس کیا تھا۔ جب رمزی خاں نے داخون کے سینے پر گولی چلائی اور وہ پشت کے بل گرا تو عین اس وقت دائیں جانب برف کے تودوں کے پیچھے عادل کو کوئی حرکت سی نظر آئی تھی، جیسے کوئی وہاں سے ایک دم نکل کر بھاگا ہو۔ یہاں کسی جانور کا امکان تو ہرگز موجود نہیں تھا۔ یقیناً یہ کوئی انسان ہی تھا۔ رمزی خاں اور اس کے ساتھی کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ اس معاملے کو کچھ کچھ سمجھ رہے ہوں...... ان ویران برفوں میں ان کے علاوہ بھی کوئی موجود تھا۔

وہ رمزی کے پیچھے پیچھے بائیں جانب بڑھے۔ رمزی نے اپنے زخمی کندھے پر ایک مفلر نما کپڑا کس کر باندھ لیا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ یہ وہی پستول تھا جو ان پاؤنڈوں نے ہمایوں سے برآمد کیا تھا۔ رمزی کے عقب میں ہمایوں تھا۔ ہمایوں کے پیچھے کرسٹل اور پھر خود عادل۔ عادل کے عقب میں موچھیل فولاد جان رائفل بدست آ رہا تھا۔ رمزی نے برف پر قدموں کے نشان ڈھونڈنے کی کوشش کی جو جلدی اسے مل گئے۔ یہ بات ثابت ہوگئی کہ جس وقت رمزی خاں نے شرابی داخون کو گولی ماری، کوئی یہاں ان برفیلے تودوں کے پیچھے موجود تھا۔ قدموں کے نشان قدرے نشیب کی طرف جا رہے تھے۔ وہ آگے بڑھتے گئے اور پھر پتھروں سے بنے ہوئے ایک کوٹھری نما کمرے کے سامنے پہنچ کر رُک گئے۔ ایک چھوٹے سے چوبی دروازے کے سوا اس میں آنے جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہ جگہ اندر سے بالکل تاریک تھی۔ رمزی خاں نے افراتفری میں اس کوٹھری کے اندر جھانکا اور پھر موچھیل فولاد جان کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ بائیں جانب مڑے اور قدرے تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ دفعتاً رمزی خاں رُک گیا۔ اس نے انگلی سے نشیب میں اشارہ کیا۔ سفید برف پر ایک دھبا سا حرکت کرتا نظر آیا۔

اب وہ لوگ بھاگنے والے انداز میں آگے بڑھے۔ کرسٹل ذرا پیچھے رہ گئی تھی۔ عادل نے بھی اپنی رفتار ذرا دھیمی کر لی اور کرسٹل کا ساتھ دیا۔ کچھ دیر بعد دھبا واضح نظر آنے لگا۔ یہ ایک بھاری جسم والا شخص تھا۔ وہ موٹے کپڑوں میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے سر منڈوا رکھا تھا۔ وہ جیسے گھبراہٹ کے عالم میں بھاگ رہا تھا۔ جب رمزی خاں نے اس کی طرف رائفل سیدھی کر لی تو وہ چونک گیا۔

چند منٹ بعد وہ سب اس شخص کے رُوبرو تھے۔ وہ واضح طور پر پریشان نظر آتا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس سال سے اوپر رہی ہوگی۔ وہ نشے میں دھت لگتا تھا۔ چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور منڈے ہوئے سر کی رگیں بھی نمایاں دکھائی دیتی تھیں۔ رمزی نے مقامی لب و لہجے میں اس سے کہا۔ ''مالکا! واپس چلیں، تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

اس نے پہلے تو حیلے بہانے سے کام لیا پھر جب دیکھا کہ رمزی خاں کا لہجہ اٹل ہے تو چار و ناچار چلنے پر راضی ہو گیا۔ وہ سب لوگ واپس اُسی کوٹھری نما کمرے میں پہنچ گئے۔ راستے میں رمزی خاں اور وہ مالکا نامی شخص دھیمے لہجے میں کچھ باتیں بھی کرتے رہے۔ عادل کی سماعت سے یہ باتیں دور ہی رہیں۔

یہ کوٹھری قریباً بارہ ضرب بارہ فٹ کی رہی ہوگی فرش پر موٹا اونی نمدہ بچھا ہوا تھا۔ دیواروں پر بھی نمدے دکھائی دے رہے تھے۔ یہاں الکحل کی بُو تھی اور کچھ عجیب و غریب چیزیں دکھائی دے رہی تھیں۔ انسانی کھوپڑی، چند ہڈیاں، ریچھ کی کھال، غالباً شیر کا حنوط شدہ پنجہ، بھینسے کے سینگ اور اسی طرح کی دیگر اشیا۔

جلد ہی عادل کو معلوم ہو گیا کہ اس شخص کا پورا نام مالکا نے زادہ ہے۔ یہ جس کوٹھری میں رہتا تھا، یہ ایک طرح سے پاؤندہ بستی کے مضافات میں واقع تھی۔ یعنی وہ اس وقت پاؤندہ بستی کے کافی قریب تھے۔ مالکا نے زادہ کو پُراسرار علوم کا ماہر سمجھا جاتا تھا اور یہ بستی کے ان سرکردہ لوگوں میں سے تھا جو سیاحوں کے بانگڑی چوٹی کی طرف جانے کے شدید مخالف تھے۔

عادل نے سرگوشی میں ہمایوں سے پوچھا۔ ''یہ کیا باتیں چل رہی ہیں؟''

ہمایوں مقامی زبان کچھ کچھ سمجھتا تھا۔ اس نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ ''یہ بندہ داخون کو رمزی خاں کی گولی سے

مرتے دیکھ چکا تھا۔ اگر یہ بستی پہنچ جاتا تو رمزی اور رابے خاں وغیرہ کا سارا پول کھل جانا تھا۔''

''تو اب کیا ہوگا؟''

''مجھے لگتا ہے کہ رمزی خاں اس بندے کو اپنے ساتھ کیمپ میں لے جانا چاہے گا۔''

اسی دوران میں رمزی خاں اور مالکا کے درمیان ہونے والی گفتگو میں تیزی آ گئی۔ مالکا کا چہرہ کچھ اور تمتما گیا۔ [illegible]جی ہوئی آنکھوں سے جیسے چنگاریاں چھوٹنے لگیں۔ پھر وہ عادل اور ہمایوں وغیرہ کی طرف متوجہ ہو کر گرجا۔ ''تم سب سب مرے گا۔ برباد ہو جائے گا۔ وہاں اوپر جائے گا تو دفن ہو جائے گا۔ تمہارا لالچ تم کو لے ڈوبے گا۔ ام سچ کہتا ہے، لے ڈوبے گا۔''

''مالکا! خاموش رہو۔'' رمزی خاں نے کہا۔

''ام خاموش نہیں رہے گا۔ اگر ام خاموش رہے گا تو یہ مرے گا اور تم سب بھی مرے گا کیونکہ تم ان کے ساتھ مل گیا ہے۔ وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ جو وہاں تھا، وہ بہت سال پہلے وہاں سے نکال لیا گیا تھا۔ اب وہاں تم کو موت کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔'' مالکا کی آنکھیں حلقوں سے باہر اُبلی پڑ رہی تھیں اور شکل ڈراؤنی ہو گئی تھی۔

ہمایوں نے ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہمارے پاس کچھ معلومات ہیں محترم۔ ہم ان کی تصدیق کرنا چاہتے ہیں اور یہ تصدیق کر کے ہی جائیں گے۔''

''کیا معلومات ہے؟ کیا ہے تمہارے پاس؟ بتاؤ ام کو...... ام بھی سنے۔'' وہ شخص کڑک کر بولا۔

ہمایوں کے بجائے رمزی نے جواب دیا۔ ''ان کو زیادہ معلوم نہیں۔ ان کے ساتھ ان کا ملک (لیڈر) ہے۔ وہ جانتا ہے سب کچھ۔''

مالکا پھر گرجا۔ ''کون ہے اُلو کا پٹھا۔ وہ بہت بڑا گدھا ہے یا پھر بہت بڑا خرانٹ ہے۔ وہ جھوٹ بول رہا ہے، بکواس کر رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تم لوگوں کے ساتھ کوئی چکر چلا رہا ہو۔ امارا بات کراؤ اس سے۔ ام پوچھتا ہے کہ کون سا خزانہ چھپا رکھا ہے اس کی والدہ نے وہاں پر۔''

''تمیز سے بات کرو مالکا۔'' عادل پھنکارا۔ ''وہ ہمارے بڑے ہیں۔ ان کے بارے میں بکواس کرو گے تو منہ توڑ [illegible]اں گا۔'' وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ہمایوں کے تیور بھی بگڑ گئے تھے۔

رمزی نے جلدی سے کھڑے ہو کر عادل کو روکا اور سمجھا بجھا کر نیچے بٹھایا۔ رائفل بدست موچھیل پہلے سے زیادہ [illegible]لس نظر آنے لگا۔

مالکا بدستور بھڑ بھڑ کر رہا تھا۔ کرخت لہجے میں بولا۔ ''اگر امارا کہا غلط نکلے تو ام اپنے ہاتھوں سے اپنا گردن کاٹ کر تمہارے پاؤں میں ڈال دے گا۔ تم کو جو کوئی بھی، وہاں سونے چاندی اور زیوروں کے بارے میں بتا رہا ہے، غلط بتا رہا ہے۔ وہاں اب کچھ نہیں، تہ خانہ خالی پڑا ہے...... تم لوگوں کے دماغوں کی طرح اور...... اور۔'' وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

''اور کیا؟'' عادل نے پوچھا۔

مالکا نے اپنی نشیلی آنکھوں کو کچھ اور بھی نشیلا بنا لیا۔ سامنے رکھی ہوئی انسانی کھوپڑی پر نگاہیں جمائیں اور عاملوں کے انداز میں سرسراتے لہجے میں بولا۔ ''اگر تم لوگ وہاں جائے گا تو موت کو اپنا انتظار کرتا ہوا پائے گا۔ ہاں، وہ ہے وہاں۔

اپنے پَر پھیلائے بیٹھا ہوا ہے وہ موت۔ تم کو دیکھے گا تو ایک دم جھپٹے گا تم پر۔ تم اس سے بھاگ نہیں سکے گا۔ وہ بہت بھوکا ہے۔ بڑی تیزی سے نیچے آئے گا اور دبوچ لے گا۔ تم سب کو برف کی قبروں میں دفن ہونا پڑے گا۔ ایک بھی نہیں بچے گا۔''

وہ آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور جیسے کسی مراقبے میں چلا گیا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں کوٹھری کا منظر آسیب زدہ نظر آنے لگا تھا۔

عادل، ہمایوں اور کرسٹل پر مالکا کی باتوں کا ذرہ بھر اثر نہیں ہوا لیکن رمزی خاں اور موچھیل فولاد جان کچھ پریشان نظر آنے لگے تھے۔ بہر حال یہ بات تو وہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ اب مالکا کو اس جگہ چھوڑ کر ہرگز نہیں جایا جا سکتا۔ وہ داخون کے قتل کا چشم دید گواہ بن چکا تھا۔

O......❖......O

کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ واپس اپنے کیمپ کی طرف روانہ ہو گئے۔ بہر حال اب مالکا ان کے ساتھ تھا۔ وہ آسانی سے آنے پر تیار نہیں ہوا تھا۔ رمزی خاں اسے بڑی دیر سمجھانے بجھانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ آخر عادل نے راست قدم اُٹھایا۔ وہ خاموشی کے ساتھ مالکا کے عقب میں پہنچا تھا اور کلہاڑی کے پچھلے حصے سے ایک زوردار ضرب مالکا کے سر پر لگائی تھی۔ وہ ادھ موا ہو کر گر پڑا تھا۔ عادل کی اس کارروائی پر رمزی خاں اور موچھیل فولاد کی آنکھوں میں خوف نمودار ہوا تھا۔ بہر طور ان سب نے مل کر مالکا کی مشکیں کس دی تھیں اور ایک کپڑا بھی اس کے منہ میں ٹھونس دیا تھا تا کہ وہ آواز نہ نکال سکے۔

وہ کافی وزنی تھا۔ اب ان سب کو باری باری اسے کندھے پر لادنا پڑ رہا تھا۔ رمزی خاں چونکہ زخمی تھا اس لیے اسے اس مشقت سے چھوٹ دے دی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ کرسٹل بھی اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ زیادہ بوجھ ہمایوں اور عادل پر ہی رہا۔ ایک بار جب موچھیل فولاد جان نے مالکا کو کندھے پر لاد رکھا تھا۔ رمزی کو یکا یک اس کلہاڑی کا خیال آ گیا جس کی مدد سے عادل نے مالکا کے سر پر چوٹ لگائی تھی۔ چھوٹے دستے والی یہ کلہاڑی ابھی تک عادل کے پاس ہی تھی۔ اس نے اپنی پتلون کی بیلٹ میں اڑسی ہوئی تھی۔ کلہاڑی کا پھل اس کی بغل کے نیچے تھا۔ اوپر موٹی جیکٹ تھی۔

رمزی خاں نے عادل سے کہا۔ ''وہ کلہاڑی ام کو دے دو۔''

''اتنا بھی اعتبار نہیں کر پا رہے ہو؟'' ہمایوں نے پوچھا۔

''ام دو دفعہ دھوکا کھا چکا ہے۔ تیسری بار نہیں کھائے گا۔ ویسے بھی یہ خاناں (رابے خاں) کا آرڈر ہے کہ تمہارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہونا چاہیے۔''

''لیکن یہ کوئی ہتھیار تو نہیں ہے۔'' عادل نے کہا۔

''ہتھیار نہیں ہے تو پھر دے کیوں نہیں رہے؟ ادھر لاؤ۔'' رمزی کا لہجہ اچانک سخت ہو گیا۔ اس نے رائفل کو مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

عادل نے کمر سے کلہاڑی نکال کر رمزی کی طرف برف پر پھینک دی جسے اس نے اُٹھا کر اپنی کمر کے پٹکے میں اڑس لیا۔ زخمی ہونے کے باوجود رمزی خاں کے طمطراق میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ عادل، ہمایوں اور کرسٹل کی طرف

سے پوری طرح چوکس تھا۔ اس کے کندھے سے اب بھی خون رِس رہا تھا۔ کرسٹل کے میڈیکل پاؤچ میں فرسٹ ایڈ کا سامان موجود رہتا تھا۔ خوش قسمتی سے، داخون کے ساتھ زبردست کھینچا تانی کے باوجود یہ میڈیکل پاؤچ اب بھی کرسٹل کی بیلٹ کے ساتھ اٹیچ تھا۔ اس نے رمزی کی بینڈیج تو کر دی تھی مگر ابھی اسے مزید ٹریٹمنٹ کی ضرورت تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اسی جگہ پر واپس پہنچ گئے جہاں کرسٹل والا واقعہ ہوا تھا۔ بدمست داخون ''فرنگن کرسٹل'' سے شاید انگریز دورِ حکومت کا کوئی بدلہ چکانا چاہتا تھا۔ اب وہ شام کی نیم تیرگی میں برف پر بے سدھ پڑا تھا۔ اس کا مردہ جسم تیزی سے اکڑنا شروع ہو گیا تھا۔ رمزی خاں کے حکم پر عادل اور ہمایوں نے آئس ایکس کے ساتھ برف میں گڑھا کھودنا شروع کیا۔ گاہے بگاہے فولاد جان نے بھی اس میں مدد کی۔ آدھ پون گھنٹے میں قریباً چار فٹ گہرا گڑھا تیار ہو گیا۔ اسی دوران میں مالکا نے بھی کسمسانا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہوش میں آ رہا تھا۔ رمزی نے کرسٹل سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''او چھوکری اس کو کوئی ٹیکا میکا لگا دو۔''

کرسٹل کے پاس انجکشن کی صورت میں ٹرنکولائزر موجود تھا۔ وہ اس نے مالکا کے چربی دار بازو میں ٹھونک دیا۔ وہ چند منٹ میں پُرسکون ہو گیا۔ اس دوران میں فولاد جان نے داخون کے لباس کی کھلی تلاشی لے کر کچھ اشیا نکال لیں۔ پھر عادل اور ہمایوں نے اس کی لاش گھسیٹ کر گڑھے میں ڈال دی۔ کرسٹل نے اس سارے منظر کی طرف سے پشت کر رکھی تھی۔

عادل نے رمزی خاں کو مخاطب کر کے کہا۔ ''میرا تو مشورہ ہے، اس موٹے عامل کو بھی لٹا دو، اس شرابی کے ساتھ۔ قصہ پاک ہو گا۔''

رمزی نے عادل کو بُری طرح گھورا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ جو تم کر چکے ہو، یہی ضرورت سے زیادہ ہے۔ اب چپ رہو۔

دراصل اس موٹے نشئی نے سرمد صاحب سمیت بیرونی سیاحوں کے بارے میں جس طرح کی بیہودہ زبان استعمال کی تھی، اس نے عادل کو دُکھ پہنچایا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ داخون کو اس سنسان ڈھلوان پر ''سپردِ برف'' کر کے آگے روانہ ہو رہے تھے۔

وہ جب کیمپ میں واپس پہنچے تو رات کے دس بج چکے تھے۔ سردی میں بے حد اضافہ ہو گیا تھا۔ ہوا برفانی تودوں کی بھول بھلیوں میں سے گزرتی تھی تو مزید یخ بستہ ہو جاتی تھی۔ ابھی وہ کیمپ سے ایک دو فرلانگ دور ہی تھے کہ انہیں ٹارچوں کی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ یہ رابے خاں اور اس کے ساتھی ہی تھے جو انہیں ڈھونڈنے کے لیے نکلے تھے۔

رمزی کو دیکھتے ہی رابے خاں برس پڑا۔ مقامی لب و لہجے میں بولا۔ ''کہاں مر گئے تھے تم سب؟''

پھر اس کی ٹارچ کی روشنی، رمزی کے خون آلود کندھے پر پڑی۔ اس کے ساتھ ہی اسے عقب میں ہمایوں دکھائی دیا جس نے عامل مالکا نے زادہ کا بھاری جسم بمشکل اپنے کندھے پر سنبھالا ہوا تھا۔ رابے خاں بُری طرح چونک گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی زبردست گڑبڑ ہو گئی ہے۔

رمزی اور رابے خاں میں چند جملوں کا تبادلہ ہوا۔ پھر دراز قد رابے خاں مقامی لہجے میں بولا۔ ''تمہیں داخون کا کچھ پتا ہے؟ وہ بھی صبح سے نہیں مل رہا۔''

رمزی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اسے گولی لگ گئی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' رابے خاں مزید چونک گیا۔

رمزی نے ایک گہری سانس لی اور پھر وہیں کھڑے کھڑے ساری رُوداد الف سے ے تک رابے خاں کے گوش گزار کر دی۔ اس رُوداد کا بس کوئی کوئی فقرہ ہی عادل کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ رابے خاں کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔ ساری حقیقت جاننے کے بعد اسے یہ بھی پتا چل گیا کہ مالکانے زادہ کو بیہوشی کی حالت میں کندھے پر لاد کر یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ وہ بے طرح پیچ و تاب کھانے لگا۔ پھر وہ کرسٹل کی طرف متوجہ ہوا اور دانت پیس کر بولا۔ ''تم گوری چمڑی والوں کا ہر کام اُلٹا ہوتا ہے۔ تم کو کیا ضرورت پڑا تھا، وہاں اکیلے رُکنے کا اور تصویریں کھینچنے کا۔ حرامزادی...... تُو نے ام سب کو ایک بڑا مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ خانہ خراب کیا ہے ام سب کا۔'' ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ کرسٹل کو مارنے کے لیے جھپٹ پڑے گا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور چند گہری سانسیں لے کر نیم بیہوش مالکا کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ مالکا کو ہمایوں نے اب برف پر لٹا دیا تھا۔ ٹارچ کے روشن دائرے میں مالکا کا منڈا ہوا سر شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ دیکھنے میں اس کے خدوخال کچھ کچھ نیپالیوں اور چینیوں سے ملتے تھے۔

اب مزید پاؤندے بھی موقع پر جمع ہو گئے تھے۔ وہ لوگ نیم بیہوش مالکانے زادہ کو اُٹھا کر کیمپ میں لے آئے۔ وہ سب کے سب کچھ ہراساں بھی دکھائی دے رہے تھے، جیسے انہیں ڈر ہو کہ ابھی مالکانے زادہ اُٹھے گا اور ان سب کو اپنے کسی آسیبی عمل میں جکڑ لے گا۔ توہمات اور شکوک کی ایسی پرچھائیاں عادل نے اپنے دور دراز گاؤں لالی میں بھی بہت دیکھی تھیں لیکن یہاں پر پرچھائیاں کچھ زیادہ ہی گہری اور طویل نظر آتی تھیں۔ پاؤندوں نے مالکانے زادہ کو بڑے احترام سے، رابے خاں والے خیمے میں رکھا۔ اس کے جسم کو گرم لحافوں میں لپیٹا گیا، تاہم ہاتھ پاؤں بندھے ہی رہنے دیئے گئے۔

عادل اور ہمایوں نے اپنے خیمے میں سرمد صاحب کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ انہوں نے بھی کرسٹل کو اس بات پر سرزنش کی کہ وہ فوٹو گرافی کے چکر میں اکیلی پیچھے رہ گئی۔ ہمایوں نے سرمد صاحب کو مالکا کے اس واویلے کے بارے میں بھی بتایا جو اس نے اپنی کوٹھری میں کیا تھا۔ اس نے سینے پر ہاتھ مار مار کر دعویٰ کیا تھا، اوپر بانگڑی کی چوٹی پر اب کچھ نہیں ہے...... اور ان سب کو کسی آسمانی آفت سے بھی ڈرایا تھا۔

سرمد صاحب نے ان باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ تاہم انہوں نے بتایا کہ اب انہیں زیادہ تیزی سے عمل کرنا ہو گا۔ انہوں نے کہا۔ ''یہ بات تو آپ سب کی سمجھ میں آ گئی ہو گی کہ یہ لوگ مالکا کو اُٹھا کر یہاں کیوں لائے ہیں۔ رمزی خاں سے قتل ہو گیا ہے اور مالکا اس کا چشم دید گواہ ہے۔ رابے خاں فی الوقت تو ہرگز نہیں چاہے گا کہ اس واقعے کی خبر بستی تک پہنچے۔ دوسری طرف وہ مالکا کو زیادہ دیر یہاں اپنے پاس بھی نہیں رکھ سکتے۔ وہ چاہیں گے کہ اب ہم نے جو بھی کرنا ہے جلد سے جلد کریں۔''

کرسٹل بہت بجھی بجھی ہوئی تھی۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا، دل دہلا دینے والا تھا۔ اگر عادل وغیرہ بروقت نہ پہنچتے تو عین ممکن تھا کہ اس کی جان ہی چلی جاتی۔ عادل بھی خود کو دل گرفتہ محسوس کر رہا تھا۔ داخون کو گولی لگنے اور برف پر گر کر اس کے مرنے کا منظر بار بار اس کی نگاہ میں آتا تھا۔ بے شک لالی گاؤں میں لڑائی جھگڑے کے واقعات ہوتے تھے۔ ایک دو

بار مقامی زمینداروں میں زبردست فائرنگ بھی ہوئی تھی جس میں دو چار لاشیں بھی گری تھیں مگر اس طرح اپنی آنکھوں کے سامنے کسی کو مرتا عادل نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

کچھ دیر بعد رابے خاں نے سرمد صاحب کو اپنے خیمے میں بلا لیا۔ وہ یقیناً ان سے یہی کہنا چاہتا تھا کہ اب جو کرنا ہے جلدی کرنا ہے۔

وہ سب بہت پژمردہ تھے۔ اگلے روز صبح سویرے سرمد صاحب نے انہیں ایک لیکچر دیا اور روزمرہ مصروفیت کے لیے تیار کیا۔ انہوں نے کہا کہ صبح سویرے اپنی مرضی اور منشا کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے اور چل پڑنے میں ہی بندے کی کامیابی چھپی ہے۔ جب کسی پریشانی یا دُکھ نے جسم کو ناتواں کر رکھا ہو تو روزمرہ کے معمولات کو بحال رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ مگر اس مشکل پر قابو پانے کا نام ہی ہمت اور دلیری ہے۔

اگلے تین چار روز ان سب کے لیے سخت ترین تھے۔ خاص طور سے عادل کے لیے۔ سرمد صاحب اس پر خصوصی توجہ دے رہے تھے۔ وہ اسے روزانہ چودہ چودہ گھنٹے مشق کرا رہے تھے۔ یہ مشق ایک ایسی چٹان پر تھی جو عمودی ہی نہیں تھی، اس سے بھی زیادہ زاویہ بناتی تھی۔ وہ تھک کر چُور ہو جاتا۔ ہاتھ پاؤں شل ہو جاتے۔ اسے لگتا کہ اس کی برداشت آخری حد تک پہنچ گئی ہے۔ سرمد صاحب بھی جان جاتے کہ یہ اس کی برداشت کی حد ہے مگر وہ اس حد کو کچھ اور وسیع کرنے کی کوشش کرتے۔ اسے پھر سے اُٹھاتے اور خطرناک چڑھائی پر لگا دیتے...... ایسے میں وہ عادل کو...... بے رحم محسوس ہونے لگتے لیکن رات کو جب عادل ٹھنڈے دل سے سوچتا تو اسے لگتا کہ یہ سب اس کی بھلائی کے لیے تھا اور اس سے بھلائی ہوئی بھی ہے۔ اس کی برداشت کی آخری حد کچھ اور بڑھ گئی ہے۔ ایسے میں سرمد صاحب کا کہا ہوا فقرہ اس کے کانوں میں گونجنے لگتا۔ وہ کہتے تھے۔ ''کسی بھی ہنر میں کمال حاصل کرنے کی اصل کوشش تب شروع ہوتی ہے جب ہم سمجھتے ہیں کہ اب ہم میں مزید مشق کرنے کی ہمت نہیں رہی۔ جب ہم اپنی ہمت کی حد کو ایک دیوانی کوشش کے ساتھ توڑ دیتے ہیں تو بے مثال کامرانیاں سامنے کھڑی نظر آتی ہیں۔''

عمودی اور مشکل ترین چٹانوں پر چڑھنے میں عادل نے جس تیزی سے مہارت حاصل کی تھی، اس نے سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ یہ اس کی فطری صلاحیت تھی جسے سرمد صاحب کی تربیت اور کوچنگ نے چمکا کر بے مثال کر دیا تھا اور اب وہ اپنی اصل چڑھائی کے لیے تقریباً تیار تھے۔ کئی ہفتے پہلے اس سفر کا آغاز کرتے وقت سرمد صاحب نے جو باتیں کی تھیں، وہ ابھی تک عادل کے حافظے پر نقش تھیں۔ سرمد صاحب کو ننانوے فیصد یقین تھا کہ وہ بانگڑی کی چوٹی پر اپنا مقصد حاصل کر لیں گے۔ ان زیورات اور برتنوں تک پہنچ جائیں گے جو قریباً ساڑھے تین سو برس سے کسی تاریک تہ خانے میں موجود تھے...... اور ابھی تک انسانی نظر ان تک نہیں پہنچ پائی تھی۔ یہ عین ممکن تھا کہ پاؤندہ بستی کے سرکردہ لوگوں نے چوٹی پر پہنچ کر اس کھنڈر کو وقتاً فوقتاً کھنگالا ہو لیکن سرمد صاحب کو یقین تھا کہ وہ ان زیورات کے خاص مقام تک نہیں پہنچ سکے۔ یہ پاؤندے اب اسے ایک کارِلا حاصل سمجھتے تھے اور ان لوگوں سے بھی چڑ کھاتے تھے جو صرف چوٹی کو سر کرنے کی نیت سے اس جانب آتے تھے۔ انہوں نے کہانیاں گھڑی ہوئی تھیں کہ چوٹی پر جانا اپنے لیے کسی بڑی مصیبت کو دعوت دینا ہے۔ چند روز پہلے مالکانے زادہ نے بھی اسی طرح کا واویلا کیا تھا۔ اس نے حتی الامکان خوفناک شکلیں بنائی تھیں اور انہیں کسی قدرتی آفت سے ڈرانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ مالکانے زادہ ابھی تک رابے خاں کی تحویل میں

تھا۔اس کی ایک ٹانگ کو زنجیر سے اس طرح باندھ دیا گیا تھا کہ وہ خیمے سے باہر نہ نکل سکے۔اسے باندھنا ان لوگوں کی مجبوری تھی اور اس پر وہ شرمندہ تھے۔کفارے کے طور پر مالکانے زادہ کی بہت خاطر مدارت کی جا رہی تھی۔اس کے آرام و آسائش کا بے حد خیال رکھا جا رہا تھا۔عادل نے کئی دفعہ دیکھا تھا کہ کوئی نہ کوئی پاؤندہ خیمے میں مالکا کی مٹھی چاپی میں مصروف رہتا تھا۔کسی وقت مالکا غصے میں گالیاں بھی بکنے لگتا تھا......جنہیں خندہ پیشانی سے سن لیا جاتا تھا۔بلکہ اس کے تھپڑ وغیرہ بھی برداشت کر لیے جاتے تھے۔وہ نشہ بھی کرتا تھا۔اس کی شراب کی ضرورت پوری کرنے کے لیے رابے خاں نے اپنے سارے ساتھیوں پر پینے کی پابندی عائد کر دی تھی۔اس کا ایک فائدہ تو بہر حال ہوا اور وہ یہ کہ جو پاؤندے پینے کے بعد سرخ انگارہ آنکھوں سے کرسٹل کو گھورتے رہتے تھے، ان کی نظر بازی میں نمایاں کمی واقع ہو گئی۔

عادل واضح طور پر محسوس کر رہا تھا کہ سرمد صاحب متذبذب ہیں۔کسی وقت تو اسے لگتا تھا کہ وہ اب اوپر جانا چاہ ہی نہیں رہے۔لیکن اس لیے جا رہے ہیں کہ انہیں جانا پڑ رہا ہے۔رابے خاں اور اس کے ساتھیوں کے پاس ہتھیار ہیں اور ان ہتھیاروں کی وجہ سے سرمد صاحب مجبور ہیں کہ اوپر جائیں۔شاید انہیں پورا یقین نہیں تھا کہ پاؤندے اپنے وعدے کا پاس کریں گے۔یعنی زیورات میں سے، طے شدہ شرائط کے مطابق انہیں حصہ دیں گے۔یا شاید......وہ کسی اور خطرے کی بُو سونگھ رہے تھے۔عادل نے اب تک ان کی غیر معمولی چھٹی حس کے کئی حیران کن ثبوت ملاحظہ کیے تھے۔وہ جیسے آنے والی آفات کو اپنے اندر کی آنکھ سے دیکھ لیتے تھے اور بے قرار ہو جاتے تھے۔

جس رات کی صبح انہیں روانہ ہونا تھا، اس رات کے پہلے پہر رابے خاں اور سرمد صاحب کے درمیان تھوڑا سا تلخ مکالمہ بھی ہوا۔سرمد صاحب نے کہا۔''ابھی میرا کندھا پوری طرح ٹھیک نہیں۔اگر میری رائے لیتے ہو رابے تو ہمیں تین چار دن مزید انتظار کر لینا چاہیے۔''

رابے خاں تنک کر بولا۔''دیکھو سرمد صیب! ام کو تمہارا نیت میں گڑ بڑی لگتا ہے۔آخر تم اس کام میں دیری کیوں چاہتا ہے۔تم اچھی طرح جانتا ہے، ام مالکا کو زیادہ دیر اپنے پاس چھپا کر نہیں رکھ سکتا۔ہو سکتا ہے کہ ایک آدھ دن میں اس کا تلاش شروع ہو جائے اور تلاش کرنے والا لوگ یہاں تک بھی پہنچ جائے۔''

سرمد صاحب بولے۔''تم خود ہی تو کہتے ہو کہ مالکا کبھی کبھی ہفتوں تک اپنی کوٹھری سے غائب رہتا ہے۔اب بھی یہی سمجھا جائے گا کہ وہ کسی کو بتائے بغیر کسی نچلے علاقے کی طرف نکل گیا ہے۔''

''پھر بھی ام اس طرح کا کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ام کو پورا یقین ہے کہ تمہارا کندھا اب اوپر چڑھنے کے لائق ہے۔اگر تم کئی دن پہلے کچے زخم کے ساتھ اوپر چڑھ گیا تھا تو اب کیوں نہیں چڑھ سکتا؟''

کرسٹل بولی۔''آئی تھنک۔اسی وجہ سے ان کا زخم ابھی تک کاچا (کچا) ہے۔''

رابے پھنکارا۔''تم اپنا چونچ بند ہی رکھو لایتی چڑیا۔ورنہ ام تمہارے سارے پَر کھینچ کر تمہیں سیخ پر چڑھا دے گا۔''

کرسٹل نے کچھ بولنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر سرمد صاحب کے تاثرات دیکھ کر خاموش رہی۔

رابے فیصلہ کن انداز میں بولا۔''سب لوگ تیاری مکمل کر لے۔پروگرام کے مطابق ام لوگ صبح دس بجے تک یہاں سے نکل جائے گا۔''

اس کے بعد وہ اُٹھا اور اپنی لمبی لمبی ٹانگیں چلاتا ہوا باہر نکل گیا۔پروگرام کے مطابق اب رمزی کو دیگر ساتھیوں کے

ہمراہ یہاں مالکا کے پاس رہنا تھا۔رابے خاں، موچھیل فولاد جان اور ان کے ایک تیسرے ساتھی خناب گل کو ان کے ساتھ بانگڑی کی فلک بوس چوٹی کی طرف روانہ ہونا تھا۔عادل کی معلومات کے مطابق فولاد جان اور خناب گل اچھے کوہ پیما تھے۔پاؤندہ ہونے کے باوجود وہ انگلش کے ٹوٹے پھوٹے لفظ بھی بول لیتے تھے۔رابے خاں چڑھائی کی جدید تکنیک میں زیادہ ماہر تو نہیں تھا لیکن وہ بآسانی ان کا ساتھ دے سکتا تھا۔وہ رات کو دیر تک ضروری تیاری میں مصروف رہے اور آخری پہر تازہ دم ہونے کے لیے سو گئے۔

O......❖......O

وہ بڑی صاف شفاف صبح تھی۔دنیا کی یہ عظیم الشان چوٹیاں جن میں سے کوئی بھی 8000 میٹر سے کم اونچی نہیں تھی، نیلے آسمان کے پیش منظر میں دمک رہی تھیں......حسین دوشیزاؤں کی طرح یہ سینہ تانے کھڑی تھیں اور جیسے دعوت دے رہی تھیں کہ آؤ ہمیں فتح کرو۔اگر بازوؤں میں طاقت ہے تو ہمیں تسخیر کر کے دکھاؤ۔ہاں یہ خوبصورت دوشیزاؤں کی طرح تھیں لیکن جس طرح کبھی کبھی حسین عورت زہریلی ناگن کا روپ دھار لیتی ہے، یہ چوٹیاں بھی اپنے عاشقوں سے ایک دم آنکھیں پھیر لیتی تھیں۔ان کے موسم اتنی تیزی سے بدلتے تھے کہ عقل دنگ رہ جاتی تھی۔وہ گھیر کے بے بس کر دیتی تھیں اور پھر اپنی مہلک بلندیوں میں اپنے چاہنے والوں کو یوں مارتی تھیں کہ ان کا نام و نشان بھی نہیں ملتا تھا اور آج ایک ایسی ہی حسین چوٹی ان کے سامنے کھڑی تھی۔انہیں دعوت دے رہی تھی اپنی ہمت آزمانے کی۔

وہ اپنے پورے ساز و سامان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔اس ساز و سامان میں چار خیمے بھی تھے۔انہوں نے خود کو ایک دوسرے کے ساتھ رسے کے ذریعے منسلک کیا اور آگے بڑھنے لگے۔رابے خاں سب سے آگے تھا کیونکہ وہ پہاڑ تک جانے والے راستوں کا بھیدی تھا۔فولاد جان سب سے پیچھے تھا۔خم دار میگزین والی خوفناک آٹھ ایم ایم گن پوری طرح لوڈ تھی اور اس کے ہاتھ میں تھی۔اس کی عقابی نظریں ہر وقت چاروں اطراف گردش کرتی رہتی تھیں۔یوں لگتا تھا کہ وہ کسی بھی خطرے کے وقت بلا جھجک فائر کھول سکتا ہے۔ان کا تیسرا ساتھی بھی مشین پسٹل سے مسلح تھا اور کافی ہتھیار شناس اور نڈر شخص نظر آتا تھا۔ان دونوں کی موجودگی میں کسی طرح کا رسک لینا خود کو شدید خطرے کے حوالے کرنا ہی تھا۔چند روز پیشتر جب ہمایوں مشکوک انداز میں رابے خاں کے خیمے کے قریب پایا گیا تھا، رابے نے بے دریغ اس کے پاؤں کی طرف تین چار فائر داغ دیئے تھے اور علی الاعلان کہا تھا کہ اگلی دفعہ وہ اس طرح اپنا ایمونیشن ضائع نہیں کرے گا بلکہ سیدھی سر میں گولی مارے گا۔

وہ سہ پہر دو بجے تک مسلسل چڑھتے رہے۔ابھی وہ رسوں کی مدد کے بغیر ہی چڑھ رہے تھے۔ایک دو جگہ چڑھائی مشکل ہوئی تو ہمایوں آگے چلا گیا۔اسی دوران میں اس کا ایک پاؤں برف کے اندر چلا گیا اور وہ ایک عمیق برفانی دراڑ میں گرتے گرتے بچا۔وہ ایک دوسرے کے ساتھ رسوں سے بندھے ہوئے تھے اس لیے باقیوں نے اسے مزید نیچے پھسلنے سے بچا لیا۔برفانی دراڑ میں گرنے کا خوف، کوہ پیما کے بدترین اندیشوں میں سے ایک ہوتا ہے۔ایسی برفانی دراڑیں اوپر سے برف سے ڈھکی ہوئی ہوتی ہیں۔ان میں گرنے والا زندہ درگور ہو جاتا ہے اور یہ برف کی ''گور'' ہوتی ہے۔یہ عموماً نیچے سے چوڑی اور اوپر سے تنگ ہوتی ہے۔لہٰذا اس کی دیواروں پر چڑھ کر باہر نکلنا بھی ناممکن ہوتا ہے۔

دوپہر کو کچھ دیر آرام کرنے کے بعد انہوں نے چڑھائی دوبارہ شروع کی۔اب خطرناک مرحلے شروع ہو رہے

تھے۔ انہیں برف میں میخیں ٹھونک ٹھونک کر رسوں کے ذریعے اوپر چڑھنا تھا۔ ہمایوں اور عادل سب سے آگے تھے۔ ہمایوں میخیں ٹھونک رہا تھا اور پیچھے آنے والوں کے لیے چڑھائی کو آسان بنا رہا تھا۔ عادل میخیں اور بولٹس وغیرہ چیک کر رہا تھا اور جہاں کوئی کمی محسوس ہوتی، اسے درست کرتا۔ تربیت زبردست کام آ رہی تھی۔ عادل کے پیچھے کرسٹل تھی، پھر سرمد صاحب۔ اس کے بعد رابے خاں اور اس کے دونوں ساتھی۔

کوئی پانچ سو میٹر کی دشوار چڑھائی کے بعد جب وہ ایک جگہ بیٹھے تو انہیں دور نیچے برف کی سفید چادر پر اپنا کیمپ ماچس کی تین چار چھوٹی ڈبیوں کی طرح نظر آیا۔ ٹوائلٹ والا ٹینٹ علیحدہ ایک چھوٹی ڈبیہ کی طرح نظر آتا تھا۔ عادل نے ہمایوں کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے رابے خاں کی ایک غلطی نوٹ کی؟''

''کیسی غلطی؟''

''جب ہم اوپر آ رہے تھے، ایک موقع ایسا آیا تھا کہ ہم چاروں آگے تھے اور وہ تینوں پیچھے تھے۔'' عادل کی بات نے ہمایوں کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ جان گیا کہ بات قابلِ غور ہے۔

عادل نے سرگوشی جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر اگلی دفعہ ہم کوشش کریں تو بات بن سکتی ہے۔ جب ہم چاروں اوپر چڑھ جائیں......اور ان کا پہلا بندہ اوپر آئے تو ہم اس سے ہتھیار چھین سکتے ہیں۔ ایسے میں ان تینوں کو شوٹ کرنا ہمارے لیے زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔''

''کیا سرمد صاحب اس طرح کے ایڈونچر کی اجازت دیں گے؟'' ہمایوں نے بھی سرگوشی کی۔

''ہمایوں بھائی! ہم حالتِ جنگ میں ہیں۔ جنگ میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب سپاہی کو کمانڈر کی اجازت کے بغیر اپنے طور پر قدم اُٹھانا پڑتا ہے۔''

فولاد جان اپنی رائفل کو حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ''یہ تم کیا بڑبڑ کرتا ہے۔ چپ بیٹھو اور کھانا کھاؤ۔''

اگلے مرحلے کی چڑھائی شروع ہوئی۔ ایک مرتبہ پھر انہیں رسوں کے ذریعے اوپر جانا تھا۔ یہ مرحلہ قریباً ڈھائی تین سو میٹر کا تھا۔ مشکل ترین کام ایک بار پھر ہمایوں کے ذمے تھا۔ وہ ٹھوس برف میں جگہ جگہ میخیں ٹھونکتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور رسے کو ان میخوں سے منسلک کرتا جا رہا تھا۔ عادل کی دھڑکن تیز ہو چکی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس مرتبہ اوپر چڑھنے کی ترتیب کیا ہوتی ہے۔ اگر رابے اور اس کے دونوں ساتھی حسبِ سابق سب سے پیچھے رہتے تو دو آپشن تھے۔ ایک تو یہ کہ رسے کی سپورٹ ختم کر کے انہیں نیچے گرانے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ دوسرا یہ کہ پہلے اوپر چڑھنے والے شخص کو پکڑ کر اس سے ہتھیار چھینا جا سکتا تھا...... کچھ دیر بعد عادل کے سینے سے ٹھنڈی سانس خارج ہوئی۔ رابے نے اس مرتبہ پہلے والی غلطی نہیں دہرائی تھی۔ ہمایوں کے بعد اوپر جانے والے شخص فولاد جان تھا۔ اس کو بعد عادل، سرمد صاحب اور کرسٹل تھے۔ کرسٹل کے عقب میں رابے اور اس کا ساتھی تھے۔ ہمایوں اکیلا فولاد جان کے بے بس نہیں کر سکتا تھا اور اگر کر بھی لیتا تو نیچے آنے والا رابے خاں باآسانی کرسٹل کو یا ان تینوں میں سے کسی کو نشانہ بنا سکتا تھا۔

یہ چڑھائی قریباً ایک گھنٹے میں مکمل ہوئی۔ وہ ہمایوں کے پاس ہموار سطح پر پہنچ گئے۔ یہ پہاڑ کی عمودی چڑھائی کے درمیان ایک چھجا نما جگہ تھی۔ اس کی لمبائی بیس پچیس فٹ ہو گی مگر اس بغیر جنگلے والی ''بالکونی'' میں کھڑے ہو کر نیچے ہزاروں فٹ کی خوفناک گہرائی میں دیکھنا رونگٹے کھڑے کر دیتا تھا۔ برفانی ہوائیں ان کے جسموں سے ٹکراتی تھیں تو یوں

لگتا تھا کہ کوئی تند و تیز جھونکا انہیں اس ''قدرتی بالکونی'' سے دھکیل کر نیچے عمیق گہرائیوں میں پھینک سکتا ہے۔ باامر مجبوری انہیں یہیں پر قیام کرنا تھا۔

رابے خاں کی ہدایت پر یہاں دو چھوٹے خیمے نصب کر دیئے گئے۔ ایک خیمے میں سرمد صاحب اور ان کے ساتھی تھے، دوسرے میں رابے خاں اور اس کے ساتھی۔

رات کو عادل نے ہمت کر کے سرمد صاحب سے یہ بات چھیڑ دی۔ اس نے کہا۔ ''سر! میں محسوس کر رہا ہوں کہ اس وقت ہم آزاد نہیں بلکہ قیدی ہیں۔ رابے خاں ہمیں اپنی مرضی کے مطابق چلا رہا ہے۔''

''ظاہر ہے کہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔'' سرمد صاحب نے کہا۔ ''ان کے پاس ہتھیار ہیں اور تم نے دیکھا ہی ہے کہ وہ ایک لمحے کے لیے غافل نہیں ہوتے۔ ہمارے پاس صرف ایک پستول تھا، اب وہ بھی ان کے قبضے میں ہے اور ہمارے خلاف استعمال ہو رہا ہے۔''

عادل نے ہمایوں کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آمادگی پا کر سرگوشی میں بولا۔ ''سر! اگر آپ کی اجازت ہو تو ہم ایک کوشش کر سکتے ہیں۔ رات کے وقت یقیناً یہ سب کے سب تو نہیں جاگ رہے ہوں گے۔ دو یقیناً سوئیں گے ایک جاگے گا۔ ہم کسی بہانے ان کے خیمے میں جھانک کر صورتِ حال دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے بعد کارروائی کر سکتے ہیں۔''

سرمد صاحب نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں پتا ہی ہے پچھلی دفعہ رابے خاں نے ہمایوں کے پاؤں کے پاس گولیاں چلائی تھیں اور اعلان کیا تھا کہ اب اگر کوئی ان کے خیموں کے پاس بھی نظر آیا تو سیدھا فائر کریں گے۔ ابھی شام کے وقت بھی اس نے یہی بات دہرائی ہے۔ جس طرح ہم سوچ رہے ہیں، اسی طرح وہ بھی سوچ رہے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ کسی کو خیمے کے قریب آنے دیں گے۔ وہ دور ہی سے بات کرنے کے لیے کہیں گے۔''

''مگر سر! ایک کوشش کرنے......''

''نہیں عادل۔'' سرمد صاحب نے تیز سرگوشی میں اس کی بات کاٹی۔ ''میں کسی طرح کے ایکشن کی حمایت نہیں کروں گا۔ خاص طور سے اس خطرناک جگہ پر۔ یہاں کوئی دھینگا مشتی ہوئی تو بہت نقصان ہوگا۔ چھ سات فٹ جگہ ہے۔ ایک طرف پہاڑ، دوسری طرف اندھی کھائی ہے۔ جسے بھی ذرا سا دھکا لگا، وہ نیچے گیا۔''

سرمد صاحب کا حتمی لہجہ سن کر عادل اور ہمایوں خاموش ہو گئے۔ بہرحال سرمد صاحب کی باتوں میں عادل کو امید کی ہلکی سی کرن بھی نظر آئی تھی۔ وہ جیسے کہنا چاہ رہے تھے کہ اگر کوئی کوشش، کرنی ہی ہے تو پھر اس کے لیے یہ جگہ موزوں نہیں ہے۔ یعنی آگے چل کر کہیں کوئی ایسا موقع بن بھی سکتا تھا مگر پھر ایسا ہوا کہ وہ رات ایک ہنگامے کا سبب بن گئی۔

ابھی رات کے قریباً دس ہی بجے تھے۔ مدھم آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ رابے خاں اور اس کے دونوں ساتھی اپنے خیمے میں گپ شپ کر رہے ہیں۔ ساتھ میں قہوے کی ہلکی سی خوشبو بھی ان تک پہنچ رہی تھی۔ سرمد صاحب اور ان کے تینوں ساتھی یعنی عادل، ہمایوں اور کرسٹل بھی کھانے سے فارغ ہو چکے تھے اور سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ زمین سے ہزاروں فٹ کی بلندی پر اس تھوڑی سی ہموار جگہ پر لگا ہوا یہ جدید خیمہ انہیں گھر جیسا آرام فراہم کر رہا تھا۔ باہر ہواؤں کا شور تھا اور کبھی کبھی کسی چھوٹے گلیشیئر کے نشیب میں گرنے کی گونج دار آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔

اچانک انہیں محسوس ہوا کہ رابے خاں وغیرہ کے خیمے سے اُبھرنے والی آوازیں بلند ہو گئی ہیں۔ ان لوگوں میں

شاید کسی بات پر بحث ہو رہی تھی۔ فولاد جان اور اس کے ساتھی خناب کی آوازیں زیادہ بلند تھیں۔ وہ جھگڑ رہے تھے۔ ان کی گفتگو میں بار بار مالکانے زادہ کا نام بھی آرہا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ جھگڑا سنگین صورت اختیار کر گیا۔ گاہے بگاہے رابے خاں کی رعب دار آواز بھی اُبھرتی تھی۔ وہ فولاد اور خناب کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اندازہ ہوا کہ فولاد اور خناب گتھم گتھا ہو گئے ہیں۔ وہ لڑتے ہوئے خیمے سے باہر آ گئے۔ ہمایوں، عادل اور سرمد بھی باہر نکل آئے۔ وہ دونوں جانوروں کی طرح لڑ رہے تھے۔ رابے خاں کے ہاتھ میں رائفل تھی اور وہ ان دونوں کو پیچھے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ عادل کی نگاہوں کے سامنے بجلی سی کوند گئی۔ یہ ایک سنہری موقع تھا۔ اس سنہری موقع کو ہمایوں نے عادل سے بھی پہلے تاڑ لیا۔ وہ رابے خاں کے زیادہ قریب تھا۔ وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح رابے خاں کی طرف گیا اور پوری طاقت سے اس سے ٹکرایا۔ رابے خاں رائفل سمیت دور لڑھک گیا۔ ہمایوں جست کر کے اس پر جا پڑا۔ دوسری طرف عادل اور سرمد صاحب دونوں گتھم گتھا افراد پر جھپٹے۔ عادل نے فولاد کو اس کے لمبے بالوں سے پکڑ کر کھینچا اور پستول ڈھونڈنے کے لیے اس کی کمر کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن پستول وہاں نہیں تھا۔ عادل نے سر کی زوردار ٹکر سے فولاد کو دور پھینک دیا۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ اسے خیمے کی طرف جانا چاہیے۔ یقیناً دوسری رائفل اور پستول خیمے میں ہی تھے۔ وہ خیمے کی طرف لپکا۔ اسی دوران میں فولاد کے ساتھی خناب نے دو قدم بھاگ کر چھلانگ لگائی اور عادل کو لیتا ہوا خیمے پر گرا۔ خیمے کی لچک دار سپورٹس ٹوٹ گئیں اور وہ منہدم ہو گیا۔ عادل اوندھا گرا تھا، خناب اس کی پشت پر تھا۔ عادل نے اس کی پسلیوں میں کہنی کی مہلک ضرب لگائی۔ وہ ذرا ڈھیلا پڑا تو عادل مچھلی کی طرح تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گیا۔ لالی گاؤں میں ''نوری نت'' کے پتلے پر کی گئی کڑی مشق اس کے کام آرہی تھی۔ اس کی ایک زوردار ٹانگ نے خناب کو کئی قدم پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ وہ پیچھے ہٹا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ ''کئی قدم'' کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ صرف سات فٹ جگہ تھی اور عقب میں کئی ہزار فٹ گہری اندھی کھائی تھی۔ کنارے پر خناب نے ایک لمحے کے لیے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن پھر لڑھک گیا۔ گرتے ہوئے اس نے کنارہ تھام لیا تھا۔ اب اس کا جسم کھائی کے جان لیوا خلا میں تھا اور وہ دونوں ہاتھوں کی مدد سے جھول رہا تھا۔ اس نے بازوؤں کے زور سے پھر اوپر چڑھنے کی کوشش کی مگر عادل یہ موقع دینے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔ اس کی دوسری بے رحم ٹھوکر خناب کے چہرے پر پڑی۔ کنارے سے اس کی گرفت ختم ہو گئی اور وہ ایک کربناک آواز کے ساتھ موت کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ یہ سب کچھ تین چار سیکنڈ کے اندر ہی وقوع پذیر ہوا تھا۔ ''عادل......'' سرمد صاحب کی چلاتی ہوئی آواز کانوں میں پڑی۔

وہ اضطراری طور پر نیچے جھکا اور اس کا یوں جھکنا اسے شدید زخمی ہونے سے بچا گیا۔ رابے خاں کی چلائی ہوئی کلہاڑی اس کے سر کے بالوں کو چھوتی گزر گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ رابے دوسرا وار کرتا، عادل بیٹھے بیٹھے اس کی ٹانگوں سے چمٹا اور اسے پشت کے بل گرا دیا۔

سرمد صاحب اور ہمایوں، فولاد جان کو زیر کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ خبیث غیر معمولی طاقت اور پھرتی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ یکایک وہ تڑپ کر گرفت سے نکلا۔ کرسٹل دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ وہ سیدھا اس پر جا پڑا۔ ''رُک جاؤ......'' وہ چنگھاڑا۔ ''نہیں تو اس حرامزادی کو گولی مار دے گا۔''

سب اپنی اپنی جگہ ساکت رہ گئے۔ فولاد جان کے ہاتھ میں واقعی پستول تھا۔ یہ پستول اس نے اپنے بھاری...... بھر

کم لباس میں سے کب اور کس وقت نکالا، کسی کو پتا نہیں چلا۔ فولاد جان کی لرزہ خیز آواز اس امر کی گواہی دے رہی تھی کہ ان تینوں میں سے کوئی آگے بڑھا تو واقعی وہ جیتی جاگتی کرسٹل کو لاش میں تبدیل کر دے گا۔

''مار دے گا...... ہاں مار دے گا۔'' وہ پھر نوحہ کرنے والے انداز میں دھاڑا۔ لگتا تھا کہ وہ رو رہا ہے۔

رابے خاں تیزی سے آگے گیا۔ اس نے اپنی گری ہوئی رائفل اُٹھالی اور اُلٹے قدموں چل کر فولاد جان کے قریب کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک بار پھر بے دست و پا تھے۔ فولاد جان نے وحشت کے عالم میں کرسٹل کو اس کے سنہری بالوں سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی، کھائی کے کنارے پر گری۔ وہ تھوڑا سا اور زور لگاتا تو وہ بھی شاید خناب کے پیچھے ہی پیچھے روانہ ہو جاتی۔ اب وہ چاروں اندھی کھائی کے کنارے پر تھے۔ فولاد جان اور رابے خاں نے اپنے آتشیں ہتھیار ان کی طرف سیدھے کر رکھے تھے۔

فولاد جان اشک بار آواز میں گرجا...... عادل کو مخاطب کر کے بولا۔ ''تم نے مار دیا اسے۔ تم قاتل ہے، ام تم کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔'' اس نے پستول عادل کی طرف سیدھا کیا۔ عادل کو اپنی آنکھوں کے سامنے موت بالکل صاف نظر آئی۔ اسے لگا کہ گولی اس کے سر یا گردن میں کہیں لگے گی۔ وہ پیچھے کی طرف جائے گا اور پھر ایک ایسی تاریک کھائی کے اوپر پرواز کرنے لگے گا جس کی تہ کا کچھ اندازہ نہیں ہے۔ وہ کتنی دیر گرتا رہے گا؟ کیا وہ ٹھوس جگہ پر ٹکرانے سے پہلے ہی مر جائے گا، یا ٹکرانے کے بعد مرے گا؟ اپنی بوڑھی ماں اور غمناک آنکھوں والی شہزادی کے چہرے اس کی نگاہوں میں آئے۔ جب اس کی موت کی خبر ان تک پہنچے گی اور انہیں معلوم ہوگا کہ ایک یخ بستہ رات میں زمین سے ہزاروں فٹ کی بلندی پر سے گر کر عادل کی جان چلی گئی تھی تو وہ کیا سوچیں گی؟ کیسے برداشت کریں گی یہ سب کچھ؟

یکایک رابے خاں کی کڑک دار آواز عادل کے کانوں میں پڑی۔ وہ اپنے ساتھی فولاد جان سے مخاطب تھا۔ ''نہیں...... نہیں۔'' وہ اسے روک رہا تھا۔ اس نے زور لگا کر فولاد جان کے پستول کا رُخ نیچے کرنا چاہا۔ فولاد جان ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا چکا تھا۔ پستول نے دھماکے سے شعلہ اگلا اور گولی نیچے برف میں کہیں گھس گئی۔

''نہیں فولاد نہیں...... ابھی نہیں۔'' رابے خاں پھر چلایا اور بائیں ہاتھ سے فولاد کی کلائی مضبوطی سے تھام لی۔ دائیں ہاتھ میں آٹھ ایم ایم رائفل تھی اور اس کا رُخ عادل وغیرہ کی طرف تھا۔ وہ دونوں ہی سر تا پا شعلہ تھے۔

رابے خاں نے ان چاروں کو خیمے میں چلنے کا حکم دیا۔ وہ خیمے میں چلے گئے اور رابے خاں کے حکم پر نکاسی کے راستے کی دونوں زپ بند کر دیں۔

سرمد صاحب کے چہرے اور گردن پر خراشیں نظر آرہی تھیں۔ یہ خراشیں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہونے والی دھینگا مشتی کا نتیجہ تھیں۔ سرمد صاحب نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''جو ہوا اچھا نہیں ہوا۔ خناب کی موت ان کو آسانی سے ہضم نہیں ہوگی۔''

سرمد صاحب کی بات یقیناً درست تھی۔ باہر سے فولاد جان کو روکنے اور گرجنے برسنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ رابے خاں اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کرسٹل نے لرزاں آواز میں سرمد صاحب سے پوچھا۔ ''یہ خناب کیا فولاد جان کا رشتے دار تھا۔''

سرمد صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس کا پھوپھی زاد تھا۔''

باہر صورتِ حال سنگین ہوتی جا رہی تھی۔ فولاد جان غضبناک انداز میں رو رہا تھا۔ مشتعل فولاد جان اور رابے خاں کے درمیان جو باتیں ہو رہی تھیں ان سے انہیں اندازہ ہوا کہ فولاد اور خناب میں مالکانے زادہ کے حوالے سے بحث ہوئی اور پھر جھگڑا ہوا۔ خناب، مالکانے زادہ کے عقیدت مندوں میں سے تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر مالکانے زادہ نے اوپر بانگڑی پر جانے سے منع کیا ہے تو انہیں اوپر نہیں جانا چاہیے۔ کم از کم کھنڈر سے تو باہر ہی رہنا چاہیے۔ بس اسی تکرار نے لڑائی کی شکل اختیار کر لی۔ لیکن یہ تو فولاد کے بھی وہم و گمان میں نہیں تھا کہ اس لڑائی کا نتیجہ خناب گل کی اچانک موت کی صورت میں نکل آئے گا۔ وہ اب سراپا غیظ و غضب تھا اور خون کے بدلے خون کا مطالبہ کر رہا تھا۔ مقامی عقیدے کے مطابق اسے فوری انصاف درکار تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے قتل ہوا تھا اور اگر اسے فوری انصاف نہ ملتا تو مرنے والے کی روح آسمان اور زمین کے درمیان بھٹکتی رہ جاتی اور اس کا سارا وبال خود فولاد جان پر پڑتا۔

پھر باہر ہونے والی باتوں سے یوں لگا کہ اگر رابے خاں نے ابھی فی الفور کوئی فیصلہ نہ کیا تو فولاد جان اس سے بھی باغی ہو جائے گا اور اسے اپنا دشمن تصور کرے گا۔ یہ دونوں مقامی زبان میں بات کر رہے تھے۔ ان سب میں سے صرف ہمایوں ہی یہ باتیں اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔

سرمد صاحب نے اس سے پوچھا۔ ''ہاں، اب کیا بات چل رہی ہے؟''

''وہ ایک ہی رٹ لگا رہا ہے جی۔ خون کا بدلہ خون، ورنہ وہ رابے خاں کی بھی نہیں سنے گا اور جو اس سے بن پڑا کرے گا۔ وہ عادل سے بدلہ لینے کی بات کر رہا ہے لیکن رابے خاں اسے بتا رہا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ رابے کہہ رہا ہے کہ اس لڑکے کو خاص طور سے ساتھ لایا گیا ہے اور اس کے بغیر یہ سفر مکمل نہیں ہو سکے گا۔''

باہر فولاد جان اب باقاعدہ چنگھاڑ رہا تھا۔ وہ بار بار ایک فقرہ بولتا تھا اور اس کے جواب میں رابے خاں بھی کچھ کہتا تھا عادل نے محسوس کیا کہ ہمایوں کا رنگ کچھ پھیکا پڑ رہا ہے۔ ہمایوں اب تک ایک دلیر ساتھی ثابت ہوا تھا لیکن ان لمحوں میں وہ ذرا نروس دکھائی دیا۔

''کیا ہوا ہے؟ کیا کہہ رہے ہیں وہ؟'' سرمد صاحب نے پوچھا۔

''نہیں، کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ وہی بدلے کی بات ہو رہی ہے۔''

سرمد صاحب جیسے کچھ تاڑ گئے تھے۔ غالباً باہر ہونے والی باتوں میں سے بھی کچھ جملے ان کی سمجھ میں آ رہے تھے۔ انہوں نے ہمایوں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ شاید...... اب تمہارے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ یعنی اگر عادل نہیں تو پھر تم۔ ایک کے بدلے ایک، چاہے ہم میں سے کوئی بھی ہو......''

ہمایوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی دوران میں جیسے باہر کوئی فیصلہ ہو گیا۔ ٹارچ کا روشن دائرہ خیمے کی طرف بڑھا۔ ''چرر'' کی طویل آواز سے پہلے خیمے کا بیرونی غلاف چاک ہوا، پھر اندرونی بھی ہو گیا۔ غلاف چاک کرنے والا رابے خاں ہی تھا۔ اس نے ہمایوں کو گریبان سے دبوچا اور زور لگا کر باہر کھینچ لیا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر چمک رہا تھا۔ اسی تیز دھار خنجر سے اس نے خیمے کو چاک کیا تھا۔ خنجر کمر میں اڑس کر اس نے پستول نکال لیا اور ہمایوں کو پتھریلی دیوار کے ساتھ کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ فولاد جان نے بھری ہوئی آٹومیٹک رائفل کا رُخ ان تینوں کی طرف کر رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ذرا سے شک پر بھی وہ گولیوں کی بوچھاڑ کر دے گا۔

''رُک جاؤ۔'' سرمد صاحب جلدی سے باہر نکل آئے۔

''تم پیچھے ہٹو۔'' رابے خاں نے انہیں زوردار دھکا دیا پھر چند قدم پیچھے ہٹ کر پستول کا رُخ ہمایوں کی طرف کر لیا۔

یہ نازک ترین صورتِ حال تھی۔ رابے خاں کی رائفل بھی اس کے دائیں ہاتھ میں آ گئی تھی۔ یعنی وہ تین ہتھیاروں کی زد میں تھے۔ رابے خاں نے اب تینوں کو کور کر لیا تھا۔ فولاد جان نے اپنی رائفل کا رُخ ہمایوں کی طرف موڑ دیا۔ اب وہ کسی بھی لمحے ہمایوں پر ٹریگر دبا سکتا تھا۔ یہ عادل کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس کی جگہ ہمایوں کو قربانی کا بکرا بنایا جائے، یہ اسے کسی طرح قبول نہیں تھا۔ اس کے کشارہ سینے میں ایک بار پھر چنگاریاں بکھر گئیں۔ اس کا دل چاہا وہ نتائج سے بے پروا ہو کر فولاد جان پر جا پڑے...... حالانکہ وہ جانتا تھا کہ کامیابی کے امکانات پندرہ بیس فیصد سے زیادہ نہیں ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا، سرمد صاحب کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ وہ رابے خاں سے کہہ رہے تھے۔ ''اگر ہمایوں کو کچھ ہوا تو نتیجہ تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔''

عادل نے دھیان سے دیکھا اور سرتاپا لرز گیا۔ سرمد صاحب اس قدرتی بالکونی کے بالکل کنارے پر کھڑے تھے۔ اس طرح ان کے دونوں پاؤں کا کچھ حصہ خلا میں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ہوا کا کوئی تند جھونکا بھی انہیں ہزاروں فٹ کی گہرائی میں پھینک سکتا ہے۔

وہ بالکل ساکت نظر آتے تھے۔ اور پختہ ارادے نے جیسے انہیں سر سے پاؤں تک ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ پھر بولے۔ ''میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، تم اس پر گولی چلاؤ گے تو میں نیچے کود جاؤں گا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔''

خدا کی پناہ...... سرمد صاحب کی آواز میں ایسا مصمم ارادہ تھا کہ جس نے رابے خاں کو تو چونکایا ہی، فولاد جان بھی ٹھٹک کر رہ گیا

''رُک کیوں گئے ہو، چلاؤ اس بچے پر گولی اور مجھے بھی مرتا ہوا دیکھو......'' وہ پھر بولے۔ آواز میں اطمینان ہی اطمینان تھا۔

لمحے صدیوں پر بھاری تھے۔ یہ اعصاب کی جنگ تھی۔ یہ دونوں پاؤندے بڑی اچھی طرح جانتے تھے کہ سرمد صاحب کے بغیر ان کا سفر بے کار ہو گا تہ خانے میں زیورات کی اصل جگہ کے بارے میں صرف وہی جانتے ہیں اور وہی انہیں وہاں تک پہنچا سکتے ہیں۔

رابے خاں نے ہاتھ بڑھا کر فولاد جان کی رائفل کا رُخ نیچے کر دیا۔ پھر سرمد صاحب سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تم اپنے ہوش میں تو ہے؟ یہ کیا کر رہا ہے؟''

''یہی سوال میں تم سے کر رہا ہوں، تم نے اپنے ہوش کیوں کھو دیئے ہیں۔ یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے ہاتھا پائی کے دوران میں ہوا ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی نیچے گر سکتا تھا اور کسی کی وجہ سے بھی گر سکتا تھا۔ کیا پتا کہ فولاد اور خناب جس طرح گتھم گتھا ہوئے تھے، دونوں ہی نیچے گر جاتے۔''

''تم کیا سمجھتا ہے کہ تم ایسا دھمکی دے کر ہم کو اپنے بھائی کا بدلہ لینے سے باز رکھ سکے گا۔'' فولاد جان چنگھاڑا۔

''میں دھمکی نہیں دے رہا۔ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو گولی چلا کر دیکھو۔ تمہیں اپنا پھوپھی زاد جتنا عزیز تھا، اس سے کہیں

زیادہ مجھے میرا یہ بچہ عزیز ہے۔ میں کچھ اور تو نہیں کر سکتا لیکن اس کی موت کا بدلہ تمہارے اس سفر کو بُری طرح ناکام کر کے لے سکتا ہوں۔'' سرمد صاحب کے لہجے میں غیر معمولی سکون اور ٹھہراؤ تھا اور یہی ٹھہراؤ ان دونوں پاؤندوں کو سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔

رابے خاں، فولاد جان کو لے کر چند قدم پیچھے ہٹا اور اس کے کان میں سرگوشیاں کرنے لگا۔ یہ سرگوشیاں دو تین منٹ جاری رہیں۔ دونوں کی رائفلوں کا رُخ بدستور ان چاروں کی طرف تھا، پھر غیر متوقع طور پر فولاد جان نے بڑی نفرت سے عادل اور ہمایوں کی طرف تھوکا اور ان کی طرف گولی چلائی۔ اس نے تین فائر کیے، یہ فائر اس نے برف پر کیے تھے۔ تب وہ پھنکارتا ہوا اپنے خیمے کی طرف چلا گیا۔

بلا ٹل گئی۔ کم از کم وقتی طور پر ٹل گئی۔ رابے خاں، عادل کی طرف دیکھ کر گرجا۔ ''خناب کا خون تمہیں معاف نہیں کیا ہے۔ اس کا فیصلہ سفر سے واپسی پر ہوگا۔ تم کو حساب دینا پڑے گا، ہر صورت میں دینا پڑے گا۔''

اس ہنگامے میں دونوں خیمے بُری طرح متاثر ہوئے تھے۔ رابے خاں والے خیمے کو ٹھیک کیا گیا۔ دوسرے خیمے کی جگہ سامان میں سے ایک اور خیمہ نکال لیا گیا۔ فولاد جان ابھی تک شدید غم و غصے کے ریلے میں بہہ رہا تھا۔ وہ نہ جانے کیا کیا بول رہا تھا۔ گاہے بگاہے وہ عادل کے لیے گالیاں بھی بکنے لگتا تھا۔ کرسٹل ابھی تک داخون کے قتل والے واقعے کو ہی نہیں بھولی تھی، اب اس نئے واقعے نے اسے مزید متاثر کر دیا تھا۔ وہ بالکل گم صم بیٹھی تھی اور بار بار اس کنارے کو دیکھنے لگتی تھی جس سے آگے ایک تاریک خلا تھا......اور جس خلا نے کچھ دیر پہلے جیتے جاگتے خناب کو نگلا تھا۔ وقتی طور پر تو عادل کی جان بچ گئی تھی اور ہمایوں کی بھی لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب شعلہ صفت فولاد جان کے اعصاب جواب دے جائیں اور وہ ان دونوں پر فائر کھول دے۔ یہ بہت تناؤ والی صورتِ حال تھی۔

○......❖......○

وہ رات جیسے تیسے گزر گئی۔ اگلی صبح وہ پھر چڑھائی کے لیے تیار تھے۔ رونے سے فولاد جان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اس کے تیور خطرناک تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اب وہ ان چاروں میں سے کسی کی کوئی غلطی معاف نہیں کرے گا اور نتائج سے بے پروا ہو کر اپنی آٹھ ایم ایم استعمال کر گزرے گا۔ رابے خاں بھی ہمیشہ سے زیادہ سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے نہایت کرخت لہجے میں ان چاروں کو اُٹھنے اور تیاری کرنے کی ہدایت کی۔ اس موقع پر تو یہی لگ رہا تھا جیسے ان چاروں اور دو عدد خطرناک رائفلوں کے درمیان بس ایک ''دفینہ'' ہی حائل ہے۔ اگر رابے اور فولاد کو سونا چاندی ملنے کی امید نہ ہو تو وہ ابھی اسی جگہ پر ان تینوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیں اور کرسٹل پر مزید ستم توڑنے کے لیے اسے اپنی تحویل میں لے لیں۔ عادل کے ذہن میں بے شمار اندیشے چنگھاڑ رہے تھے اور یقیناً ایسے ہی اندیشے دیگر ساتھیوں کے ذہنوں میں بھی ہوں گے۔ زیورات ملنے کے بعد صورتِ حال کیا ہوگی؟ حصہ ملنا تو اب دور کی بات نظر آ رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ انہیں قتل کر دیا جاتا اور انہی ویران برفوں میں کہیں دفن کر دیا جاتا جیسے داخون دفن ہوا تھا۔ اگر تہ خانے میں سے کچھ نہ ملتا تو بھی یہی صورتِ حال پیش آ سکتی تھی۔ ناکامی کے بعد یہ لوگ سخت مایوسی کا شکار ہوتے۔ انہیں مار ڈالنا ان دونوں کے لیے بالکل دشوار نہ ہوتا۔ یہ بات تو طے تھی کہ یہ انہیں ''پاؤندہ بستی'' میں ہرگز نہیں لے جائیں گے۔ ایسی صورت میں ان کے پاس یہی راستہ تھا کہ ان چاروں کو قتل کر دیا جاتا۔ مالکانے زادہ کا معاملہ پیچیدہ تھا۔ ممکن تھا کہ اسے بھی مار دیا جاتا یا پھر

زیورات ملنے کی صورت میں لالچ وغیرہ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا جاتا۔

اب چڑھائی دشوار ہوتی جا رہی تھی اور وہ مشکل ترین مرحلہ بھی قریب آ گیا تھا جس کے لیے بڑی محنت سے عادل کو تیار کیا گیا تھا۔ سرمد صاحب نے عادل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ اب تم ہمیں لیڈ کرو۔ تمہیں ایک طرح سے وارم اَپ ہونے کا موقع بھی ملے گا۔''

''جو آپ کا حکم سر۔'' عادل نے کہا اور اس کے جسم میں میٹھا میٹھا جوش لہر لینے لگا۔

آخر وہ گھڑیاں قریب آ ہی گئی تھیں جس کے لیے اس نے سخت تربیت حاصل کی تھی اور طویل مشقیں کی تھیں۔ اس نے ''بارنیس'' پہنا۔ ہیلمٹ، چشمہ، دستانے اور دیگر لوازمات پورے کیے۔ ہتھوڑی ڈرل مشین اور بولٹس وغیرہ لے کر چڑھائی شروع کر دی۔ خوف کہیں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اب اسے مزہ آ رہا تھا۔ اس کا دل کہتا تھا کہ سرمد صاحب نے اس کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، وہ درست ہے۔ وہ بلندی کی طرف جانے کے لیے دوسروں سے بہت بہتر ہے۔ اس میں یہ خداداد صلاحیت ہے۔ وہ ایک عمودی چڑھائی پر جس طرح میخیں گاڑتا اوپر چڑھتا جا رہا تھا، وہ سب کو حیران کر رہا تھا۔ کرسٹل کے بیک پیک (کمر کے تھیلے) میں ویڈیو کیمرا بھی موجود تھا۔ سرمد صاحب کی ہدایت کے مطابق وہ کہیں کہیں کلپس بھی بنا رہی تھی۔ اوپر چڑھتے ہوئے عادل نے چند لمحے رُک کر اپنے اردگرد دیکھا اور ششدر ہوا۔ کیا یہ جاگتی آنکھوں کا خواب تھا۔ وہ قریباً انیس ہزار فٹ کی بلندی پر موجود تھا۔ ایک سپاٹ برفیلی دیوار کے ساتھ چیونٹی کی طرح چمٹا ہوا تھا اور اس کے اردگرد دنیا کی بلند ترین برفیلی چوٹیاں تھیں۔ نیچے ایسی گہرائیاں تھیں جن کی تہ کا اندازہ لگانا بھی دشوار تھا۔ خطرہ اور جوش......خطرہ اور جوش یہ دونوں احساس اس طرح آپس میں گڈمڈ ہو گئے تھے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ناممکن تھا۔ کہیں ایک بولٹ دھوکا دے جاتا یا ایک کاربینر کھل جاتا تو زندگی......موت کی اتھاہ گہرائیوں کی طرف روانہ ہو سکتی تھی۔

کرسٹل اس کے پیچھے آ رہی تھی۔ باقی افراد بھی بہت نیچے تھے۔ کرسٹل کی ہانپتی سانسیں عادل کی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ پھر کرسٹل نے عجیب کام کیا۔ اس نے عادل کے بوٹ کو بوسہ دیا اور بولی۔ ''ہام، تو م سے محبت کرتا عاڈل...... بہت زیادہ محبت۔''

عادل ٹپٹا کر رہ گیا۔ ہزاروں فٹ کی بلندی پر رسے سے لٹک کر اظہارِ محبت کرنے کا یہ اچھا طریقہ تھا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔

''ڈو یو لسن می؟'' اس نے پوچھا۔

''نو۔'' عادل نے اطمینان سے کہا۔

''تو م بہت ناٹی۔ اسی لیے ہام کو آچھا لگتا۔ تو م دوسروں سے بہت ڈفرنٹ، یو آر گاڈ گفٹڈ۔ خدا نے تو م کو اسی خاص کام کے لیے بنایا۔''

''شکریہ۔'' عادل نے ایک جگہ ڈرل سے سوراخ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے پھر عادل کے پاؤں کو بوسہ دیا۔ ''ہام، تو م کے لیے سب کچھ کر سکتا۔ اگر تو م کہے کہ ہام اپنے کاربینرز کھول کر نیچے چھلانگ لگا دے تو ہام ابھی لگا سکتا ہائیں۔''

''او کے، تو پھر لگا دو۔'' عادل نے ٹھوس برف میں ایک لمبا بولٹ کستے ہوئے کہا۔

''واقعی لگا دے؟'' کرسٹل نے پوچھا۔

کرسٹل کے لہجے نے عادل کو چونکا دیا۔ عجیب ہیجانی سا لہجہ تھا جس میں خود فراموشی اور سرکشی کی جھلک تھی۔ اس دیوانی لڑکی سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ کوئی بھی اُلٹی سیدھی حرکت کر سکتی تھی۔ نیچے نہ بھی گرتی تو خود کو کسی شدید خطرے میں ڈال دیتی۔ اس نے بات آگے بڑھنے سے پہلے ہی ختم کر دی۔ ''مذاق کر رہا ہوں۔ مجھے پتا ہے تم اتنی جلدی میرا پیچھا چھوڑنے والی نہیں ہو۔''

''اگر کوئی شک ہو تو کبھی ہام کو آزمانا مانگتا ہوئیں گا۔''

''تم اردو کا کچومر نکال دیتی ہو۔ شاید تم کہنا چاہتی ہو کہ اگر مجھے کوئی شک ہو تو کبھی تمہیں آزما لوں۔''

''یس اِٹ اِز۔''

''ٹھیک ہے، اب اپنی بات یاد رکھنا۔ میں کبھی تمہیں آزماؤں گا۔''

''لیکن آچھا آزمانا۔ بُرا نائیں۔''

''آزمانا تو آزمانا ہی ہوتا ہے۔'' عادل نے رسے کے ذریعے کچھ اوپر جاتے ہوئے کہا۔

''آچھا...... یہ کاچومر (کچومر) کیا ہوتا۔ تو م نے ابھی بولا ہے۔''

''اس کو روغنی نان کے ساتھ کھاتے ہیں۔ اچھا اب چپ ہو جاؤ۔'' عادل نے سٹپٹا کر کہا اور کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

چڑھائی کافی مشکل تھی۔ پورے دن میں وہ صرف دو ڈھائی ہزار فٹ اوپر جا سکے پھر ایک نسبتاً ہموار جگہ پر انہوں نے کیمپ لگا لیا۔ دو خیمے ایستادہ کر دیئے گئے۔ اب انہیں اپنا بیس کیمپ نظر آنا بند ہو گیا تھا۔ ہاں، دوسرا کیمپ دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ رابے خاں کے کہنے پر سرمد صاحب نے واکی ٹاکی کے ذریعے ''بیس کیمپ'' سے رابطہ قائم کیا۔ بہت مدھم آواز آ رہی تھی۔ بہرحال رابے خان ساتھیوں کی خیر خیریت دریافت کرنے میں کامیاب ہوا۔ اسے یہ بھی پتا چلا کہ مالکانے زادے کو شدید بخار ہے اور وہ بہت اول فول بول رہا ہے۔

جتنی دیر رابے خاں واکی ٹاکی پر بات کرتا رہا، فولاد جان اپنی آٹومیٹک رائفل دونوں ہاتھوں میں لیے بالکل چوکس کھڑا رہا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی غافل ہونے کو تیار نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں ابھی تک ورم زدہ تھیں اور چہرے سے غم و غصہ ٹپکتا تھا۔ خاص طور سے عادل کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی چھوٹ جاتی تھیں۔

وہ اپنے اپنے خیموں میں جانے لگے تو فولاد جان کرخت لہجے میں بولا۔ ''تم میں سے ایک امارے ساتھ امارے خیمے میں رہے گا۔ ام تم پر اب زیادہ اعتبار نہیں کر سکتا۔''

وہ طائرانہ نظروں سے ان چاروں کی طرف دیکھنے لگا جیسے سوچ رہا ہو کہ کس کو اپنے خیمے میں چلنے کا کہے۔ اس کی نگاہیں کرسٹل پر آ کر رُک گئیں۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ تاثرات گواہی دے رہے تھے کہ وہ کرسٹل کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ایسا ممکن نہیں۔ سرمد صاحب اُسے ایسا ہرگز نہیں کرنے دیں گے۔

''ہاں، کون جائے گا؟'' رابے خاں نے پوچھا۔ پھر کسی کے جواب دینے سے پہلے ہی بولا۔ ''تم آ جاؤ سرمد

صاحب۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے، تمہاری آشیر باد سے ہی تو ہوتا ہے۔''

سرمد صاحب فوراً رابے خاں اور فولاد جان کے خیمے کی طرف چلے گئے۔ عادل نے آگے بڑھنا چاہا تھا لیکن سرمد صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

عادل، ہمایوں اور کرسٹل اپنے خیمے میں آ گئے۔ کل والے واقعے کے بعد رابے اور فولاد بہت محتاط ہو گئے تھے اور ان کا رویہ بھی پہلے سے بہت سخت ہو گیا تھا۔ یہ پھر ایک نہایت یخ بستہ اور اَبر آلود رات تھی۔ گہرے بادلوں کے مرغولوں نے ان کے خیموں کو ڈھانپ لیا تھا۔ ٹمپریچر نکتہ انجماد سے 30 درجے نیچے تھا۔ وہ ٹن پیک فوڈ سے مختصر ڈنر کرنے کے بعد اپنے اپنے سلیپنگ بیگز میں گھس گئے۔ ہمایوں اپنی ڈائری لکھتا رہا۔ کرسٹل اور عادل باتیں کرتے رہے۔

عادل نے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے کرسٹل! اگر کل معاملہ بگڑ جاتا، میرا مطلب ہے کہ فولاد جان ہمایوں پر فائر کر دیتا تو کیا سرمد صاحب واقعی گہرائی میں چھلانگ لگا دیتے؟''

ہمایوں نے ڈائری ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ ''بات چھلانگ لگانے یا نہ لگانے کی نہیں تھی عادل۔ بات اپنے یقین اور اپنے اندر کی توانائی کی تھی۔ سر کا یقین، فولاد وغیرہ کے یقین سے زیادہ پختہ ثابت ہوا۔ ان کے یقین نے فولاد کے یقین کو شکست دے دی......''

''ہمایوں بھائی! تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن اگر ایسا نہ ہو سکتا تو پھر......؟''

''یہی تو بے یقینی ہے۔ سر سرمد جیسے لوگ ''اگر'' کے بارے میں سوچتے ہی نہیں۔ وہ بس یہ جانتے ہیں کہ یہ ہوگا اور ہو کر رہے گا۔ اسی لیے وہ کامیاب ہو جاتے ہیں۔ بہرحال ہمیں آئندہ بہت محتاط رہنا ہوگا۔ اس خبیث فولاد جان کی آنکھ میں سؤر کا بال ہے۔ اس کو ذرا سا اشتعال آیا تو یہ کچھ نہ کچھ کر گزرے گا۔''

ہمایوں کو سر میں شدید درد محسوس ہو رہا تھا۔ وہ حسبِ عادت پچھلے دو روز سے دوا سے اجتناب کر رہا تھا لیکن آج کرسٹل کے کہنے پر اسے کھانا پڑی۔ کرسٹل نے اپنے میڈیکل پاؤچ میں سے ٹیبلٹس نکال کر اسے دیں جو اس نے پانی کے ساتھ نگل لیں اور سو گیا۔ عادل اور کرسٹل ہلکی پھلکی باتوں میں مصروف رہے۔ باہر ہواؤں کا شور تھا اور بادلوں کے مرغولے تھے۔ اچانک کرسٹل نے عادل سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''تو م نے اس بات کو مائنڈ تو نائیں کیا جو ہام نے آفٹر نون میں کہا؟'' اس کا اشارہ اظہارِ محبت کی طرف تھا۔

''اگر تم نے مذاق میں کہا تو کوئی بات نہیں۔ لیکن اگر سنجیدگی سے کہا تو پھر مائنڈ کرنا چاہیے۔''

''تو پھر مائنڈ کر لو۔'' وہ شوخی سے بولی۔

عادل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''کرسٹل! تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ تم کسی بھی لڑکے کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہو اور وہ نہ ہو، یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن...... میرا مسئلہ کچھ اور ہے کرسٹل۔ میں نے تمہیں بتایا ہے، میں کسی سے پیار کرتا ہوں۔ بہت زیادہ...... میں یہاں ان برفوں میں جو مارا مارا پھر رہا ہوں تو اس کے پیچھے اصل وجہ وہی ہے۔ میں اس کے لیے کچھ کر کے دکھانا چاہتا ہوں اور وہ یہاں سے سیکڑوں میل دور ہے۔ وہ وہاں کی تپتی دوپہروں میں کھیتوں کھلیانوں میں گھومتی ہے، خالی راستوں کو دیکھتی ہے اور میرا انتظار کرتی ہے۔''

کرسٹل نے عادل کی آنکھوں میں دیکھا۔ جیسے اس کی آنکھوں میں شہزادی کی تصویر کھوجنا چاہتی ہو۔ مسکرا کر بولی۔

''وہ کیسی ہے عادل؟ کیا وہ بہت بیوٹی فل ہائیں؟''

عادل نے تکیہ سر کے نیچے درست کرتے ہوئے کہا۔''میں نے تو تمہیں اس کے بارے میں کافی کچھ بتایا ہے..... اوراس کے علاوہ بھی کئی باتیں بتائی ہیں لیکن تم نے ابھی تک منہ پر چپ کی مہر لگا رکھی ہے۔ کچھ تم بھی تو بتاؤ۔''

''ہام کیا بتائے؟'' وہ لگاوٹ سے بولی۔

''میرے خیال میں بہت کچھ بتانے کو ہے...... مثلاً وہ لڑکا جو تمہیں ایبٹ آباد کے ہوٹل میں ملا تھا۔ آدھی رات کو تمہارے کمرے میں داخل ہوا تھا اور شاید...... تمہاری مرضی کے خلاف ہی داخل ہوا تھا۔''

وہ ایک بار پھر چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ چند سیکنڈ بعد اُٹھ کر بیٹھ گئی تاکہ عادل سے رُوبرو ہو کر بات کر سکے۔ عادل اسی طرح نیم دراز رہا۔''تو یہ بات انڈراسٹڈ ہے کہ توم نے ہام کا جاسوسی کیا۔''

''نہیں کرسٹل! یہ سب ایک اتفاق تھا۔ میں جاگ رہا تھا جب تمہارے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تو تجسس سے مجبور ہو کر باہر نکلا۔ وہ برٹش لڑکا تمہارے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے اسے نکلتے بھی دیکھا۔ اس دوران میں تم دونوں کے درمیان شاید کوئی سخت کلامی بھی ہوئی تھی۔'' عادل یہ بات چھپا گیا کہ اس نے روشن دان پر چڑھائی کی تھی اور وہاں سے یہ نظارہ دیکھا تھا۔

وہ ایک دم بجھی ہوئی سی نظر آنے لگی۔ وہ ہر وقت ہشاش بشاش رہتی تھی اس لیے افسردگی اس کے چہرے پر کچھ عجیب سی دکھائی دی۔ عادل نے اس کی خاموشی کو توڑنے کے لیے تھوڑا سا اصرار کیا تو وہ بولی۔''عاڈل! وہ ایک رائل فیملی ہے۔ وہ ہام سے شادی کرنا مانگتا لیکن ہام نائیں مانگتا۔ وہ ام سے اکثر شادی کا ڈیمانڈ کرتا۔''

''تو تم صاف انکار کیوں نہیں کر دیتیں؟''

''بس ہام کا کچھ مجبوری۔ وہ کچھ اور ہام کچھ اور۔ بہت ڈیفرنس ہائیں۔''

''ڈیفرنس کیا ہے؟ وہ کسی رائفل فیملی سے ہے تو تم بھی تو شاید کسی ڈیوک، لارڈ وغیرہ کی بیٹی ہو۔''

''پھر بھی ہام میں بہت فرق۔ ہام کے مقابلے میں اس کا سٹیٹس بہت اونچا۔ ویسے بھی ہام اس کو بالکل لائیک نائیں کرتا۔''

''پھر بھی مجبوری کیا ہے، جس کی وجہ سے تم اسے صاف انکار نہیں کرتیں؟ تمہارے ملکوں میں تو عورت ایک بار ''نو'' کہہ دے تو سارے ملک کی عدالتیں اس کے پیچھے آن کھڑی ہوتی ہیں۔ آخر ایسی کون سی مجبوری ہے؟''

''سوری۔ ہام اس مجبوری کو توم سے شیئر نائیں کر سکتا۔''

''کیا سر نے منع کیا ہے؟''

''ہاں...... ایسا ہی سمجھ لو عاڈل۔''

''کیا اس مجبوری کے دور ہونے کا کوئی امکان ہے؟ میرا مطلب ہے کوئی چانس؟''

''ہاں، سر سرمد کو ہوپ تو ہے کہ یہاں سے واپسی پر وہ کچھ کر سکیں گے۔''

''کہیں اس مجبوری کا تعلق بھی تو روپے پیسے سے نہیں؟ میرا مطلب ہے کہ اس لڑکے سے پیچھا چھڑانے کے لیے تمہیں کسی بڑی رقم وغیرہ کی ضرورت ہو؟''

وہ مسکرا کر بولی۔''ہام اب اتنا غریب بھی نائیں ہے۔''

''نہیں، میرا مطلب تھا کہ ہو سکتا ہے کہ اپنے والدین کو بتائے بغیر تمہیں کسی بڑی رقم کا انتظام کرنا ہو۔''

''نائیں۔ ایسا سرے سے کچھ نائیں ہے۔ یو آر کمپلیٹلی رانگ۔'' پھر وہ ایک دم لہجہ بدل کر بولی۔''لیکن یہ توم نے کیسا باتیں شروع کر دیا۔ دیکھو یہ کتنا رومانٹک جگہ ہے اور انوائرمنٹ اس سے بھی زیادہ رومانٹک ہے۔''

عادل نے چونک کر ہمایوں کی طرف دیکھا۔ وہ براؤن رنگ کے سلیپنگ بیگ میں آرام سے سو رہا تھا۔ اس کی بھاری سانسیں، جو مدھم خراٹوں سے مشابہ تھیں خیمے میں گونج رہی تھیں۔''کہیں تم نے ہمایوں بھائی کو ضرورت سے زیادہ ڈوز تو نہیں دے دیا۔'' عادل نے پوچھا۔

''تھوڑا سا زیادہ۔'' وہ شوخی سے بولی۔''جیسے حلاوے میں نمک۔''

عادل کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ وہ دونوں پاس پاس لیٹے تھے۔ جیسے پیٹرول کے قریب ہی آگ دھری ہو۔

''تم کیا چیز ہو۔ مجھے تمہاری کچھ سمجھ نہیں آتی۔'' عادل نے کہا۔

''توم غلط مت لو۔ ہام صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ کمفرٹ ایبلی سو یار ہے۔ توم کو بتایا ہے نا کہ بس تھوڑا سا زیادہ دیا ہے جیسے حلاوے میں نمک۔''

عادل بیزار انداز میں بولا۔''ایک تو غلط سلط کام کرتی ہو، اوپر سے اتنی بُری اردو میں بولتی ہو۔ تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ حلاوا نہیں ہوتا حلوا ہوتا ہے اور حلوے میں نمک نہیں ہوتا، آٹے میں نمک ہوتا ہے۔''

اس نے عادل کی بات کو بالکل نظر انداز کیا۔ کھوئی کھوئی سی آواز میں بولی۔''عاڈل! کیا ہو کچھ پتا نائیں۔ ہمارے سفر کا سب سے ڈفیکلٹ مرحلہ شروع ہوئیں گا۔ کیا پتا، کس کے ساتھ کیا ہو جائے اور پھر اوپر چوٹی پر بھی تو خطرات ہی ہیں۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''آج کا یہ نائٹ کتنا پُر سکون ہے۔ پیس فل اور کمفرٹ ایبل...... ہام دونوں کتنا پاس ہے۔ کیا توم کے اندر ہام کے لیے کوئی پیشن نائیں؟''

''میں نے تمہیں بتایا ہے نا، میں کسی سے بہت محبت کرتا ہوں۔''

''لیکن اگر ہام دونوں کچھ ٹائم کے لیے پاس آتا ہے تو اس سے اس محبت کا کیا لاس ہوتا ہائیں۔''

''یہی بات تو تم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔'' عادل نے کہا اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

باہر ہواؤں کا شور تھا۔ ٹینٹ کے لیمپ کی بیٹری کمزور پڑ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بجھ گیا اور ٹینٹ میں تاریکی چھا گئی۔''چھوٹی ٹارچ کہاں ہے۔'' عادل نے کرسٹل سے پوچھا۔

''لیفٹ سائیڈ کی پاکٹ میں دیکھو۔'' کرسٹل نے جواب دیا۔

عادل گھپ اندھیرے میں ٹٹولتا رہا لیکن پاکٹ میں ٹارچ نہیں تھی۔''نہیں ملی۔'' اس نے کہا۔

''تو رائٹ والے میں دیکھو۔'' کرسٹل بولی۔

وہ خیمے کی رائٹ پاکٹ دیکھنے کے لیے دائیں طرف گیا تو اس کا ہاتھ کسی زندہ چیز سے ٹکرایا۔ اس نے سمجھا شاید یہ

ہمایوں کی پنڈلی ہے۔ لیکن وہ کرسٹل کا عریاں بازو تھا۔ اس نے ہاتھ کو ذرا سی حرکت دی تو اسے کرنٹ سا لگا۔ کرسٹل کا سارا بالائی جسم عریاں تھا۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ ”یہ کیا حرکت ہے؟“ وہ پھنکارا۔

”اس کو حرکت نائیں، جسم کہتے ہیں۔ کیا توم کو ہام کا جسم پسند نائیں۔“

”اب میں تم کو سیدھا سیدھا تھپڑ مار دوں گا۔“ وہ سرسراتے لہجے میں بولا۔

”بس ایک تھپڑ...... اونلی ون؟“ اس کی شوخی برقرار تھی۔

عادل دھم سے دوبارہ لیٹ گیا۔ اس نے کروٹ بدل لی تھی اور منہ میں بڑبڑا کر اپنی ناراضگی کا اظہار بھی کیا تھا۔ خیمے میں تاریکی کے ساتھ ساتھ خاموشی بھی چھا گئی۔ اس خاموشی میں بس برفانی ہواؤں کی ”سائیں سائیں“ تھی یا ہمایوں کے بوجھل سانسوں کی گونج تھی۔ دو چار منٹ بعد کرسٹل نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔ ”توم سو گیا؟“

عادل نے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ جواب کا مطلب یہ تھا کہ وہ نہیں سویا۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے بس اس کے بالائی جسم کو محسوس کیا تھا، معلوم نہیں کہ اس کی عریانی کی حدیں کہاں ختم ہوتی تھیں۔ وہ سراپا فتنہ اس سے صرف چند انچ کے فاصلے پر لیٹی ہوئی تھی۔ سراپا دعوت تھی۔ یہ کیسا کڑا امتحان تھا...... یہ کتنی سخت آزمائش تھی۔

عادل کی رگوں میں جوان خون سر پٹختا تھا۔ اسے لگا کہ اس کا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا ہے۔ شاید سرمد صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ کسی کے لیے باوقار رہنا اور بات ہے لیکن نہایت موزوں اور جذبات انگیز صورتِ حال کے باوجود خود کو باوقار رکھنا اور اپنا دامن آلودہ ہونے سے بچالینا دیگر بات ہے۔ اس میں بہت تکلیف جھیلنا پڑتی ہے اور یہی تکلیف ہے جو قدرت کو محبوب ہوتی ہے اور قدرت کسی نہ کسی شکل میں تکلیف جھیلنے والے کو اس کا صلہ دیتی ہے اور عموماً یہ صلہ عشق کی مراد کی صورت میں ملتا ہے۔ سرمد صاحب کا چہرہ عادل کی آنکھوں کے سامنے آگیا اور وہ اپنے دل و دماغ پر بے پناہ دباؤ جھیل کر خاموش لیٹا رہا۔

آخر کرسٹل نے دوبارہ کہا۔ ”آئی نو۔ یو آر ناٹ سلیپنگ۔“ عادل پھر بھی خاموش رہا۔ وہ ہاری ہوئی سی آواز میں بولی۔ ”اوکے...... اوکے عادل۔ ہام، توم سے کچھ نائیں مانگتا...... بس...... ایک بار توم کو گلے لگا کر تمہارے رخسار پر Kiss کرنا مانگتا۔ یہ تو ٹھیک ہائیں...... یہ تو سیکس نائیں ہے نا۔“

عادل کا دل سر پیٹنے کو چاہ رہا تھا۔ پھر بھی وہ حوصلہ کر کے بولا۔ ”میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔ پہلے تم کپڑے پہنو۔“

”اوکے۔“ اس کی آواز گہری تاریکی میں اُبھری اس کے بعد ایک دو منٹ کپڑوں کی مدھم سرسراہٹ سنائی دیتی رہی۔ تب وہ دوبارہ بولی۔ ”یس، ہام اب ڈریس میں ہائیں۔“

”بس اب چپ کر کے سو جاؤ۔“ عادل نے سخت لہجے میں کہا۔

”اینڈ...... یور پرامس؟“

عادل کوئی مناسب سا جواب ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ قدرت نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ ہمایوں کو ایک دم شدید کھانسی ہوئی، وہ پہلے تو کسمسایا پھر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”پانی......“ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

کرسٹل نے فوراً چھوٹی ٹارچ روشن کی۔ یہ ٹارچ اس کے لباس میں ہی تھی۔ ہمایوں کھانستا چلا جا رہا تھا۔ کرسٹل نے

اسے پانی پلایا، عادل نے اس کی پشت سہلائی۔ دو تین منٹ بعد وہ بہتر ہو گیا۔ اسے کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ عادل نے اسے ایک ”انرجی بار“ کھلائی، پھر وہ باتوں میں مصروف ہو گئے۔ کرسٹل کچھ بجھی بجھی ہوئی سی تھی۔

اگلا دن پھر بہت مشکل چڑھائی کا تھا۔ حسبِ سابق عادل سب سے آگے تھا۔ اس کے عقب میں رابے خاں خود آ رہا تھا۔ فولاد جان سب سے آخر میں تھا۔ یہ ایک ایسی ترتیب تھی جس میں کسی طرح کی مہم جوئی کی گنجائش نہیں تھی۔ رابے اور فولاد جان نے اس ترتیب کے ذریعے خود کو تقریباً محفوظ کر لیا تھا۔ اس نہایت مشکل پہاڑ پر چڑھتے ہوئے عادل کو یہی لگ رہا تھا جیسے وہ کسی پرانی کہانی کا کردار ہو۔ پہاڑی کی چوٹی پر کوئی قلعہ ہو، جہاں کسی نے اس کی شہزادی کو قید کر رکھا ہو اور وہ اسے چھڑانے کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر بلندیوں کی طرف جا رہا ہو۔ واقعی یہ سب کچھ شہزادی کے لیے ہی تو تھا۔ پھر اسے کنول شہزادی والی کہانی یاد آئی جو ماں اسے بچپن میں سنایا کرتی تھی۔ شہزادی کنول کے پھول میں رہتی تھی اور کنول میں بہت اندھیرا تھا۔ پروانوں کا ایک گروہ ادھر سے گزرا۔ ان میں سے ہر کسی نے چاہا کہ شہزادی اس سے شادی کر لے۔ شہزادی نے شرط رکھی کہ جو اس کے لیے روشنی لائے گا، وہ اس کی دلہن بن جائے گی۔ پروانے روشنی کی تلاش میں نکل پڑے۔ کچھ دن بعد کنول کی طرف سے ایک جگنو کا گزر ہوا۔ اس کے پاس روشنی تھی۔ شہزادی نے اس سے شادی کر لی۔ بے خبر پروانے ابھی تک روشنی کی تلاش میں ہر رات اپنی جانیں قربان کرتے رہتے ہیں۔ یہ آخری فقرہ عادل کو ہمیشہ بہت متاثر کیا کرتا تھا، آج اس نے کچھ زیادہ ہی کیا تھا۔ ایک آہنی میخ کے ہول میں رسا پروتے ہوئے اس کا پاؤں نیچے والی سپورٹ سے پھسلا۔ وہ جھٹکے سے نیچے کی طرف گیا۔ ہیمر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ہزاروں فٹ گہرائی کی طرف پرواز کر گیا۔ رابے خاں کے منہ سے بے ساختہ ”اوہ“ کی آواز نکل گئی۔ نیچے کرسٹل بھی چلا کر رہ گئی۔ عادل ہوا میں معلق تھا، اس کا سر نیچے کی طرف تھا۔ حفاظتی رسے نے اسے گرنے سے بچالیا تھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ سیدھا ہو گیا اور اپنا توازن درست کر لیا۔

”کیا ہوا عادل؟“ نیچے سے سرمد صاحب نے بلند آواز سے پوچھا۔

”کچھ نہیں سر! ذرا پاؤں پھسل گیا تھا۔“ عادل نے بھی بلند آواز میں جواب دیا۔

اس نے یہ نہیں بتایا کہ اس کا پاؤں کیوں پھسلا تھا، اس نے اپنے خیال کی طرف پرواز کے بارے میں نہیں بتایا اور نہ ہی یہ بتایا کہ بچپن کی ایک کہانی کا سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں کے سامنے دلہن بنی شہزادی کا چہرہ آگیا تھا۔

اس روز انہوں نے قریباً ایک ہزار فٹ تک کلائمبنگ کی اور تھک کر چُور ہو گئے۔ ابھی سہ پہر ہی ہوئی تھی۔ وہ کچھ دیر مزید چڑھائی جاری رکھ سکتے تھے مگر چونکہ کیمپ لگانے کے لیے ایک مناسب جگہ نظر آگئی تھی اس لیے وہ رُک گئے۔ یہاں سے اردگرد کا نظارہ شاندار تھا۔ کے ٹو اور راکاپوشی کی چوٹیاں نئے زاویوں سے دکھائی دے رہی تھیں۔ موسم صاف تھا اس لیے انہیں اپنا کیمپ نمبر دو دکھائی دے رہا تھا لیکن صرف ایک سیاہ نکتے کی طرح۔ اوپر کی طرف اب وہ خطرناک ترین چڑھائی انہیں صاف نظر آ رہی تھی جس کے لیے سرمد صاحب نے عادل کو خصوصی تربیت دی تھی اور اس کی صلاحیتوں پر بھروسہ کیا تھا۔ یہ ایسی چڑھائی تھی جس کا نظارہ ہی دل میں خوف جگا دیتا تھا۔ نہایت بلندی پر ہونے کے باوجود پہاڑ کے اس حصے پر برف نہ ہونے کے برابر تھی۔ عمودی چڑھائیاں خطرناک ہوتی ہیں لیکن یہ عمودی سے بھی زیادہ تھی۔ ایک سائبان کی طرح ان کے سروں پر جھکی محسوس ہوتی تھی۔ اس کی نہایت سخت اور چکنی سطح اسے مزید خطرناک

بناتی تھی۔ قریباً ایک ہزار فٹ کی چڑھائی کو طے کیے بغیر وہ لوگ بانگڑی چوٹی تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس کے سوا اس رُخ پر کوئی اور راستہ ہی نہیں تھا۔ یہ چڑھائی ایک مہیب چیلنج کی طرح ان کے سامنے تھی اور وہ دوربینوں کے علاوہ خالی آنکھ سے بھی اسے وضاحت کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔

کیمپ لگ گیا تو طے شدہ پروگرام کے مطابق رابے خاں نے اعلان کیا۔ ''اس سے آگے ام صرف چار بندے جائے گا۔ یعنی سرمد صاحب، عادل، فولاد جان اور ام خود...... اگر موسم ٹھیک ہوا تو ام کل صبح گیارہ بجے کے قریب چڑھائی شروع کرے گا۔ اگر کسی کے ذہن میں کوئی سوال ہے تو پوچھ لے۔''

''آپ کا واپسی کتنے ٹائم میں ہوئیں گا۔'' کرسٹل نے اپنے مخصوص انداز میں سوال کیا۔

''امید ہے کہ ام لوگ کل شام سے پہلے یہاں واپس پہنچ جائے گا۔ کیا خیال ہے سرمد صیب؟'' رابے خاں نے سوالیہ نظروں سے سرمد صاحب کو دیکھا۔

''ہاں امید تو یہی ہے۔'' سرمد صاحب کا لہجہ سپاٹ تھا۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ اوپر جانا نہیں چاہ رہے۔ اب جو کچھ بھی ہو رہا ہے، مجبوری کے تحت ہو رہا ہے۔

رابے خاں بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''پھر بھی ام لوگ تم سے واکی ٹاکی پر رابطہ رکھے گا۔ اگر کوئی دیری والا معاملہ ہوا تو ام تم کو اطلاع دے گا۔''

تیز ہوا سے کرسٹل کی ٹوپی اُڑ گئی۔ اس کے بال بکھر کر ہوا میں لہرانے لگے۔ ہمایوں اس کی ٹوپی پکڑنے کے لیے تیزی سے آگے گیا۔ فولاد جان تڑپ کے پیچھے ہٹ گیا اور رائفل ہمایوں کی طرف سیدھی کر لی۔ ''رُک جاؤ'' وہ گرجا۔

ہمایوں جہاں کا تہاں رُک گیا۔ یوں لگا کہ اگر وہ ایک قدم بھی مزید آگے بڑھتا تو فولاد جان اس پر فائر کر دیتا۔ رابے خاں نے خود آگے بڑھ کر اونی ٹوپی اُٹھائی اور کرسٹل کے حوالے کی۔ کرسٹل کا رنگ برف کی طرح سفید نظر آنے لگا تھا۔ فولاد جان نفرت انگیز انداز میں پھنکارا۔ ''تم سے دس بار بکواس کیا ہے کہ کسی طرح کا تیزی نہ دکھاؤ، ورنہ مارے جاؤ گے۔ ام سے زیادہ برداشت نہیں ہوگا۔ امارے بھائی کو مار کر تم نے امارا برداشت چھین لیا ہے۔''

وہ چاروں اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑے رہ گئے۔ آج بھی رابے خاں نے سرمد صاحب کو بطور یرغمال اپنے خیمے میں چلنے کا حکم دیا۔ عادل، ہمایوں اور کرسٹل اپنے خیمے میں آ گئے۔ عادل اپنے کندھوں میں تھوڑا سا کھچاؤ محسوس کر رہا تھا۔ سرمد صاحب نے عادل کے کندھوں کو اچھی طرح ٹٹولا۔ پھر کرسٹل سے کہا کہ عادل کو فزیوتھراپی کی ضرورت ہے، بہتر ہے کہ وہ سب سے پہلے اچھی طرح اس کی پشت اور کندھوں کا مساج کر دے۔ کرسٹل نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

تاہم کچھ دیر بعد جب وہ تینوں کھانا کھانے کے بعد لیٹے اور کرسٹل نے اپنی آستینیں اڑس کر عادل کے مساج کی تیاری کی تو عادل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''نہیں، میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا۔''

''عاڈل! سر نے ابھی تمہارے سامنے کیا کہا؟''

''سر کو میں خود جواب دے لوں گا۔ مساج سے میرے مسل اور سخت ہونے لگتے ہیں۔ میں ہمایوں بھائی سے کہتا ہوں، وہ تھوڑا سا دبا دیتے ہیں۔''

''دیکھو عاڈل! کل بہت امپورٹنٹ ڈے ہے۔ تمہیں فلی فٹ ہونا ہوئیں گا۔''

''میں نے کہا نا۔ میں ضرورت نہیں سمجھتا۔'' عادل نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ عادل اوندھا لیٹ گیا اور اس نے ہمایوں سے کہا کہ وہ اس کے کندھوں کو تھوڑا دبا دے۔ ہمایوں اس ساری صورتِ حال کو سمجھ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر متذبذب رہا۔ جب عادل نے اصرار کیا تو وہ اس کی طرف بڑھ آیا۔

کرسٹل خاموشی سے سلیپنگ بیگ میں گھس کر لیٹ گئی۔ کل واقعی ایک اہم ترین دن تھا۔ بس چالیس پچاس میٹر کے بعد ہی چڑھائی کا وہ مشکل ترین پورشن شروع ہو جانا تھا جس سے ان کی مہم کی ناکامی یا کامیابی کا فیصلہ ہونا تھا۔ اس کے بعد حالات ٹھیک رہتے تو انہیں سہ پہر چار بجے تک چوٹی پر پہنچ جانا تھا۔ چوٹی پر کیا صورتِ حال پیش آنا تھی، اس کے بارے میں ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ جب تک سرمد صاحب ان دونوں پاؤنڈوں کو قدیم زیورات تک نہ پہنچاتے، وہ اور عادل محفوظ تھے۔ زیورات تک پہنچنے کے بعد ان دونوں پاؤنڈوں کا رویہ کیا ہوگا، اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ عادل کا ذاتی خیال تھا کہ رابے اور فولاد کو زیورات کی اصل جگہ تک پہنچانے سے پہلے سرمد صاحب کو ایک دو شرطیں رکھنی چاہئیں۔ کم از کم اتنا تو ہو کہ وہ رابے خاں سے اپنا مقبوضہ پستول واپس لے لیں۔ انہی باتوں کے بارے میں سوچتے سوچتے عادل کو نیند آنے لگی۔ ہمایوں مسلسل اس کی گردن اور کندھوں کے مساج میں مصروف تھا۔ عادل نے ہمایوں سے بھی سونے کی درخواست کی۔ دونوں کچھ دیر اپنے اپنے سلیپنگ بیگ میں لیٹے باتیں کرتے رہے۔ کرسٹل شاید سو چکی تھی۔ باہر تیز ہوائیں برفانی تودوں سے سر پٹخ رہی تھیں۔ بلندی 22 ہزار فٹ کے قریب تھی اور برفستان کی ایک نہایت برفیلی رات ویران پہاڑی سلسلوں کو اپنے پنجوں میں جکڑ چکی تھی۔ کچھ دیر بعد عادل سو گیا۔

دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو خیمے میں نیم تاریکی تھی اور ہمایوں کے دھیمے خراٹے سنائی دے رہے تھے۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ چار بجے تھے اور ابھی سپیدۂ سحر نمودار نہیں ہوا تھا۔ اچانک اسے سسکیوں کی مدھم آواز آئی۔ یہ کرسٹل تھی۔ وہ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی اور رو رہی تھی۔ پہلے تو عادل نے سوچا کہ بے خبر بنا رہے لیکن پھر اس سے رہا نہیں گیا۔

''کیا بات ہے کرسٹل؟'' اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

اس نے چونک کر عادل کو دیکھا اور سر پھر گھٹنوں پر جھکا دیا۔

''میری کوئی بات بُری لگی ہے؟'' عادل نے پوچھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''نائیں، توم بہت اچھا۔ ہام بُرا، ہام نے توم کو بہت تنگ کیا۔ سوری ویری سوری۔ ہام کو ''مافی'' دے دو۔''

عادل نے طویل سانس لے کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''کرسٹل! میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا۔ تم بہت اچھی اور دلکش لڑکی ہو۔ کوئی مرد بھی تم کو ٹھکرانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ میرا جو رویہ ہے، اس کے پیچھے ایک مجبوری ہے اور میں تمہیں اس کے بارے میں بتا چکا ہوں۔''

وہ توقف سے بولی۔ ''لیکن...... ہام نے توم سے کوئی بہت بڑا چیز تو نائیں مانگا تھا عاڈل۔ بس ایک چھوٹا سا...... دو چار سیکنڈ کا خوشی مانگا تھا۔ جیسے...... ایک بٹر فلائی کو چند سیکنڈ کے لیے اپنی مٹھی میں بند کیا جائے...... اور پھر...... ریلیز کر دیا جائے۔ پھر اس کی یاد کو ایک فوٹو کی طرح اپنے البم میں لگا لیا جائے...... لیکن اگر توم کو یہ بھی بُرا لگا، تو ہام اس کے لیے

مافی مانگتا۔"

عادل نے اسے کندھوں سے تھام کر اپنی طرف گھمایا اور گلے سے لگالیا۔ وہ اس سے چمٹ گئی۔ اس کا سینہ ہچکیوں سے دہل رہا تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو عادل نے اپنی گردن پر محسوس کیے۔ وہ اسی طرح عادل کو اپنے ساتھ بھینچے بیٹھی رہی۔ تب اس نے کئی بار بڑے جذباتی انداز میں عادل کے رُخساروں کو چوما اور دوبارہ اس کے ساتھ لگ گئی۔ اس کی انگلیاں عادل کے سر کے بالوں میں اُلجھی ہوئی تھیں۔

کچھ دیر بعد وہ پیچھے ہٹی، نیلی آنکھوں میں اب بھی آنسو تھے۔ لیکن ان آنسوؤں میں اب خوشی کی چمک بھی تھی۔

"توم بہت آچھا عاڈل! ہام توم کو زندگی بھر بھول نائیں سکتا۔ اس کے ساتھ ہام زندگی بھر گاڈ سے "پرے" کرے گا کہ وہ توم کو اور شہزادی کو بہت خوش رکھے۔"

عادل نے مسکرا کر اس کے لہجے کی نقل کی۔ "اور ہام بھی توم سے ایک بات کہنا مانگتا...... جب توم کی لائف میں کوئی آچھا سالڑکا آئے......اور ضرور آئے گا......تو اس سے فوراً شادی کرلو۔ عورت کا زندگی ایک ہسبینڈ اور ایک ہوم کے بغیر نامکمل۔"

"تو ٹھیک ہے، توم ہام کے لیے کوئی اچھا سالڑکا ڈھونڈنا۔ جو ہام کا لائف پارٹنر بنے۔ کیا ایسا لڑکا ملتا ہوئیں گا؟"

عادل بولا۔ "تمہارے دیس میں تو مشکل سے ملتا ہوئیں گا۔ لیکن ہمارے ہاں شاید اتنا مشکل نہیں ہے۔"

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔ تب دوبارہ عادل کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "ہام نے کوئی غلط لفظ بولا ہو تو ہام اس کے لیے مافی مانگتا۔"

"یہی تو غلط بول رہی ہو" عادل نے کہا۔ "یہ مافی نہیں معافی ہوتا ہے......معافی۔"

"مافی......مافی......مافی......" کرسٹل نے تین چار بار دہرایا اور پھر خود ہی ہنسنے لگی۔

O......❖......O

چند گھنٹے بعد سرمد صاحب، عادل، فولاد اور رابے خاں اس سفر کے مشکل ترین مرحلے میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ ایک چمکیلی دوپہر تھی۔ کے ٹو اور اس کی نواحی چوٹیاں بادلوں کے آنچل اُتار کر سینہ تانے کھڑی تھیں۔ گہرا نیلا آسمان ان پر جھکا ہوا تھا۔ گہری خاموش وادیاں محویت سے یہ ملاپ دیکھ رہی تھیں۔ بہرحال یہ دلکش منظر ان چاروں کے لیے زیادہ دلکش نہیں تھا۔ ان کے سامنے ایک کٹھن ترین چڑھائی تھی۔ نیچے نگاہ ڈالتے تھے تو ایسی ہولناک گہرائیاں منہ پھاڑے کھڑی تھیں جن کی تہ کا نظر آنا ناممکن تھا۔ یہاں غلطی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ جس سطح پر انہیں چڑھنا تھا، وہ عمودی سے بھی کچھ زیادہ تھی۔ کوہ پیماؤں کے لیے ایسی چڑھائیاں ایک چیلنج سے کم نہیں ہوتیں۔ لیکن اصل چیلنج اس شخص کے لیے ہوتا ہے جو ٹیم میں سب سے آگے ہوتا ہے۔ اسے راستہ بنانا ہوتا ہے، میخیں گاڑنا ہوتی ہیں یا ڈرل سے بولٹنگ کرنا ہوتی ہے تاکہ رسوں کا حفاظتی بیک اَپ مہیا کیا جا سکے۔ طاقتور خشک بیٹریوں سے چلنے والی دو ڈرل مشینیں عادل کے پاس موجود تھیں۔ اضافی خشک بیٹریاں پیچھے آنے والے فولاد جان کے پاس تھیں۔ عادل یہاں سب سے آگے تھا اور اصل چیلنج بھی اسے ہی درپیش تھا۔ وہ ڈرل کرتا اور بولٹ کستا ہوا اوپر کی طرف سرکنے لگا۔ یہ راستہ نہیں پل صراط تھا۔ ان کے دل شدت سے دھڑک رہے تھے۔ پیشانیوں پر پسینہ تھا۔ ان دشوار ترین لمحوں میں بس دو چہرے تھے جو گاہے بگاہے عادل کی آنکھوں

کے سامنے آتے تھے۔ اس کی والدہ کا چہرہ اور شہزادی کا چہرہ۔ وہ ان دونوں چہروں کو خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ دنیا بھر کی راحتیں ان کی نذر کرنا چاہتا تھا اور وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر آج وہ کامیاب ہو گیا تو یہ راحتیں اور خوشیاں ان کی نذر کر سکے گا۔ ماں کی غیر مرئی آواز جیسے رہ رہ کر اس کے کانوں سے ٹکراتی تھی۔ "سنبھل کے عادے پتر! دھیان سے، آرام سے۔"

ماں کی آواز معدوم ہوتی تو شہزادی کی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگتی۔ "عادل! میرا مان رکھنا۔ میرا سر میرے گھر والوں کے سامنے جھکنے نہ دینا۔ میں دن رات تمہارا انتظار کر رہی ہوں اور مجھے یقین ہے تم اباجی کی شرط پوری کر کے دکھاؤ گے۔ لیکن جو کچھ بھی کرنا، احتیاط سے، دھیان سے۔ اللہ نہ کرے تمہیں کچھ ہوا تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گی۔"

عادل کے بازو شل ہو رہے تھے۔ ڈرل کرتے ہوئے اچانک اس کا پاؤں پھسلا۔ وہ جھٹکے سے نیچے کو گیا۔ ایک بولٹ اُکھڑ گیا لیکن دوسرے بولٹ نے اپنا کام کیا۔ وہ مضبوطی سے جما رہا اور عادل مزید نیچے جانے سے رُک گیا۔ تاہم ڈرل مشین اس کے ہاتھ سے نکل گئی اور ہزاروں فٹ کی اندھی گہرائی کی طرف نکل گئی۔ یہ سب کچھ دو یا تین سیکنڈ میں ہوا۔ عادل سمیت سب کی دھڑکنیں جیسے تھم گئی تھیں۔ جلد ہی وہ دوبارہ اپنا بیلنس حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ پیچھے آنے والے سرمد صاحب نے اس سے تسلی کے چند بول بولے اور وہ پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ صرف ایک دن پہلے بھی تو ایک اسی طرح کا واقعہ پیش آیا تھا، جب وہ پھسلا تھا اور ہتھوڑی اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ اس وقت دلہن بنی شہزادی اس کے ذہن میں آئی تھی لیکن آج تو ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔

پھر ایک اور آواز عادل کے کانوں میں گونجنے لگی۔ یہ پاؤندہ بستی کے نشئی عامل ماکانے زادہ کی آواز تھی۔ اس نے کہا تھا۔ "اوپر مت جاؤ، موت تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ وہ تم پر جھپٹے گی۔ تم کو برف کی قبروں میں دفن کر دے گی۔"

اس آواز کے اثر کو زائل کرنے کے لیے سرمد صاحب کے کہے ہوئے فقروں کی بازگشت عادل کے کانوں سے ٹکرائی۔ "واہمے ہمیں کمزور کرتے ہیں۔ انسان کی تقدیر صرف اور صرف اس کے عمل سے جڑی ہوتی ہے۔ عمل اور مسلسل عمل۔ جو لوگ اپنے ارادوں پر کاربند رہتے ہیں، وہ دریاؤں کے رخ موڑ دیتے ہیں۔ وہ تاج محل تعمیر کرتے ہیں اور چاند پر قدم رکھ کے دکھا دیتے ہیں۔"

اس آخری آواز نے عادل کے اندر اضافی توانائی پیدا کر دی۔ وہ اردگرد سے بے خبر ہو کر چیونٹی کی رفتار سے اوپر کی طرف کھسکتا رہا اور اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے راستہ بناتا گیا۔ ہمت بالکل جواب دے جاتی تو وہ دو چار منٹ کے لیے رک جاتا اور تب ایک بار پھر کام شروع کر دیتا۔ کسی وقت تو اس کا زاویہ اس چھپکلی کی طرح ہو جاتا جو چھت پر رینگ رہی ہو۔ اس قسم کی چڑھائی میں میخوں اور بولٹس کے اُکھڑنے کا اندیشہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔

وہ واقعی پل صراط جیسا راستہ تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کے نیچے برف کا دوزخ تھا۔ آخر اس کی جاں توڑ کوششیں رنگ لائیں اور وہ یہ خطرناک ترین 700 فٹ طے کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس نے رسے کے ذریعے جو سپورٹ مہیا کی تھی، اس نے پیچھے آنے والوں کے لیے مشکلات کو نصف سے بھی کم کر دیا۔ سرمد صاحب تو خیر کلائمبنگ کے ماہر تھے ہی، رابے خاں اور فولاد جان بھی جدید طریقہ کار کے مطابق مشکل چڑھائیاں چڑھ چکے تھے۔ انہوں نے سُست روی لیکن تسلسل کے ساتھ اپنا کام مکمل کیا اور عادل کے پاس پہنچ گئے۔ اب چوٹی انہیں بالکل سامنے نظر آ رہی تھی۔ یہ باقی ماندہ

چڑھائی بھی مشکل تھی لیکن چونکہ انہوں نے مشکل ترین راستہ طے کر لیا تھا، اس لیے یہ چڑھائی آسان محسوس ہو رہی تھی۔
عادل نے خوشگوار لہجے میں سرمد صاحب کو مخاطب کیا اور بولا۔ ''سر! لگتا ہے کہ یہ چڑھائی تو میں بھاگتا ہوا چڑھ جاؤں گا۔''

سرمد صاحب بولے۔ ''اس لیے سیانے لوگ کہتے ہیں کہ مشکل ترین کام پہلے کر لو پھر اس سلسلے کے دیگر مشکل کام آسان لگنے لگیں گے۔ بہر حال ویل ڈن۔'' انہوں نے عادل کی پیٹھ تھپکی۔

رابے خاں اور فولاد جان سات آٹھ فٹ کے فاصلے پر موجود تھے۔ چھوٹی رائفل فولاد جان کے گلے میں تھی لیکن وہ کسی بھی وقت اسے استعمال کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ وہ گاہے بگاہے رائفل کو ٹٹول بھی لیتا تھا جیسے اس کے صحیح رُخ کا اندازہ کر رہا ہو۔ سرمد صاحب اور عادل سے اپنا درمیانی فاصلہ بھی اس نے مسلسل برقرار رکھا ہوا تھا۔ یہاں اس بلندی پر ہوا بے حد تیز تھی اور اس میں برف کے ذرات تھے۔ ان سب کو اپنے گلاسز بار بار صاف کرنے پڑ رہے تھے۔ اب انہیں آکسیجن سلنڈرز کی ضرورت بھی پڑ رہی تھی۔

عادل باقی کے دو تین سو فٹ طے کرنے کے لیے بے قرار تھا۔ بادل کے کسی گہرے ٹکڑے نے چوٹی کو ڈھانپ لیا تھا اور سرمد صاحب بادل گزرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''عادل! کوہ پیما کو کسی بھی وقت کسی بھی مرحلے کو آسان نہیں لینا چاہیے۔ اضافی جوش سے بے پروائی پیدا ہوتی ہے اور یہ بے پروائی کبھی کبھی سخت نقصان کرتی ہے۔''

انہوں نے کچھ دیر انتظار کرنے کی ہدایت کی اور آخری چڑھائی کے سلسلے میں ضروری باتیں بتائیں۔

عادل کی بے چین نظریں اس کھنڈر کو تلاش کر رہی تھیں جو ان کی منزل تھا۔ لیکن فی الوقت اس کے آثار کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔

قریباً پندرہ منٹ بعد وہ دوبارہ چڑھائی کے لیے تیار ہوئے۔ ترتیب وہی پہلے والی تھی۔ سب سے پہلے عادل پھر رابے خاں پھر سرمد صاحب اور آخر میں فولاد جان جس کا چہرہ چٹان کی طرح سخت نظر آتا تھا۔ یہ برفانی چڑھائی تھی لیکن برف اتنی سخت تھی کہ اس میں اور پتھر میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ ایک جاں گسل کوشش نے انہیں بالآخر چوٹی پر پہنچا دیا۔ بانگڑی کی وہ فلک بوس چوٹی جو کئی ماہ سے ان کے لیے ایک چیلنج بنی ہوئی تھی۔ عادل جب پہاڑ کی بلند ترین جگہ پر کھڑا ہوا تو فتح کے احساس نے اسے سرشار کر دیا...... اب اسے دوسری فتح کا انتظار تھا۔ وہ کھنڈر...... جس کا اسرار انہیں یہاں تک کھینچ کر لایا تھا۔ اس نے دھند آلود فضا میں اردگرد نگاہ دوڑائی۔ ''وہ دیکھو۔'' سرمد صاحب نے اپنی انگلی سے ایک جانب اشارہ کیا۔

ہر طرف پھیلی ہوئی برف کی سفیدی کے درمیان، عادل کو کچھ سیاہ دھبے سے نظر آئے۔ یہ قریباً تین سو فٹ دور اور قدرے ڈھلوان پر تھے۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ یہ ایک پتھریلی دیوار ہے جس کا کچھ حصہ برف میں سے جھانک رہا ہے۔ تو یہ تھا وہ قدیم کھنڈر جس کی کشش نے انہیں اَن گنت مشکلات میں سے گزارا تھا اور یہاں پہنچایا تھا۔

سرمد صاحب نے چوٹی پر ایک چھوٹا سا جھنڈا گاڑا۔ تصویریں اور دو چار ویڈیو کلپ بنائے گئے۔ پھر وہ لوگ انتہائی تیز ہوا میں دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتے نشیب میں واقع کھنڈر کی طرف بڑھنے لگے۔ یہ پہاڑ کی وہ سائیڈ تھی جس پر کہیں بہت نیچے جا کر پاؤندہ بستی بھی آباد تھی۔ اس جانب کے سارے مناظر ان کے لیے نئے تھے۔ کم از کم عادل کے

لیے تو نئے ہی تھے۔ بادلوں کے مرغولے حدِ نگاہ کو محدود کر رہے تھے ورنہ وہ سیکڑوں میل تک پھیلی ہوئی وادیاں اور چوٹیاں دیکھ سکتے۔

عادل کا دل شدت سے دھڑکنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے برف میں دبے ہوئے قدیم کھنڈر کے آثار دیکھے اور اس کے ذہن میں وہ کہانی تازہ ہونے لگی جو ایک رات کیمپ میں سرمد صاحب نے اسے سنائی تھی۔ بلند حوصلہ راجپوت قبیلے اور جابر سردار وشوا ناتھ کی کہانی۔ جب محصور ہو جانے والوں نے اپنی عورتوں کو چتا میں ڈالا اور خود سب کے سب کٹ مرے۔ عادل بڑی محویت سے کھنڈر کو دیکھتا رہا۔ کھنڈر کا قریباً 95 فیصد حصہ تو ضرور برف میں دبا ہوا تھا۔ بمشکل ایک بیرونی دیوار کا تیس چالیس مربع فٹ کا حصہ نظر آ رہا تھا۔ یہ قدیم دیوار وزنی پتھروں کی بنی ہوئی تھی اور صدیاں گزرنے کے بعد اور سخت ترین موسم جھیلنے کے بعد بھی پوری استقامت سے اپنی جگہ موجود تھی۔

''اندر جانے کا راستہ تو شاید دائیں طرف ہے۔'' فولاد جان نے ٹھٹھری ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔

''نہیں، یہ ہمارے بالکل سامنے ہے لیکن نظر نہیں آ رہا۔ بہت زیادہ برف پڑی ہوئی ہے اس طرف۔'' سرمد صاحب نے جواب دیا۔

''تو پھر اندر جانے کے لیے ام کو اپنے ہاتھوں سے راستہ بنانا پڑے گا۔'' فولاد جان بولا۔ سردی اتنی زیادہ تھی کہ وہ بمشکل بول پا رہے تھے۔ جب وہ بات کرتے تھے، منہ سے بھاپ کے گاڑھے مرغولے برآمد ہوتے تھے۔

''عمارت کے دروازے تک پہنچنے کے لیے ہمیں کوئی پندرہ بیس فٹ برف کھودنا پڑے گی اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔'' سرمد صاحب نے کہا۔

اس معاملے میں پر ان تینوں میں دس پندرہ منٹ گفتگو ہوئی۔ عادل بس خاموش تماشائی بنا کھڑا رہا۔ سرمد صاحب کا خیال تو یہی تھا کہ نیچے کی برف پتھر کی طرح سخت ہے اور اس میں راستہ بنانا آسان کام نہیں ہوگا۔ فولاد جان کا خیال تھا کہ دیوار پر کوشش کی جائے۔ اسے توڑا جائے یا پھر خلا کر کے اس میں راستہ بنا لیا جائے۔ دھماکا خیز مواد ان کے سامان میں کسی ایسے ہی مقصد کے لیے رکھا گیا تھا۔ یہ مواد طاقتور ڈائنامیٹ اسٹکس کی صورت میں موجود تھا۔

سرمد صاحب نے کہا۔ ''میرے خیال میں یہاں دو تین طاقتور دھماکے کرنا ہمارے لیے کسی بھی طرح اچھا نہیں ہوگا۔ یہ کافی عمودی ڈھلوان ہے اور برف سے ڈھکی ہوئی ہے۔ برف نے جگہ چھوڑی تو کافی مشکل ہو جائے گی۔''

''ام کو پتا ہے...... اور اچھی طرح پتا ہے۔ یہ بہت سخت برف ہے۔ یہ اتنی آسانی سے حرکت نہیں کر سکتا۔'' فولاد جان نے بیزار لہجے میں کہا۔ رائفل اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ ایک لمحے کے لیے بھی ان کی طرف سے غافل نہیں ہوتا تھا۔ خاص طور سے وہ اپنا اور عادل کا درمیانی فاصلہ ضرور برقرار رکھتا تھا۔

سرمد صاحب نے ٹیلی اسکوپ سے برف کا بغور جائزہ لیا اور آنکھیں شیشوں سے لگائے لگائے بولے۔ ''ہمیں اس ڈھلوان کا زاویہ بھی تو دیکھنا چاہیے۔ یہ کم از کم ستر اسّی درجے کا ہے۔ جب وائبریشن ہو گی تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

O......❖......O

اب شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ وہ اس کھنڈر سے تھوڑا سا اور نیچے چلے گئے اور ایک مناسب جگہ ٹینٹ کے لیے چن لی۔ اتنی بلندی پر اور اتنی مختصر جگہ پر کیمپ لگانا ایک کارِ دشوار ہوتا ہے۔ جگہ اتنی مختصر تھی کہ ٹینٹ کا کھڑا

ہونا بھی محال نظر آرہا تھا۔ بہر حال وہ کسی نہ کسی طور کر گزرے، کیونکہ وہ اس کے لیے پہلے سے تیار تھے۔ یہاں آکسیجن کی کمی تھی اور سردی بھی انتہا درجے کی تھی۔ وہ رات جیسے تیسے گزر گئی۔ فولاد جان نے بس شروع میں ڈیڑھ دو گھنٹے نیند لی۔ پھر وہ ساری رات جاگتا رہا اور ان دونوں کا پہرا دیتا رہا۔ اگلا دن ان سب کے لیے اہم ترین تھا۔ آج انہیں اس قدیم عمارت کے اندر جانا تھا جس کے کسی تہ خانے میں ساڑھے تین سو سال پرانے زیورات اور قیمتی پتھر جوں کے توں موجود تھے۔ اور اس دجسے کی درست جگہ کا علم صرف اور صرف سرمد صاحب کو تھا۔

صبح پو پھٹنے سے پہلے ہی فولاد جان اور رابے خاں ٹینٹ سے باہر نکل گئے۔ ان کی بے تابی عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ان کی نگاہیں مسلسل، ذرا بلندی پر واقع پتھریلی دیوار پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ فیصلہ رات کو ہی ہو گیا تھا کہ کھنڈر کے دروازے تک جانے کے لیے برف نہیں کھودی جائے گی بلکہ دیوار توڑی جائے گی اور ڈائنامیٹ کے ذریعے اندر جانے کا راستہ بنایا جائے گا۔

خیمے میں اب سرمد صاحب اور عادل ہی تھے۔ سرمد صاحب نے عادل کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''عادل! تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔ شاید یہ بات تمہیں عجیب لگے لیکن ہمارے پاس اب صرف ایک یہی راستہ ہے۔''

''آپ بتائیں جناب۔'' عادل ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''ہم ان لوگوں کے ساتھ کھنڈر میں نہیں جا رہے۔''

''کیا...... مطلب...... سر؟''

''ہمارے پاس یہاں سے نکل بھاگنے کا وہ بہترین موقع ہوگا، جب یہ لوگ ڈائنامیٹ پھاڑیں گے۔ دھماکے کے وقت ان دونوں کی پوری توجہ دیوار کی طرف ہی ہوگی۔ ہم کچھ فاصلے پر موجود رہیں گے اور اپنے موقع کا انتظار کریں گے۔''

''لیکن سر! ہم جس مقصد کے لیے یہاں آئے ہیں؟''

''وہ پورا ہو چکا ہے۔'' سرمد صاحب نے ترت جواب دیا۔ عادل اپنے سلیپنگ بیگ میں لیٹا ہوا تعجب سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں سر؟''

سرمد صاحب نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''چند دن پہلے جب تم نے نیچے ایک کوٹھڑی میں مالکانے زادے کو پکڑا تھا تو اس نے میرے بارے میں اور اس کھنڈر کے بارے میں کیا کہا تھا؟''

عادل چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ ''اس وقت وہ شراب کے نشے میں دھت تھا سر۔ اس نے کہا تھا کہ کھنڈر میں کچھ نہیں ہے۔ جو تھا، وہ بہت پہلے نکالا جا چکا ہے...... اور جو بندہ یہ کہہ رہا ہے کہ وہاں اب بھی کچھ ہے، وہ غلط بیانی کر رہا ہے۔ یا پھر...... اسے پتا نہیں ہے۔ اس نے کچھ بیہودہ باتیں کہیں، جس پر میں نے اس کا گریبان پکڑنا چاہا مگر رمزی وغیرہ نے میرا راستہ روک لیا۔ اس نے عاملوں والا انداز اختیار کر کے ہمیں ڈرانے کی کوشش بھی کی۔ پتا نہیں کیا کیا کہتا رہا...... موت ایک بڑے پرندے کی صورت وہاں بیٹھی ہے۔ وہ تم پر جھپٹ پڑے گی...... مار دے گی۔''

سرمد صاحب نے روزن سے باہر دیکھا۔ رابے اور فولاد جان مگن تھے۔ بہر حال رائفل بدستور فولاد کے ہاتھ میں تھی اور وہ گاہے بگاہے ٹینٹ کی طرف بھی نگاہ اُٹھا لیتا تھا۔ سرمد صاحب نے عادل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں یہ کہوں عادل کہ اس شرابی مالکانے زادہ نے جو کچھ کہا، وہ بالکل درست تھا تو پھر......''

عادل کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ وہ بے حد حیرت سے سرمد صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اپنے دھیمے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ''ہاں عادل! مالکانے زادہ جیسا بھی ہے جو بھی ہے لیکن وہ بات سو فیصد ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہاں تہ خانے میں اب کچھ نہیں ہے۔ لوہے کا ایک زنگ آلود باکس ہے جس کی قیمت ہزار دو ہزار سے زیادہ نہیں ہوگی۔ مالکانے زادہ کی یہ بات بھی کافی حد تک درست ہے کہ میں تم لوگوں سے غلط بیانی کرتا رہا ہوں...... اور دھوکا دیتا رہا ہوں لیکن یہ دھوکا کسی بُری نیت سے نہیں تھا اور نیت اچھی ہو اور نتیجہ بھی اچھا ہو تو پھر دھوکا...... دھوکا نہیں رہتا۔''

عادل اب اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر حیرت کی یورش تھی۔ سرمد صاحب سر کے نیچے بازو رکھے لیٹے تھے اور اسی بھید بھرے انداز میں عادل کو دیکھ رہے تھے۔ کہنے لگے۔ ''عادل! میں تم سے شرمندہ ہوں لیکن میں نے جو کچھ کیا تمہاری بہتری کے لیے کیا۔ میں تمہیں ہر صورت...... کسی بھی قیمت پر یہاں ان پہاڑوں میں لانا چاہتا تھا اور مجھے پتا تھا کہ تم صرف ایک ہی صورت میں ان ساری تکلیفوں اور مصیبتوں سے گزر سکتے ہو کہ تمہیں ایک اچھی رقم ملنے کی امید ہو۔ اتنی رقم جو شہزادی کو حاصل کرنے میں تمہاری مدد کر سکے۔''

''سر...... سر! میں معافی چاہتا ہوں لیکن مجھے آپ کی باتیں بالکل بھی سمجھ میں نہیں آ رہیں۔ آپ درست کہہ رہے ہیں تو پھر...... آپ مجھے کیوں یہاں لانا چاہ رہے تھے۔ اور ابھی...... آپ نے یہ بھی کہا نا کہ جو مقصد آپ حاصل کرنا چاہتے تھے، وہ آپ نے کر لیا ہے......؟''

''ہاں عادل! جن زیورات کے لیے...... یا جس دولت کے لیے تم یہاں آئے تھے، وہ تمہیں مل گئی ہے۔ بے شک وہ دولت تمہیں مل گئی ہے۔ وہ تمہارے پاس ہے اور اب اسے تم سے کوئی چھین بھی نہیں سکتا۔''

''آپ کس دولت کی بات کر رہے ہیں سر؟''

''اس دولت کی۔'' سرمد صاحب نے کہا اور اپنے کیمرے کی اسکرین عادل کے سامنے کر دی۔ اسکرین پر عادل کی پرسوں کھینچی جانے والی ایک تصویر تھی۔ وہ نہایت خطرناک ڈھلوان پر رسوں کے ذریعے چڑھ رہا تھا اور اس کے نیچے ہزاروں فٹ گہری کھائیاں منہ پھاڑے کھڑی تھیں۔ اس وسیع منظر میں وہ خود ایک چیونٹی کی طرح دکھائی دے رہا تھا لیکن اس چیونٹی کی ہمت اور دلیری کو دیکھا جاتا تو وہ ان پہاڑوں سے بلند تھی۔

''دیکھو عادل یہی ہے وہ بے مثال دولت جو تمہیں اس دشوار ترین سفر میں حاصل ہوئی ہے۔ قدرت نے تمہیں بلندی کی طرف جانے کی خاص صلاحیت عطا کی تھی۔ تمہاری یہ حیرت انگیز صلاحیت اس دور دراز گاؤں میں کھجور کے درختوں پر چڑھ چڑھ کر ضائع ہو رہی تھی۔ اب تم اس صلاحیت کا درست ترین استعمال کرنے کے قابل ہو چکے ہو۔ تم نے ہم سب کو ورطۂ حیرت میں ڈالا ہے۔ تم جانتے نہیں ہو عادل! تم کیا حاصل کر چکے ہو۔''

سخت سردی کے باوجود عادل کو لگا کہ اس کے جسم کے سارے مسام پسینہ اُگل رہے ہیں۔ یہ کیسے انکشافات کر رہے تھے سرمد صاحب۔ وہ جیسے گنگ سا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہنے میں کامیاب ہوتا یا سرمد صاحب

بات کو آگے بڑھاتے، فولاد جان اور رابے خاں خیمے کی طرف آتے دکھائی دیئے۔ وہ دونوں خاموش ہو گئے۔

دن کا اُجالا اب تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ دبیز دھند کی تہ پتلی ہو رہی تھی اور بانگڑی کی چوٹی کا ہیولا دکھائی دینے لگا تھا۔ تیز ہوائیں مسلسل ان کے قدم اُکھاڑ رہی تھیں۔ خیمے میں داخل ہوتے ہی رابے خاں نے کہا۔ ''امارا خیال ہے کہ اب ام کو وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ اتنا بلندی ہو تو موسم کسی بھی وقت خراب ہو سکتا ہے۔''

فولاد جان چونکہ ہر وقت رائفل کے ساتھ ہوتا تھا اس لیے رابے خاں نے ڈائنا میٹ والا وزنی باکس اُٹھایا۔ عادل نے اس کی مدد کو آگے بڑھنا چاہا لیکن اس نے منع کر دیا۔ وہ لوگ کوئی چھوٹے سے چھوٹا رسک بھی نہیں لے رہے تھے اور چاہتے تھے کہ عادل اور سرمد صاحب ان سے فاصلے پر رہیں۔ وزنی باکس کے ساتھ چڑھائی چڑھ کر رابے خاں دیوار کے اس حصے کے پاس پہنچ گیا جو برف کی دبیز تہوں کے اندر سے نظر آ رہی تھی۔ ایک ڈرل مشین ابھی تک ان کے سامان میں موجود تھی اور اس کی فاضل بیٹریاں بھی تھیں۔

رابے خاں نے عادل کو حکم دیا۔ ''چلو، بچہ جی! تم دیوار میں سوراخ کرو۔''

عادل کو پتا تھا کہ یہ مشکل کام اسی سے کرنے کو کہا جائے گا۔ اس نے ڈرل مشین کے ساتھ ایک موٹا برما اٹیچ کیا اور دس پندرہ منٹ کے اندر دیوار میں تین جگہ سوراخ کر دیئے۔ ان سوراخوں میں ڈائنا میٹ اسٹکس رکھی جا سکتی تھیں۔ اس دوران میں سرمد صاحب دور کھڑے رہے تھے اور ٹیلی اسکوپ سے اردگرد کا جائزہ لیتے رہے تھے۔ سوراخ مکمل کرنے کے بعد عادل ذرا ہانپا ہوا سا ان کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اب رائفل رابے خاں کے ہاتھ میں تھی اور فولاد جان سوراخوں میں ڈائنا میٹ لگا رہا تھا اور تار وغیرہ بچھا رہا تھا۔

سرمد صاحب نے ٹیلی اسکوپ عادل کی طرف بڑھاتے ہوئے اوپر بانگڑی کی چوٹی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کچھ دکھانا چاہ رہے تھے۔

عادل نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ اسے ایک جگہ برف کی سفید چادر کے درمیان ایک سیاہ لکیر سی نظر آئی۔ جیسے بالکل سفید کاغذ پر کسی عورت کا بال رکھا ہوا ہو۔ یہ دراصل برف کی دراڑ تھی۔

''یہ کیا ہے سر؟'' عادل نے دبتے آواز میں پوچھا۔

''وہی جس کا ذکر مالکانے زادہ نے کیا تھا اور میں نے بتایا ہے نا کہ اس نے جو کچھ بھی کہا وہ درست تھا۔ سمجھو یہ وہی موت ہے جو اوپر اپنے پَر تول رہی ہے۔ ان عقل کے اندھوں کو کچھ نظر نہیں آ رہا۔'' سرمد صاحب کا اشارہ رابے اور فولاد کی طرف ہی تھا۔

''آپ کا مطلب ہے کہ دھماکوں کی وجہ سے برف کھسک سکتی ہے۔''

''مجھے ڈر ہے کہ ایسا ہوگا۔ اگر یہ ساری برف نہ بھی کھسکی اور کچھ حصہ بھی کھسک گیا تو اس کھنڈر عمارت کی چھت بیٹھ جائے گی۔''

''پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''بس، اس جگہ سے دور ہٹنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔''

اسی دوران میں فولاد جان نے اپنا کام مکمل کر لیا۔ فولاد اور رابے دیوار کے پاس سے ہٹ کر ان کے قریب آن

کھڑے ہوئے۔ اب یہ فیصلہ کن لمحے تھے۔ فولاد جان نے لائٹر کے ذریعے ڈائنا میٹس کے فلیتے کو آگ دکھا دی تھی۔ آگ تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ چاروں محفوظ فاصلے پر تھے۔

آخر پہلا دھماکا ہوا۔ سنسان قرب و جوار گونج اُٹھے۔ پھر دوسرا دھماکا ہوا۔ شعلے کے ساتھ قدیم دیوار کے پتھر اور سخت برف کے ٹکڑے ہوا میں اُڑتے نظر آئے۔ دھماکے والی جگہ ایک دھند سی پھیل گئی۔ تیسرا دھماکا پہلے دونوں دھماکوں سے زیادہ طاقتور تھا۔ عادل نے دیکھا کہ اس دھماکے کے بعد فصیل نما دیوار کے درمیان ایک سیاہ خلا نمودار ہو گیا۔ رابے اور فولاد کامیاب ہو گئے تھے۔ انہوں نے اندر جانے کا راستہ بنا لیا تھا۔ سرمد صاحب کے اندیشے ابھی تک تو غلط ثابت ہوئے تھے۔

جونہی دیوار میں خلا نمودار ہوا، رابے اور فولاد کی بے قراری دیدنی ہو گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھے اور تیزی سے خلا کی طرف دوڑے لیکن اس عالم میں بھی چوکنا فولاد جان ان دونوں کی طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔ اس خبیث کی نگاہیں کسی ریڈار کی شعاعوں کی طرح کام کرتی تھیں۔ دھماکوں سے پہلے دھماکوں کے دوران میں بھی اس نے سرمد صاحب اور عادل کو کسی طرح کی مہم جوئی کا موقع نہیں دیا تھا۔ اب بھی وہ دیوار کے خلا کی طرف بھاگتے ہوئے مڑ مڑ کر ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ رائفل پوری طرح لوڈ تھی اور اس کے داہنے ہاتھ میں تھی۔

خلا کے سامنے پہنچ کر رابے اور فولاد کو احساس ہوا کہ وہ ان دونوں کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ ویسے بھی سرمد صاحب کے بغیر ان کا اس کھنڈر عمارت میں گھسنا بے کار تھا۔ انہیں کچھ معلوم ہی نہیں تھا کہ انہیں کدھر جانا ہے۔ رابے خاں نے اپنی ہوئی آواز میں سرمد صاحب کو پکارا اور بولا۔ ''اوئے خدائی خوار! اب تم اُدھر کھڑا کیا کرتا ہے، آ جاؤ اِدھر۔''

عادل اور سرمد صاحب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ رابے کے حکم پر عمل کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ فولاد جان کی آٹھ ایم ایم رائفل اتنے فاصلے سے بھی ٹھیک ٹھیک نشانہ لے سکتی تھی۔ وہ انہیں مارنے کے لیے گولی نہ چلاتا لیکن زخمی تو کر ہی کر سکتا تھا۔ اب وہ منزل پر پہنچ چکے تھے اور سرمد صاحب کو صرف اصل جگہ کی نشاندہی کرنا تھی۔

''کھڑا منہ کیا دیکھتا ہے۔ چلو آؤ اِدھر۔'' فولاد کڑک کر بولا۔ اس کا غضب ناک لہجہ ابھی تک تین دن پہلے والے واقعے کی یاد تازہ کر رہا تھا۔ جب فولاد کا پھوپھی زاد بھائی ہزاروں فٹ گہرے کھڈ میں جا گرا تھا۔

''چلو عادل!'' سرمد صاحب نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

وہ دونوں دیوار میں نمودار ہونے والے مستطیل خلا کی طرف بڑھے۔ اس خلا کی لمبائی قریباً چھ فٹ اور چوڑائی چار فٹ کے لگ بھگ تھی۔ اندر گہری تاریکی تھی...... اور وہ ہوا تھی جو زمانوں سے ان در و دیوار میں ٹھہری ہوئی تھی۔

ابھی سرمد صاحب اور عادل دیوار سے پچاس ساٹھ قدم دور ہی تھے کہ وہ ہوا جس کی توقع نہیں تھی...... اور رابے وغیرہ کو تو بالکل بھی نہیں تھی۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک اور شدید تھا کہ سرمد صاحب اور عادل اپنی جگہ بت بنے کھڑے رہ گئے۔ ایک زبردست گڑگڑاہٹ ہوئی۔ کھنڈر عمارت سے اوپر ڈھلوان پر ہزاروں لاکھوں ٹن برف نے یکا یک حرکت کی اور برف کے چند بہت بڑے تودوں نے اردگرد کی ہر شے کو ڈھانپ لیا۔ رابے اور فولاد جان تو رہے ایک طرف، یوں لگا کہ پورا کھنڈر ہی پیوند زمین ہو گیا ہے...... اور یہ صرف ابتدا تھی، ابھی بہت کچھ اور بھی ہونا تھا۔ عادل نے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا اوپر بلندی پر نظر آنے والی سیاہ دراڑ تیزی سے چوڑی ہوتی جا رہی تھی۔ قریباً نصف کلومیٹر تک پھیلی

ہوئی برف اپنی جگہ چھوڑ رہی تھی۔ کسی بھی وقت اردگرد کی ہر شے برف کے بے پناہ بوجھ کے نیچے دب سکتی تھی۔ ''آؤ عادل۔'' سرمد صاحب نے چلاتی ہوئی سی آواز میں کہا۔

عادل اضطراری طور پر نشیب کی طرف بڑھا لیکن سرمد صاحب نے اس کا بازو پکڑ لیا اور داہنی طرف کھینچا۔ اس وقت سب سے اہم ضرورت یہ تھی کہ وہ نیچے کھسکنے والی برف کی براہِ راست زد سے بچ جائیں۔ خیمے کے پاس سے گزرتے ہوئے سرمد صاحب چند سیکنڈ کے لیے اندر گئے۔ واپس آئے تو ان کے ہاتھوں میں دو تین ڈائنامیٹ اسٹکس تھیں، جو انہوں نے اپنے بیک پیک میں رکھ لیں۔ وہ واکنگ اسٹکس کے سہارے سنبھل سنبھل کر چلتے، گرتے پڑتے دائیں جانب ہٹتے چلے گئے۔ یہ نہایت کٹھن وقت تھا اور راستہ اس سے بھی مشکل۔ یہ عمودی ڈھلوانیں تھیں۔ گاہے بگاہے انہیں برف پر لیٹ کر اور ڈھلوانوں سے چمٹ کر آگے بڑھنا پڑ رہا تھا۔ پہلے خوفناک تودوں کے گرنے کے بعد بظاہر سکون تھا لیکن اوپر برف مسلسل حرکت کر رہی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ یہ حرکت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ جیسے کوئی خوفناک عفریت دبے پاؤں آگے سرک رہا ہو اور کسی بھی وقت ایک چنگھاڑ کے ساتھ جھپٹنے والا ہو۔ اوپر دراڑ کی چوڑائی مسلسل بڑھ رہی تھی اور یہ اس امر کا بین ثبوت تھا کہ برف نیچے آنے والی ہے۔

قریباً دس منٹ کی جاں گسل کوشش کے بعد وہ برف کے متوقع راستے سے ہٹ گئے اور اوپر چڑھنا شروع ہوئے۔ جلد ہی وہ چوٹی پر تھے۔ یہاں سے سیاہ دراڑ کی چوڑائی مزید واضح نظر آ رہی تھی۔ نیچے کھنڈر والی جگہ پر اب برف کا ایک چھوٹا سا پہاڑ دکھائی دے رہا تھا۔ رابے خاں اور فولاد جان اپنے آتشیں ہتھیاروں سمیت اور اپنی آتشیں خواہش سمیت اس ہزاروں ٹن برف کے نیچے دفن ہو چکے تھے۔ وہ جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔

''وہ مر گئے جناب؟'' عادل نے اپنی آواز میں پوچھا۔

''اس سوال کا جواب ہاں کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔'' سرمد صاحب نے کہا۔ عادل کی طرح ان کی نظریں بھی برف کے عظیم الشان مقبرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ابھی کچھ دیر بعد شاید یہ مقبرہ مزید بلند ہونے والا تھا۔

''ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ موسم بگڑ رہا ہے۔'' سرمد صاحب نے کہا۔

انہوں نے اپنے آخری کیمپ کی طرف رُخ کیا اور نیچے اُترنے لگے۔ جو بولٹ اور رسے وہ لٹکتے چھوڑ آئے تھے وہ ان کی مدد کرنے لگے۔ عادل نیچے تھا اور سرمد صاحب چند فٹ اوپر۔ عادل کے کانوں میں سرمد صاحب کا کہا ہوا ایک فقرہ گونجنے لگا۔ ''کوہ پیمائی میں اُترتے ہوئے زیادہ حادثے پیش آتے ہیں۔ اس لیے کوہ پیما کو زیادہ ہوش سے کام لینا چاہیے۔''

وہ ڈیڑھ سو فٹ ہی نیچے اُترے ہوں گے جب ان دونوں کو گڑگڑاہٹ کی مہیب آواز سنائی دی پھر ہولناک دھماکوں سے کوہ و دامن لرز سے گئے۔ ایک گونج تھی جو پہاڑ میں ہر طرف سرایت کرتی محسوس ہوئی۔ آخر چوٹی کی دوسری جانب نیچے کھسکتی ہوئی برف نے جگہ چھوڑ دی تھی اور ایک بڑی ''ایوالانچ'' کی شکل میں نیچے گری تھی۔ وہ اسے دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن تصور کر سکتے تھے کہ کھنڈر اور اس کے قرب و جوار کیا شکل اختیار کر گئے ہوں گے۔

مالکانے زادہ جس کا تصور عادل کے ذہن میں ایک شرابی اور فریبی عامل کا تھا...... اپنے تصور سے بالکل مختلف نکلا تھا۔ اس نے جو جو کچھ کہا، درست نکلا۔ حتیٰ کہ اس کی آخری پیشین گوئی (برف کی قبروں والی) بھی پوری ہوئی۔ مکمل نہ

سہی لیکن جزوی طور پر تو پوری ہوئی تھی۔ سرمد صاحب اور عادل بچ گئے تھے لیکن رابے خاں اور فولاد جان کا حد سے بڑھا ہوا لالچ ان کو لے ڈوبا تھا۔ رابے خاں اور فولاد جان کا ارادہ تھا کہ یہ مہم ختم ہونے کے بعد وہ خناب کے قتل کا حساب کتاب کریں گے۔ ان کا یہ حساب کتاب بھی ان کے ساتھ ہی دفن ہو گیا تھا۔

وہ دونوں سنبھل سنبھل کر نیچے اُترتے رہے۔ عادل کے پورے بدن میں ایک ہلکی سی لرزش موجود تھی۔ یہ لرزش پچھلے ایک گھنٹے میں پیش آنے والے واقعات اور انکشافات کے سبب تھی۔ وہاں اوپر مغلیہ دور کے کھنڈر میں کچھ بھی نہیں تھا۔ سرمد صاحب یہ بات اچھی طرح جانتے تھے لیکن پھر بھی وہ اسے اور دیگر ساتھیوں کو یہاں لے آئے تھے۔ اب عادل کے ذہن میں خیال آنے لگا...... شاید سرمد صاحب اس حد تک نہیں جانا چاہتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ ان کا پروگرام بس یہی ہوتا کہ مختلف ڈھلوانوں پر مشق کی جائے...... یا زیادہ سے زیادہ چھ سات ہزار میٹر تک چڑھائی کر لی جائے۔ لیکن جب رابے خاں وغیرہ نے انہیں آ دبوچا تو سرمد صاحب کو بیچ چوٹی تک کا سفر کرنا پڑ گیا۔

O......❖......O

عادل کا ذہن انہی خیالوں میں اُلجھا رہا اور وہ سرمد صاحب کے ساتھ واپسی کا سفر طے کرتا رہا۔ واپسی کے سفر میں سب سے زیادہ مشقت چھاتی اور ٹانگوں کو سہنا پڑتی تھی۔ بالآخر انہیں اپنا سیکنڈ لاسٹ کیمپ نظر آنا شروع ہو گیا۔ خیمے کے قریب کرسٹل کی سرخ جیکٹ ایک نکتے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ ایک زرد نکتہ ہمایوں کی جیکٹ کی نشاندہی کر رہا تھا۔ یقیناً وہ لوگ ٹیلی اسکوپس کی مدد سے انہیں دیکھ رہے تھے اور شاید حیران بھی ہو رہے تھے کہ باقی دو بندے کہاں ہیں۔

ابھی وہ دونوں کیمپ سے ڈیڑھ سو فٹ اوپر ہی تھے کہ انہیں کرسٹل اور ہمایوں کے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ خوشی کی آوازیں نہیں تھیں۔ ان میں اضطراب تھا اور عجلت تھی۔ وہ جیسے پکار رہے تھے۔

''کوئی مسئلہ لگ رہا ہے۔'' سرمد صاحب کی ہانپتی ہوئی آواز عادل کے کانوں میں پڑی۔

انہوں نے اپنے اُترنے کی رفتار بڑھا دی۔ ساتھ ساتھ وہ نیچے بھی دیکھ رہے تھے۔ کرسٹل اور ہمایوں انہیں بتا رہے تھے اور بائیں طرف اشارہ بھی کر رہے تھے۔ سرمد صاحب نے پھسلتے ہوئے رسوں کے ذریعے تین چار طویل جستیں نیچے کی طرف لگائیں اور کیمپ کے پاس لینڈ کر گئے۔ عادل نے بھی ان کی تقلید کی۔

ہمایوں نے تیزی سے پوچھا۔ ''آپ دونوں خیریت سے تو ہیں؟''

''ہاں ہم بالکل ٹھیک ہیں، یہاں کیا مسئلہ ہوا ہے؟'' سرمد صاحب نے پوچھا۔

''رات گیارہ بجے کے لگ بھگ وائرلیس سگنل ٹھیک آنے لگے تھے۔ ہمیں کیمپ سے رابے خاں کے ساتھیوں نے اطلاع دی کہ مالکانے زادہ کا بخار بہت شدت اختیار کر گیا ہے اور اس کی ناک سے خون رِس رہا ہے۔ پھر کچھ دیر بعد یہ خبر آئی کہ وہ جانبر نہیں ہو سکا۔ ابھی ہم اس خبر کے اثر سے نہیں نکلے تھے کہ ایک دوسری اطلاع آ گئی...... رابے خاں کے ساتھیوں نے بتایا کہ مالکانے زادہ کو تلاش کرتے کرتے بستی کے لوگ بیس کیمپ تک پہنچ گئے ہیں اور ان کے تیور بڑے خطرناک ہیں۔ اس کے بعد بیس کیمپ سے ہمارا رابطہ ختم ہو گیا۔ لیکن اب لگ رہا ہے کہ معاملہ ہماری توقع سے زیادہ سنگین ہو گیا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' سرمد صاحب نے پوچھا۔
ہمایوں نے ٹیلی اسکوپ ان کی طرف بڑھادی اور نیچے اتھاہ گہرائی کی طرف اشارہ کیا۔
''یہ لو عادل! تم اس سے دیکھو۔'' کرسٹل نے دوسری ٹیلی اسکوپ عادل کی طرف بڑھادی۔
عادل نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائی اور ہمایوں کی بتائی ہوئی سمت میں دیکھنے کی کوشش کی۔ اب دن کے قریباً گیارہ بج چکے تھے۔ بلندیوں پر چھائی ہوئی دھند کچھ چھٹنے لگی تھی۔ کہیں کہیں سفید برف پر دھوپ کے دھبے بھی نظر آتے تھے۔ یقیناً یہ دھبے بیسیوں کے حساب سے لمبے چوڑے تھے۔ انہی دھبوں کے درمیان اپنے کیمپ نمبر دو کے پاس عادل کو کئی سیاہ نقطے دکھائی دیئے۔ اس کی رگوں میں لہو سنسنا اُٹھا۔ وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ یقیناً یہ پاؤنڈہ بستی کے کوہ پیا تھے۔ ماکانے زادہ کی موت کے بعد وہ شدید غم و غصے کی لپیٹ میں آ گئے تھے اور اب اسی کیفیت میں ان کی طرف آ رہے تھے۔

سرمد صاحب نے ٹیلی اسکوپ اپنی آنکھوں سے ہٹائی اور بولے۔ ''یہ لوگ یقیناً کل رات سے ہی سفر کر رہے ہیں اور کافی اوپر آ گئے ہیں لیکن ابھی بھی یہاں تک پہنچنے کے لیے انہیں دس بارہ گھنٹے کی کلائمبنگ کرنا پڑے گی۔''
کرسٹل نے کہا۔ ''سر! آج موسم کافی آچھا۔ مے بی کہ یہ لوگ یہ ڈسٹینس زیادہ تیزی سے طے کر لیں۔''
''لیکن پھر بھی آٹھ دس گھنٹے تو کہیں نہیں گئے۔'' سرمد صاحب نے کہا۔
''اب ہام کو کیا کرنا ہوئیں گا سر! لیکن اس سے پہلے یہ بتائیں کہ...... رابے خاں اور فولاد کا کیا ہوا؟''
''وہی جو ان کی قسمت میں لکھا تھا اور وہی جس کے لیے انہوں نے خود تگ و دو کی ہے...... تم لوگوں نے ابھی کچھ دیر پہلے ایوالانچ کی گھن گرج سنی ہے؟''
''جی سر! بہت زیادہ آواز تھی۔ ہم بہت پریشان ہوئے تھے......'' ہمایوں نے کہا۔
''اس سے پہلے تین بلاسٹ ہوئے تھے۔ ان کی آواز بھی پہنچی یا نہیں؟'' سرمد صاحب نے دریافت کیا۔
''نو سر۔ بلاسٹ تو ہام نے نائیں سنا۔'' کرسٹل نے آنکھیں جھپک کر کہا۔
''رابے اور فولاد نے ہمارے منع کرنے کے باوجود کھنڈر کی ایک دیوار توڑنے کے لیے یہ بلاسٹ کیے اور ایوالانچ کا سبب پیدا کر دیا۔''
''ان دونوں کا کیا ہوا؟'' کرسٹل نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا۔
''وہ نہیں بچ سکے۔'' سرمد صاحب نے کہا۔ ''برف کا ایک پہاڑ بن گیا ان کے اوپر اور...... کھنڈر کے اوپر بھی۔''
کچھ دیر کے لیے وہ چاروں بالکل خاموش رہے۔ ان دونوں نے ان چاروں کے لیے بدترین دشمنوں کا روپ دھارا ہوا تھا مگر ان کی اس اچانک موت نے ان کے دلوں پر اثر چھوڑا تھا۔
سرمد صاحب نے ٹیلی اسکوپ پھر آنکھوں سے لگائی تھی اور دور نیچے خطرناک گہرائیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ عادل کا خیال تھا کہ شاید کرسٹل یا ہمایوں اس مقصد کے بارے میں بھی کچھ سوال کریں گے جس کے لیے وہ اس دور دراز سفر پر آئے تھے، یعنی زیورات کی موجودگی یا غیر موجودگی۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ شاید وہ دونوں پہلے سے یہ ساری حقیقت جانتے تھے یا پھر...... وہ سر سرمد کے احترام کی وجہ سے سوال و جواب کرنا نہیں چاہ رہے تھے۔ عادل کو پہلی وجہ ہی

زیادہ معتبر معلوم ہوئی۔
کچھ دیر بعد سرمد صاحب نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے ہٹائی اور پُرسوچ انداز میں اردگرد دیکھنے لگے۔
''اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟'' عادل نے سرمد صاحب سے سوال پوچھا۔
''ہمیں نیچے اُترنا ہوگا لیکن نئے راستے سے۔''
''کیا مطلب سر؟''
''اسی راستے سے اُتریں گے تو ظاہر ہے کہ پاؤنڈوں سے مڈبھیڑ ہو جائے گی...... وہ تعداد میں کافی زیادہ ہیں۔ انیس بیس کے قریب، یقینی بات ہے کہ ان کے پاس اسلحہ بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسنیپر ٹائپ گن بھی ہو یا ایک سے زیادہ ایسی گنیں ہوں......''
''نئے راستے سے اُترنا تو کافی مشکل ہوگا۔'' عادل نے کہا۔
''یہ مشکل تو اب جھیلنی ہی ہے۔'' سرمد صاحب نے دائیں جانب دور تک نگاہ دوڑائی۔ پھر ٹیلی اسکوپ دوبارہ آنکھوں سے لگائی۔ پہلے دائیں جانب کا جائزہ لیا، پھر بائیں جانب دیر تک دیکھتے رہے۔ اس جائزے میں ہمایوں بھی ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔ یہ بڑی طاقتور ٹیلی اسکوپس تھیں اور موسم صاف ہونے کی وجہ سے وہ کافی دور تک دیکھنے کے قابل تھے۔ سرمد صاحب اور ہمایوں باتیں کرتے ہوئے کچھ آگے چلے گئے۔
پانچ دس منٹ کی گفتگو کے بعد وہ جیسے کسی حتمی نتیجے پر پہنچ گئے۔ سرمد صاحب نے کہا۔ ''ہمیں دائیں جانب چلنا ہوگا اور پھر کوئی مناسب جگہ دیکھ کر اترائی شروع کرنا ہوگی۔''
یہ بڑی خطرناک ڈھلوانیں تھیں۔ کہیں کہیں تو قدم جمانے کو جگہ بھی نہیں تھی۔ یہاں اوپر کی طرف جانا جتنا مشکل تھا، اتنا ہی شاید افقی رُخ پر جانا بھی تھا۔
بہرحال سرمد صاحب کے فیصلے کے مطابق انہوں نے خود کو ایک دوسرے کے ساتھ رسے سے منسلک کیا اور برف پر اپنے کانٹے دار Crampons کو جما جما کر دائیں طرف سرکنے لگے۔ وہ جگہ جگہ خود کو بولٹس کے ذریعے اینکر بھی کر رہے تھے تاکہ اچانک پھسلنے کی صورت میں تحفظ مل سکے۔ تازہ دم ہونے کی وجہ سے ہمایوں سب سے آگے تھا۔
کچھ آگے جا کر انہیں وہ سیاہ نقطے نظر آنا بند ہو گئے...... جو دراصل ان کی طرف آنے والے مسلح پاؤنڈے تھے۔ دور سے دیکھنے پر وہ غیر متحرک ہی لگتے تھے لیکن یقینی بات تھی کہ وہ غیر متحرک نہیں ہیں اور اپنی تمام تر توانائی کے ساتھ اوپر کی طرف آ رہے ہیں۔
ہمایوں، کرسٹل، عادل اور سرمد صاحب، قریباً دو گھنٹے تک اسی طرح افقی رُخ پر حرکت کرتے رہے لیکن نیچے کی طرف جانے کے لیے انہیں کہیں بھی مناسب جگہ نظر نہیں آئی۔
کرسٹل کی ہانپتی ہوئی سانسیں عادل کے کانوں تک بڑی وضاحت سے پہنچ رہی تھیں۔ یقیناً یہ سانسیں سرمد صاحب نے بھی سن لی تھیں۔ انہوں نے کہا۔ ''کرسٹل! اگر زیادہ تھک گئی ہو تو سانس لے لیتے ہیں۔''
''نائیں سر۔'' وہ فوراً بولی۔ ''ہام بالکل ٹھیک۔''
یہ بات وہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ رُکنا خطرناک ہے۔ وہ لوگ جتنی جلدی جتنی زیادہ دور چلے جاتے اتنا ہی

بہتر تھا...... لیکن سب سے بڑی پریشانی یہی تھی کہ انہیں نیچے کا سفر شروع کرنے کے لیے کوئی مناسب لوکیشن دکھائی نہیں پڑ رہی تھی۔ برف ایسی نہیں تھی کہ اس میں بولٹنگ کی جا سکے یا میخیں ٹھونکی جا سکیں۔ ہاں اینکر وغیرہ استعمال ہو سکتے تھے۔ لیکن وہ بھی تب جب کوئی مناسب دراڑ نظر آتی۔ بالآخر تلاش بسیار کے بعد ان کی محنت رنگ لائی اور ایک جگہ کسی حد تک مناسب دکھائی دی۔ لیکن تب تک دن کی روشنی غائب ہونا شروع ہو گئی تھی۔ برفانی بلندیوں کی شام بڑی تیزی سے اپنے پَر پھیلا رہی تھی اور اندھیرا سر پر تھا۔ ایسے میں نیچے اُترنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انہیں جیسے تیسے یہیں پر رات بسر کرنا تھی۔

اب فقط ایک خیمہ ان کے پاس موجود تھا۔ اسے ایک نہایت مشکل جگہ پر نہایت دشواری کے ساتھ ایستادہ کیا گیا اور وہ تھکے ماندے اس میں گھس گئے۔ کرسٹل کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر سرمد صاحب نے کہا۔ ”بھئی ٹھیک ہے کہ ہم رُک گئے ہیں لیکن پاؤندوں کو بھی تو رُکنا پڑا ہے۔ اندھیرے میں وہ بھی سفر جاری نہیں رکھ سکتے۔“

”لیکن اگر انہوں نے سفر جاری رکھا تو پھر کیا ہوئیں گا؟“ کرسٹل نے کہا۔

”پھر وہ مریں گے۔ یہ ممکن نہیں ہے۔“ سرمد صاحب نے اسے تسلی دی۔

بہر حال وہ بڑی بے قراری کی رات تھی۔ عادل بھی بہت تھوڑی دیر کے لیے سو سکا۔ انہیں بس یہی خیال تھا کہ جلد سے جلد صبح کا اُجالا پھیلے اور وہ نیچے اُترنے کا آغاز کریں۔ وہ چاروں بالکل خاموش تھے۔ آج صبح سویرے ہونے والے لرزہ خیز واقعات کے بارے میں ان چاروں کے درمیان کسی طرح کی کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ ہمایوں جیسے ابھی تک رابے اور فولاد کی موت کا یقین نہیں کر پا رہا تھا۔

صبح کا اُجالا ابھی پوری طرح پھیلا نہیں تھا کہ سرمد صاحب اور ہمایوں خیمے سے نکل آئے۔ سرمد صاحب اینکر لگانے کے لیے کسی اچھی جگہ کی تلاش میں تھے۔ یہ وہی اسپیشل اینکر تھے جو کرسٹل اور سرمد صاحب نے بڑی مشکلوں سے ایک اندھی دراڑ میں سے نکالا تھا۔

خیمے میں اب عادل اور کرسٹل اکیلے تھے۔ دونوں لیٹے تھے، تاہم ان کے درمیان فاصلہ تھا۔ کرسٹل نے بڑی بے باکی سے لیٹے لیٹے دو تین پلٹنیاں کھائیں اور عادل کے گلے لگ گئی۔ پھر اس نے زور سے اس کا رخسار چوما اور جتنی تیزی سے آئی تھی، اتنی ہی تیزی سے پلٹنیاں کھا کر واپس اپنی جگہ پر چلی گئی عادل اس اچانک ”حملے“ اور ”حملے“ کی تیزی پر ہکا بکا تھا۔

وہ مسکرائی۔ ”بس یہ ہام کا آخری غلطی تھا۔ ہام کی یادوں میں ایک اور یاد کا اضافہ ہو گیا۔ این اور ایور لاسٹنگ میموری۔ ہام یہاں سے جانے کے بعد ان یادوں کو بہت سنبھال کر رکھے گا۔ تمہاری یہ فرینڈ شپ ہام کو بہت انسپائریشن دیں گا۔ پتا ہے ہام کو کیسا لگتا۔“

”کیسا لگتا؟“ عادل نے ٹھنڈی سانس لی۔

”ہام نے پہلے بھی بتایا تھا۔ ہام کو ایسا لگتا ہے کہ جیسے تمہارا یہ بیوٹی فل ساتھ ایک چھوٹی سی خوشی کی طرح ہے۔ جیسے ایک بٹر فلائی کو چند سیکنڈ کے لیے اپنی مٹھی میں بند کیا جائے...... اور پھر...... ریلیز کر دیا جائے۔ پھر اس کی یاد کو ایک فوٹو کی طرح اپنے البم میں لگا لیا جائے۔“ اس کی نیلی آنکھوں میں ستاروں جیسی چمک تھی۔

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”ہام بالکل سانچے دل سے دعا کرتا کہ تو م کو شہزادی ملے اور تو م بہت ہپی لائف گزارو۔“

”عادل! ذرا باہر آؤ۔“ سرمد صاحب کی آواز نے عادل اور کرسٹل کو چونکا دیا۔ عادل اپنی جیکٹ کی زپ درست کرتا ہوا باہر نکل آیا۔ سرمد صاحب نے اینکر پھنسانے کے لیے ایک بڑی اچھی جگہ ڈھونڈ لی تھی۔ وہ باقی کا کام تیزی سے کرنا چاہتے تھے۔ ان چاروں نے چلتے پھرتے ہی ریڈی میڈ ناشتہ بھی کیا۔ سرمد صاحب نے ہمایوں کو ذمے داری دی کہ وہ رسے کو مختلف جگہوں پر اینکر کرتے ہوئے نیچے اُترنا شروع کرے۔ سب سے پہلا اینکر وہی ڈیجیٹل اینکر تھا اور یہ کافی تحفظ فراہم کر رہا تھا۔

کرسٹل ٹیلی اسکوپ کے ذریعے قرب و جوار پر نگاہ دوڑا رہی تھی۔ اچانک اس کی سرسراتی ہوئی آواز اُبھری۔ ”سر! وہ نظر آ رہے ہیں۔“

یہ ایک دھماکا خیز فقرہ تھا۔ سرمد صاحب نے کرسٹل کے ہاتھوں سے دوربین لے کر اس کی بتائی ہوئی سمت میں نگاہ دوڑائی۔ سرمد صاحب کے تاثرات نے عادل کو بتایا کہ کرسٹل کی اطلاع درست ہے۔ پاؤندے دکھائی دینا شروع ہو گئے ہیں۔ یقیناً انہوں نے توقع سے زیادہ تیزی کے ساتھ سفر کیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ پوری طرح اُجالا پھیلنے سے پہلے ہی پھر چل پڑے ہوں۔

”ہمیں جلدی کرنا ہو گی۔“ سرمد صاحب نے کہا۔

اگلے پندرہ بیس منٹ میں وہ لوگ رسے کو اس پوزیشن میں لے آئے کہ اس کے ذریعے ایک ایک کر کے نیچے اُترا جا سکے۔ پروگرام اور ترتیب کے مطابق سب سے پہلے ہمایوں نے نیچے اُترنا شروع کیا۔ یہ بڑی خوفناک اترائی تھی۔ کہیں کہیں تو عمودی ڈھلوان ہمایوں کے جسم سے دور چلی جاتی تھی اور وہ مکمل طور پر ہوا میں جھولنے لگتا تھا۔ اس کے اترنے کی رفتار کافی سُست تھی۔ لیکن وہ تینوں جانتے تھے کہ اسے رفتار بڑھانے کا بھی نہیں کہا جا سکتا...... یہ اس کے لیے خطرات میں اضافے کا سبب ہوتا۔ قریباً ایک گھنٹے کی کوشش سے وہ لگ بھگ ایک ہزار فٹ نیچے اُترنے میں کامیاب ہو گیا۔

دوسرا نمبر کرسٹل کا تھا۔ اس نے اپنے ”بارنیس“ کو درست کیا اور چھوٹی چھوٹی جستوں کے ذریعے نیچے اُترنا شروع کیا۔ وہ ابھی نصف راستے تک پہنچی ہو گی، جب اس کے رسے نے نیچے پھسلنے سے انکار کر دیا۔ یہ کاربینرز اور رسے کا اُلجھاؤ تھا جو مشکلات پیدا کر رہا تھا...... ورنہ کرسٹل کو ہمایوں کے وقت سے نصف وقت لینا چاہیے تھا۔

اچانک عادل کی نگاہ سات آٹھ سو فٹ دور ایک برفانی تودے پر پڑی اور اسے خون اپنی رگوں میں منجمد ہوتا محسوس ہوا۔ تودے کے عقب میں کوئی پچاس میٹر کی دوری پر سیاہ ہیولے نظر آ رہے تھے۔ وہ لوگ پہنچ گئے تھے۔ اب انہیں خالی آنکھ سے بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ ٹیلی اسکوپ سے دیکھنے پر ان کے کندھوں سے جھولتی ہوئی رائفلیں بھی نظر آ رہی تھیں...... نیچے کرسٹل اسی طرح رسوں میں اُلجھی ہوئی تھی۔

یہ بڑی خطرناک سچویشن تھی۔ اسلحے کے نام پر سرمد صاحب اور عادل کے پاس کوئی چیز نہیں تھی۔ ان کا واحد ہتھیار ان کا پستول تھا، جو رابے خاں کے قبضے میں تھا اور اس کے ساتھ ہی قبر میں دفن ہو گیا تھا۔

اسی دوران میں ایک اچھی تبدیلی آئی۔ کرسٹل کے رسے نے پھر سے حرکت کرنا شروع کر دی۔ وہ تیزی سے نیچے اُترنے لگی لیکن اب اتنا وقت ہرگز نہیں تھا کہ عادل اور سرمد صاحب بھی نیچے اُتر سکتے۔ وہ لوگ تیزی سے قریب پہنچ رہے

تھے۔

''ان کو روکنا ہوگا۔'' سرمد صاحب نے کہا اور اپنے عقبی تھیلے میں سے کوئی چیز نکالی۔ عادل نے دیکھا یہ وہی ڈائنامیٹ اسٹکس تھیں جو انہوں نے کھنڈر کے قریب سے بھاگتے ہوئے اُٹھائی تھیں۔ اس وقت تو سرمد صاحب کے اس عمل کی وجہ، عادل کی سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن اب آرہی تھی۔ ان کی یہ احتیاط سود مند رہی تھی۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ پاؤندہ کوہ پیاؤں نے ان دونوں کو دیکھ لیا ہے اور اپنی رفتار بڑھا دی ہے۔ سرمد صاحب نے اپنے لائٹر کے ذریعے ایک ڈائنامیٹ اسٹک کے فلیتے کو آگ دکھادی۔ کچھ دیر انتظار کیا اور پھر بازو گھما کر یہ اسٹک پاؤندوں والے رُخ پر پھینک دی۔ چند سیکنڈ بعد ایک زوردار دھماکہ ہوا اور سفید برف اوپر اُچھلتی نظر آئی۔ یہ دھماکا پاؤندوں سے کافی فاصلے پر ہوا تھا اور یقیناً انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ عادل کو اندازہ ہوا کہ سرمد صاحب پاؤندوں کو کسی طرح کا نقصان پہنچانا چاہتے بھی نہیں۔ وہ صرف ان کو خود سے دور رکھنا چاہتے ہیں اور اس دھماکے نے یہ مقصد پورا کیا۔ وہ جو تیزی سے قریب آرہے تھے رُک گئے۔ وہ اب اتنا نزدیک تھے کہ ان کی للکارتی ہوئی آوازیں بھی عادل اور سرمد صاحب کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔

پھر پاؤندوں کی طرف سے جوابی کارروائی ہوئی۔ ان کی طرف سے اوپر تلے چار پانچ فائر ہوئے۔ یہ گولیاں کسی آٹومیٹک رائفل سے چلائی گئی تھیں۔ اب پتا نہیں کہ یہ ہوائی فائرنگ تھی یا انہیں ٹارگٹ کیا گیا تھا۔ بہرحال وہ دونوں کسی بھی نقصان سے محفوظ رہے۔

وہ ایک اُبھری ہوئی برفیلی چٹان کی آڑ میں تھے۔ عادل نے ٹیلی اسکوپ کی مدد سے نیچے جھانکا۔ کرسٹل ہمایوں کے پاس پہنچ چکی تھی۔ اب وہ دونوں اوپر دیکھ رہے تھے۔ یقیناً انہوں نے بھی دھماکے اور فائرنگ کی آوازیں سن لی تھیں۔

''آپ نیچے اُتریں سر! میں ان لوگوں کو یہاں روکتا ہوں۔''

''یہ نہیں رُکیں گے۔ وہ دیکھو...... اب وہ پھیل گئے ہیں...... اور آڑ لیتے ہوئے آرہے ہیں۔''

''آپ ڈائنامیٹ اسٹک استعمال کریں۔''

''عادل! ہمارے پاس صرف دو اسٹکس ہیں اور یہ دیکھو...... ان میں سے ایک ناکارہ ہے۔ ہم اس ایک اسٹک کے ذریعے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور ہمیں بگاڑنا بھی نہیں چاہیے۔ اگر کوئی مزید ہلاکت ہوگئی تو ہمارا زندہ بچ کر نکلنا اور مشکل ہو جائے گا۔''

''تو پھر؟''

''ہمیں ایک خطرہ مول لینا ہوگا...... یہاں سے چھلانگ لگانے کا۔'' عادل کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔

سرمد صاحب نے دو چھوٹے پیراشوٹ نکال لیے جو ان کے سامان میں موجود تھے۔ یہ حجم میں چھوٹے لیکن بہت جدید پیراشوٹ تھے۔ اگلے چار پانچ منٹ کے اندر سرمد صاحب نے کمال مہارت سے یہ پیراشوٹ اپنے اور عادل کے جسم سے باندھ دیے۔ اس دوران میں پاؤندوں کی طرف سے ان کی جانب چند فائر مزید کیے گئے۔ پاؤندوں کو دھمکانے کے لیے عادل نے بھی سرمد صاحب کی ہدایت پر ایک ڈائنامیٹ اسٹک ان کی طرف اُچھالی، جو کافی تاخیر سے بلاسٹ ہوئی۔

اور اب وہ چھلانگ لگانے کے لیے تیار تھے۔ اتنی بلندی سے اور اتنی تیز ہوا میں یہ چھلانگ...... موت کی چھلانگ ہی تھی لیکن یہ ان دونوں کو لگانی تھی کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ سرمد صاحب کی مقناطیسی شخصیت نے عادل کے اندر یہ حوصلہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ یہ چھلانگ لگا سکے۔ سرمد صاحب نے اسے آخری ہدایات دیں۔ پھر وہ رسا کھول کر نیچے پھینک دیا جو کرسٹل اور ہمایوں کو گہرائیوں میں لے کر گیا تھا۔ پاؤندے اب کسی بھی وقت ان دونوں پر جھپٹ سکتے تھے۔ وہ للکار رہے تھے اور گالیاں بک رہے تھے۔

عادل نے اپنی آنکھیں بند کیں اور سرمد صاحب کے ساتھ بانگڑی کی اندھی گہرائیوں میں چھلانگ لگادی۔

یہ یقین اور بھروسے کی چھلانگ تھی۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کب تک ایسے ہی پتھر کی طرح گرے گا۔ اس کا پیرا شوٹ کب کھلے گا اور وہ کہاں اور کیسے لینڈ کرے گا۔ بس وہ گر رہا تھا۔ شہزادی کا چہرہ اس کی نگاہوں میں تھا۔ وہ سنہری دھوپ میں سبز کھیتوں کے درمیان کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

O......❖......O

عادل اونچی نیچی برفیلی چٹانوں کے درمیان کہیں گرا تھا۔ اس کا کھلا ہوا پیراشوٹ اس کے قریب ہی پھڑ پھڑا رہا تھا۔ سرمد صاحب کی ہدایت کے مطابق اس نے کوشش کی اور خود کو پیراشوٹ کی ڈوریوں سے آزاد کروایا۔ اس کے پورے بدن پر خراشیں اور چھوٹی بڑی چوٹیں آئی تھیں۔ لگتا تھا کہ پورا بدن خراشوں کی وجہ سے جل رہا ہے۔ سرمد صاحب کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔

پیراشوٹ سے آزاد ہونے کے بعد وہ سرمد صاحب کو ڈھونڈنے کے لیے نکلا۔ قریباً آدھ گھنٹے کی کوشش کے بعد وہ اسے نظر آگئے۔ وہ کافی دور گرے تھے۔ اپنی آئس اسٹک کے سہارے وہ بُری طرح لنگڑاتے ہوئے اس کی طرف آرہے تھے۔ ان کی بائیں ٹانگ پر شدید چوٹ آئی تھی۔

''تم خیریت سے ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی ہاں...... لیکن آپ......''

''میں بھی ٹھیک ہوں۔ معمولی ضرب آئی ہے۔'' پھر انہوں نے بلندی کی طرف دیکھا۔ بانگڑی کی چوٹی آسمان کو چُھو رہی تھی۔ وہ اس کے دامن میں تھے لیکن اب بھی ان کی بلندی ڈیڑھ ہزار میٹر کے قریب تھی۔

''کرسٹل اور ہمایوں نظر آئے؟'' سرمد صاحب نے پوچھا۔

''نہیں سر۔''

''مجھے آئے ہیں۔'' انہوں نے کہا اور ٹیلی اسکوپ عادل کی طرف بڑھا کر اوپر ڈھلوانوں کی طرف اشارہ کیا۔

عادل نے کچھ دیر تلاش کیا پھر اسے برف کی سفید سطح پر دو سیاہی مائل نکتے نظر آگئے۔ یقیناً یہ ہمایوں اور کرسٹل ہی تھے۔ وہ نیچے آرہے تھے۔

''پاؤندے تو بہت اوپر ہوں گے۔'' عادل نے کہا۔

''ہاں...... انہیں نیچے اُترنے میں ابھی بہت وقت لگنا ہے۔''

''مم...... میں آپ کی ٹانگ دیکھوں۔''

''نہیں عادل! کہا ہے نا زیادہ چوٹ نہیں۔ میں نے خود ہی بینڈیج کر لی ہے۔'' انہوں نے کہا اور اپنے سامان میں سے نقشہ نکال لیا۔ عادل نے پھر ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگالی۔ ان دونوں کی بس اب ایک ہی خواہش تھی، کرسٹل اور ہمایوں جلد از جلد نیچے اُتر آئیں۔ بے شک انہوں نے پاؤنڈوں کو زبردست چکما دیا تھا لیکن ابھی وہ ان کی دسترس سے پوری طرح دور نہیں تھے۔

اگلے ڈیڑھ دو گھنٹے سخت اضطراب کے تھے۔ واکی ٹاکی سیٹ کی چارجنگ ختم ہو چکی تھی۔ عادل ٹیلی اسکوپ کے ذریعے مسلسل ہمایوں اور کرسٹل پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ کبھی تیز رفتاری سے اور پر کبھی آہستہ آہستہ نیچے اُتر رہے تھے۔ گاہے بگاہے انہیں اینکرز اور بولٹس وغیرہ کا سہارا لینا پڑ رہا تھا۔ دسری طرف سرمد صاحب اپنی ٹانگ کی تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے مسلسل نقشے پر جھکے ہوئے تھے اور پنسل سے نشان وغیرہ لگا رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ بھی ٹیلی اسکوپ کے ذریعے ہمایوں اور کرسٹل کو دیکھ لیتے تھے۔ پاؤنڈوں کے آثار ابھی کہیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔

بالآخر وہ خوش کن گھڑی آگئی جب ہمایوں اور کرسٹل ان سے آن ملے۔ وہ سب ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے اور ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کی۔ تفصیلی گفتگو کا یہ وقت نہیں تھا۔ انہیں جلد از جلد حرکت میں آنا تھا۔ ان کے سامنے حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی برف تھی اور اونچی نیچی چٹانیں تھیں۔ اس بیکراں ویرانے کی دوسری جانب انسانی آبادیاں تھیں، جہاں تک انہیں پہنچنا تھا اور پاؤنڈوں سے بچتے ہوئے پہنچنا تھا۔ انہوں نے بانگڑی کی بلند و بالا...... ''بھیدوں بھری''...... چوٹی کی طرف سے رُخ پھیرا...... اور چل پڑے۔

O......❖......O

یہ چھٹے دن بعد کی بات ہے۔ نیلے آسمان پر سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ دن کے کوئی گیارہ بجے کا عمل تھا۔ سرمد صاحب، ہمایوں، کرسٹل اور عادل چلاس کے ایک چھوٹے سے ریسٹ ہاؤس میں موجود تھے، تھکے ہارے اور نڈھال۔ ان کے چہروں پر طویل مسافت کی نقاہت تھی۔ سرمد صاحب ایک بستر پر لیٹے تھے۔ ایک مقامی ڈاکٹر نے ان کی زخمی ٹانگ کا طویل معائنہ کرنے کے بعد حیرت سے کندھے اچکائے اور گہری سانس لے کر مقامی لہجے میں بولا۔

''مجھے بالکل یقین نہیں آ رہا کہ...... جناب نے اس ٹانگ کے ساتھ اتنا طویل سفر کیا ہے۔ اِٹ از امپاسیبل۔''

''چوٹ زیادہ ہے؟'' عادل نے پوچھا۔

''چوٹ؟ ان کی ٹانگ تین جگہ سے ٹوٹی ہوئی ہے...... جی ہاں تین جگہ سے...... پنڈلی کی چھوٹی ہڈی کا ایک فریکچر تو ہیئر لائن ہے مگر بڑی ہڈی دو جگہ سے مکمل ٹوٹ چکی ہے۔''

عادل اور ہمایوں کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔ یہ واقعی ناقابلِ یقین بات تھی۔ سرمد صاحب نے راستے میں انہیں اپنی ٹانگ کی صورت حال کے بارے میں زیادہ نہیں جاننے دیا تھا۔ انہوں نے شاید اپنی ہمت سے بھی بڑھ کر برداشت کا مظاہرہ کیا تھا اور ان پر بوجھ بنے بغیر دشوار سفر جاری رکھا تھا۔ اب پتا چل رہا تھا کہ انہوں نے اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے گرد خود ہی تین چار لکڑیاں رکھ کر ٹوٹی ہوئی بڑی ہڈی کو سیدھا کیا تھا اور پٹی باندھ لی تھی۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ''ان کو فوری طور پر ٹریٹمنٹ اور سرجری کی ضرورت ہے، ورنہ اندرونی زخم ہیں جو خراب ہو سکتے ہیں۔''

''فوری طور پر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' ہمایوں نے پوچھا۔

''آپ کسی طرح انہیں داسو یا پھر ایبٹ آباد تک لے جائیں تاکہ سرجری ہو سکے۔''

عادل، ہمایوں اور کرسٹل گنگ تھے۔ یقیناً انہیں اپنے اپنے طور پر شرمندگی بھی ہو رہی تھی کہ وہ سرمد صاحب کی شدید ترین تکلیف سے بے خبر رہے۔

سرمد صاحب کے چہرے پر ایک دھیمی مسکراہٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ عادل کو لگا جیسے وہ کسی گوشت پوست کے شخص کو نہیں، فولادی انسان کو دیکھ رہا ہے۔ اسے وہ ناقابلِ فراموش منظر یاد آ گیا جب ان دونوں نے ہزاروں فٹ کی بلندی سے اندھی چھلانگ لگائی تھی۔ پہاڑ کی ایک عمودی دیوار کے ساتھ ساتھ تیرتے ہوئے وہ چار پانچ ہزار فٹ نیچے گئے تھے اور پھر پیراشوٹس نے کھل کر انہیں سنبھالا دیا تھا۔

اگلے چوبیس گھنٹے بڑے اہم تھے۔ پہلے انہوں نے جیپ پر شاہراہ قراقرم کا دشوار سفر کیا اور داسو پہنچے۔ یہاں کرسٹل اور ہمایوں نے سرمد صاحب کو مجبور کر کے انہیں ایک پین کلر انجکشن لگوایا۔ دو انجکشن راستے کے لیے رکھ لیے گئے۔ داسو سے مانسہرہ تک کا کٹھن سفر قریباً نو گھنٹے میں مکمل ہوا۔ وہ لوگ جس وقت ایبٹ آباد کے بارونق شہر میں پہنچے، وہاں اتنا بارونق نہیں تھا۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ وہ لوگ سیدھے ایک بڑے پرائیویٹ ہسپتال میں پہنچے۔ صبح تک سرمد صاحب کے سارے ٹیسٹ وغیرہ ہو گئے اور نو بجے انہیں آپریشن تھیٹر میں پہنچا دیا گیا۔ اس شخص کی غیر معمولی قوتِ برداشت کا جو مظاہرہ عادل نے دیکھا، وہ ششدر کر دینے والا تھا۔ اس ساری تکلیف کے دوران میں فقط صرف ایک پین کلر انجکشن انہیں لگایا گیا تھا اور وہ بھی بہت مجبور کر کے۔ انہیں مناتے ہوئے کرسٹل کی آنکھوں میں باقاعدہ آنسو آ گئے تھے۔

تین گھنٹے بعد سرمد صاحب آپریشن تھیٹر سے نکلے۔ ان کی ٹانگ میں پلیٹس وغیرہ ڈالی گئی تھیں۔ انہوں نے عادل کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہا۔ ''میں تو شاید اب کبھی پہاڑوں پر نہ چڑھ سکوں لیکن پہاڑوں کو تم جیسا مہم جو تو میں نے دے ہی دیا ہے۔'' عادل کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس نے ان کا پاؤں چھو لیا۔ سرمد صاحب کی طبیعت کچھ بحال ہوئی تو عادل کو اپنے گھر کا حال احوال معلوم کرنے کی خواہش شدت سے محسوس ہونے لگی۔ حقیقت یہ تھی کہ پچھلے قریباً تین ماہ سے اسے پیچھے کی کچھ خبر نہیں تھی۔ جہاں وہ اور سرمد صاحب وغیرہ موجود تھے، وہاں کسی طرح رابطے کا ذریعہ ہی نہیں تھا۔ وہ اپنے اردگرد سے بالکل کٹے رہے تھے۔ لاہور سے چلے آنے کے بعد وہاں کیا ہوا تھا؟ اس کے گاؤں کے حالات کیا تھے؟ والدہ کہاں تھی؟ شہزادی کی طرف صورتِ حال کیا تھی؟ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔

وہ ہسپتال سے باہر نکل کر ایک پی سی او پر پہنچا اور وہاں سے اپنے دوست صادق کا نمبر ملایا۔ اسے اندازہ تھا کہ صادق لاہور میں ہی ہوگا اور بدستور کباڑ کے کام میں دلچسپی لے رہا ہوگا۔ اس کے یہ دونوں اندازے بعد ازاں درست ثابت ہوئے۔ صادق کی جانی پہچانی آواز عادل کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''ہیلو کون؟''

''چند مہینوں میں آواز بھی بھول گئے۔ میں عادل بول رہا ہوں۔''

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ وہ جیسے حیرت کے شدید حملے سے سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر وہ لرزاں آواز میں پکارا۔ ''عادے...... یار...... کہاں چلے گئے تم؟ کوئی اطلاع نہیں۔ کوئی خیر خبر نہیں......'' اس نے کہا اور پھر بولتا چلا گیا۔

کوئی پانچ منٹ تک وہ اسی طرح کے تابڑ توڑ سوالات کرتا رہا اور عادل جواب دیتا رہا۔ عادل نے بھی والدہ...... شہزادی...... اور ماموں طفیل وغیرہ کی خیر خیریت دریافت کیا۔ پھر اس نے تایا فراست اور چودھری مختار وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔

تایا فراست کے ذکر پر صادق چند سیکنڈ کے لیے خاموش ہوا۔ پھر بولا۔ ''ہاں، وہ بھی ٹھیک ہیں۔ تمہارے تایا اور چودھری مختار کی دوستی دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے اور......''

وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

''کوئی خاص بات ہے؟'' عادل نے پوچھا۔

''نہیں...... کوئی ایسی خاص بھی نہیں...... بہر حال...... تم آؤ گے تو...... تفصیل سے بات کریں گے۔''

عادل سمجھ گیا کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔ یہ بات تو اسے کئی ماہ پہلے ہی معلوم ہو چکی تھی کہ چودھری مختار اپنے بیٹے ناصر کے لیے شہزادی کا رشتہ چاہتا ہے اور اسی سلسلے میں تایا فراست سے تعلقات گاڑھے کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اب صادق نے بھی یہ بتایا تھا کہ اس کی کوششیں بار آور رہی ہیں۔

عادل کے سینے میں بے چینی سی پھیل گئی۔ بہر حال فون پر تو لمبی بات نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس نے صادق کو بتایا کہ وہ دو روز تک لاہور پہنچ رہا ہے۔

O......❖......O

تیسرے روز سہ پہر کے وقت وہ لوگ لاہور واپس پہنچے۔ برسات کا موسم زوروں پر تھا۔ بے حد حبس تھا لیکن ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی۔ سرمد صاحب اپنی گاڑی کی پچھلی نشست پر لیٹ کر آئے تھے۔ ہمایوں اور ڈرائیور ان کے ساتھ تھے۔ عادل اور کرسٹل بذریعہ لگژری کوچ لاہور پہنچے تھے۔

اب عادل والدہ اور شہزادی سے ملنے کے لیے بے تاب تھا۔ اس نے سرمد صاحب سے گوجرانوالہ والدہ کے پاس جانے کی اجازت مانگی۔

''کب تک آ جاؤ گے؟'' سرمد صاحب نے پوچھا۔

''جب آپ کہیں؟''

وہ کچھ دیر سوچ کر بولے۔ ''ٹھیک ہے، ابھی تم چند دن آرام کرو۔ جیسے ہی تمہاری ضرورت محسوس ہوئی، میں تمہیں کال کر لوں گا۔''

انہوں نے ''ضرورت'' کی کوئی وضاحت نہیں کی۔ عادل نے بھی وضاحت نہیں چاہی۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ سرمد صاحب پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کرنے لگا ہے۔

سرمد صاحب نے ایک چیک پہلے ہی لکھ کر رکھا ہوا تھا۔ یہ تیس ہزار کا چیک تھا۔ عادل کو دیتے ہوئے بولے۔ ''یہ تمہارے اخراجات کے لیے۔''

عادل نے بہت انکار کیا لیکن انہوں نے چیک زبردستی عادل کی جیب میں ڈال دیا۔

کرسٹل اور ہمایوں یہاں سرمد صاحب کے پاس ہی موجود تھے اور عادل کی معلومات کے مطابق ان دونوں کو ابھی یہیں رہنا تھا۔ لہٰذا عادل کو سرمد صاحب کی تیمار داری کی طرف سے تسلی تھی۔ کرسٹل اور ہمایوں سے رخصت ہو کر عادل...... سرمد صاحب کے عجیب وضع گھر سے نکل آیا۔ یہ گھر کیا تھا، ایک درویش کا ڈیرا تھا۔ یہاں زندگی کی آسائشیں نہیں تھیں۔ گرمی سردی کا مقابلہ کرنے کے انتظامات نہیں تھے۔ یہاں کا مکین اپنا کھانا خود پکاتا تھا۔ اپنے کپڑے خود دھوتا تھا۔ وہ اپنا رزق براہِ راست زمین سے حاصل کرتا تھا اور اس کے لیے اپنے ہاتھوں سے کھیتی باڑی کی صعوبتیں بھی برداشت کرتا تھا۔ اسے دیکھ کر یہ مصرع بے ساختہ زبان پر آ جاتا تھا۔ عجیب مانوس اجنبی تھا، مجھے تو حیران کر گیا وہ۔

سرمد صاحب کے گھر سے نکل کر عادل سیدھا صادق کے پاس پہنچا۔ صادق نے اب کباڑ خانے کو ایک ٹھیک ٹھاک گودام کی شکل دے دی تھی۔ وہ اب پرانی مشینری بھی خرید رہا تھا اور اس مشینری کو ''ری پیئر'' بھی کر وا رہا تھا۔ اس

نے عادل کا استقبال گرم جوشی سے نم آنکھوں کے ساتھ کیا۔ دونوں دوست گودام کے ایک ٹھنڈے کمرے میں آبیٹھے اور سوال و جواب کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔

عادل نے اپنے بارے میں تو صرف وہی باتیں بتائیں جو اس نے بتانا ضروری سمجھیں۔ بہر حال صادق نے یہاں کے حالات کے بارے میں سب کچھ کھول کر بیان کر دیا۔ وہ عادل کی غیر موجودگی میں دو تین بار لالی گاؤں کا چکر لگا کر آیا تھا۔ وہ گوجرانوالہ میں عادل کی والدہ کی خبر گیری بھی کرتا رہا تھا اور کام میں جو تھوڑا بہت منافع ہو رہا تھا، وہ ان تک پہنچاتا رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ آج کل اس کی والدہ گوجرانوالہ سے واپس لالی گاؤں اپنے بھائی طفیل کے پاس گئی ہوئی ہیں۔ صادق نے یہ بھی بتایا کہ عادل کی آمد کی خبر ان تک پہنچ گئی ہے اور وہ اس سے ملنے کے لیے سخت بیتاب ہیں۔

شہزادی کے بارے میں عادل نے سوال کیا تو صادق کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ ''کیا بات ہے؟ جو کچھ بھی ہے کھل کر بتاؤ صادق؟''

اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''عادل! لوگ بات کا بتنگڑ بناتے ہیں...... گاؤں میں یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ شہزادی کی منگنی چھوٹے چودھری ناصر کے ساتھ ہو گئی ہے۔ بس سنی سنائی بات ہے۔ یقین سے کوئی نہیں کہہ سکتا اور نہ ہی حویلی میں کوئی ایسا فنکشن وغیرہ ہوا ہے۔''

عادل کے سینے میں ایک تیر سا لگا۔ تایا فراست نے اسے مہلت دی ہوئی تھی اور تین سال کی اس مہلت میں سے ابھی تو آدھا سال ہی گزرا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا اور اگر ہوا تھا تو...... بدعہدی تھی۔

صادق نے کہا۔ ''بہر حال ایک بات ہے عادل! اگر منگنی نہیں بھی ہوئی تو ہو ضرور جانی ہے۔ دونوں گھرانے آگے بڑھ بڑھ کر ایک دوسرے سے مل رہے ہیں۔ چودھری مختار کے بیٹے ناصر اور تمہارے تایا کے بیٹے قاسم نے مل کر چاولوں کا کام شروع کیا ہے۔ یہ کام شروع ہوتے ہی بڑی ''اسپیڈ'' سے چل پڑا ہے۔ انہوں نے دو شیلر اور لگا لیے ہیں۔ شیلروں سے لے کر گاؤں تک پکی سڑک بھی اپنے خرچے سے بنوا رہے ہیں۔ بڑی تیزی سے ترقی کر رہے ہیں یہ لوگ......''

صادق مختلف باتیں کر رہا تھا لیکن عادل کا ذہن ابھی تک منگنی والی بات میں اٹکا ہوا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟

صادق نے اس سے کئی بار پوچھا کہ سرمد صاحب کے ساتھ شمالی علاقوں کے سفر پر جانے کا رزلٹ کیا نکلا ہے؟ عادل نے ہر بار گول مول جواب دے کر اسے ٹال دیا۔ اس نے کہا۔ وہ صرف ایک ٹریننگ تھی، اس ٹریننگ کا نتیجہ بعد میں نکلے گا۔

''یعنی کیش کی صورت میں ابھی کوئی نتیجہ نہیں؟''

''ایسا ہی سمجھ لو۔'' عادل نے کہا۔

''تم نے سرمد صاحب کو شہزادی والی ساری گل بات بتائی ہوئی ہے نا؟''

''ہاں، پتا ہے ان کو۔'' عادل نے جواب دیا۔

سہ پہر کو لالی گاؤں کا پرانا چوکیدار معراج دین بھی صادق سے ملنے آ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ کباڑ کا یہ کام صادق اور عادل نے مل کر کیا ہوا ہے۔ چوکیدار معراج دین یہاں لاہور میں کچھ خریداری کرنے آیا ہوا تھا اور اب واپس گاؤں جا رہا تھا۔ چائے وغیرہ پی کر وہ گاؤں جانے کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس نے عادل کو بھی ساتھ چلنے کی پیشکش کی لیکن عادل کو کل

سرمد صاحب کا دیا ہوا چیک کیش کرانے کے بعد گاؤں جانا تھا۔ وہ ماں اور ماموں طفیل کے لیے خریداری بھی کرنا چاہتا تھا اور شہزادی کے لیے بھی کچھ لینا چاہتا تھا، اس امید پر کہ شاید کوئی تحفہ شہزادی تک پہنچانے کا موقع مل جائے۔

وہ اگلے روز سہ پہر سے ذرا پہلے اپنے گاؤں کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کا دل اندیشوں، امیدوں اور وسوسوں سے بھرا ہوا تھا۔ کچھ عجیب سی کیفیت تھی جسے وہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ پہلے بس، پھر لاری اور پھر تانگے کا دشوار طویل سفر طے کر کے وہ اگلے روز صبح اپنے گاؤں لالی پہنچ سکا۔ ساری رات ہی بارش ہوتی رہی تھی۔ بہاولپور سے آگے کا سفر اس کے لیے زیادہ دشوار ثابت ہوا تھا۔ جب وہ گاؤں پہنچنے کے لیے شہزادی کے گاؤں پال پور کے پاس سے گزرا اور اسے تایا کی حویلی کے بلند و بالا برج نظر آئے تو سینے میں ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ اس زمین پر ایک ایسی ہی حویلی کھڑی کرنے کا اس نے دعویٰ کیا تھا لیکن ابھی تک اس دعوے کے پورے ہونے کی شروعات بھی دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ اسے سرمد صاحب کی زبان پر بھروسہ تھا اور یہی بھروسہ اسے مایوسی و ناامیدی سے دور رکھے ہوئے تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ ہانگڑی کی چوٹی تک پہنچ گئے تو بہت کچھ حاصل کریں گے۔ ان کا کہنا اس طرح تو پورا نہیں ہوا تھا، جس طرح عادل سمجھا تھا...... یعنی وہاں قیمتی زیورات والا تو کوئی موقع پیدا نہیں ہوا تھا لیکن سرمد صاحب نے اسے ایک اور نوید سنائی تھی اور وہ نوید یہی تھی کہ جو کچھ عادل کو اس سفر سے حاصل کرنا چاہیے تھا، وہ اس نے حاصل کر لیا ہے۔ وہ غیر معمولی مہارت...... وہ صلاحیت جو اسے مستقبل قریب میں بہت کام دے سکتی ہے۔ مستقبل قریب میں کیا تھا، یہ بھی انہوں نے عادل کو نہیں بتایا تھا۔

ماموں طفیل کا گھر لالی گاؤں کی بیرونی حدود میں تھا۔ عادل نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ اس کی والدہ اور ماموں گھر سے باہر کھڑے تھے۔ یقیناً چوکیدار معراج دین کی زبانی اس کی آمد کی اطلاع گاؤں میں پہنچ چکی تھی۔ والدہ کو دیکھتے ہی وہ تانگے سے اُتر آیا اور دوڑتا ہوا ان کے گلے لگ گیا۔ ماں بیٹے کا ملاپ رقت آمیز تھا۔ وہ بار بار اس کا منہ چوم رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں۔ ''میرا پتر کتنا ماڑا ہو گیا ہے۔ ہڈیاں نکل آئی ہیں۔''

حالانکہ ہڈیاں تو ان کی نکلی ہوئی تھیں۔ وہ پہلے ہی کمزور تھیں، اب مزید ہو گئی تھیں۔ عادل کو یوں لگ رہا تھا، اس نے ماں کو نہیں ہڈیوں کے پنجر کو گلے سے لگا رکھا ہے لیکن اس پنجر میں اتنی محبت اتنی گرم جوشی تھی جس نے عادل کو سرتاپا توانائی سے بھر دیا۔ اپنی بھوک کو چھپا کر بیٹے کو کھانا کھلانے والی ماں بے شک بہت کمزور تھی لیکن اس کی ممتا کمزور نہیں تھی۔ یہ ممتا جب بھی عادل کو گلے سے لگاتی تھی اس کے حوصلے آسمان کو چھونے لگتے تھے۔ یہ بوڑھی ہڈیاں اپنے اندر کرشماتی اثرات رکھتی تھیں۔

ماموں طفیل بھی بڑی گرم جوشی سے ملے۔ وہ بار بار عادل کے عقب میں بھی دیکھ رہے تھے، جیسے کسی چیز کو تلاش کر رہے ہوں۔

''عادے پتر! اپنی گاڑی کہاں چھوڑ آئے ہو؟'' آخر انہوں نے پوچھا۔

ممانی بھی پاس ہی کھڑی تھیں۔ انہوں نے کہا۔ ''ساری رات بارش ہوتی رہی ہے۔ کیچڑ ہی کیچڑ ہے۔ ادھر بہاولپور میں ہی کہیں کھڑی کر آیا ہوگا۔''

''اور وہ اٹیچی کیس وغیرہ بھی گاڑی کے اندر ہی ہیں؟'' ماموں طفیل نے پوچھا۔

عادل تھوڑا سا حیران تھا۔ یہ گاڑی اور اٹیچی کیسوں وغیرہ کا ذکر کہاں سے آ گیا تھا۔ اس کے پاس تو ایک ہی چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا جو اس نے تانگے کی سیٹ کے نیچے رکھا ہوا تھا۔

ماں نے اسے پھر اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''کیا کر رہے ہو؟ ساری باتیں یہیں پر کھڑے کھڑے کرو گے۔ میرا پتر اتنا لمبا پینڈا کر کے آیا ہے۔ پتا نہیں ناشتہ بھی کیا ہے یا نہیں۔''

''ناشتہ کر لیا ہے ماں اور بڑا تگڑا کیا ہے۔''

کچھ بچے بھی عادل کے اردگرد جمع ہو گئے تھے اور ذرا تعجب سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک بچے نے پوچھ ہی لیا۔ ''چاچا عادل! تیری لال گڈی کدھر ہے۔''

''وہ بھی آ جائے گی۔'' عادل نے گول مول جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ احساس بھی ہوا کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہے۔ شاید کسی نے اس کے بارے میں کچھ جھوٹ موٹ باتیں کہی ہیں۔ لال گاڑی اٹیچی کیس وغیرہ۔

ماں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے آلو والے پراٹھے پکائے۔ ساتھ میں دہی تھا جس میں پودینے کی چٹنی ڈالی گئی تھی۔ عادل بہت کہتا رہا کہ اس نے راستے میں ناشتہ کیا تھا مگر وہ ماں ہی کیا جو مان جاتی۔ دوسری طرف ماموں اور دیگر گھر والے عادل کا چھوٹا سا اٹیچی کیس دیکھ دیکھ کر کچھ حیران ہو رہے تھے۔ وہ لوگ عادل سے اس کی تین چار مہینوں کی کارکردگی دریافت کرنے لگے۔ اسی دوران میں بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کی پڑوسن اور رازدان...... ریحانہ اس سے ملنے آئی تھی۔ ساتھ میں اس کی والدہ اور چھوٹے بھائی بھی تھے۔

ریحانہ نے بھی چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''عادے بھائی! تمہاری گاڑی کدھر ہے؟''

اس سے پہلے کہ عادل کچھ وضاحت کرتا، دروازے پر پھر دستک ہونا شروع ہو گئی۔ اس دفعہ عادل باہر گیا۔ باہر لالی اور پال پور کے جڑواں دیہات کا پرانا ٹھیکیدار نوازش علی کھڑا تھا۔ وہ علاقے میں زمینداروں کے ڈیرے، ٹیوب ویلوں کے کوٹھے اور پکی حویلیاں وغیرہ بناتا تھا۔ نوازش علی کے ساتھ دو اور بندے بھی تھے۔ نوازش کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا تھا اور چہرے پر خوشامدی مسکراہٹ۔ ''جی آیاں نوں عادل پتر۔ تیرے بغیر تو یار پنڈ ہی ویران ہو گیا تھا۔ پوچھ لے اپنے مامے سے، میں کئی بار آ کر تیرا پتا کر چکا ہوں۔''

ٹھیکیدار نوازش کی باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بیٹھنے اور چائے وغیرہ پینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ طوعاً و کرہاً عادل نے اس کے لیے بیٹھک کھلوائی اور چائے وغیرہ پلائی۔ ٹھیکیدار کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ بھی کسی غلط فہمی کا شکار ہے۔ اس کا خیال ہے کہ عادل کو شہر میں کہیں سے کافی سارا مالی فائدہ ہوا ہے اور وہ اپنے ماموں کی کاشت والی زمین پر حویلی وغیرہ بنانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس بار وہ حویلی کے لیے بنیادیں کھدوائے گا اور بھروائے گا۔ سال کے آخر میں وہ دوبارہ گاؤں آئے گا اور حویلی کی تعمیر شروع کروائے گا۔

عادل یہ باتیں سن سن کر حیران ہو رہا تھا۔ ٹھیکیدار نوازش کو خطرہ تھا کہیں عادل بنیادیں وغیرہ بھروانے کے لیے اس کے حریف ٹھیکیدار افضل آرائیں کو نہ چن لے۔

عادل نے ٹھیکیدار نوازش سے بھی گول مول باتیں ہی کیں اور اس سے کہا کہ ابھی کوئی آخری فیصلہ نہیں ہوا۔ جب بھی ضرورت پڑی، وہ اسے یاد ضرور کرے گا۔

اب عادل کو اس سارے معاملے میں کسی شرارت یا سازش کی بُو آ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد عادل نے اکیلے میں ماموں طفیل سے بات کی۔ اس نے کہا۔ ''ماما! یہ پنڈ میں کیا باتیں پھیلی ہوئی ہیں؟''

ماموں طفیل کو بھی اب کسی حد تک گڑبڑ کا اندازہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے کہا۔ ''عادے! کیا واقعی تُو کار وغیرہ لے کر نہیں آیا؟'' عادل نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اور وہ ولایتی سامان سے بھرے ہوئے چار اٹیچی کیس؟''

''نہیں ماما! ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے کوئی ڈاکا تو نہیں مارنا تھا اور نہ ہی کوئی لاٹری شاٹری لگی ہے میری......''

''تو پھر یہ باتیں کیسے پھیلی ہیں؟ سب سے پہلے کل چوکیدار معراج دین نے بتایا تھا کہ عادا لاہور آ گیا ہے۔ اس کے بعد دوپہر تک یہ باتیں ہونے لگیں کہ اس نے لال رنگ کی لمبی کار لے لی ہے اور کافی سارے پیسے بھی آ گئے ہیں اس کے پاس...... تیری ماں وچاری تو کل سے مبارکبادیں وصول کر رہی ہے۔'' ماموں نے ذرا تاسف سے کہا۔

''کہیں یہ چودھری مختار اور اس کے پتر کی شرارت تو نہیں؟'' عادل نے کہا۔

''لگتا تو مجھے بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اپنے کارندوں سے کہہ کر یہ پنڈ میں کوئی بھی بات منٹوں میں پھیلا سکتے ہیں۔ یہ چوکیدار معراج بھی تو ان کے کارندوں کی طرح ہی ہے۔''

عادل کے سینے میں چنگاریاں سی سلگ گئیں۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''ماما! یہ جو شہزادی کی منگنی والی بات ہے، یہ کہاں تک صحیح ہے؟''

ماموں طفیل نے ذرا توقف سے کہا۔ ''ہم نے بھی یہ گل بس سنی ہی ہے۔ کئی لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ منگنی نہیں ہوئی بس اندرخانے بڑوں میں 'ہاں' ہوئی ہے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔ یہ وڈے لوگ ہیں۔ ان کے اپنے طور طریقے ہوتے ہیں ویسے میں تو ایک گل کہوں گا تجھ سے، اگر تُو بُرا نہ مانے تو۔''

''کہو ماما! تمہارے اور ماں کے سوا میرا اور ہے کون؟''

''تُو یہ شہزادی کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔ رشتے ناتے اپنے جیسوں میں ہی چنگے ہوتے ہیں اور پھر یہ جو دشمنی چل پڑی ہے نا، تیری چھوٹے چودھری ناصر وغیرہ کے نال...... یہ بھی بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ صبح تیری ماں بھی یہی گل کر رہی تھی۔ تجھے...... پنڈ آنا ہی نہیں چاہیے تھا...... چلو اب آ گیا ہے تو زیادہ دیر یہاں رُکنا نہ۔ خوامخواہ کوئی گل نہ ہو جائے۔''

عادل نے ماموں کے تاثرات دیکھے اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ چند گھنٹے پہلے تک ماموں اور ممانی کا رویہ اور تھا۔ ان سب کا خیال تھا کہ عادل واقعی کوئی کار وغیرہ اور پیسہ لے کر آیا ہے۔ لیکن اب وہ پریشان نظر آنے لگے تھے اور شاید یہی چاہتے تھے کہ وہ اور سکینہ جلد یہاں سے چلے جائیں۔

عادل کو خاموش دیکھ کر ماموں طفیل جلدی سے بولا۔ ''میں جو کہہ رہا ہوں، تیرے اور سکینہ کے بھلے کے لیے ہی کہہ رہا ہوں۔ اس طرح کی دشمنی چنگی نہیں ہوتی اور میرا یہ بھی مشورہ ہے کہ ایک بار حویلی جا کر اپنے تائے کو سلام کر آ۔ بلکہ حویلی بھی نہ جانا...... ڈیرے پر چلے جانا۔''

''سلام کرنے تو میں ضرور جاؤں گا ماما۔ وہاں جانا بنتا ہے میرا۔'' عادل نے پُرحرارت اور معنی خیز لہجے میں کہا۔

''تائے کے پتروں سے بھی کسی طرح کا بکھیڑا کرنے کی لوڑ نہیں ہے۔ ان سے آمنا سامنا ہو تو کنی کترا کر گزر جانا...... بلکہ...... میرا تو پھر یہی مشورہ ہے تجھے کہ سکینہ کو لے کر جلدی سے واپس گوجرانوالہ چلا جا۔ وہ سیانے کہتے ہیں نا کہ جب جھکڑ تیز چل رہا ہو تو ٹہنیاں جھک جاتی ہیں اور ٹوٹنے سے بچ جاتی ہیں۔''

عادل کی خواہش تھی کہ کسی طرح جلد از جلد ریحانہ سے تنہائی میں ملاقات ہو جائے۔ وہ اس کی ہمراز و غم خوار تھی اور جو کچھ شہزادی کے بارے میں وہ عادل کو بتا سکتی تھی، کوئی اور نہیں بتا سکتا تھا۔ شام کے وقت عادل گھر کی چھت پر چلا گیا۔ دو دن کی بارش اور بوندا باندی کے بعد آج آسمان نکھرا ہوا تھا۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں ہر شے نکھری نکھری اور صاف ستھری دکھائی دیتی تھی۔ گاؤں کے جوہڑ میں بطخیں تیر رہی تھیں اور کناروں پر چمکیلے پتوں والی جھاڑیاں، جیسے پانی میں اپنا عکس دیکھ رہی تھیں۔ اپنے گاؤں کی ایسی ہی سنہری شامیں عادل کے دل کی گہرائی میں چھپی رہتی تھیں۔ ایسی شاموں میں وہ اپنے کھلنڈرے دوستوں کے ساتھ گلی ڈنڈا، والی بال اور کشتی جیسے کھیلوں میں حصہ لیتا تھا اور نہر پر خوب خوب تیرا کی کیا کرتا تھا۔ شہزادی کا خیال ایسی سنہری شاموں میں زیادہ شدت سے اس پر حملہ آور ہوتا تھا اور وہ دور اونچی حویلی کے کلس دیکھ کر شہزادی کا تصور ذہن میں اجاگر کیا کرتا تھا۔ آج بھی کچھ یہی کیفیت تھی۔ غروب ہوتے سورج کی آخری کرنیں قریباً چار فرلانگ دور پال پور کی بلند حویلی کے در و بام کو روشن کر رہی تھی۔ ان در و بام میں اس کی شہزادی رہتی تھی۔ اس سے قریب ہو کر بھی وہ اس سے بہت زیادہ دور تھی۔

پھر عادل کی نگاہ نہر کی طرف دو تین پختہ عمارتوں پر پڑی۔ یہ چاول صاف کرنے والے وہ کارخانے تھے جو چودھری ناصر اور قاسم نے مل کر لگائے تھے۔ ان کارخانوں کے سامنے سے گزرنے والی پختہ سڑک کے کام کا آغاز ہو چکا تھا۔ دن بھر کے تھکے ماندے مزدور اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔

اچانک ایک آہٹ پر عادل چونک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ سامنے کچی سیڑھیوں پر سے فربہ اندام ریحانہ اوپر آ رہی تھی۔ یقیناً اس نے اپنے گھر کی چھت سے عادل کو چھت پر دیکھ لیا تھا اور اب اس سے ملنے آ رہی تھی۔ شام کی سرمئی اب تیزی سے اندھیرے میں بدل رہی تھی۔ دونوں منڈیر کی اوٹ میں علیحدہ علیحدہ چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ''شہزادی کیسی ہے ریحانہ؟'' عادل نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''بس ٹھیک ہے۔'' ریحانہ نے مختصر جواب دیا۔ ''تُو بتا عادے بھائی! تجھے شہر میں کچھ کامیابی ملی کہ نہیں؟''

''ملے گی ریحانہ...... ضرور...... ملے گی۔ محنت کبھی ضائع نہیں جاتی۔''

''لیکن...... عادے بھائی! مجھے لگتا ہے کہ تجھے بہت دیر ہو جائے گی...... بلکہ...... شاید...... دیر ہو بھی چکی ہے۔''

عادل کے سینے میں سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ ریحانہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تُو تو ہر روز حویلی میں جاتی ہے ریحانہ! تجھے تو ہر بات کا پتا ہو گا۔ شہزادی کی منگنی والی کیا بات ہے؟''

''مجھے بھی اتنا ہی پتا ہے جتنا دوسروں کو ہے۔ لگتا ہے کہ...... اندر خانے کوئی ''ہاں'' وغیرہ ہوئی ہے۔ پر کھل ڈل کر منگنی والی بات نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ تایا فراست اس کو پسند نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ لمبی منگنیاں ہونی ہی نہیں چاہئیں۔ اگر ہو بھی تو دو تین ماہ کی ہو اور پھر ویاہ ہو جائے۔''

''اگر کوئی ''ہاں'' ہوئی ہے تو وہ بھی تایا جی کی مرضی سے ہی ہوئی ہو گی نا؟''

''ہاں، یہ بات بھی ٹھیک ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ اس معاملے میں تمہاری تائی مجیدہ زیادہ اگے اگے ہے۔''

''شہزادی اس بارے میں کیا کہتی ہے؟''

ریحانہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اس وچاری نے کیا کہنا ہے، وہ تو بس اس آس پر ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی کرشمہ ہو جائے۔ تُو کچھ بن جائے اور...... تایا فراست کا دل تیرے لیے نرم ہو جائے۔ کل جب یہ خبر پھیلی کہ تُو لمبی کار پر پنڈ آ رہا ہے اور تیرے پاس کافی سارے روپے آ گئے ہیں تو وہ خوش تھی۔ میں نے دیکھا اس نے کمرے میں جا کر نفل وغیرہ بھی پڑھے تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ ساری افواہ تھی اور چودھری مختار کے کاموں (کارندوں) نے جان بوجھ کر پھیلائی تھی تو وہ بالکل گم صم ہو گئی۔''

عادل کے دل میں ٹیس سی اُٹھی۔ اس نے کہا۔ ''ریحانہ! کل حویلی میں کام کرنے جانا ہے تُو نے؟''

''ہاں عادے بھائی! وہ تو روز ہی جانا ہوتا ہے۔''

''تو شہزادی سے یہ کہنا، میں کوئی آرام سے نہیں بیٹھا ہوا۔ پوری پوری کوشش کر رہا ہوں اور اس کوشش کا پھل جلد ہی مل بھی جانا ہے۔ اللہ کے گھر سے پوری پوری امید ہے۔ وہ ہمت نہ ہارے۔ میں اسے ہر صورت میں جیت کر رہوں گا۔ دیر ہو سکتی ہے لیکن اندھیر نہیں۔''

''اچھا عادے بھائی! میں کوشش کروں گی۔ دو تین دن سے تائی مجیدہ مجھ پر بھی پوری نظر رکھ رہی ہے۔ شاید اسے شک ہے کہ میں تمہاری بات شہزادی تک پہنچاتی ہوں اگر کسی کو پتا چل گیا نا عادے بھائی...... تو اس قاسم نے تو میری کھال ہی ادھیڑ دینی ہے۔ تم کو پتا ہی ہے وہ کتنا ڈھاڈا ہے۔''

عادل نے ریحانہ سے تسلی تشفی کے چند بول بولے۔ اسی دوران میں عادل کے ہم عمر لڑکوں کی ایک ٹولی اس سے ملنے کے لیے آ گئی اور دروازے پر دستک شروع ہو گئی۔ ان میں عادل کا قریبی دوست شاہد بھی تھا۔ عادل ان سے ملنے نیچے چلا گیا۔

O......❖......O

اگلے روز شام کو ریحانہ نے شہزادی کا جوابی پیغام عادل تک پہنچا دیا۔ ان کی ملاقات وہیں چھت کی تاریکی میں ہوئی۔ ریحانہ افسردہ نظر آ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''عادے بھائی! میں اپنی طرف سے ایک لفظ بھی بولوں تو میری زبان سڑ جائے۔ وہی کہوں گی جو شہزادی نے مجھ سے کہا ہے۔''

''ٹھیک ہے کہو۔''

وہ آزردہ لہجے میں بولی۔ ''عادے بھائی! شہزادی نے کہا ہے کہ تم خوامخواہ اپنے آپ کو نہ رولو۔ اس خواری سے کچھ حاصل نہیں ہونا ہے۔ وہ کہتی ہے گھر میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو میری اور تمہاری شادی کے حق میں ہو۔ چودھری مختار کی تایا جی سے بہت پکی اور گاڑھی ہو گئی ہے۔ ا رکاروبار شروع ہو گئے ہیں۔ چودھری گھرانے کے لوگ اب کسی طرح بھی اس رشتے سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ یہ سب بڑے زور والے لوگ ہیں۔ یہ تمہاری کوئی پیش نہیں چلنے دیں گے۔''

''لیکن ریحانہ! جو بات میں نے تم سے کہی تھی، اس کا کیا جواب دیا اس نے؟''

"وہ کیا جواب دے عادے بھائی! دوسروں کی طرح اس کو بھی یہ بات نہ ہونے والی لگتی ہے کہ تم بہت سارا روپیہ جمع کرلو گے اور اپنے تایا کا ہم پلا ہو کر دکھا دو گے۔ چودھری مختار کے کامے بھی تمہارے بارے میں اُلٹی سیدھی باتیں پھیلاتے رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تم اپنے کسی یار کے ساتھ مل کر وہاں لاہور میں کباڑیے کا کام کررہے ہو۔ ردی بیچتے ہو۔ پھر یہ بات مشہور ہوئی کہ تم نے کباڑیے کا کام بھی چھوڑ دیا ہے اور کسی خبطی بندے کے ساتھ پہاڑوں کی طرف نکل گئے ہو، جڑی بوٹیاں ڈھونڈنے کے لیے...... کیا تم واقعی جڑی بوٹیاں ڈھونڈنے نکلے ہوئے تھے عادے بھائی؟"

"نہیں، یہ جھوٹی باتیں ہیں۔" عادل نے سخت بیزاری سے کہا۔

"یہ لوگ تم پر ہنستے ہیں عادے بھائی! اور میں جانتی ہوں جب بھی کوئی ایسی گل ہوتی ہے، شہزادی کا دل خون ہو جاتا ہے۔ ابھی پچھلی ہی عید پر چودھری ناصر کی بہن نے ایسی بات کر کے بڑے رُلایا تھا وچاری کو۔ وہ آج کل بہت ملتی جلتی ہے نا شہزادی سے......" بات ختم کر کے ریحانہ نے کھوئی کھوئی نظروں سے عادل کو دیکھا اور دوبارہ بولی۔ "ویسے عادے بھائی! تمہارے ہاتھ پیر دیکھ کر اور تمہارا رنگ دیکھ کر لگتا تو یہی ہے کہ تم بہت دن پہاڑی علاقوں میں اور برفوں میں گھومتے پھرتے رہے ہو، کیا واقعی ایسا تھا؟"

"ہاں، میں گیا تھا پہاڑوں میں...... لیکن جڑی بوٹیاں ڈھونڈنے کے لیے نہیں۔" عادل نے پُرتپش لہجے میں کہا۔

رات کو ماں بھی اسے دیر تک سمجھاتی رہی۔ وہ لالٹین کی روشنی میں لیٹی تھی۔ وہ اس کے پاؤں دبا رہا تھا۔ جو چیزیں وہ لاہور سے اس کے لیے لایا تھا، وہ اس کے سرہانے رکھی تھیں۔ ماں کی آنکھوں میں بار بار خوشی کے آنسو آتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اندیشوں کی نمی بھی آنکھوں میں چمک جاتی تھی۔ اس نے کہا۔ "عادل پتر! وہ وڈے لوگ ہیں، ہم ان کی دشمنی مول نہیں لے سکتے۔ میں گوجرانوالہ میں ہوتی تو تجھے یہاں آنے ہی نہ دیتی۔ چل آ اب واپس چلے جائیں۔ تُو ماشاء اللہ اب کمانے لگ گیا ہے۔ دیکھنا میں تیرے لیے ایسی ووہٹی لاؤں گی کہ سب دیکھدے رہ جائیں گے۔ تُو بس چھڈ دے اس وڈی امیرزادی کا خیال۔"

"ٹھیک ہے ماں! جیسا تُو کہتی ہے ویسا ہی ہوگا۔" عادل نے کہا۔ اس کی نگاہیں لالٹین کے شعلے پر جمی ہوئی تھیں۔

وہ جو بلند ترین پہاڑوں کو جیت کر آیا تھا، ماں سے بحث کرنے اور جیتنے کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتا تھا۔ اس نے اس موقع پر خاموشی ہی بہتر سمجھی۔

اس نے گاؤں سے چلے تو جانا تھا لیکن جانے سے پہلے وہ ایک بار تایا فراست کو سلام کرنے ضرور جانا چاہتا تھا۔ یہ کام وہ کل ہی نمٹانا چاہتا تھا۔

ماں نے اسے خیالوں میں گم دیکھ کر کہا۔ "کیا سوچنے لگا ہے عادے...... کہیں...... کہیں شہزادی سے ملنے کا خیال تو تیرے دل میں نہیں آرہا؟" ماں کے لہجے میں اندیشوں کے دیو چنگھاڑ رہے تھے۔

"نہیں ماں نہیں۔ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے تائے سے وعدہ کر رکھا ہے کہ شہزادی سے کوئی تعلق واسطہ نہیں رکھوں گا اور میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ تائے کی عزت میری عزت ہے۔"

○......❖......○

جس وقت ماں بیٹے میں یہ باتیں ہو رہی تھیں، عین اسی وقت گاؤں کی چند گلیاں چھوڑ کر چودھری مختار کی حویلی میں

اس کا دراز قد بیٹا ناصر بھی خاص قسم کی بات چیت میں مصروف تھا۔ اس کے سامنے فراست علی کے ڈیرے کا فربہ اندام چوکیدار انور بیٹھا تھا۔ ابھی ابھی ایک ہزار روپے کے دو کڑکتے نوٹ انور کی جیب میں گئے تھے اور وہ چودھری ناصر کی بات بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ نوجوان چودھری ناصر نے راز داری کے لہجے میں کہا۔ "بالکل پکی اطلاع ہے اندر سے۔ سویرے اتوار ہے۔ عادے کو بھی چنگی طرح پتا ہے کہ اتوار کے دن سویرے آٹھ نو بجے چودھری فراست ڈیرے پر ہی ہوتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ نو بجے تک ڈیرے پر پہنچ جائے گا۔ وہ چودھری فراست سے ملنے کا کہے گا۔ تم نے کہنا ہے کہ چودھری صاحب اندر نہیں ہیں۔"

"اگر اس نے ان کی جیپ وغیرہ دیکھ لی تو۔"

"تو کہنا کہ وہ جیب کھڑی کر کے پیدل چلے گئے ہیں، باغیچے والے نئے احاطے کی طرف۔ باغیچے والے نئے احاطے کا عادے کو پتا نہیں ہے۔ تم نے کہنا ہے کہ چلو میں تمہیں ساتھ لے چلتا ہوں۔ اسے احاطے کے پچھلے والے دروازے کی طرف سے لے جانا۔ چابی تو ہوتی ہے نا تمہارے پاس؟"

"ہاں جی، چابی تو ہے۔"

"بس ٹھیک ہے۔ آگے کی بات کا تو تجھے پتا ہی ہے۔"

فربہ اندام انور نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ ناصر نے اس کی چادر ہٹائی اور اچانک اس کا گریبان پکڑ لیا۔ پھر ایک جھٹکے سے انور کا گریبان پھٹ گیا اور نیچے سے بنیان بھی پھٹ گئی۔ اس نے حیرت سے چودھری ناصر کی طرف دیکھا۔ چودھری کے ہاتھ میں اب چرخی والا ریوالور نظر آرہا تھا۔ اس نے ریوالور زور سے انور کی چربی دار چھاتی پر مارا۔ وہاں گہری خراشیں آئیں اور خون کا رِساؤ بھی دکھائی دیا۔

انور کا چہرہ زرد ہو گیا تھا لیکن چودھری ناصر کے تاثرات دیکھ کر وہ ذرا سنبھلا۔ چودھری ناصر بولا۔ "گھبراؤ نہیں، یہ جان بوجھ کر کیا ہے میں نے۔ کوئی ثبوت تو ہونا چاہیے کہ عادے نے زبردستی کی تم سے۔"

انور نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ اب تکلیف کے آثار اس کے چہرے سے معدوم ہو گئے تھے۔ چودھری ناصر نے اپنی کڑھائی دار قمیص کی بغلی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ سو روپے کا ایک اور نوٹ نکال کر انور کے ہاتھ میں دے دیا۔ "یہ تمہاری اس چوٹ کے لیے۔" وہ مسکرایا۔

انور خوش نظر آنے لگا۔ اس نے چادر کو دوبارہ بکل کی شکل میں لپیٹ لیا۔ ناصر نے آخری ہدایت دیتے ہوئے کہا۔ "اپنے ساتھی جھورے کو بھی ساری بات سمجھا دینی ہے، یہ نہ ہو کہ وہ کوئی گڑبڑ کرے۔"

"آپ بےفکر رہیں چھوٹے چودھری جی۔" انور نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔

○......❖......○

عادل نو بجے کے بعد تایا سے ملنے کے لیے نکلا۔ اس نے ماں کو پوری تسلی دی تھی کہ وہاں کسی طرح کی کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ وہ بس تایا کو سلام کر کے اور ان کی خیر خیریت دریافت کر کے واپس آجائے گا۔ بہرحال احتیاط کے طور پر عادل نے پستول اپنی قمیص کے نیچے لگا لیا تھا۔ ماں چاہتی تھی کہ عادل نے اگر جانا ہی ہے تو ماموں کو ساتھ لے کر جائے لیکن وہ خاموشی سے ہی نکل آیا تھا۔ ایک ٹریکٹر ٹرالی پال پور کی طرف جارہی تھی۔ وہ اس پر سوار ہو گیا اور دو چار منٹ کے

اندر ہی پال پور کی مغربی سمت تایا کے ڈیرے کے پاس اُتر گیا۔

تائے کا ڈیرا گھنے درختوں میں تھا۔ شام کے وقت یہاں کافی رونق ہوتی تھی لیکن یہ تو سویرا سویرا تھا۔ اسے درختوں میں بس اکا دکا بندے ہی کام کرتے نظر آئے۔ ابھی وہ ڈیرے کے مین دروازے سے تیس چالیس قدم دور ہی تھا کہ اسے تائے کا خاص کارندہ نظر آیا۔ انور ایک طرح سے ڈیرے کا نگران بھی تھا۔

''کیا حال ہے انورے؟'' عادل نے پوچھا۔

''ٹھیک ٹھاک ہوں عادے صاحب! آپ یہاں کیسے؟'' اس نے چادر کی بکل درست کرتے ہوئے کہا۔

''بس تایا جی کو سلام کرنے آیا تھا۔ وہ اندر ہی ہیں نا؟''

''ہاں آئے تو تھے لیکن چلے گئے ہیں۔ باغیچے والے احاطے کی طرف۔''

''باغیچے والا احاطہ!'' عادل نے پوچھا۔

''آہو جی، یہ نیا احاطہ بنوایا ہے نا چودھری صاحب نے۔ آموں کے باغ کے اندر ہے...... آپ نے جانا ہے تو میں لے چلتا ہوں۔''

''چلو۔'' عادل نے کہا۔

وہ انور کے ساتھ درختوں کے نیچے سے گزرتا آموں والے گھنے باغ کی طرف چل دیا۔ برسات کی وجہ سے کہیں کہیں پانی کھڑا تھا۔ وہ ایک تنگ پگڈنڈی سے تھوڑا سا چکر کاٹ کر گئے جلد ہی باغ کے بیچوں بیچ عادل کو ایک اونچی چار دیواری نظر آئی...... اندر ایک دو کمرے بھی تھے۔ یہ ساری نئی تعمیر تھی...... اور پچھلے چار پانچ مہینوں میں ہی ہوئی تھی۔ لوہے کے ایک دروازے کے پاس پہنچ کر انور رُک گیا۔ اس نے شلوار کی جیب میں سے چابیوں کا گچھا نکالا اور مقفل دروازہ کھولنے لگا۔ اس موقع پر عادل کو کچھ عجیب سا لگا۔ لیکن اس سے پہلے کہ عادل کچھ سوچتا یا کسی طرح کا ردِعمل ظاہر کرتا، انور نے کہا۔ ''ادھر پانی کھڑا ہے نا۔ اس لیے ہم پچھلے دروازے سے آئے ہیں، آپ چلے جاؤ اندر......''

''عادل دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا۔ یہ احاطہ تین چار کینال میں ہوگا۔ آموں سے لدے ہوئے بے شمار درخت یہاں موجود تھے۔ کئی درختوں پر بڑے بڑے جھولے ڈالے گئے تھے۔ عادل نے حیران نظروں سے دیکھا۔ شہزادی اور اس کی دو سہیلیاں جھولے جھول رہی تھیں۔ دونوں سہیلیاں اٹکھیلیاں کر رہی تھیں جبکہ شہزادی قدرے خاموش اور کھوئی کھوئی سی ایک بے حرکت جھولے پر بیٹھی تھی۔ اس کا دوپٹا گلے میں تھا۔ لمبے بال کمر پر لہرا رہے تھے۔ ہلکے گلابی رنگ کی شلوار قمیص میں وہ ایک حسین تصویر کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ آج عادل نے اسے کئی ماہ کے بعد دیکھا تھا۔ وہ جیسے سکتہ زدہ سا اسے تکتا رہ گیا۔ پھر وہ سب کچھ بھول کر بے ساختہ چند قدم آگے بڑھا...... لڑکیوں نے اسے دیکھا۔ وہ چلاتی ہوئی اس درخت کی طرف بھاگیں جہاں ان کے دوپٹے لٹک رہے تھے۔ انہوں نے دوپٹے سروں پر لیے۔ شہزادی جھولے سے اُتر آئی تھی مگر اسی طرح ساکت کھڑی تھی۔ اس کی منتظر آنکھوں میں جیسے دیپ سے جل اُٹھے تھے۔ چند لمحوں کے لیے لگا جیسے وہ اپنے گرد و پیش کو فراموش کر کے اس کی طرف لپکے گی اور اس کے سینے سے لگ جائے گی۔ لیکن پھر ایک دم اس کے تاثرات بدلے۔ حسین چہرے پر حیرانی اور خوف کی یلغار ہوئی۔

''عادل! تم یہاں؟'' وہ لرزاں آواز میں بولی۔

عادل بھی جیسے یکا یک ہوش میں آیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ عقب میں چار دیواری کا آہنی دروازہ بند ہو چکا تھا۔ انور بھی دکھائی نہیں دیا۔

''تم...... یہاں...... کیوں آئے ہو؟'' اس مرتبہ شہزادی کی آواز میں خوف کے ساتھ ساتھ غصہ بھی تھا۔ وہ بغیر دوپٹے کے تھی۔ اس نے اپنے بازو موڑ کر اپنے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ عقب میں دونوں لڑکیاں بھی سکتہ زدہ سی کھڑی تھیں۔

اس سے پہلے کہ عادل جواب میں کچھ کہتا، چار دیواری کا سامنے والا پھاٹک ایک دم کھلا اور چار پانچ بندے تیزی سے اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک کے کندھے سے رائفل جھول رہی تھی، باقی کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ عادل نے پہچان لیا، یہ تایا فراست کے کارندے تھے۔ ان کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ لڑکیوں کے چلانے کی آواز سن کر اندر آئے ہیں۔ وہ عادل کو شہزادی کے قریب کھڑے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ رائفل والے کا نام مشتاق تھا اور عادل اسے جانتا تھا۔ وہ چند قدم آگے آیا اور کڑے تیوروں کے ساتھ بولا۔ ''اوئے عادے! تُو یہاں؟''

عادل نے سنبھل کر کہا۔ ''میں یہاں تایا جی سے ملنے آیا تھا......''

مشتاق پھنکارا۔ ''یہ عورتوں کا احاطہ ہے، تایا جی یہاں، کہاں سے آ گئے؟''

''مم...... مجھے انورے نے کہا ہے، تایا جی یہاں ہیں۔''

''یہ بکواس کر رہا ہے۔'' ایک دوسرا کارندہ گرج کر بولا۔ ''اس کی نیت ٹھیک نہیں...... کمینہ، چوروں کی طرح گھسا ہے اندر۔''

''اوئے...... پالتو کتے...... زبان سنبھال کر بات کر۔'' عادل کے سینے میں چمکتی ہوئی چنگاریاں شعلہ بن گئیں۔

''پکڑو اسے۔'' مشتاق گرجا۔

مشتاق اور اس کے ساتھی غضبناک ہو کر اس پر جھپٹے۔ یہ سب کچھ عادل کے لیے نیا نہیں تھا۔ وہ ایسے بہت سے مرحلوں سے گزر چکا تھا اور اب برف پوش پہاڑوں کی سختیاں جھیلنے کے بعد تو وہ اور بھی پتھریلا ہو چکا تھا۔ بالکل کڑک۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹا۔ لاٹھی کے دو وار اس نے جھک کر بچائے۔ پھر اس نے ایک لاٹھی بردار کے منہ پر سر کی طوفانی ٹکر رسید کی۔ وہ کئی قدم پیچھے جا گرا۔ عادل نے لاٹھی بھی اس کے ہاتھ سے چھین لی تھی۔ اگلے دو تین منٹ میں تایا کے کارندوں سے اس کی زوردار لڑائی ہوئی۔ لاٹھی ٹوٹ گئی تو عادل نے انہیں گھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا۔ اس کے چھریرے جسم میں برق کوند رہی تھی۔ تائے کا ایک کارندہ تو تختہ تڑوا کر پشت کے بل گر پڑا تھا، دوسرا سر پر چوٹ لگنے سے مکمل بیہوش تھا۔ باقی تینوں لڑ تو رہے تھے لیکن ہکا بکا بھی تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو مدد کے لیے پکار رہے تھے۔ لڑکیوں کے چلانے کی آوازیں بھی عادل کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ پھر احاطے کا عقبی دروازہ دھماکے سے کھلا اور فربہ اندام انور تین چار ساتھیوں کے ساتھ دوڑتا ہوا اندر آیا۔ اس نے پیچھے سے عادل کے سر پر ہاکی کا زوردار وار کیا۔ عادل گھٹنوں کے بل گر گیا۔ تائے کے کارندے اس پر پل پڑے۔ وہ اسے لاٹھیوں سے بے دریغ پیٹنے لگے۔ عادل ان آہنی بالٹیوں پر گرا جن میں آم ٹھنڈے کرنے کے لیے رکھے گئے تھے۔ اس کے سینے پر شدید چوٹ آئی۔ شہزادی کی چلاتی ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ دور کھڑی اپنے نوکروں کو پکار رہی تھی۔ ''چھوڑ دو اسے...... نہ مارو۔ مر جائے گا...... چھوڑ دو......''

عادل نے اپنا سر نیچے جھکا کر دونوں بازوؤں میں چھپالیا تھا تا کہ کم سے کم چوٹ لگے لیکن چوٹیں تو جسم کے ہر حصے پر لگ رہی تھیں۔ سر سے رِسنے والا خون اس کے سامنے کچی زمین پر ٹپک رہا تھا۔ جو پستول وہ قمیص کے نیچے لگا کر لایا تھا، وہ گر چکا تھا اور کارندوں نے اُٹھالیا تھا پھر اس نے شہزادی کے بڑے بھائی قاسم کی گرج دار آواز سنی۔ ''کیا ہوا ہے؟ یہ کیسے آیا یہاں؟''

نڈھال عادل کو مشتعل کارندوں نے دبوچ کر کھڑا کر دیا۔ وہ چیونٹیوں کی طرح اس سے چمٹے ہوئے تھے۔ مشتاق ہانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''قاسم بھائی! یہ پچھلے دروازے سے پتا نہیں کس طرح اندر آ گیا ہے۔ یہاں بیبیاں پینگ جھول رہی تھیں۔''

عقب سے انور کڑک کر بولا۔ ''میں بتاتا ہوں جی یہ کس طرح آیا ہے۔ اس نے زبردستی کی ہے میرے ساتھ۔ پستول سیدھا کیا ہے میری طرف۔ یہ دیکھیں جی۔ یہاں پستول کا دستہ مارا ہے اس نے......'' انور نے اپنے پھٹے گریبان میں سے اپنی چھاتی دکھائی۔

عادل ہکا بکا تھا۔ اس نے اپنے منہ میں جمع ہو جانے والا خون ایک طرف تھوکا اور انور کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''یہ جھوٹ بولتا ہے، میں یہاں تایا جی سے ملنے آیا تھا۔ اس نے کہا تھا تایا جی یہاں احاطے میں ہیں۔''

''میں نے اس سے ایسی کوئی بات نہیں کی جی۔'' فربہ اندام انور ڈھٹائی سے بولا۔ ''اس نے مجھ سے زبردستی پچھلا دروازہ کھلوایا اور دھمکی دی کہ اگر میں نے کسی کو بتایا تو میری اور میرے بچوں کی خیر نہیں۔''

عادل کے سینے میں آگ سی بھڑکنے لگی۔ انور اس کے منہ پر سفید جھوٹ بول رہا تھا۔ '' ی، کتے میں جان سے ماردوں گا تجھے......'' عادل نے کہا اور مچل کر خود کو کارندوں سے چھڑانا چاہا۔ زخمی ہونے کے باوجود اس کے لچک دار جسم میں غیر معمولی توانائی تھی۔ قریب تھا کہ وہ خود کو کارندوں سے چھڑا لیتا اور انور پر جا پڑتا کہ کارندوں نے زور مار کر اسے اوندھے منہ گرا دیا۔ گرتے گرتے بھی اس نے انور کے منہ پر ایسا زوردار جھانپڑ مارا کہ وہ اُچھل کر آموں کے ایک ڈھیر پر جا گرا۔ اس کی ناک سے خون کی دھار بہہ نکلی تھی۔ کارندے ایک بار پھر عادل پر پل پڑے۔ شہزادی کی آواز اب سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید دوسری لڑکیاں اسے کھینچ کر کہیں اندر لے گئی تھیں۔ قاسم خود بھی عادل کو مارنے والوں میں شامل ہو گیا۔ عادل کو اس کے ہاتھوں میں سیاہ ریوالور نظر آیا۔ اس نے ریوالور سے عادل کی گردن پر ایک زوردار ضرب لگائی تو عادل کو لگا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے دھندسی چھانے لگی ہے۔ قاسم کی زہریلی پھنکار اس کے کانوں میں پڑی۔ ''ماردو کتے کو...... جان سے ماردو۔''

یہی وقت تھا جب ایک اور گرجتی ہوئی آواز عادل کی سماعت سے ٹکرائی...... ''رُک جاؤ...... یہ کیا ہو رہا ہے؟ رُک جاؤ۔'' یہ تایا فراست کی آواز تھی۔

عادل زمین پر اوندھا پڑا تھا۔ اس کی نئی قمیص تار تار ہو چکی تھی۔ پانچ چھ کارندوں نے اسے دبوچ رکھا تھا۔ تایا فراست نے آگے بڑھ کر عادل کو دیکھا اور پھر بولے۔ ''چھوڑ دو اسے...... پیچھے ہٹ جاؤ۔''

قاسم نے کہا۔ ''ابا جی! یہ خبیث اپنے ہوش میں نہیں ہے، خون چڑھا ہوا ہے اس کے سر کو۔'' پھر وہ مشتاق سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اس کے ہاتھ پاؤں باندھو رسی سے۔''

تایا فراست نے ذرا توقف سے کہا۔ ''نہیں، اس کی لوڑ نہیں۔ میں دیکھتا ہوں کتنی گرمی ہے اس کے دماغ میں۔ چھوڑ دو اسے...... پیچھے ہٹ جاؤ۔''

قاسم اور مشتاق نے ایک بار پھر اعتراض کیا۔ بہرحال فراست کے حکم پر پیچھے ہٹ گئے۔ ریوالور ابھی تک قاسم کے ہاتھ میں تھا۔ باقی کارندوں نے بھی عادل کو چھوڑ دیا۔ وہ اپنے چکراتے ہوئے ذہن کو سنبھال کر کھڑا ہو گیا۔ خون مسلسل اس کے سر اور منہ سے رِس رہا تھا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''دیکھ لو تایا جی! میں آپ سے ملنے آیا تھا اور میرا یہ حال کیا ہے ان لوگوں نے۔ پیچھے سے وار کیا ہے انہوں نے...... مرد ہوتے تو سامنے سے آتے۔ اب بھی مرد ہیں تو سامنے سے آئیں......''

''اوئے۔ تیری مردانگی کی ایسی تیسی......'' قاسم پھر مشتعل ہو کر عادل کی طرف بڑھا لیکن تایا فراست نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا۔

انہوں نے ساری صورتِ حال کو بھانپ لیا تھا۔ وہ انور کا پھٹا ہوا گریبان اور زخمی سینہ بھی دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے بیٹے قاسم کو باہر جانے کا کہا پھر عادل، انور اور مشتاق کو اپنے ساتھ لیا اور احاطے کے ایک کمرے میں آ گئے۔ دروازہ بند کر کے انہوں نے اصل صورتِ حال جاننے کی کوشش کی۔ انور جھوٹ بول رہا تھا اور بڑی ڈھٹائی سے بول رہا تھا۔ مشتاق بھی حتیٰ الامکان اس کی مدد کرنے میں مصروف تھا۔ عادل نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی لیکن ساری باتیں اس کے خلاف جا رہی تھیں۔ آٹھ دس منٹ بعد تایا فراست نے انور اور مشتاق کو بھی باہر بھیج دیا۔ عادل ایک پرانے کپڑے سے بار بار سر اور ہونٹوں سے بہنے والا خون پونچھ رہا تھا۔ اس نے اپنی تار تار قمیص نوچ کر پھینک دی تھی، اب اس کے جسم پر صرف بنیان اور پتلون تھی۔

تایا فراست کی پیشانی پر بے شمار بل نظر آنے لگے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی عادے! تم نے اپنی عزت کا پاس کیا، نہ میری عزت کا۔''

''میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں تایا جی! یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں...... ڈراما کر رہے ہیں۔ اگر ایسی بات ہوتی تو......''

''دیکھ، چور نالے چتر والا کام نہ کرو۔ شرمندہ ہونے کے بجائے تم اُلٹا دوسروں کو الزام دے رہے ہو۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔''

''تایا جی! اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہوتی تو میں ہاتھ جوڑ کر آپ سے معافی مانگ لیتا لیکن جب میں نے کچھ کیا ہی نہیں تو شرمندہ کس بات پر ہو جاؤں؟''

''نہیں، تمہیں شرمندہ ہونے کی نہیں...... پنڈ میں سینہ تان کر چلنے کی ضرورت ہے۔ بہت کچھ کر کے آئے ہو تم شہر سے بھی۔'' تایا فراست نے سخت طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''وہاں کباڑ اور ردیاں بیچ رہے ہو اور پنڈ میں مشہور کر رہے ہو کہ لاکھوں کی کمائیاں ہیں اور وہ ماں تمہاری مبارکبادیں وصول کرتی پھرتی ہے لوگوں سے...... بتاؤ مجھ کو ان چھ سات مہینوں میں کون سا پہاڑ توڑا ہے تم نے؟ کون سی توپ چلائی ہے اور جو آگے جا کر ہونا ہے، وہ بھی سب اندازہ ہے ہم کو۔''

''تایا جی! میں جو کچھ کر رہا ہوں، وہ مجھے پتا ہے اور میرے اللہ کو۔ اور مجھے اللہ سے پوری امید ہے کہ وہ میری محنت

کا صلہ مجھے ضرور دے گا۔ میں اپنی حق حلال کی کمائی لا کر آپ کے سامنے رکھوں گا...... لیکن...... لیکن شاید آپ کو یقین نہیں۔ اسی لیے آپ کے گھر میں وہ ہو رہا ہے جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کم از کم آپ کے ہوتے ہوئے تو ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا۔ آپ نے زبان دی ہوئی ہے۔''

''کیا ہو رہا ہے میرے گھر میں؟ کیا گل کر رہے ہو تم؟'' تایا فراست تنک کر بولے۔

''تایا جی! مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کے گھر میں...... رشتے کی بات ہو رہی ہے۔''

''کس کے رشتے کی؟''

''شہزادی کے رشتے کی، چودھری مختار کے بیٹے کی طرف۔ پورے پنڈ میں یہ بات پھیلی ہوئی ہے کہ اندر خانے آپ لوگوں نے...... ہاں کر دی ہے۔'' عادل نے دل کڑا کر کے کہہ دیا۔

تایا فراست کا چہرہ سرخ انگارہ ہو گیا۔ پہلے تو لگا کہ وہ بہت تند و تیز بولیں گے لیکن پھر انہوں نے خود کو سنبھالا اور عادل کی طرف انگلی اُٹھا کر بولے۔ ''دیکھ عادے! زبان سنبھال کر بات کر...... اور میں تیرے منہ سے بار بار اپنی دھی کا نام بھی سننا نہیں چاہتا۔ کوئی حق نہیں ہے تجھے اس طرح گل کرنے کی۔''

عادل نے ڈرے بغیر کہا۔ ''تایا جی! یہ میرے سوال کا جواب تو نہ ہوا۔ کیا آپ نے واقعی رشتے کے سلسلے میں چودھریوں کو ''ہاں'' کہہ دی ہے؟''

تایا فراست نے اپنی پگڑی کا اونچا شملہ درست کرتے ہوئے کہا۔ ''یہاں اب تک ایسی کوئی گل نہیں ہوئی تھی پر اب ہو گی...... اب ہو گی۔ جو زبان ہوئی تھی اس سے تُو خود پھرا ہے۔ تُو نے کہا تھا میں شہزادی سے کوئی واسطہ نہیں رکھوں گا۔ پر آج تُو چوری چھپے یہاں گھسا ہے۔ بے حیائی دکھائی ہے تُو نے۔ اب میں بھی کسی وعدے کا پابند نہیں ہوں اور ان چھ مہینوں میں دیکھ بھی لیا ہے میں نے کہ آگے چل کر تُو نے کون سا دلی فتح کرنا ہے۔''

غم و غصے سے اور بے بسی کی شدت سے عادل کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ اس نے تایا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تایا جی! میں اپنی ماں کے سر کی قسم کھاتا ہوں، میں یہاں صرف آپ سے ملنے آیا تھا۔ ان لوگوں نے کسی کے کہنے پر ناٹک کیا ہے، مجھے پھنسایا ہے...... اور اگر آپ کو اب بھی یقین نہیں تو پھر......'' وہ فقرہ ادھورا چھوڑ کر تیزی سے دیوار کی طرف بڑھا۔ یہاں ایک تھری ناٹ تھری رائفل جھول رہی تھی۔ اس نے تیزی سے یہ ڈبل بیرل رائفل اُتاری۔ تایا فراست اضطراری طور پر ایک قدم پیچھے ہٹے...... لیکن عادل نے رائفل کو اُلٹا کر اس کا دستہ تایا کی طرف بڑھایا اور نال اپنے سینے پر رکھ لی۔ ''اب بھی یقین نہیں تو پھر مجھے گولی مار دیں۔ میں اپنا خون آپ کو معاف کرتا ہوں۔ خدا کے واسطے، گولی مار دیں مجھے۔'' اس نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔

تایا فراست کے چہرے پر غصے کی سرخی کچھ کم تو ہوئی لیکن ماتھے کی تیوریاں برقرار رہیں۔ اگلے پانچ دس منٹ میں تایا اور بھتیجے کے درمیان تند و تیز گفتگو ہوئی۔ تایا فراست کا کہنا تھا کہ وہ خیالی پلاؤ پکانے والوں میں سے نہیں ہیں۔ ایک بے کار امید کے سہارے وہ اپنی بیٹی کو دیر تک گھر میں نہیں بٹھا سکتے۔ انہیں ابھی سے اندازہ ہو گیا ہے کہ اس انتظار کا نتیجہ کیا نکلنا ہے۔

عادل کی منت سماجت کے جواب میں تایا نے بس اتنا کہا کہ وہ اس سال کے آخر تک دیکھیں گے۔ اگر انہیں کوئی

امید نظر آئی تو ٹھیک ہے، ورنہ وہ کہیں نہ کہیں شہزادی کی بات طے کر دیں گے۔ ان کا لہجہ بالکل حتمی تھا اور وہ مزید کوئی بات سننا نہیں چاہتے تھے۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اب جلد از جلد اپنے دیئے ہوئے قول سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔ آخر میں انہوں نے عادل کو ہدایت کی کہ موجودہ حالات میں اس کا یہاں رُکنا ٹھیک نہیں۔ وہ آج رات ہی ماں کو لے کر یہاں سے چلا جائے۔

O......❖......O

تایا کی زمین سے عادل خود ہی زخمی ہو کر نہیں آیا تھا، اس کا دل بھی زخمی تھا۔ یوں لگتا تھا کہ سینے کے اندر خون ٹپک رہا ہے۔ ڈھائی سال کی بقایا مہلت اب گھٹ کر چھ سات ماہ رہ گئی تھی۔ گاؤں میں اس کی جو بے عزتی ہوئی اور جو زخم اسے لگے وہ علیحدہ تھے۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ سب کچھ چودھری مختار کا کیا دھرا ہے۔ چودھریوں نے اس کے لیے یہاں سازشوں کا جال بچھایا ہوا تھا۔ شاید تایا فراست نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ فی الحال یہاں سے چلا جائے، کہیں کوئی ایسی گڑبڑ نہ ہو جائے کہ وہ خود بھی اسے سنبھال نہ سکیں۔

گاؤں میں اس واقعے کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جا رہا تھا۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ باغ میں موجود کارندوں نے عادل کو ننگا کر کے مارا ہے اور اس نے معافیاں مانگ کر اپنی جان چھڑائی ہے۔ کچھ کا کہنا تھا کہ وہ شہزادی کو اغوا کرنے کی نیت سے نئے احاطے میں داخل ہوا اور شہزادی کے شور مچانے پر پکڑا گیا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ گھر میں ماموں طفیل اور ممانی بھی بالکل گم صم تھے۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ وہ دریا میں رہ کر مگرمچھوں سے بیر نہیں رکھ سکتے۔ اس لیے وہ ماں بیٹا جلد سے جلد یہاں سے نکل جائیں۔

کرنے کو تو عادل بہت کچھ کر سکتا تھا۔ اگر وہ ایک بار چودھری مختار کی حویلی میں گھس جاتا تو پھر وہاں دو چار لاشیں تو ضرور گر جاتیں لیکن ابھی اسے تحمل سے کام لینا تھا۔ سرمد صاحب کے یہ الفاظ بھی بار بار اس کے کانوں میں گونجتے تھے۔ ''غم و غصے کو برداشت کرنا بھی ان تکلیفوں کے زمرے میں آتا ہے جن کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہم اسی فرد یا افراد کو اپنے غم و غصے کا نشانہ بنائیں جن کی وجہ سے ہم مشتعل ہوئے ہیں۔ ہم اپنے غم و غصے کا رُخ کسی اور طرف موڑ کر بھی اپنا بدلہ چکا سکتے ہیں۔ جیسے کلاس میں مانیٹر کے ہاتھوں بے عزت ہونے والا لڑکا، مانیٹر سے لڑنے کے بجائے زیادہ محنت سے پڑھائی کر کے اور امتحان میں مانیٹر کو نیچا دکھا کر اپنا بدلہ چکا سکتا ہے۔''

سرمد صاحب کی ایسی ہی باتیں سننے والے کے دل میں اُتر جاتی تھیں اور اس کی اندرونی کیفیت کو بدل ڈالتی تھیں۔

رات کو عادل خاموشی سے پھر انہی درختوں میں پہنچا تھا جہاں ایک جھنڈ کے درمیان خالی جگہ پر گاؤں کے لڑکوں نے اکھاڑا سا بنا رکھا تھا۔ یہاں نوری نت کا وہ پھٹا پرانا پتلا بھی تھا جس پر لڑکے گھونسا بازی کیا کرتے تھے۔ عادل کے سینے میں جیسے آگ سی بھڑک رہی تھی۔ یہ آگ کسی اور طرف کا رخ کرتی تو یقیناً بہت کچھ بھسم ہو جاتا...... اس نے اس آگ کا رُخ نوری نت کے پتلے کی طرف کر دیا۔ وہ دیر تک اس پر مکا بازی کرتا رہا۔ دھائیں دھائیں کی آوازوں سے رات کی خاموش تاریکی میں ارتعاش پیدا ہوتا رہا۔ اس کے بازو شل ہو گئے۔ ٹانگیں بے جان محسوس ہونے لگیں لیکن وہ لگا رہا۔ سانس اب سینے میں سما نہیں رہی تھی۔ پسینہ دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا۔ یہی پسینا اس کے اندر کی آگ پر گر کر

اسے ماند بھی کر رہا تھا۔ وہ رُکا نہیں بلکہ تھک کر گر گیا۔ آج صبح جو چوٹیں اس کے جسم پر لگی تھیں، ان سے پھر خون رسنے لگا تھا۔

قدموں کی مدھم آواز نے اسے چونکایا۔ یہ شاہد تھا، اس کے بچپن کے ساتھیوں میں سے ایک۔ عادل اُٹھ بیٹھا۔ شاہد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اُٹھایا اور گلے سے لگایا۔ شاہد آبدیدہ تھا۔ آج صبح پال پور میں باغ کے اندر عادل کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس نے عادل کے سارے یار دوستوں کو سخت غمزدہ کر دیا تھا۔ شاہد نے عادل کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''عادے! ہم سب جانتے ہیں یہاں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ لمبو ناصر اپنے باپ چودھری مختار کے ساتھ مل کر شہزادی کو تجھ سے چھیننا چاہتا ہے۔ وہ تجھے اتنا بےعزت کر دینا چاہتے ہیں کہ تُو دوبارہ پنڈ کا رُخ ہی نہ کرے۔ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔''

''کیا کرو گے تم؟'' عادل نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''تم کہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ میں نے کوڈو اور سلمان سے بھی بات کی ہے۔ ہم اس ی ناصر کی ٹانگیں توڑ کر کھیتوں میں پھینک دیں گے...... یا ویسے ہی غائب کر دیتے ہیں اس لمڈھینگ کو۔''

عادل نے گہری سانس لی۔ ''نہیں شاہد! یہ تو بڑا کمزور سا جواب ہوگا۔ میں ناصر کو جواب ضرور دوں گا پر کسی اور ڈھنگ سے۔ یہ وقتی ہار ہے، آخری جیت ہماری ہی ہوگی۔''

''لیکن تُو کیا کرے گا عادے! تُو ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ بڑی اونچی ہواؤں میں ہیں۔ ان کے غنڈوں کے پاس بڑا پیسا آ گیا ہے۔ بندے اب کیڑے مکوڑے نظر آتے ہیں ان کو۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا یار! تم لوگ فکر نہ کرو۔'' عادل نے آبدیدہ شاہد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اس رات، دن کا اُجالا پھیلنے سے پہلے پہلے عادل اپنی ماں کو لے کر خاموشی سے لالی گاؤں سے نکل آیا تھا۔ جب دیہاتی تانگا ماں بیٹے کو لے کر پکی سڑک کی طرف روانہ ہو رہا تھا، عادل کو دور پال پور میں تایا کی حویلی کے اونچے برج نظر آئے تھے۔ ان برجوں کے نیچے کسی کمرے میں اس کی شہزادی سو رہی تھی۔ اس کے کانوں میں شہزادی کی وہ درد بھری آواز گونجنے لگی جو کل لڑائی کے دوران میں سنائی دی تھی۔ ''چھوڑ دو اسے...... نہ مارو...... مر جائے گا...... چھوڑ دو۔''

کیسی بے بسی، تڑپ تھی اس آواز میں۔ وہ جانتی تھی، وہ اسی کے لیے زخم کھا رہا ہے۔ اسی کے لیے دربدر ہو رہا ہے۔ عادل نے حویلی کے برجوں کے پیچھے آسمان پر وہ ہلکی ہلکی روشنی دیکھی جو سورج طلوع ہونے سے پہلے نمودار ہوتی ہے۔ اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں کہا۔ ''شہزادی...... رات کتنی بھی لمبی ہے...... لیکن تیرے آنسوؤں کی قسم...... صبح ضرور آئے گی۔''

○......❖......○

ماں کو گوجرانوالہ میں چھوڑ کر عادل اپنے دوست صادق کے پاس لاہور پہنچ گیا۔ اپنی چوٹوں کے بارے میں عادل نے صادق کو بس اتنا بتایا کہ راستے میں کچھ لڑکوں سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ وہ دونوں رات بھر اپنے کام کے بارے میں بات کرتے رہے۔ صادق کا خیال تھا کہ کباڑ کے کام کو پرانی مشینری کی خرید و فروخت کے کام میں بدل دیا جائے لیکن ظاہر ہے کہ اس کے لیے بھی رقم کی ضرورت تھی۔ کم از کم آٹھ دس لاکھ کا سرمایہ تو شروع میں ہونا ہی چاہیے تھا۔

اگلے روز عادل کا دل چاہا کہ سرمد صاحب کو فون کر کے ان کی خیر خیریت دریافت کرے لیکن پھر نہ جانے کیوں ایک جھجک سی آڑے آ گئی۔ اس کے ذہن میں آیا کہ کہیں سرمد صاحب یہ نہ سمجھیں کہ بار بار حال پوچھنے کے بہانے وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ سرمد صاحب اسے کیا کام سونپنے والے ہیں اور اس سے کیا مالی فائدہ حاصل ہونے والا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس نے ہمایوں کو فون کر لیا اور ان سے سرمد صاحب کا حال چال پوچھ لیا۔ وہ ابھی تک مکمل بیڈ ریسٹ پر تھے۔ اکثر رات کو ٹانگ میں درد محسوس کرنے لگتے تھے۔ تاہم حسبِ عادت پین کلر وغیرہ نہیں لیتے تھے۔ کرسٹل بھی یہیں لاہور میں موجود تھی اور تندہی سے سرمد صاحب کی تیمارداری کر رہی تھی۔

عادل کو صادق کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ صنعتی نمائش میں کھجور کے تنوں پر چڑھنے والا کھیل آج کل پھر پیش کیا جا رہا ہے لیکن لاہور میں نہیں کسی اور شہر میں۔ اس کھیل کے لیے رانا سیٹھ نے پھر چودھری مختار کے کارندے حبشی سے رابطہ کر رکھا تھا۔ اس بارے میں تفصیلی معلومات رانا سیٹھ کے کیمرا مین ابرار کے پاس تھیں۔ عادل کو معلوم ہوا کہ ابرار انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں کوئی پارٹ ٹائم جاب بھی کر رہا ہے۔ شام کے وقت عادل، ابرار سے ملنے ہی انٹر کانٹی نینٹل گیا تھا لیکن وہاں ابرار سے ملاقات نہیں ہو سکی...... ہاں کسی اور سے ہو گئی اور یہ بڑی سنسنی خیز ملاقات تھی۔ ہوٹل کے مین ڈائننگ ہال سے گزرتے ہوئے عادل کی نگاہ اچانک ایک گوشے کی میز کی طرف اُٹھ گئی۔ وہاں کی مدھم روشنی میں اسے خوبرو کرسٹل بیٹھی نظر آ گئی۔ اس کے ساتھ جو غیر ملکی نوجوان بیٹھا تھا، وہ یقیناً وہی ''لیوپڈ'' نامی فرینڈ تھا جس نے ایبٹ آباد کے ہوٹل میں کرسٹل سے بدتمیزی کی تھی۔ کرسٹل نے عادل کی طرف دیکھا۔ ذرا سا چونکی لیکن پھر انجان بن گئی۔ عادل سمجھ گیا کہ وہ جان پہچان ظاہر کرنا نہیں چاہتی۔ یقیناً لیوپڈ نے عادل کو دیکھا تھا لیکن وہ چونکہ عادل کو جانتا نہیں تھا لہٰذا اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ ان دونوں کو دیکھ کر عادل بھی ایک قریبی میز پر جا بیٹھا۔ یہاں سستا ترین آرڈر تو کولڈ ڈرنک کا ہی ہو سکتا تھا۔ عادل نے یہی آرڈر دیا اور خوامخواہ اپنے موبائل فون سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔

اس ہال میں بیشتر میزیں خالی پڑی تھیں۔ ہلکا میوزک پلے ہو رہا تھا۔ عادل کن انکھیوں سے دیکھتا رہا۔ کرسٹل اور لیوپڈ نارمل موڈ میں ہی باتیں کر رہے تھے۔ ان کے سامنے آئس کریم اور جوسز وغیرہ رکھے تھے۔ بہرحال کچھ دیر بعد عادل کو یوں لگا جیسے ان کی گفتگو میں تلخی آتی جا رہی ہے۔ کرسٹل کا رنگ بدل گیا تھا اور لیوپڈ بھی ہاتھ ہلا ہلا کر باتیں کر رہا تھا۔ گاہے بگاہے وہ اپنے سر کو جھلاہٹ آمیز انداز میں ہلاتا بھی تھا۔ اس کے مقابلے میں کرسٹل کا لہجہ کچھ دبا دبا تھا۔ پھر اچانک تلخی بڑھ گئی۔ لیوپڈ کے بولنے کی آواز عادل کے کانوں تک پہنچنے لگی لیکن الفاظ بالکل سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ چند سیکنڈ بعد لیوپڈ بڑے غصیلے انداز میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی کرسی کو ہلکی سی ٹھوکر ماری اور پاؤں پٹختا ہوا لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ کرسٹل نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ رُکا نہیں۔

کرسٹل کچھ دیر گم صم بیٹھی رہی۔ اس نے سفید پینٹ کے اوپر نفیس سی ہاف سلیو شرٹ پہن رکھی تھی۔ سنہری مائل بال شانوں پر جھول رہے تھے۔ وہ ابھی تک عادل سے لاتعلق بنی ہوئی تھی۔ آخر اس نے میز پر رکھا ہوا اپنا موبائل فون اُٹھایا اور کسی سے رابطہ کرنے لگی۔ اس نے تین چار بار کوشش کی مگر رابطہ نہیں ہو سکا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ لیوپڈ سے ہی رابطہ کر رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے گہری سانس لی اور ہارے ہوئے سے انداز میں اُٹھ کر لفٹ کی طرف بڑھ گئی۔ یقیناً وہ لیوپڈ کے پیچھے ہی گئی تھی۔ عادل نے لیوپڈ کو لفٹ کے ذریعے سیکنڈ فلور پر جاتے دیکھا تھا۔ کرسٹل بھی سیکنڈ

فلوز پر ہی جا رہی تھی۔ عادل تیزی سے سیڑھیوں کی طرف لپکا اور کرسٹل کے پہنچتے پہنچتے وہ بھی سیکنڈ فلور پر پہنچ گیا۔ کرسٹل اس کی آمد سے بے خبر رہی۔ بہر حال عادل نے اسے کوریڈور میں داخل ہوتے اور پھر ایک کمرے کے دروازے پر ناک کرتے دیکھ لیا۔ وہ واپس آ کر پھر ہال میں بیٹھ گیا اور کولڈ کافی کا آرڈر دے دیا۔ پتا نہیں کیوں اسے اُلجھن سی ہو رہی تھی۔ کرسٹل جس طرح جز بز ہو کر لیوپڈ کے پیچھے اس کے کمرے میں گئی تھی، وہ چونکا دینے والی بات تھی۔ پتا نہیں کہ ان دونوں کے درمیان کیا تعلق تھا جو اس جیسی آزاد اور بے باک لڑکی بے بس نظر آنے لگی تھی۔

اچانک عادل کے فون کی بیل ہوئی۔ وہ ٹھٹک گیا۔ یہ کرسٹل کا نمبر تھا...... وہ اسے کال کیوں کر رہی تھی؟ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ کال ریسیو کی۔ ''ہیلو...... ہیلو۔'' اس نے دو بار کہا۔

دوسری طرف سے کرسٹل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہاں اس کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ غالباً لیوپڈ سے ہی مخاطب تھی...... وہ انگلش میں کہہ رہی تھی...... ''پلیز لیوپڈ! یہ ٹھیک نہیں، تم نے زیادہ ڈرنک کی ہے۔ تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔''

لیوپڈ کی آواز فاصلے سے سنائی دی۔ اس نے دو تین فقرے بولے۔ ان فقروں سے عادل کی سمجھ میں یہی آیا کہ ایک تو وہ نشے میں ہے، دوسرے کرسٹل کو اپنے قریب کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ عادل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ یہ تو ویسی ہی سچویشن تھی جو ایبٹ آباد کے ہوٹل میں سامنے آئی تھی۔

عادل کو اب یہ اندازہ بھی ہوا کہ کرسٹل نے عادل کو اندر کی صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے لیے ہی موبائل فون پر چپکے سے یہ کال کر دی ہے۔ اب موبائل فون شاید اس کے پاس ہی ٹیبل یا تکیے وغیرہ پر رکھا تھا اور آوازیں عادل کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ دونوں میں تند و تیز گفتگو جاری تھی۔ ان کی زیادہ تر انگریزی عادل کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ آوازیں بھی بالکل صاف نہیں تھیں۔ تاہم اتنا اندازہ تو عادل کو ہو گیا کہ لیوپڈ کسی شرط کی بات کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ رہا ہے کہ اس سال بھی اسی نے جیتنا ہے۔ اسے اپنا حریف آس پاس کہیں نظر نہیں آتا۔ اس کی باتوں میں دو تین بار ''نوبل راک'' کا ذکر بھی آیا۔ پتا نہیں کہ یہ نوبل راک کیا بلا تھی۔

ایک بار کرسٹل کی کراہ سنائی دی۔ شاید لیوپڈ نے نشے کی حالت میں اسے سخت ہاتھ لگائے تھے۔ یا پھر ویسے ہی تھپڑ وغیرہ مارا تھا۔ اس کا ایک فقرہ عادل کو صاف سنائی دیا۔ ''کیا میری برتھ ڈے کو تم اتنی زیادہ کنجوسی سے مناؤ گی۔ مجھے بہت مایوس کر رہی ہو تم۔''

چند لمحے بعد کرسٹل کی اشک بار آواز سنائی دی۔ ''لیوپڈ! تم حد سے بڑھ رہے ہو......'' اس نے کچھ اور بھی کہا جو مدھم آواز کے سبب عادل کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اب عادل کے لیے حرکت میں آنا ضروری ہو گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور بذریعہ لفٹ سیکنڈ فلور پر پہنچ گیا۔ لیوپڈ کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے ڈور بیل بجائی۔ چوتھی پانچویں بیل پر دروازہ تھوڑا سا کھلا اور لیوپڈ کا لال بھبوکا چہرہ نظر آیا۔ اس نے عادل کو سر تا پا گھورا۔ ''کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟'' اس نے بڑے کرخت لہجے میں کہا۔

یہی وقت تھا جب عادل کو عقب میں کرسٹل کی جھلک نظر آئی۔ اس کے سنہری بال منتشر تھے۔ شرٹ کے بالائی بٹن ٹوٹے ہوئے تھے۔ اس نے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ لیوپڈ نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ عادل کی نظر سے اوجھل ہو گئی اس سے پہلے کہ لیوپڈ بھنائے ہوئے انداز میں دروازہ بند کر دیتا...... عادل اسے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ وہ لڑکھڑا ا

ایک صوفے پر گرا۔ عادل نے پھرتی کے ساتھ دروازہ اندر سے لاک کر دیا۔

لیوپڈ ایک دم آگ بگولا ہو گیا تھا۔ وہ پچیس چھبیس سال کا نہایت ورزشی جسم والا چست نوجوان تھا۔ غصے میں اس کے رُخسار کا زخم کچھ اور نمایاں نظر آنے لگا تھا اور اس کے ''لک'' کو خطرناک ٹچ دے رہا تھا۔ وہ صوفے پر گرتے ہی مقناطیس کی طرح اس کی طرف آیا۔ اس نے ایک طوفانی گھونسا عادل کے چہرے پر مارنے کی کوشش کی۔ عادل پہلے سے تیار تھا، جھکائی دے کر خود کو صاف بچا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جوابی گھونسا رسید کیا جو عین لیوپڈ کی انگلش ناک پر پڑا۔ وہ تیورا کر کرسٹل کے قدموں میں گرا۔ کرسٹل چلا کر پیچھے ہٹ گئی۔ دروازہ لاک ہو چکا تھا اور چابی عادل کی جیب میں تھی ورنہ وہ شاید کمرے سے بھاگ ہی جاتی۔ عادل نہیں چاہتا تھا کہ ہوٹل میں کسی طرح کا شور شرابا ہو......

چوٹ کھانے کے باوجود لیوپڈ کھڑا ہو گیا اور سر جھکا کر عادل سے لپٹ گیا۔ اس کا جسم کھلاڑیوں جیسا تھا۔ نشے نے اس کے جسم میں اضافی توانائی بھر دی تھی۔ اس نے گالیاں بکتے ہوئے پورا زور لگایا اور عادل سمیت میز پر گرا۔ وہسکی کی بوتل قالین پر لڑھک گئی۔ گلاس چکنا چور ہو گئے۔ ایک چھوٹا سا فریش کریم کیک، عادل کے نیچے مسلا گیا۔ عادل نے لیوپڈ کی ٹانگوں کے درمیان اپنی پنڈلی کی جچی تلی ضرب لگائی پھر سر کی ٹکر سے لیوپڈ کو دور گرا دیا۔ اس کے بعد اس نے شرابی لیوپڈ کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ نوری نت جیسا اصلی بندہ اس کے سامنے تھا۔ عادل نے اس کے چہرے کا نقشہ خراب کر دیا۔ عادل کو ایک ٹیبل لیمپ رسید کرنے کی کوشش میں لیوپڈ اس بُری طرح غیر متوازن ہوا کہ کھڑکی سے ٹکرایا اور اُلٹ کر نیچے جا گرا۔ ایک لمحے کے لیے تو عادل کو یہی لگا کہ شاید وہ دوسری منزل سے گر کر اپنی کھوپڑی تڑوا بیٹھے گا لیکن پھر اس کی تقدیر اس کا ساتھ دے گئی۔ گرتے گرتے بھی اس نے کھڑکی کی چوکھٹ تھام لی اور کسی بازی گر کی طرح ہوا میں جھول گیا۔ اس بات کا پتا تو عادل کو کافی بعد میں چلا کہ وہ واقعی ایک زبردست کوہ پیما ہے...... خالی ہاتھ چٹانوں پر چڑھنے والا۔

عادل نے فوراً اسے کھینچ کر دوبارہ کمرے میں کر لیا۔ تاریکی کی وجہ سے کوئی نیچے سے یہ منظر نہیں دیکھ سکا تھا۔ عادل نے کھڑکی بند کر دی۔ لیوپڈ اب قالین پر لیٹا لمبی لمبی سانس لے رہا تھا۔ اس کا تھوبڑا خون سے رنگین تھا۔ عادل نے اسے دوبارہ اُٹھنے اور کوشش کرنے کی دعوت دی لیکن وہ وہیں پڑا کینہ پرور نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

عادل نے اس کی طرف انگلی اُٹھائی اور سنگین لہجے میں کہا۔ ''بس چپ چاپ یہاں پڑے رہو، اگر پیچھے آئے تو تماشا لگ جائے گا۔ کرسٹل نے دو لفظ بھی کہہ دیئے تو سیدھے لاک اَپ میں پہنچو گے۔''

لگتا تھا کہ بات شرابی لیوپڈ کی سمجھ میں آ گئی ہے۔ کرسٹل ابھی تک تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ایک کندھے پر سے اس کی شرٹ پھٹ بھی چکی تھی۔ بہر حال یہ چاک اتنا نمایاں نہیں تھا۔ عادل نے کرسٹل کو ساتھ لیا اور وہسکی کی بوتل کو نفرت انگیز ٹھوکر مارتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد کرسٹل اور عادل ایم ایم عالم روڈ کے ایک فائیو سٹار ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ عادل کے سر اور ماتھے کی دو دن پرانی چوٹیں دیکھ کر کرسٹل حیران ہوئی تھی۔ عادل نے ان چوٹوں کے بارے میں کرسٹل کو بھی وہی بتایا جو صادق کو بتایا تھا۔ یعنی راہ چلتے کسی سے جھگڑا۔ موسم برسات اپنا آخری زور مار رہا تھا۔ اچانک ہی کالی گھٹائیں چھائی تھیں اور آسمان سے گرج چمک کے ساتھ تابڑ توڑ پانی برسنے لگا تھا...... وہ دونوں یہاں ٹیکسی پر پہنچے تھے۔ کرسٹل نے عادل سے

درخواست کی تھی کہ وہ وہاں ہوٹل میں پیش آنے والے سنگین واقعے کے بارے میں سرمد صاحب کو کچھ نہ بتائے۔ عادل نے وعدہ کرلیا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے پوچھا۔ ''کرسٹل! میری سمجھ میں نہیں آتا جب تم اپنے اس ہم وطن کی خصلت جانتی بھی ہو پھر کیوں اس کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی گئیں؟''

وہ نم آنکھوں کے ساتھ بولی۔ ''اس کا برتھ ڈے ہوتا...... یہ ہام کو مجبور کرتا کہ ہام روم کے اندر جا کر اس کا برتھ ڈے سیلیبریٹ کرے۔''

''لیکن...... تم کیوں مجبور ہوتی ہو؟ کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟ تم نے شاید آج تک مجھے اپنا نہیں سمجھا۔ ورنہ اس طرح اندھیرے میں تو نہ رکھتیں۔''

''نائیں عاڈل! ایسا کبھی مت سوچنا۔''

''تو پھر مجھے بتاؤ۔ شاید میں تمہاری کچھ مدد کرسکوں۔''

''ہام...... کیا بتائے توم کو؟'' وہ اُلجھن زدہ لہجے میں بولی۔

''دیکھو، تمہاری کچھ باتیں میں نے موبائل پر سنی بھی ہیں۔ وہ کسی شرط کی بات کر رہا تھا...... اور شاید یہ بھی کہہ رہا تھا کہ وہ یہ شرط دوبارہ جیتے گا۔ کیا کوئی شرط ہارنے کے بعد تم اس کی مزاحمت نہیں کر پا رہی ہو؟''

''نائیں عاڈل! ہام نے کوئی شرط نائیں لگایا اور نہ ہارا ہے۔ یہ کوئی اور چاکر (چکر) ہے۔ یہ شرط بہت پہلے سے لگتا رہا ہے۔ سنس مینی مینی ایئرز۔''

باہر بادل زور سے گرجے اور بارش کی بوچھاڑیں کچھ اور تیز ہوگئیں۔ ریسٹورنٹ کے ہال میں اکثر میزیں خالی تھیں اور اندر کا ماحول پُرسکون تھا۔

''تمہارا مطلب ہے کرسٹل، یہ کوئی ایسی شرط ہے جو پُرانے وقتوں سے لگائی جارہی ہے اور لیوپڑ کے یہ شرط جیتنے کی وجہ سے تم پر اثر پڑا؟''

''ہاں...... you can say۔ ہام پر اثر پڑا۔''

عادل کے ذہن میں ایک اور خیال چمکا۔ اس نے کہا۔ ''مجھے یاد آیا...... تمہاری اور لیوپڑ کی باتوں میں کسی نوبل راک کا ذکر بھی آیا ہے۔ واٹ اِز دس نوبل راک؟''

کرسٹل کے سفید چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ عادل کو لگا کہ وہ بات ٹالنے کے لیے کوئی بات بنائے گی۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''کہیں یہ کوئی ایسی چٹان تو نہیں جس پر چڑھنے کا مقابلہ ہوتا ہو؟''

کرسٹل ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ عادل اس کے گرد گھیرا تنگ کرتا جارہا ہے اوراب شاید اسے عادل کو کچھ نہ کچھ بتانا ہی پڑے گا۔ اس نے پہلے عادل سے وعدہ لیا کہ وہ اس بارے میں سر سرمد یا ہمایوں ابھی کچھ نہیں بتائے گا۔ ہاں اگر وہ خود کچھ بتائیں تو اور بات ہے۔ عادل نے وعدہ کرلیا۔

گرجتے برستے موسم میں اس ریسٹورنٹ کی مدھم روشنی میں بیٹھ کر کرسٹل نے اس سلسلے میں جو کچھ بتایا، وہ عادل کے لیے کافی حیران کن تھا۔ اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

''سناترا برادری، انگلینڈ کے شاہی خاندان کی ہی ایک شاخ تھی۔ اس میں آگے بیسیوں فیملیز تھیں، گھرانے تھے

چند پشتوں کے بعد ان لوگوں کا شجرہ نسب اٹھارہویں صدی کے جارج دوم سے جاملتا تھا۔ 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد انگریزوں کو ہندوستان پر مکمل تسلط حاصل ہوگیا اور اگلے قریباً نوے سال تک انہوں نے اپنے اس تسلط کو خوب انجوائے کیا۔ لیکن اس سے پہلے بھی انگریز یہاں موجود تھے اور ''انجوائے'' کر رہے تھے۔ یہ اسی ''سنہری دور'' کی بات ہے۔ سناترا برادری کی کچھ فیملیز تفریح کے لیے کے ٹو کے دامنوں تک جاتی تھیں۔ وہاں برف پر مختلف کھیل ہوتے تھے اور موج میلا کیا جاتا تھا۔ وہیں پر ایک خوبصورت عمودی چٹان تھی۔ اس کی اونچائی اپنے اردگرد کی سطح سے کوئی 1800 فٹ تھی۔ یہاں پر انگریز نوجوان خالی ہاتھ چڑھنے کے مقابلے کرتے تھے۔ دھیرے دھیرے مذکورہ فیملیز نے اس چٹان پر چڑھنے کے مقابلے کو مستقل تفریح کی شکل دے دی۔ بتدریج ان مقابلوں نے سناترا برادری میں سالانہ ایونٹ کی شکل اختیار کرلی۔ اس چٹان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہاں تک جانے کا راستہ اگست کے آخر میں ہونے والی دو تین تیز بارشوں کے بعد ہی کھلتا تھا لہٰذا یہ مقابلے نسبتاً خنک موسم یعنی اگست کے آخر یا ستمبر میں ہوتے تھے۔ سناترا برادری کے لوگ مقررہ وقت پر اس جگہ جمع ہوتے اور چٹان پر چڑھا جاتا۔ ایسے ہی مقابلوں میں ایک موقع پر ''جو'' نامی ایک نوجوان بلندی سے گر کر ہلاک ہوگیا۔ اس ہردلعزیز نوجوان کے نام پر چٹان کو جو نوبل...... یا نوبل راک کہا جانے لگا۔

بہرحال یہ نام اور یہاں ہونے والے مقابلے صرف سناترا فیملیز تک ہی محدود رہے۔ چالیس پچاس سال بعد ان مقابلوں میں ایک اور چیز شامل ہوگئی۔ ہر سال 25 سال تک والی کیٹیگری میں جو نوجوان یہ مقابلہ جیتتا تھا، اس کو یہ حق حاصل ہوجاتا تھا کہ وہ سناترا کمیونٹی میں سے کسی بھی لڑکی کو اپنی شریکِ حیات کے طور پر چن سکتا ہے۔ شرط صرف اتنی ہوتی تھی کہ وہ لڑکی پہلے سے انگیج نہ ہو۔ انگیج ہونے کی صورت میں وہ اپنی مرضی سے اپنی انگیج منٹ ختم بھی کرسکتی تھی اور کئی بار ایسا ہوا بھی۔ ظاہر ہے کہ برادری کے چمپئن نوجوان سے شادی کرنا ایک اعزاز کی طرح ہوتا تھا۔ پھر اس نوجوان کو ایک خطیر رقم انعام میں بھی حاصل ہوتی تھی۔ یہ رقم پرانے وقتوں میں تو نسبتاً تھوڑی تھی لیکن آہستہ آہستہ بڑھتی رہی اور پانچ لاکھ پاؤنڈز تک پہنچ گئی۔ 1947ء میں انگریز یہاں سے کوچ کر گئے۔ جو نوبل راک پر سناترا برادری کی سرگرمیاں دو چار سال کے لیے تو رُک گئیں لیکن ان سرگرمیوں کو پچھلے دو ڈھائی سو سال میں چونکہ ایک مذہبی رنگ بھی مل چکا تھا، اس لیے تھوڑے سے وقفے کے بعد سناترا برادری کے لوگ ہر سال اگست یا ستمبر کے مہینے میں پھر یہاں آنے لگے...... یہ سلسلہ کسی نہ کسی طور اب تک جاری تھا۔ کچھ بڑے بوڑھوں کا خیال تھا کہ جو نوبل راک کی شکل کچھ کچھ گرجے سے مشابہ ہے۔ اس لیے یہ لوگ اسے تکریم بھی دیتے تھے۔

پچھلے برس یہاں ہونے والے مقابلے میں سناترا برادری کی ایک بڑی فیملی ماؤنٹے کا نوجوان لیوپڑ ماؤنٹے جیتا تھا۔ اس نے دو پروفیشنل راک کلائمبرز کا بے حد جاندار مقابلہ کیا اور انہیں نیچا دکھا کر سب کو حیران کر دیا۔ وہ خود بھی زبردست ایتھلیٹ تھا اور راک کلائمبنگ کے عالمی مقابلوں میں بھی حصہ لے چکا تھا۔ لیوپڑ لندن کے ایک بااثر سماجی شخص ڈیوک ایان کا لختِ جگر تھا ماؤنٹے فیملی سناترا برادری کی سب سے خوش حال فیملی سمجھی جاتی تھی اور برادری میں ان لوگوں کا گہرا اثر رسوخ تھا۔ مقابلہ جیتنے کے بعد لیوپڑ نے غیر متوقع طور پر جوناتھن فیملی کی لڑکی کرسٹل کا ہاتھ مانگ لیا۔ کرسٹل کی چونکہ کہیں انگیج منٹ نہیں تھی لہٰذا وہ خاندانی روایت کے مطابق لیوپڑ سے شادی کی پابند تھی۔ تاہم اس وقت برادری کے سب بڑے حیران رہ گئے جب کرسٹل نے روایت شکنی کرتے ہوئے لیوپڑ کے ساتھ شادی سے انکار کر دیا۔

اس انکار کی وجہ سے ایک گمبھیر مسئلہ کھڑا ہو گیا جواب تک موجود تھا بلکہ مزید سنگین ہو چکا تھا۔

کرسٹل کی پوری رُوداد سننے کے بعد عادل کی دلچسپی اس معاملے میں مزید بڑھ گئی۔ اب رات کے دس بج چکے تھے۔ بادل بدستور موجود تھے۔ کبھی ہلکی اور کبھی تیز بارش ہونے لگتی تھی۔

عادل نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''ساری بات سمجھ میں آ رہی ہے کرسٹل...... لیکن...... شادی سے انکار کی کوئی وجہ تو ہو گی تمہارے ذہن میں؟''

''وجہ بس یہی تھی عاڈل! کہ وہ ہام کو آچھا نا ئیں لگتا۔ شوئرلی، ہام اس کو خوش نا ئیں رکھ سکتا اور نہ وہ ہام کو۔''

''تمہارے انکار کو اس نے قبول نہیں کیا؟''

''نا ئیں عاڈل! اس نے اسے اپنا انسلٹ سمجھا۔ وہ ہام سے ہر صورت شادی کرنا مانگتا۔ آخر میں اس نے ہام کو بس تھوڑا سا رعایت دیا۔''

''کیسی رعایت؟''

''ایک سال کا ریلیکسیشن۔ وہ کہتا کہ ہام اس سال بھی کمپی ٹیشن جیت کر دکھائے گا اور پھر ہام کے پاس میرج سے انکار کرنے کا کوئی چوائس نا ئیں ہوئیں گا۔''

''تم نے اس کی یہ شرط مانی؟'' عادل نے پوچھا۔

''بس ہام خاموش رہا تھا۔ وہ سمجھتا کہ ہام کچھ کچھ رضامند۔ آئی ایم سو مچ ڈسٹرب عاڈل! آئی ڈونٹ نو، واٹ ٹو ڈو۔'' وہ روہانسی ہو گئی اور تیزی سے انگلش بولتی چلی گئی۔

اب بات کچھ کچھ عادل کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے تن بدن میں عجیب سی سنسنی پھیل گئی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ سرمد صاحب نے اس لیوپڈ کے ساتھ مقابلہ کرنے اور اس کا مد توڑنے کے لیے ہی اسے تیار کیا ہو؟ چند ماہ سے جاری ساری تگ و دو اسی لیوپڈ کے سامنے خم ٹھونکنے کے لیے ہو؟ ایک موقع پر کچھ اس طرح کا اشارہ سرمد صاحب نے بھی دیا تھا۔ پھر ایک دفعہ کرسٹل نے بھی کچھ اسی مفہوم کی بات کی تھی اور کہا تھا۔ ''سر کا خیال ہے عاڈل کہ توم، ہام کے لیے کچھ کر سکتا۔''

عادل کو یہ سب کچھ ایک سنسنی خیز کہانی کی طرح لگ رہا تھا۔ سر سرمد نے کے ٹو کے سفر پر روانہ ہوتے وقت عادل کے دل میں ایک دیے کی امید جگائی تھی اور پھر بانگڑی چوٹی سر کرنے کے بعد انہوں نے کہا تھا۔ ''عادل! سمجھو کہ وہ دفینہ تمہیں مل گیا ہے۔'' اور اب کرسٹل ایک خطیر رقم کی بات کر رہی تھی۔ رائل فیملی کی رِیت کے مطابق جیتنے والے کو کم و بیش نصف ملین پاؤنڈز یعنی پانچ کروڑ پاکستانی روپے کے لگ بھگ انعامی رقم ملنا تھی اور پھر اس کو ایک بڑا اعزاز یہ بھی حاصل ہونا تھا کہ وہ سناترا برادری کی کسی بھی دوشیزہ کو شریکِ حیات بنانے کے لیے منتخب کر سکتا تھا۔ بعد ازاں عادل کا یہ دوسرا اندازہ غلط ثابت ہوا کیونکہ سناترا برادری کی دوشیزہ سے شادی والی شق صرف برادری کے نوجوانوں کے لیے تھی۔

اب اس نوبل راک والے معاملے میں عادل کی دلچسپی ایک دم بہت بڑھ گئی تھی۔ اس نے کرسٹل سے اس بارے میں مزید کئی سوال کیے۔ اس نے اپنی معلومات کے مطابق تسلی بخش جوابات دیے۔

آخر میں عادل نے اس سے پوچھا۔ ''کرسٹل! تمہارا کیا خیال ہے، کہیں سرمد صاحب مجھے لیوپڈ کے مقابل تو نہیں

لانا چاہ رہے؟''

وہ بولی۔ ''ساچی بات یہ ہے عاڈل! ہام کو اس بارے میں کنفرم انفارمیشن نا ئیں ہے لیکن ہام کا اپنا اندازہ بھی یہی ہے کہ شاید ان کے ذہن میں یہ آپشن ہے۔ کسی عام بندے کے لیے لیوپڈ سے وِن کرنا ممکن نا ئیں۔ ہی اِز ایکسٹرا آرڈینری اِن دس فیلڈ عاڈل!''

پھر کرسٹل نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ نوبل راک پر چڑھائی کی تاریخ سناترا برادری میں کوئی ڈھائی سو سال پرانی ہے۔ یعنی کہ محمد شاہ کے دورِ حکومت سے یہ سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ آج تک کے اندراج کے مطابق صرف دو بندے ایسے ہیں جنہوں نے ریکارڈ ٹائم میں نوبل راک پر چڑھائی مکمل کی۔ ان میں ایک وہی ''جو'' نامی نوجوان تھا جو بعد میں گر کر ہلاک ہوا۔ دوسرا یہ لیوپڈ ہے۔ لیوپڈ کا ٹائم ''جو'' سے بھی تقریباً تین منٹ کم تھا۔ اس حوالے سے اسے غیر معمولی قرار دیا جا رہا تھا اور کہا جا رہا تھا کہ آئندہ تین چار سال تک وہی نوبل راک کا چمپئن رہے گا۔

عادل نے کرسٹل سے پوچھا۔ ''اس سال یہ مقابلے کب ہونے ہیں؟''

وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ ''عاڈل! سمجھو وہ ٹائم آ گیا ہے۔ سناترا برادری کی آٹھ دس فیملیاں تو اسلام آباد پانچ چکی ہیں۔ ابھی مزید آ رہی ہیں۔ لگتا ہے کہ ستمبر کے فرسٹ ویک میں یہ مقابلے ہوئیں گے۔''

حیران کن اتفاق تھا کہ جس وقت ریسٹورنٹ کے نیم روشن گوشے میں عادل اور کرسٹل کے درمیان یہ اہم گفتگو ہو رہی تھی، اس وقت عادل کے موبائل فون پر سرمد صاحب کی کال آ گئی۔ عادل نے کال ریسیو کی...... اور مؤدب لہجے میں سرمد صاحب کی خیر خیریت دریافت کی۔

تمہیدی گفتگو کے بعد وہ بولے۔ ''تم کہاں ہو عادل؟''

''میں لاہور میں ہی ہوں سر! کل ہی آیا ہوں۔''

''تو ٹھیک ہے۔ کل صبح تم میرے پاس آ جاؤ...... تمہارے فراغت کے دن اب ختم ہو گئے ہیں۔ اب کام کرنا ہو گا۔'' انہوں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''میں بالکل تیار ہوں جناب۔''

سرمد صاحب سے بات کرنے کے بعد عادل خود کو ایک دم توانا محسوس کرنے لگا۔ ترنگ اور جوش کی ایک لہر سی اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ کرسٹل کے ساتھ ابھی ابھی جو انکشاف انگیز گفتگو ہوئی تھی، اس کی روشنی میں یہ صاف پتا چل رہا تھا کہ سرمد صاحب کس رُخ پر سوچ رہے ہیں۔

تھوڑی دیر کرسٹل سے مزید بات کرنے کے بعد وہ دونوں ریسٹورنٹ سے نکل آئے۔ عادل نے کرسٹل کو دوستانہ مشورہ دیا کہ وہ اب کہیں اکیلی باہر نہ نکلے اور لیوپڈ سے ہر طرح کا رابطہ منقطع رکھے۔ وہ لیوپڈ کے ردِعمل سے خوفزدہ تھی۔ عادل نے اسے تسلی دی کہ وہ اور ہمایوں اس پر کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے۔

اگلے روز صبح سویرے ہی عادل سرمد صاحب کی طرف روانہ ہو گیا۔ حلوا پوری اور چنے کے لاہوری ناشتے کے بعد اس نے صادق کو ساتھ لیا اور نکل پڑا۔ صادق نے کباڑ اور مشینری کے کام کے لیے اب ایک پک اَپ نما گاڑی بھی لے لی تھی۔ سیکنڈ ہینڈ تھی لیکن خاصی فٹ تھی۔ سفید رنگ کی اس پک اَپ پر عادل سرمد صاحب کی رہائش گاہ کی طرف جا رہا

تھا۔ دن کے نو بج چکے تھے، سڑکوں پر رش تھا۔ نسبت روڈ کے گنجان چوک سے گزرتے ہوئے عادل نے ہجوم پر نگاہ دوڑائی۔ ہر کوئی اپنے اپنے ''کام'' پر پہنچنے کی جلدی میں تھا۔ سیکڑوں افراد حرکت میں تھے۔ پیدل چلنے والوں کی اکثریت تھی۔ اچانک عادل کی نگاہ لوگوں کے درمیان ایک تمتمائے ہوئے سے چہرے پر پڑی اور اسے لگا کہ اس کے جسم کا سارا خون اس کے سر کی طرف آ گیا ہے۔ ذرا دیر کے لیے وہ سکتہ زدہ سا رہ گیا تھا۔ اس کی نظر کمزور نہیں تھی اور نہ اس کی نظر نے دھوکا کھایا تھا۔ اس نے لوگوں کے درمیان جس شخص کی جھلک دیکھی، وہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ یہاں سے طویل فاصلوں پر کے ٹو کے برفستانوں میں عادل اسے دیکھ چکا تھا...... اسے یہاں نسبت روڈ کے چوک میں لوگوں کے درمیان ''مالاکانے زادہ'' نظر آیا تھا۔ منڈا ہوا شفاف سر، سوجی سوجی آنکھیں، تمتمایا چہرہ...... ہاں، یہ مالاکانے زادہ تھا...... اور مالاکانے زادہ، کئی دن پہلے بانگڑی کے بیس کیمپ میں بیمار رہنے کے بعد مر چکا تھا۔ اگر وہ مر چکا تھا تو پھر یہ کون تھا؟ اس کا ہم شکل؟ نہیں...... ایسا ہرگز نہیں تھا...... تو پھر؟ کیا عادل نے جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھا تھا؟

''گاڑی روکو۔'' وہ پکار کر بولا۔

صادق ابھی اتنا ماہر ڈرائیور نہیں بنا تھا۔ اس نے بوکھلاہٹ میں بریک دبائے۔ پیچھے آنے والا رکشا پک اَپ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ صادق نے گاڑی کنارے پر روکی۔ عادل ہکا بکا سا نیچے اُترا اور لوگوں کے درمیان راستہ بناتا ہوا اس طرف بڑھا جہاں اس نے مالاکانے زادہ کی جھلک دیکھی تھی۔ وہاں اب کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ لوگوں کو دھکیلتا ہوا ایک دکان کے اونچے تھڑے پر چڑھ گیا۔ چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ کہیں کوئی منڈا ہوا چمکیلا سر دکھائی نہیں دیا۔

کچھ دیر بعد وہ صادق کے پاس واپس پک اَپ میں تھا۔ ''کون تھا یار؟'' صادق نے حیران لہجے میں پوچھا۔

''شاید مجھے دھوکا ہوا ہے...... میں نے ایک مرے ہوئے شخص کو دیکھا ہے۔'' عادل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''مرا ہوا شخص؟'' صادق نے مزید تفصیل پوچھی۔ عادل...... صادق کو اپنی تقریباً تمام سٹوری سنا چکا تھا۔ اس میں مالاکانے زادہ، فولاد جان اور رابے خاں کا ذکر بھی تفصیل سے موجود تھا۔ عادل نے کہا۔ ''مجھے ابھی یوں لگا ہے جیسے مالاکانے زادہ یہاں نسبت چوک میں موجود تھا۔''

''شاید تم رات کو ٹھیک سے سو نہیں سکے ہو۔'' صادق نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''ہاں...... لگ تو ایسے ہی رہا ہے...... لیکن......'' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

دونوں کچھ دیر اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ پھر عادل کے فون پر ہمایوں کی کال آ گئی۔ وہ پوچھ رہا تھا کہ عادل کتنی دیر میں پہنچ رہا ہے۔

''بس دس منٹ کی ڈرائیو ہے۔'' عادل نے کہا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد صادق اسے سرمد صاحب کی رہائش گاہ کے پاس ڈراپ کر رہا تھا۔

اس روز عادل اور سرمد صاحب کے درمیان تفصیلی گفتگو ہوئی۔ یہ گفتگو قریباً چار گھنٹے جاری رہی۔ اس کے درمیان ہی چٹائیوں پر بیٹھ کر ایک سادہ سا لنچ بھی کیا گیا...... سرمد صاحب کے اپنے کھیت میں اُگے ہوئے کدو کا سالن اور تندری روٹی، کچھ ایسا مزہ تھا اس میں کہ فائیو اسٹار ہوٹل کا سواد بھول گیا۔ سرمد صاحب کی ساری بات چیت اس لیے حسبِ توقع

تھی کہ کل شب کرسٹل نے اس حوالے سے کافی کچھ عادل کو بتا دیا تھا۔ سناترا برادری کی ڈھائی سو سال پرانی روایت نوبل راک۔ اس پر چڑھائی کے واقعات اور شرائط وغیرہ، یہ سب کچھ بڑا داستانی لگ رہا تھا۔

گفتگو کے آخر میں سرمد صاحب نے کہا۔ ''سناترا برادری سے باہر کا کوئی فرد ان خاندانی مقابلوں میں حصہ نہیں لیتا تھا لیکن کرسٹل اور لیوپڑ والا تنازعہ بالکل مختلف تھا...... اصل میں گرما گرمی کے دوران میں کرسٹل نے ہی یہ بات لیوپڑ سے کہی تھی کہ وہ دعا کرتی ہے کہ اس کا مد ٹوٹ جائے۔ کوئی اس کو نیچا دکھانے والا آ جائے۔ لیوپڑ نے کہا تھا...... ٹھیک ہے ڈارلنگ! میں تمہاری خاطر چند مہینے کسی ایسے سورما کا انتظار کر لیتا ہوں لیکن اگر یہ نہ ہوا تو پھر تمہیں میری نیک خواہش کے سامنے سر جھکانا پڑے گا۔ اس وقت میں نے لیوپڑ سے کہا تھا کہ امید ہے اگلے برس تک ہم تمہارا چیلنج قبول کرنے کے قابل ہو جائیں گے...... اور اس وقت ہمارے درمیان یہ بات بھی طے ہو گئی تھی کہ لیوپڑ کے چیلنج کو قبول کرنے والا، سناترا برادری سے باہر کا بندہ بھی ہو سکتا ہے۔''

عادل نے عجیب نظروں سے سر سرمد کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''سر! آپ کو کیسے معلوم تھا کہ کوئی نہ کوئی آپ کو مل جائے گا؟''

''میرے پاس ہمایوں موجود تھا۔ یہ پیدائشی کوہستانی ہے۔ چلاس اور اسکردو کے بلند پہاڑوں میں پرورش پائی ہے اس نے۔ تم نے دیکھا ہے یہ کس قدر سخت جان اور محنتی ہے۔ مجھے امید تھی کہ میں اسے لیوپڑ کے مقابل لانے کے قابل ہو جاؤں گا لیکن پھر اس دوران میں ہم دونوں کی نظر تم پر پڑ گئی۔ تمہاری خداداد صلاحیت نے ہم دونوں کو متاثر کیا اور ہم دونوں نے صنعتی نمائش میں تمہیں دیکھنے کے بعد فیصلہ کیا کہ تم سے رابطہ کیا جائے۔ آنے والے ہفتوں اور مہینوں میں ہمارا یہ فیصلہ بالکل درست ثابت ہوا۔''

ہمایوں حسبِ عادت ایک طرف خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے بال پیشانی پر جھول رہے تھے۔ اس کی آنکھیں جیسے ہر وقت کسی سوچ میں غرق رہتی تھیں۔ عادل نے دیکھا تھا، شدید پریشانی یا خطرے کے وقت بھی اس کا چہرہ سپاٹ ہی نظر آتا تھا، تاہم اس کی پیشانی کسی اندرونی حدت کے سبب تمتمانے لگتی تھی۔

سر سرمد اور ہمایوں سے گفتگو کے دوران میں بھی عادل کے ذہن کے ایک گوشے میں صبح ''نسبت چوک'' میں دیکھا ہوا منظر نقش رہا۔ مالاکانے زادہ کی پُراسرار جھلک بار بار عادل کی آنکھوں کے سامنے آتی رہی۔ بہرحال اس حوالے سے اس نے سر سرمد اور ہمایوں سے کوئی بات نہیں کی۔ کرسٹل نے بھی ابھی تک کل رات والا واقعہ سر سرمد یا ہمایوں کے گوش گزار نہیں کیا تھا۔ تاہم اس کے انداز سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ لیوپڑ کی شدید بدتمیزی اور ہاتھا پائی کے بارے میں جلدی از خود سرمد صاحب کو بتا دے گی۔

سرمد صاحب کی باتوں سے عادل کے دل و دماغ میں ایک نیا جوش لہریں لینے لگا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ اگر سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسے سرمد صاحب کہہ رہے ہیں تو...... اس بار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ وہ دولت کا بھوکا نہیں تھا...... لیکن فی الوقت حالات نے دولت کو اس کی ضرورت بنا دیا تھا...... اٹل ضرورت۔ اسے کسی کی خاطر ایک مقررہ رقم حاصل کرنا تھی اور اپنی جان داؤ پر لگا کر بھی کرنا تھی۔ دو روز بعد اگست کی بائیس تاریخ تھی اور یہی ان لوگوں کی کے ٹو کی طرف روانگی کا دن تھا۔ سرمد صاحب نے کرسٹل اور ہمایوں کو بھی تیاری کی ہدایت جاری کر دی۔ یہ جان

کر عادل کو حیرت ہوئی کہ زخمی ٹانگ کے باوجود سرمد صاحب خود بھی اس سفر پر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان کی ٹانگ پر گھٹنے سے اوپر تک پلاستر تھا اور وہ بیساکھیوں کے سہارے ہی چل سکتے تھے۔ سرمد صاحب کے اندازے کے مطابق آنے جانے میں قریباً بیس روز لگ جانے تھے۔ دس روز وہاں قیام تھا یعنی یہ کل قریباً ایک مہینے کا سفر تھا۔ عادل ایک بار پھر ماں کے پاس گوجرانوالہ پہنچا۔ ان کو اپنی خیر خیریت سے آگاہ کیا اور دعاؤں کا طالب ہوا۔ والدہ کے لیے بھی یہ بات اطمینان کا باعث تھی کہ وہ ایک ماہ کے لیے لاہور اور گوجرانوالہ سے دور جا رہا ہے۔ اس طرح وہ اس جھگڑے کے اثرات سے دور نکل جائے گا جو وہاں پال پور گاؤں میں ہوا تھا۔ بلکہ ماں تو چاہ رہی تھی کہ وہ ایک ماہ کے بجائے دو چار ماہ کے لیے کہیں دائیں بائیں ہو جائے۔

عادل نے ماں کو تسلی تشفی دی اور خرچے کے لیے رقم وغیرہ دے کر لاہور واپس آ گیا۔ اس روز وہ رات کو دیر تک صادق سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن رابطہ نہیں ہوا۔ اس نے کباڑ خانے کے ساتھ والے دکاندار سے رابطہ کیا۔ اس نے بتایا۔ ''صادق بھائی دوپہر سے نظر نہیں آ رہا، گیٹ کو تالا لگا ہوا ہے۔''

عادل نے پوچھا۔ ''اس کی پک اَپ اندر ہی ہے؟''

''نہیں، وہ بھی نہیں ہے۔ شاید اسی پر گیا ہوگا۔ لیکن وہ جب جاتا ہے بتا کر جاتا ہے، شاید کہیں جلدی میں چلا گیا ہے۔''

''ٹھیک ہے، وہ رات کو یا صبح جب بھی آئے اس سے کہنا کہ مجھے فون کر لے...... اس وقت تو اس کا فون بھی بند جا رہا ہے۔''

اگلے روز کئی کام کرنا تھے۔ عادل اور ہمایوں سفر کی تیاری میں مصروف رہے۔ کچھ فوڈ ''ٹن پیک'' کرایا گیا۔ ایک نیا ٹینٹ خریدا گیا۔ کوہ پیمائی کے سامان میں جو کمی تھی، وہ پوری کی گئی۔ ہمایوں والا لائسنس یافتہ پستول رابے خاں اور فولاد جان کے ساتھ ہی برف کی قبر میں دفن ہو گیا تھا۔ اسی لائسنس پر نیا ہتھیار ایشو کرانے کے لیے ہمایوں کئی دن سے کوشش کر رہا تھا۔ سرمد صاحب کے ایک کرم فرما کے تعاون سے پستول دستیاب ہو گیا۔

سہ پہر کے وقت عادل کو پھر صادق کا خیال آیا۔ صادق کا فون حسبِ سابق خاموش تھا۔ اس نے پڑوسی دکان دار کو فون کیا۔ اس نے بتایا۔ ''صادق بھائی رات کو بھی نہیں آیا۔ کباڑ لانے والے لڑکے بار بار اس کا پوچھ رہے ہیں۔''

عادل کو کچھ پریشانی لاحق ہوئی۔ وہ اس طرح کا غیر ذمے دار تو نہیں تھا۔ اپنے گاؤں کے عبدالقدیر کا لینڈ لائن فون نمبر عادل کے پاس موجود تھا۔ عادل نے اسے فون کیا اور درخواست کی کہ وہ ذرا صادق کا پتا لگانے کی کوشش کرے۔ خود وہ ایک بار پھر ہمایوں اور کرسٹل وغیرہ کے ساتھ مل کر سفر کی تیاری میں مصروف رہا۔

رات کو بھی صادق کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔ صبح سویرے جب ہمایوں، کرسٹل اور سرمد وغیرہ ایبٹ آباد روانگی کے لیے گاڑیوں میں بیٹھ رہے تھے، ایک اور پریشان کن اطلاع عادل کو موصول ہوئی۔ یہ اطلاع اس کے دوست عبدالقدیر نے ہی اس تک پہنچائی۔

عبدالقدیر کا فون آیا تو عادل سمجھا کہ شاید وہ صادق کے بارے میں کچھ بتائے گا لیکن قدیر نے صادق کے بجائے لالی گاؤں کی بات کی۔ اس نے کہا۔ ''یار عادے! مجھے ایک پریشان کرنے والی اطلاع ملی ہے۔''

''کیوں...... کیا ہوا؟'' عادل چونکا۔

''کل رات دس گیارہ بجے کے قریب تیرے ماموں طفیل کے گھر میں ایک ڈاکو گھسا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی ساتھی بھی ہو جو گھر سے باہر کھڑا ہو۔ تیرا ماما زخمی ہوا ہے اور تحصیل ہسپتال میں ہے۔''

عادل سناٹے میں رہ گیا۔ اس نے ممانی کی خیر خیریت پوچھی اور بچوں کی بھی۔

قدیر نے کہا۔ ''بچے تو ٹھیک ہیں پر تیری مامی کو بھی چوٹیں آئی ہیں۔ وہ سر پر چوٹ کی وجہ سے ڈیڑھ دو گھنٹے بیہوش رہی ہے لیکن اب ٹھیک ہے۔ کوئی جنونی سا بندہ تھا۔ کسی وزنی چیز سے سب کے سر پر ضربیں لگائی ہیں۔ بڑے بچے کا سر بھی زخمی ہے۔ چودہ پندرہ ٹانکے لگے ہیں اسے۔ گھر میں نقد پیسے بھی تھے لیکن ڈاکو صرف سونے کی چیزیں لے کر گیا ہے۔''

عادل کے لیے یہ شدید دھچکا تھا۔ پتا نہیں کیوں ایک خیال اس کے ذہن میں بجلی کی طرح چمکا اور اسے اپنے پورے جسم میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ پچھلے دو روز کی شدید مصروفیت میں وہ نسبت روڈ والے اس تحیر خیز منظر کو بھولا ہوا تھا۔ لوگوں کے ہجوم میں مالکانے زادہ کے چہرے کی تمتمائی ہوئی جھلک...... اور مالکانے زادہ اس کی معلومات کے مطابق مر چکا تھا۔ عادل کو محسوس ہوا کہ اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں۔ صادق بھی پرسوں سے لاپتا تھا اور اب گاؤں میں ماموں طفیل کے گھر پر یہ پُراسرار حملہ...... کہیں نسبت روڈ والے منظر...... اور ان دونوں واقعات میں کوئی تعلق تو نہیں تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ پائندہ عالم، مرا نہ ہو ابھی زندہ ہو...... یہ عادل ہی تھا جس نے مالکانے زادہ کے سر پر پیچھے سے کلہاڑی کی اُلٹی ضرب لگائی تھی اور اسے بے بس کرنے میں رمزی وغیرہ کی مدد کی تھی۔

بہر حال عادل نے فوراً ہی اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ اپنا یہ خیال اسے ایک دور دراز قیاس آرائی ہی کی طرح لگا۔ اس نے قدیر سے پوچھا۔ ''مامی اب مکمل ہوش میں ہے؟'' قدیر نے اثبات میں جواب دیا۔ عادل نے پوچھا۔ ''اس نے کچھ بتایا ہے اس بندے کے بارے میں؟''

''وہ کہتی ہے کہ وہ اس گاؤں یا علاقے کا تو نہیں لگتا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ ایک کپڑے میں لپیٹا ہوا تھا اور بڑے گھیر کی شلوار کے ساتھ قمیص پہن رکھی تھی۔ تمہاری مامی اس کی آواز نہیں سن سکی۔''

قدیر نے عادل کو بتایا کہ لاہور میں صادق کا ابھی کوئی پتا نہیں ہے۔ عادل نے قدیر سے درخواست کی کہ وہ صادق کے یار دوستوں سے مل کر اس کا کھوج لگانے کی کوشش کرے۔ ان کے سفر کا شیڈول بڑا سخت تھا ورنہ ایسے حالات میں عادل یہاں رُک جاتا اور اس سارے معاملے کو دیکھنے کی کوشش کرتا۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ کہیں ماموں طفیل کے گھر میں پیش آنے والے واقعے کے پیچھے تایا فراست کے بیٹوں قاسم اور عاصم وغیرہ کا ہاتھ نہ ہو۔ باغ والے واقعے کے بعد وہ بہت بھڑکے ہوئے تھے۔ انہیں یہ رنج بھی ہو سکتا تھا کہ ماموں طفیل نے ماں بیٹے (عادل اور اس کی ماں) کو بطور مہمان اپنے گھر میں ٹھہرایا ہوا تھا۔

O......❖......O

بہر طور مقررہ وقت پر وہ لوگ براستہ سڑک ایبٹ آباد کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہ دو گاڑیوں میں تھے۔ دوسری اسٹیشن ویگن تھی۔ اس میں ڈرائیور کے علاوہ ہمایوں سوار تھے۔ اس وین میں زیادہ تر ان کا ساز و سامان ہی تھا۔ عادل کچھ

خاموش خاموش تھا۔ ''کیابات ہے عادل! تم گم صم ہو؟'' سرمد صاحب نے پوچھا۔

''نہیں سر! ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' وہ زبردستی مسکرا کر بولا۔

وہ جانتا تھا کہ سرمد صاحب کی نگاہیں بندے کے اندر دور تک دیکھ لیتی ہیں۔ ان کے سامنے جھوٹ بولنا آسان نہیں ہوتا تھا۔

انہوں نے اپنی پلاسٹر شدہ ٹانگ کو ہولے سے اُٹھا کر اس کی جگہ تبدیل کی اور بولے۔ ''عادل! تمہیں پتا ہے مجھے دنیا میں سب سے پیارے لوگ کون لگتے ہیں؟''

پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولے۔ ''وہ جو اپنا دُکھ اور گہری پریشانی سینے میں چھپاتے ہیں اور مسکرانے والوں کے ساتھ مسکراتے ہیں۔ یہ بہت بڑی بات ہوتی ہے عادل۔''

''لیکن سر......''

وہ بات کاٹ کر بولے۔ ''تم کچھ بھی کہو، لیکن مجھے لگتا ہے کہ تم پرسوں سے کچھ فکرمند ہو اور یہ فکرمندی گاؤں کے حالات والی فکرمندی سے علیحدہ ہے۔ میرا مطلب ہے کہ شہزادی والی فکرمندی کے علاوہ بھی کوئی پریشانی ہے۔''

عادل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''سر! مجھے ایک بات بتایئے۔ یہ مالاکانے زادہ کون تھا؟ میرا مطلب ہے کیا یہ واقعی کوئی عامل وغیرہ تھا یا اس نے بس ڈھونگ رچایا ہوا تھا؟''

''یہ مالاکانے زادہ کا خیال تمہارے دماغ میں اچانک کیوں آ گیا؟''

''بس یونہی سر۔''

''مالاکانے زادہ جیسے لوگوں کے بارے میں کچھ بھی یقین سے کہنا مشکل ہوتا ہے۔ بہرحال جب بہت سے لوگ کسی شخص کے انوکھے پن پر یقین رکھیں اور مسلسل رکھیں تو پھر اس کے پیچھے کوئی چھوٹی بڑی وجہ تو ضرور ہوتی ہے۔ بعض دفعہ وہ ''وجہ'' ہمارے عقیدے اور اعتقاد کا سبب بھی بن جاتی ہے۔ بہرحال ذاتی طور پر تو یہ شخص مجھے کچھ زیادہ اچھا نہیں لگا تھا۔''

عادل نے کہا۔ ''سر! بدھ کی صبح کو جب میں آپ سے ملنے آپ کی رہائش گاہ کی طرف آ رہا تھا، نسبت روڈ کے چوک میں، میں نے مالاکانے زادہ کو دیکھا۔ یا یوں کہہ لیں کہ میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی...... بالکل واضح اور صاف......''

سرمد صاحب ایک دم خاموش سے ہو گئے۔ گاڑی تیزی سے ہائی وے پر بھاگی جا رہی تھی۔ وہ کھڑکی سے باہر کھیتوں کھلیانوں کے سلسلے کو دیکھتے ہوئے بولے۔ ''کہیں یہ وہی نظری دھوکے والی بات تو نہیں تھی؟''

عادل نے مؤدب لہجے میں کہا۔ ''سر! اس طرح کا وہم یا دھوکا تو تب ہوتا ہے جب آپ کے ذہن میں پہلے سے کوئی ڈر، اندیشہ یا پھر خواہش وغیرہ موجود ہو۔ میرے دماغ میں تو ایسا کچھ بھی نہیں تھا...... اور میں نے اسے قریباً دس پندرہ قدم کے فاصلے سے دیکھا۔ وہ جیسے، اپنے کسی خیال میں مگن تھا، تیزی سے چلتا ہوا لوگوں کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔''

سرمد صاحب کی کشادہ پیشانی پر تفکر کی ایک لکیر سی نمودار ہو گئی۔ انہوں نے عادل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس کے بعد تو کچھ نہیں ہوا؟ میرا مطلب ہے دوبارہ اس کی جھلک...... یا کچھ اور؟''

''اس کے بعد دو واقعے ہوئے ہیں سر! اب مجھے پتا نہیں کہ یہ علیحدہ معاملہ ہے یا پھر ان کا تعلق اسی واقعے سے ہے۔ صادق! جو کباڑ کے کام میں میرا پارٹنر ہے، پرسوں سے لاپتا ہے۔ کم از کم ابھی تک تو اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔ دوسری طرف گاؤں میں میرے ماموں کے گھر ڈکیتی کی واردات ہوئی ہے۔''

عادل نے واردات کی تفصیل سرمد صاحب کے گوش گزار کی اور بتایا کہ گھر میں گھسنے والا اپنے حلیے اور ڈیل ڈول سے پہاڑی علاقے کا رہنے والا لگتا تھا...... اور اس نے بیدردی سے سب کے سروں پر ضرب لگائی ہے۔ اس نے ماموں کے بارے میں بھی بتایا جن کے سر پر بڑا فریکچر ہوا تھا اور وہ ہسپتال میں زیرعلاج تھے۔

سرمد صاحب نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اگر ان واقعات کا پتا پہلے چل جاتا تو روانگی کے پروگرام میں ردوبدل کر لیا جاتا...... یا پھر روانگی سے پہلے اس معاملے کو کلیئر کر لیا جاتا۔

عادل بھی اس بات کو بخوبی سمجھ رہا تھا کہ اب سفر ملتوی کرنے یا اس میں تاخیر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ انہیں بہر صورت اب آگے ہی بڑھنا ہو گا۔ وہ جی ٹی روڈ پر سفر کرتے ہوئے راولپنڈی کی طرف رواں دواں رہے۔ ساتھ ہی اس موضوع پر بات بھی ہوتی رہی۔ سرمد صاحب نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''مالاکانے زادہ کی موت کی خبر واکی ٹاکی پر ہی سنی گئی تھی۔ بتانے والے اس کے پاؤنڈہ مرید تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس سلسلے میں جھوٹ تو نہیں بول سکتے تھے۔''

عقبی نشست سے کرسٹل اپنے مخصوص لہجے میں بولی۔ ''یس سر! ہم نے بھی واکی ٹاکی پر وہ کال سنا تھا۔ بولنے والے بہت سیڈ تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ابھی ابھی مالاکانے زادہ ایکسپائر ہو گیا۔''

سرمد صاحب نے کہا۔ ''ایسا ہوتا ہے بعض دفعہ کسی کو مردہ سمجھ لیا جاتا ہے لیکن اس میں وائٹل سائنز موجود ہوتے ہیں۔ بعد میں وہ سنبھل جاتا ہے۔ لگتا ہے کہ مالاکانے زادہ کے ساتھ بھی کچھ اسی طرح کی بات ہوئی ہے۔''

''لیکن سر! اگر وہ زندہ ہے تو ایسا کیوں ہے کہ وہ اتنی دور سے لاہور آئے اور عادل کے فرینڈ اور فیملی ممبرز سے بدلہ لینے کا کوشش کرے؟'' کرسٹل نے آنکھیں جھپک کر کہا۔

سرمد صاحب نے کار کی کھڑکی سے باہر، پوٹھوہار کے اونچے نیچے ٹیلوں کی طرف دیکھا اور بولے۔ ''ان پہاڑوں میں رہنے والے کچھ لوگوں کے مزاج بہت مختلف ہوتے ہیں۔ ان میں بدلے اور انتقام کو بھی خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے اور یہ پاؤنڈے تو مذہبی لحاظ سے بھی ہم سے بہت مختلف ہیں۔ کچھ کچھ پرانے کیلاشیوں جیسی جھلک پائی جاتی ہے ان میں۔ مجھے بار بار وہ لڑائی یاد آ رہی ہے جو پچھلے سفر میں کیمپ نمبر دو پر ہمارے اور رابے خاں وغیرہ کے درمیان ہوئی تھی۔ اس میں خناب گل نام کے جس بندے کو عادل نے پہاڑ سے نیچے گرایا، وہ مالاکانے زادہ کا حمایتی اور پرستار تھا۔ دور نزدیک سے اس کی مالاکانے زادہ سے کوئی رشتے داری بھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ رابے خاں اور فولاد جان کو چوٹی پر جانے سے بار بار منع کرتا تھا اور وہ جھگڑا اسی بات سے شروع ہوا تھا جس میں خناب کی جان گئی۔ اگر مالاکانے زادہ واقعی لاہور میں نظر آیا ہے تو پھر اس کا واسطہ خناب کی موت سے بھی ہو سکتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ عادل کو ڈھونڈ رہا ہو۔''

کرسٹل بولی۔ ''یہ تو ڈینجرس سچویشن ہے سر لیکن سوچنے کا بات ہے۔ مالاکانے زادہ کو اس بات کا نالج کیسے ہوا کہ خناب کو عادل نے پہاڑ سے گرایا تھا؟''

''ہاں، یہ سوچنے کی بات ہے۔ ممکن ہے کہ خناب پہاڑ سے گر کر فوری ہلاک نہ ہوا ہو۔ بعد میں جو پاؤنڈے

ہمارے پیچھے اوپر آئے، انہوں نے اسے زندہ حالت میں دیکھا ہو...... بہر حال...... ابھی تو یہ سارے مفروضے ہی ہیں۔ سب سے اہم سوال تو یہ ہے کہ یہ مالکانے زادہ زندہ ہے یا نہیں۔“

عادل کو اپنی والدہ کی طرف سے بھی فکر لاحق تھی۔ انہوں نے راولپنڈی کے قریب گوجر خاں میں تھوڑی دیر کے لیے گاڑیاں روکیں تو عادل نے گوجرانوالہ میں اپنے خالو عطا شاہ کے ایک واقف کار کو فون کیا۔ اس نے خالو عطا شاہ سے عادل کی بات کرادی۔ عادل نے خالو عطا کو خطرے سے آگاہ کیا اور انہیں اس بات پر قائل کرنے میں کامیاب رہا کہ وہ اس کی والدہ کو لے کر ڈیڑھ دو ہفتے کے لیے شیخوپورہ اپنے بڑے بیٹے کے پاس چلے جائیں۔

○......❖......○

ان کا سفر جاری رہا...... دو روز بعد وہ ایبٹ آباد سے شاہراہ قراقرم پر سفر کرتے ہوئے اور بشام...... داسو وغیرہ سے ہوتے ہوئے اسکردو روڈ پر آئے...... اور پھر معروف کنکورڈیا گلیشیئر کے نواح میں پہنچ گئے۔ یہاں Shigae نامی گاؤں سے آگے انہیں پاپیادہ سفر کرنا تھا۔ حسبِ سابق یہاں گاڑیاں چھوڑ دی گئیں۔ پروگرام کے مطابق سرمد صاحب کے لیے سواری کے واسطے ایک نہایت عمدہ خچر کا انتظام کیا گیا تھا۔ سامان وغیرہ کے لیے بھی دو ٹٹو موجود تھے۔ کسی ہنگامی صورتِ حال کے لیے ایک اضافی خچر کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ سرمد صاحب کی ہمت قابلِ داد تھی۔ وہ زخمی حالت میں اتنے کٹھن سفر کے لیے نہ صرف آمادہ تھے بلکہ لیڈنگ رول بھی ادا کر رہے تھے۔

عادل بہت گم صم تھا۔ اس کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ بہر حال اپنی اندرونی کیفیت اس نے بس اپنے تک ہی رکھی تھی، وہ ساتھیوں کو پریشان کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔ عادل کی پریشانی کی وجہ ایک فون کال تھی۔ یہ فون کال اس نے چلاس کے نزدیک ایک ریسٹ ہاؤس میں سنی تھی۔ کال کرنے والا اس کا گاؤں کا دوست عبدالقدیر تھا۔

قدیر نے کہا تھا کہ وہ اسے خوامخواہ پریشان کرنا نہیں چاہتا لیکن ضروری بات ہے اس لیے وہ بتانے پر مجبور ہو رہا ہے۔ تمہید کے بعد اس نے کہا تھا کہ وہاں لالی اور پال پور کے جڑواں دیہات میں زبردست ہلچل ہے۔ لگتا ہے کہ اس کے تایا فراست کی حویلی میں کوئی بہت بڑا واقعہ ہوا ہے...... جسے عام لوگوں سے چھپایا جا رہا ہے۔ پال پور گاؤں میں جو شدید افراتفری مچی ہوئی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعہ بہت بڑا ہے...... اور اس واقعے کا ذمے دار بھی عادل ہی کو ٹھہرایا جا رہا ہے۔ خود کو ذمے دار ٹھہرائے جانے پر عادل ہکا بکا رہ گیا تھا۔ وہ تو باغ والے احاطے میں تایا فراست کے بیٹوں اور ملازموں سے اتنی بے عزتی کرا کے بھی مشتعل نہیں ہوا تھا اور اپنی والدہ کو لے کر خاموشی سے گاؤں سے نکل آیا تھا۔ اب پتا نہیں اس پر کیا الزام لگایا جا رہا تھا۔

عبدالقدیر نے اپنی اطلاع میں اس سفید پک اَپ کا بھی ذکر کیا جو عادل کے دوست صادق کے استعمال میں تھی۔ قدیر نے بتایا کہ وہ سفید پک اَپ پال پور سے قریباً دو میل دور سرکنڈوں میں کھڑی ملی ہے اور شاید اسی پک اَپ کی وجہ سے حویلی میں ہونے والے واقعے میں عادل کو ملوث سمجھا جا رہا ہے۔ قدیر نے اطلاع دی کہ تایا فراست اور چودھری مختار کے کارندے ہتھیاروں سے لیس ہو کر چاروں طرف دندنا رہے ہیں اور ہر اس شخص سے بُرا سلوک کر رہے ہیں جس کا عادل یا اس کی والدہ اور ماموں سے کوئی تعلق واسطہ رہا ہو......

اس کال نے عادل کو بہت فکرمند کر دیا تھا۔ تسلی کی صرف ایک بات ہی تھی کہ وہ پہلے ہی والدہ کو خالو عطا شاہ کے

ساتھ شیخوپورہ کے دور افتادہ گاؤں کی طرف روانہ کر چکا تھا۔ اب پتا نہیں، وہاں تایا کے گاؤں میں کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے اتنی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ اگر حویلی میں کچھ ہوا تھا تو پھر یہ اور بھی خطرناک بات تھی۔ عادل کے دل سے شہزادی کے لیے خیر و عافیت کی دعا نکلی۔ ایک اور چیز جو بُری طرح اُلجھا رہی تھی، وہ گاؤں کے قریب صادق کی سفید پک اَپ کی موجودگی تھی۔ وہ پک اَپ لاہور سے اتنا طویل سفر کر کے بہاولپور کے اس دور دراز گاؤں تک کیسے پہنچی؟ یہ بات تو بعید از امکان تھی کہ صادق نے گاؤں میں عادل کی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے اپنے طور پر کوئی قدم اُٹھایا ہوگا۔ حالانکہ اسے بہت رنج بھی تھا۔ شروع میں عادل نے اس سے اصل بات چھپائی تھی لیکن بعد میں بتا دی تھی۔

عادل کی سوچ کے گھوڑے ایک بار پھر نسبت روڈ کے چوک میں نظر آنے والے عجیب منظر کی طرف دوڑنے لگے۔ نہ جانے کیوں اس کی چھٹی حس بار بار کہہ رہی تھی کہ اوپر تلے پیش آنے والے ان واقعات میں اور نسبت روڈ کے منظر میں کوئی نہ کوئی تعلق ہے، کوئی گہرا تعلق۔

ایک بار تو اس کے جی میں آئی کہ وہ سرمد صاحب سے کہہ دے کہ وہ یہ سفر مزید جاری نہیں رکھ سکتا اور واپس جانا چاہتا ہے لیکن پھر اس کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔ یہ غیر معمولی عزت اور بے عزتی کا سوال تھا۔ سرمد صاحب مہینوں سے جس کام کے لیے جان مار رہے تھے، اس کا وقت آ گیا تھا۔ اب پیچھے ہٹنا ممکن نہیں تھا۔ پھر عادل کی محبت کے لیے بھی یہی فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ اگلے چند روز میں اس نے شہزادی کو ہمیشہ کے لیے کھو دینا تھا، یا پھر پا لینا تھا۔ ہار جیت تو قدرت کے ہاتھ میں تھی لیکن وہ اوپر والے کی بخشی ہوئی ہمت اور توانائی کو اس کی آخری حدوں تک استعمال کرنا چاہتا تھا اور ایسا کرتے ہوئے اس کی موت بھی واقع ہو جاتی تو وہ خود کو سرخرو سمجھتا۔

سرمد صاحب خچر پر سوار تھے اور اس کے ساتھ ساتھ واکی ٹاکی پر کسی سے بات بھی کر رہے تھے۔ بات ختم کرنے کے بعد انہوں نے عادل کو مخاطب کیا اور بولے۔ ”یہ یہاں کا ایک بہت تجربہ کار پورٹر انور شاہ ہے۔ اس سے بات ہو رہی تھی۔ اس نے بتایا ہے کہ نوبل راک تک جانے والا راستہ پچھلی دو بارشوں کے بعد کھل گیا ہے اور قریباً پندرہ انگریز فیملیز وہاں پہنچ چکی ہیں۔ ابھی دس پندرہ مزید آئیں گی۔ پچھلے سالوں میں یہ تعداد اس سے بھی زیادہ ہوتی تھی لیکن آج کل چونکہ سیکیورٹی کے مسائل ہیں، اس لیے لوگ محتاط ہیں۔“

عادل نے کہا۔ ”میں نے سنا تھا سر! یہ غیر ملکی اپنی سیکیورٹی باہر سے بھی لے کر آتے ہیں؟“

”ہاں بھئی سب روپے کا کھیل ہے۔ بلکہ پاؤنڈز کا کھیل ہے اور پاؤنڈز ان کے پاس بہت ہیں۔ ایک ایک گارڈ پر دس دس لاکھ بھی خرچ کرنا پڑے تو کر سکتے ہیں۔ مقامی پورٹرز کو بھی یہ لوگ کھل کر روپیہ دیتے ہیں۔ اسی لیے جو ٹٹو ہمیں پچھلی دفعہ پانچ سو روپے روزانہ پر ملا تھا، اب تگنی قیمت پر بھی مشکل سے حاصل ہوا ہے...... اور ہاں، ایک اور خاص بات بھی انور شاہ سے معلوم ہوئی ہے...... بلکہ بہت خاص بات۔“ آخری الفاظ کہتے کہتے سرمد صاحب کا لہجہ دھیما اور رازدارانہ ہو گیا تھا۔

عادل نے چلتے چلتے خود کو ان کے کچھ اور نزدیک کر لیا۔ وہ خچر پر بیٹھے بیٹھے تھوڑا سا عادل کی طرف جھک گئے اور بولے۔ ”مالکانے زادہ کے بارے میں ہمارا قافیہ درست ثابت ہوا ہے شاید۔“

”کیا مطلب سر؟“

"مالکانے زادہ...... مرا نہیں...... وہ قریباً بارہ گھنٹے سکتے کی سی حالت میں رہا تھا، پھر اس کے ہاتھ پاؤں میں حرکت نظر آنے لگی تھی۔ قریباً 18 گھنٹے بعد وہ ہوش میں آ گیا تھا۔" اس خبر نے عادل کو بُری طرح چونکایا۔ اس کے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔

عادل نے کہا۔ "سر! اب مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ وہاں ہمارے دیہات میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں کسی نہ کسی طور اس مالکانے زادہ کا ہاتھ ہے۔"

سرمد صاحب نے معاملہ فہم نظروں سے عادل کو دیکھا۔ "کیا تمہیں وہاں کے بارے میں کوئی اور اطلاع بھی ملی ہے؟"

"ہاں جناب!" عادل نے جواب دیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ تفصیل بتاتا، خچر کی چڑھائی میں دشواری پیش آنے لگی۔ ایک پورٹر نے آگے بڑھ کر اس کی لگام تھام لی۔ سرمد صاحب نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر عادل کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

تاہم رات کو کیمپ میں کھانا کھانے کے بعد جب سرمد صاحب اور عادل کو تنہائی ملی تو اس نے سرمد صاحب کو اس فون کال کے بارے میں بتا دیا جو اس نے چلاس کے قریب سنی تھی۔ اس فون کال کے بعد چونکہ سگنل آنا بند ہو گئے تھے اس لیے مزید کوئی اطلاع نہیں مل سکی تھی۔

عادل نے کہا۔ "سر! وہاں تایا کے گاؤں پال پور میں کوئی بہت خاص واقعہ ہوا ہے۔ اندازہ ہے کہ اس واقعے میں تایا کا چھوٹا بیٹا عاصم زخمی بھی ہوا ہے۔ حویلی میں اور پورے علاقے میں کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ مزید پریشانی کی بات یہ ہے کہ اس واقعے کا الزام مجھ پر لگایا جا رہا ہے۔ شاید یہ سمجھا جا رہا ہے کہ میں نے اپنے دوست صادق کے ساتھ مل کر اس مار پیٹ کا بدلہ لیا ہے جو باغ والے احاطے میں میرے ساتھ ہوئی......"

عادل نے سرمد صاحب کو بھی بعد میں تمام تفصیل سے آگاہ کر دیا تھا اور اس فون کال کے بارے میں بھی سرمد صاحب کو بتا دیا تھا۔ سرمد صاحب توجہ سے سنتے رہے۔ انہوں نے پوچھا۔ "لیکن تمہارے ساتھ ساتھ صادق کو بھی کیوں ملوث کیا جا رہا ہے؟"

"اس کی وجہ وہ پک اَپ ہے سر جو گاؤں کے قریب سرکنڈوں سے ملی ہے۔ وہ صادق کی پک اَپ ہے۔ گاؤں کے پرانے چوکیدار کے علاوہ اور کئی افراد نے بھی لاہور میں یہ پک اَپ دیکھی ہوئی ہے۔"

سرمد صاحب کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ وہ بولے۔ "اگر ان معاملات میں مالکانے زادہ کا ہاتھ ہی ہے تو ممکن ہے کہ اس نے پہلے صادق کو غائب کیا ہو اور پھر اس پر تشدد کر کے دیگر معلومات حاصل کی ہوں۔ ان معلومات کی روشنی میں وہ تمہیں ڈھونڈنے کے لیے تمہارے گاؤں جا پہنچا ہو۔ تمہاری خوش قسمتی کہ اس کی آمد سے ایک دن پہلے تم اور تمہاری والدہ گاؤں سے نکل آئے۔"

"بالکل سر! یہی باتیں میرے ذہن میں آ رہی ہیں۔"

سرمد صاحب اور عادل تا دیر اس سنگین موضوع پر بات کرتے رہے اور قیافہ لگانے کی کوشش کرتے رہے کہ وہاں پال پور گاؤں میں کیا کچھ ہوا ہوگا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ تایا فراست کا چھوٹا بیٹا عاصم صرف زخمی نہ ہوا ہو بلکہ جان سے چلا گیا

د۔ لیکن اگر ایسی بات ہوتی تو پھر پولیس میں رپورٹ ضروری تھی...... اور قدیر کی فون کال میں کہیں بھی اس طرح کا ذکر ہیں تھا۔ کچھ دیر بعد ہمایوں اور کرسٹل بھی اس گفتگو میں شریک ہو گئے۔ مالکانے زادہ کے زندہ ہونے اور لاہور میں یکھے جانے کی اطلاع ان دونوں کے لیے بھی حیرت انگیز تھی۔ عادل کا دل بہت بجھا بجھا ہوا تھا۔ کسی وقت تو اسے خدشہ محسوس وتا تھا کہ کہیں وہ آخری کوشش کرنے سے پہلے ہی شہزادی کو ہار نہ جائے۔ گاؤں میں جس طرح کی صورتِ حال پیدا ہو گئی ھی، یقینی بات تھی کہ تایا کے دل میں اس کے لیے رہی سہی ہمدردی بھی ختم ہو جانا تھی۔ آخری ملاقات میں اس نے تایا سے پھر تھوڑا سا وقت لے لیا تھا۔ اب اس تازہ واقعے کے بعد پتا نہیں وہ وقت موجود رہنا تھا یا نہیں؟

اب وہ سفر کے ایسے مرحلے میں تھے کہ یہاں سے واپسی کی بھی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ انہیں آگے بڑھنا تھا...... رف آگے...... نوبل راک کی طرف...... جہاں سناترا برادری کے شوقین جمع ہو چکے تھے اور ایک نہایت خطرناک و جوش کھیل شروع ہونے والا تھا۔

O......❖......O

انہوں نے چھ سات دن تک حتیٰ الامکان تیز رفتاری سے سفر کیا۔ سردی اپنے عروج کی طرف بڑھ رہی تھی۔ گاہے ا ہے ہڈیوں میں گودا جما دینے والی ہوا سے بھی واسطہ پڑتا تھا۔ دو راتیں ایسی بھی گزریں جب صبح تک آسمان سے ھا جوں پانی برستا رہا اور بادل دھاڑتے رہے۔ برقِ آسمانی سے جب کے ٹو اور اس کی نواحی چوٹیاں روشن ہوتیں تو یوں لگتا جیسے اچانک ایک طلسمی منظر آنکھوں کے سامنے آ کر اوجھل ہو گیا ہے...... یہ بڑی ہمت اور برداشت کا سفر تھا لیکن ت اور برداشت کا اصل امتحان تو سرمد صاحب دے رہے تھے۔ ان کا حوصلہ دیکھ کر عادل کو ایک ایسا عملی سبق مل رہا تھا و نصیحتوں کے ہزار الفاظ پر بھاری تھا۔ خوشی...... تکلیف میں پوشیدہ ہے۔ جتنی زیادہ تکلیف، اتنی زیادہ خوشی۔ کتنی سادہ ساوات تھی یہ...... شاید اسی مساوات کو مدِنظر رکھتے ہوئے شاعرِ مشرق نے بھی کہا تھا کہ انسان خود کو اس درجے تک پہنچا سکتا ہے جہاں خدا، ہر تقدیر سے پہلے اپنے بندے سے پوچھتا ہے کہ اس کی مرضی کیا ہے۔ سرمد صاحب کا فلسفہ حیات ہی تھا کہ اپنا سینہ کشادہ کر کے اور آنکھیں بند کر کے اپنے راستے میں آنے والی تکلیفیں جھیلتے چلے جاؤ اور یہ ایمان رکھو کہ ن کا صلہ کسی نہ کسی صورت میں مل کر رہتا ہے اور اگر تم یہ چاہتے ہو کہ یہ صلہ تمہاری من مرضی سے ملے تو پھر خود پر باقی وشیوں اور راحتوں کے دروازے بھی بند کرتے چلے جاؤ۔ صرف وہی دروازہ کھلا رہنے دو جو تمہارا من چاہا ہے اور خدا سے دعا کرو کہ وہ اسی من چاہے دروازے سے تمہارے حصے کی خوشیاں تمہیں دے۔ اکثر و بیشتر ایسی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ اسی طریق پر چلتے ہوئے عادل نے بھی اپنے حصے کی خوشیوں کے لیے صرف "شہزادی والا دروازہ" کھلا رہنے دیا ھا۔ باقی سارے دروازے بند کر دیئے تھے۔ سرمد صاحب، ہمایوں اور کرسٹل وغیرہ کی طرح وہ بھی بالکل سادہ غذا کھا رہا ھا۔ خود کو دنیاوی آسائشوں سے دور کر رہا تھا۔ جان توڑ مشقت کو شعار بنا رہا تھا۔ تن آسانی پر جہدِ مسلسل کے کوڑے برسا رہا تھا، بھوک پیاس کو اپنا مطیع کر رہا تھا۔ یہ باقی راحتوں کے دروازے خود پر بند کرنے والی بات ہی تو تھی۔ اور ایک ایسا ی دروازہ، شاید حسین نیلگوں آنکھوں والی کرسٹل بھی تھی۔ پچھلے سفر میں ایک طوفانی شب میں ایک ہیجان خیز تنہائی کے رنگے میں ہونے کے باوجود عادل نے خود پر یہ دروازہ یکسر بند رکھا تھا۔

آخر ان کے سفر کا وہ مرحلہ آیا جب انہوں نے ایک تنگ درے کو کراس کیا اور ایک کشادہ وادی میں داخل ہو گئے۔

دراصل یہی وہ تنگ درہ تھا جو جولائی اگست میں ہونے والی تیز بارشوں کے بعد کھلتا تھا اور وادی میں جانے کا راستہ بناتا تھا۔ بارش کا بہت سا پانی جھیل کی صورت میں جمع ہو کر لاکھوں ٹن برف کو درے کے اندر سے دھکیل دیتا تھا۔ وادی میں چند گھنٹے کے سفر کے بعد ہی انہیں رنگ برنگے خیموں کی کئی قطاریں نظر آ گئیں۔ برف کی سفید چادر پر یہ ایک خوبصورت سی عارضی بستی تھی۔ بہت سے مرد و زن اس بستی میں چلتے پھرتے نظر آئے۔ کافی بڑی تعداد میں بار برداری کے جانور بھی یہاں موجود تھے۔ ان میں زیادہ تر خچر تھے۔ انگریزوں کے علاوہ مقامی لوگ بھی یہاں دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ بوسیدہ لباسوں والے مقامی پورٹرز تھے۔ قریب پہنچنے پر کئی جگہ غیر ملکی مسلح گارڈز بھی دکھائی دیئے۔ اس کے علاوہ جنریٹر کی گھوں گھوں بھی سنائی دی۔ یہ جنگل میں منگل کا سماں تھا۔

اور پھر عادل کی نگاہ اس عظیم الشان پہاڑ نما چٹان پر پڑی جس پر چڑھائی کے مقابلے ہونا تھے۔ اس ہیبت ناک چٹان کی اونچائی دو ہزار فٹ سے کچھ ہی کم ہو گی۔ اس کا بالائی سرا آسمان کو بوسہ دیتا محسوس ہوتا تھا۔ یہی نوبل راک تھی۔ نہ جانے کتنے زمانوں سے یہ اسی طرح سربلند کھڑی تھی اور اپنی عجیب ساخت پر داد کی طالب تھی۔ داہنے پہلو سے دیکھا جاتا تو اس کی بناوٹ کو کسی حد تک گرجے سے مشابہ بھی قرار دیا جا سکتا تھا۔

ان انگلش فیملیز میں سے ایک فیملی کرسٹل کی بھی تھی۔ کرسٹل کے والدین بھی یہاں موجود تھے۔ اس کا سگا باپ مائیکل جوناتھن اور سوتیلی ماں مارٹینا۔ کرسٹل نے عادل کو بتایا کہ یہ لوگ اس سے ناراض ہیں۔ اس ناراضی کی وجہ یقیناً کرسٹل کی روایت شکنی ہی تھی۔ وہ بے شک انگلینڈ جیسے ترقی یافتہ ملک میں رہتی تھی لیکن اس کا خاندان ان قدامت پسند خاندانوں میں سے تھا جو آج بھی سولہویں سترہویں صدی سے آگے نہیں نکلے تھے۔ یہ لوگ آج بھی رنگ و نسل کے قائل تھے اور ان تمام پرانے رسم و رواج کو سینے سے لگائے ہوئے تھے جن میں سے بورژوائی ذہنیت کی بُو آتی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ یہ خود کو ترقی یافتہ بھی کہتے تھے۔ ان لوگوں کے نزدیک کرسٹل کا لیوپڈ سے شادی سے انکار کرنا سنگین روایت شکنی ہی تھی۔

یہاں پہنچ کر عادل کو پہلی بار کئی ڈیوکس اور ارل وغیرہ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اونچی ناک...... باریک ہونٹ...... اکڑی ہوئی گردنیں اور بیش قیمت لباس۔ وہ اپنی گوری چمڑی کو اپنی شان سمجھتے تھے اور مقامی لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے ان کی نگاہوں میں بے ساختہ ''احساسِ برتری'' چمکارے مارنے لگتا تھا۔ بڑی توندوں اور سرخ و سفید چہروں والے دو انگلش نوابوں سے سرمد صاحب کی بھی بات ہوئی...... یہ بات چیت عادل سے پندرہ بیس قدم کی دوری پر ہوئی۔ سرمد صاحب نے ایک دو بار ہاتھ سے عادل کی جانب اشارہ کیا۔ جیسے انگریز معززین کو بتا رہے ہوں کہ یہ وہ مقامی لڑکا ہے جو ان مقابلوں میں حصہ لے گا۔ دونوں انگریز معززین نے جس انداز سے عادل کو دیکھا، وہ بہت تحقیر آمیز تھا۔ جیسے انہوں نے بہ زبانِ خاموشی کہا ہو کہ یہاں خوار کرنے کے لیے کس کو اُٹھا لائے ہو۔ یہ اشرافیہ کے کھیل ہیں، ان میں ایسے ''مقامی'' کب اپنی عزت بچا پاتے ہیں۔

سرمد صاحب اور ان کی ٹیم کے لیے بھی تین ٹینٹ مناسب جگہ پر لگا دیئے گئے۔ یہ دیکھ کر عادل کو حیرت ہوئی کہ اپنے والدین سے مختصر ملاقات کرنے کے بعد کرسٹل، سرمد صاحب کے ٹینٹ میں واپس آ گئی۔

سرمد صاحب نے عادل کو لیوپڈ کے حوالے سے پہلے ہی سمجھا دیا تھا۔ مزید تاکید کے طور پر انہوں نے کہا۔ ''لیوپڈ

بھی پہنچ چکا ہے، یہیں کہیں گھوم رہا ہو گا۔ یہ میرا حکم ہے کہ تم اکیلے خیمے سے نہیں نکلو گے۔ میں کسی طرح کی بدمزگی نہیں چاہتا۔''

''جو آپ کا حکم سر۔'' عادل نے کہا۔

''وہ تمہیں مشتعل کرنے کی کوشش بھی کرے تو تم نے مشتعل نہیں ہونا۔ ہم اس کی ہر زیادتی کا بدلہ اس سے کھیل کے میدان میں لیں گے۔''

''میں بالکل تیار ہوں سر۔'' عادل کے سینے میں ایک جوش سا لہر لینے لگا۔

سرمد صاحب نے کہا۔ ''اور کسی بھی مرحلے میں کسی سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں...... ہماری تیاری پوری ہے اور یہ تیاری اس مقابلے کے حساب سے ہی ہے۔ جب تم اس نوبل راک کو قریب سے دیکھو گے تو تمہیں اندازہ ہو گا کہ اس کی ساخت اور سطح اسی چٹان کی طرح ہے، جس پر ہم نے قریباً سات ہفتے تک مسلسل مشق کی تھی۔''

''مجھے اس کا اندازہ ہو رہا ہے جناب۔''

''اصل مقابلوں سے پہلے ہمیں تین چار دن مشق کے لیے بھی ملیں گے۔ اس مشق سے تمہیں بہت فائدہ ہو گا...... میرا خیال ہے کہ ہم کل سے ہی اپنا کام شروع کر سکتے ہیں۔''

ٹمپریچر نقطہ انجماد سے چودہ پندرہ درجے نیچے تھا۔ ایک خیمے میں کرسٹل اور سرمد صاحب تھے۔ دوسرے میں عادل اور ہمایوں۔ تیسرے خیمے میں ضروری ساز و سامان تھا۔ ان کے دو ملازموں اور دو تین پورٹرز کو ان مشترکہ ٹینٹس میں جگہ ملی تھی جو اسی مقصد کے لیے لگائے گئے تھے۔

کرسٹل آج کل کافی بدلی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس میں سنجیدگی بڑھ گئی تھی۔ پچھلے سفر میں اس نے جو شوخیاں عادل کے ساتھ کی تھیں، انہیں بھی بریک لگ چکے تھے۔ شاید اس نے ذہنی طور پر عادل کو شہزادی کے لیے الوداع کہہ دیا تھا۔ یہ صورتِ حال عادل کے لیے بہت تسلی بخش تھی۔

رات کو ہمایوں اور عادل خیمے میں تنہا تھے۔ ہمایوں اتنا گم صم رہتا تھا کہ اس کے ساتھ رہ کر بوریت محسوس ہونے لگتی تھی۔ آج وہ معمول سے زیادہ ہی خاموش تھا۔

''کیا بات ہے ہمایوں بھائی! آج تو بالکل ہی چپ لگی ہوئی ہے۔ کیا سوچ رہے ہو؟'' عادل نے کہا۔

اس نے گہری سانس لی اور اپنے بالوں کو پیشانی سے ہٹا کر بولا۔ ''سوچ رہا ہوں کہ تم کرسٹل کو اس عیاش امیرزادے (لیوپڈ) سے بچا پاؤ گے یا نہیں اور اگر خدانخواستہ وہ اس بار پھر کامیاب رہا تو وہ اس بیچاری کا کیا حشر کرے گا۔ وہ اس کی لونڈی کی طرح ہو گی۔ بظاہر ترقی یافتہ نظر آنے والے یہ ''جاگیردار انگریز'' اندر سے اب بھی پرانی صدیوں میں جی رہے ہیں۔ جب یورپ میں بے تحاشا آقا ہوتے تھے اور لونڈی، غلام کوڑیوں کے مول بکتے تھے۔''

عادل نے کہا۔ ''اگر ایسا ہو گیا اور کرسٹل، لیوپڈ کے پاس چلی گئی تو تمہیں دُکھ ہو گا؟''

''ظاہر ہے ہو گا۔ کیا تمہیں نہیں ہو گا؟'' ہمایوں نے اُلٹا سوال کیا۔

''مجھے بھی ہو گا ہمایوں بھائی! لیکن پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ تمہیں کچھ زیادہ ہو گا۔ مجھے اب یقین سا ہو گیا ہے ہمایوں بھائی...... کہ...... تم کرسٹل کو پسند کرتے ہو۔''

"تم نے یہ بات ایک بار پہلے بھی کہی تھی اور میں نے کہا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔"

"اور اس وقت بھی انکار کرتے ہوئے تمہارے چہرے پر ایسا ہی رنگ گزرا تھا، ہمایوں بھائی۔"

"کیسا رنگ؟" اس نے خشک انداز میں کہا۔

"وہی رنگ جو کچھ چھپاتے ہوئے بندے کے چہرے پر آتا ہے۔" عادل نے بے باکی سے کہا۔

ہمایوں چند لمحے تک جز بز نظر آیا۔ پھر حسبِ عادت گلا صاف کر کے بولا۔ "یار چھوڑو، یہ بے کار کی باتیں ہیں۔ جیسا تم سوچ رہے ہو ویسا نہیں ہے...... لیکن...... اگر ہو بھی تو زمین آسمان کا کیا میل۔ ہمارے اور اس کے اسٹیٹس میں زمین آسمان سے بھی زیادہ کا فرق ہے۔"

عادل ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ "لیکن ہمایوں بھائی! یہ زمین آسمان والا محاورہ اب غلط ثابت ہو چکا ہے۔ یہ زمین آسمان کے ملنے کا دور ہے۔ ہم زمین کے باشندے، چاند پر پہنچ رہے ہیں یا نہیں؟"

"لیکن یہ باشندے بھی تو سفید فام ہی ہیں۔" ہمایوں کے مختصر جواب نے عادل کو لاجواب کر دیا۔ وہ ایسے ہی چھوٹی سی مگر بڑی کام کی بات کرتا تھا۔

اس سے پہلے کہ عادل کو کوئی جواب سوجھتا، کرسٹل اندر آ گئی۔ وہ اپنا ہیڈ فون ڈھونڈتے ہوئے آئی تھی۔ سخت سردی کے باوجود وہ پینٹ شرٹ میں تھی اور بہت سمارٹ لگ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی ہمایوں کی آنکھیں جھک سی جاتی تھیں۔ جیسے وہ اسے دیکھنے کی تاب نہ رکھتا ہو۔ یا پھر یہ کہ اپنی نظروں سے اس کی خوبصورتی کو میلا کرنا نہ بھی چاہتا ہو۔ وہ بھی ہمایوں سے کم کم ہی بات کرتی تھی۔

وہ ہیڈ فون لے کر واپس چلی گئی۔ وہ دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر لیٹ گئے۔ ٹینٹ کے روزن کا Cover ہٹا کر عادل نے باہر دیکھا۔ دور بلند و بالا نوبل راک ایک ہیولے کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ اس کی ٹاپ پر برف موجود تھی۔ بائیں طرف بھی برف دکھائی دیتی تھی لیکن باقی اطراف میں سنگلاخ پتھر تھے۔ آج خلافِ توقع آسمان صاف تھا۔ شہروں کے دھوئیں اور گرد سے پاک یہ آسمان گہرا سیاہ نظر آتا تھا اور اس پر ہزار ہا موتی جگمگا رہے تھے۔ یہ ستاروں کے جھرمٹ تھے۔ خیمے کے بچھونے پر لیٹے لیٹے عادل کو لگا جیسے نوبل راک ان ستاروں کو چھو رہی ہے...... عادل کو اس نوبل راک پر کمند ڈالنا تھی۔ پھر ان ستاروں کو توڑ کر لانا اور اپنی شہزادی کی مانگ میں بھرنا تھا اور ایسا کرتے ہوئے اس کی جان چلی گئی تو بھی پروا نہیں۔ زندگی یہیں پر تو ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ یہاں شہزادی سے مل نہ سکا تو پھر اگلی دنیا میں ملاقات کا انتظار کرے گا اور جب شہزادی اسے ملے گی۔ تو اسے بتائے گا۔ "شہزادی! میں نے اپنی سی پوری کوشش کی۔ اپنے جسم اور روح کی ساری توانائیاں تمہیں پانے کے لیے لگا دیں...... اب جو میرے بس میں ہی نہیں تھا، وہ کیسے کرتا۔ اب میں تمہارے سامنے ہوں، ہارا ہوا ضرور ہوں لیکن پشیمان نہیں ہوں۔"

ایسے ہی عجیب و غریب خیالوں میں غلطاں وہ سو گیا۔ سلیپنگ بیگ کی نرم ملائم گرمی نے نہ جانے کب تک اسے ڈھانپے رکھا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو مکمل خاموشی تھی۔ بس دور کہیں جنریٹرز کی مدھم گھوں گھوں سنائی دیتی تھی۔ اس نے رسٹ واچ دیکھی۔ رات کے ڈھائی بجے تھے۔ خیمے میں مدھم سی روشنی تھی۔ اس نے دیکھا ہمایوں بیٹھا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ وہیں لیٹے لیٹے عادل نے ذرا سا سر اُٹھایا اور دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ ایک انگلش کتاب تھی۔ تحریر کے

علاوہ اس پر اسکیچ بھی بنے ہوئے تھے۔ عادل نے ایک دو دفعہ پہلے بھی ہمایوں کے ہاتھ میں یہ کتاب دیکھی تھی۔ اس میں تین چار سو سال پہلے کے ہندوستان کے حالات و واقعات بیان کیے گئے تھے۔ عادل یہ دیکھ کر چونکا کہ خاموش طبع ہمایوں کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے ہیں۔ کتاب کا جو صفحہ اس کے سامنے تھا...... اس پر ایک الاؤ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس الاؤ میں سے کئی انسانی ہاتھ اوپر اُٹھے ہوئے تھے۔ جیسے آگ میں جلنے والے مدد کے لیے پکار رہے ہوں۔ ایک اور اسکیچ بھی تھا جس میں گھوڑے وغیرہ دکھائی دیتے تھے لیکن وہ ٹھیک سے عادل کو نظر نہیں آیا۔

پتا نہیں اس کتاب سے ہمایوں کو کیا وابستگی تھی۔ وہ جس طرح خود نا قابلِ فہم تھا، اسی طرح اس کی ترجیحات اور دلچسپیاں بھی پُر اسرار تھیں۔ اس کے بارے میں عادل کو اب تک جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، ان کے مطابق وہ چلاس اور اسکردو وغیرہ کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ اس کے والدین اس کے بچپن میں ہی اسے داغِ مفارقت دے گئے تھے۔ کچھ عرصہ دادی نے اس کی پرورش کی، پھر وہ بھی چل بسی۔ دس بارہ سالہ ہمایوں کو اپنے طور پر زندگی کے راستے بنانے پڑے۔ سخت محنت اور جاں فشانی اس کی گھٹی میں تھی۔ اس نے پہاڑوں کی دشوار گزار بلندیوں پر مختلف کام کیے۔ درخت کاٹے، شہد جمع کیا، کھالیں فروخت کرنے کے لیے جانوروں کا شکار کیا...... اور اس طرح کے بہت سے کام۔ وہ بلندیوں کا شناور ہو گیا۔ دشوار گزار پہاڑوں پر چڑھنا اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو گیا پھر اس کا رابطہ سرمد صاحب سے ہوا اور وہ مستقل طور پر ان کے زیرِ سایہ آ گیا۔ اس کے طور اطوار عجیب تھے، بہت کم بولتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے کہیں کھو جاتا تھا۔ کبھی کبھی تو عادل کو لگتا کہ وہ کوئی بھٹکی ہوئی روح ہے۔

وہ جس طرح کتاب میں کھویا ہوا تھا، عادل نے مخل ہونا مناسب نہیں سمجھا اور اسی طرح لیٹے لیٹے آنکھیں پھر بند کر لیں۔ کچھ دیر تک وہ اپنے گاؤں کے حالات اور واقعات کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہا پھر شہزادی کی صورت اس کی آنکھوں میں بس گئی اور وہ زیرِ لب شہزادی...... شہزادی پکارتے ہوئے دوبارہ سو گیا۔

اگلے روز نوبل راک کے عین نیچے اس کی ملاقات لیوپڈ سے ہوئی۔ اس وقت سرمد صاحب اور ہمایوں بھی عادل کے ساتھ تھے۔ لیوپڈ کے ساتھ بھی دو تین انگلش نوجوان تھے۔ کسرتی جسم والے لیوپڈ نے بڑی کینہ توز نظروں سے عادل کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک جگہ میڈیکل ٹیپ چپکی ہوئی تھی۔ گردن پر بھی چند دن پرانی چوٹ کے آثار تھے۔ یہ اس لڑائی کی نشانیاں تھیں جو ہوٹل کے آراستہ کمرے میں لیوپڈ اور عادل کے درمیان ہوئی تھی۔

لیوپڈ نے ایک جانب برف پر تھوکا اور سرمد صاحب سے مخاطب ہو کر انگریزی میں بولا۔ "تو یہ ہے وہ پاکستانی گوریلا جسے جناب، ہمارے مقابلے کے لیے چڑیا گھر سے نکال کر لائے ہیں۔ اس سے تو پہلے بھی جان پہچان ہے۔"

سرمد صاحب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "لیوپڈ! تمہیں اس طرح کسی کا مذاق اُڑانے کا حق نہیں ہے۔ مقابلے سے پہلے تم سب برابر ہو۔ مقابلے کے بعد ہی فیصلہ ہو گا کہ کون زیادہ عزت کا حق دار ہے اور کون نہیں۔"

"لیکن جناب! اس جوکر کو ہمارے مقابل کھڑا کرنے کے لیے تو آپ نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے نا۔ اب اگر یہ آپ کی توقعات پر پورا نہیں اُترا تو اس سے زیادہ بے عزتی آپ کو سہنا پڑے گی۔"

"میں ہر صورتِ حال کے لیے تیار ہوں۔" سرمد صاحب نے انگلش میں جواب دیا۔

"غالباً آپ کو اس سے زیادہ فرق بھی نہیں پڑتا۔ ایک پاکستانی کی حیثیت سے آپ اس کے عادی ہیں۔"

سرمد صاحب کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ عادل کو بھی اس کاٹ دار فقرے کی پوری طرح سمجھ آئی تھی۔ انگلش میں لیوپڈ نے کہا تھا...... ایز اے پاکستانی یو آر یوز ٹو۔ عادل کے سینے میں چنگاریاں سی بکھر گئیں۔

''تم اپنی زبان سنبھال کر بات کرو سفید بندر۔'' عادل اردو میں دھاڑا۔

لیوپڈ کا چہرہ بھی انگارہ ہو گیا۔ ''یو باسٹرڈ...... سن آف بچ۔'' وہ پھنکارا اور تیزی سے عادل کی طرف آیا۔ اس کا گھونسا عادل کی چھاتی پر لگا۔ لیوپڈ کے دو دوست بھی عادل کی طرف جھپٹے۔

سرمد صاحب بیساکھیوں کے سہارے آگے بڑھے اور اس کے سامنے آ گئے۔ ''رُک جاؤ...... رُک جاؤ۔'' وہ زور سے بولے۔

عادل جوابی حملے کے لیے تیار تھا لیکن ایک مسلح گارڈ نے اسے عقب سے دبوچ لیا۔ چند دوسرے گارڈز نے لیوپڈ اور اس کے دونوں ساتھیوں کو روک لیا۔ ہمایوں سمیت کئی افراد بیچ میں پڑ گئے اور یہ ہنگامہ سنگین صورت اختیار کرتے کرتے رہ گیا۔

بعدازاں ان مقابلوں کے کرتا دھرتا لارڈ اوتس ماؤنٹنے اور دیگر معززین میں ایک میٹنگ ہوئی۔ سر سرمد بھی اس میں شریک ہوئے۔ ایک ضابطہ اخلاق بنایا گیا اور طے ہوا کہ اگر کوئی بھی فرد رولز کی خلاف ورزی کرے گا تو اس کے خلاف کارروائی ہو گی وغیرہ وغیرہ۔

اگلے روز عادل نے سر سرمد کی زیرِ نگرانی پہلی بار مشق میں حصہ لیا۔ اس نے پہلی دفعہ نوبل راک کو بالکل قریب سے دیکھا۔ اسے سرمد صاحب کی دوراندیشی کا اعتراف کرنا پڑا۔ یہ نوبل راک نوے پچانوے فیصد اسی چٹان سے ملتی تھی جس میں وہ پچھلے سفر میں مسلسل مشق میں مصروف رہے تھے۔ عادل کو بالکل اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ اس چٹان کی اصل چڑھائی قریباً 1600 فٹ تھی۔ پتھروں کی ایک عمودی دیوار تھی جس میں جگہ جگہ دراڑیں تھیں۔ کلائمبر کو ان دراڑوں میں ہاتھوں کی انگلیاں اور پاؤں کی ٹوہ پھنسا پھنسا کر آگے بڑھنا ہوتا تھا۔ قریباً بیس بیس فٹ کے فاصلے پر اینکر پوائنٹس پہلے سے موجود تھے۔ ان پوائنٹس سے رسے کو منسلک کر دینے کے بعد کوہ پیما کو گرنے سے تحفظ ملتا تھا۔ کوہ پیماؤں کے مسلسل چڑھنے، اُترنے سے چٹان پر نشان سے بن گئے تھے جو فاصلے سے دیکھنے پر لکیروں کی طرح نظر آتے تھے۔ اس دن عادل نے چار پانچ گھنٹے تک مسلسل مشق کی۔ وہ ایک بار راک کی چوٹی تک پہنچا اور دو بار آدھا آدھا سفر کیا۔ پسینہ اس کے جسم سے دھاروں کی صورت بہا تو اس کا جسم کھلنے لگا۔ وہ ہاتھ پاؤں کو زیادہ تیزی سے حرکت دینے کے قابل ہو گیا۔ اسے دیکھنے والے غیر ملکی چونک گئے اور انہیں اندازہ ہو گیا کہ سرمد صاحب کسی معمولی لڑکے کو لے کر نہیں آئے۔

مشق ختم کرنے کے بعد جب وہ پسینے سے شرابور سرمد صاحب کے پاس آیا تو ان مقابلوں کے کرتا دھرتا لارڈ اوتس بھی اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ سرمد صاحب کے ساتھ بیٹھے تھے۔ لمبی ناک اور عقابی آنکھوں والے لارڈ اوتس نے بڑی فراخ دلی سے عادل کی کارکردگی کو سراہا اور امید ظاہر کی کہ وہ اپنے حریفوں کو ٹف ٹائم دے گا۔

موسم نہایت خوشگوار تھا۔ سہ پہر کے وقت تیز دھوپ نکل آئی۔ برف پوش وادیاں اور چوٹیاں دمک اُٹھیں۔ کرسٹل بہت چست لباس میں نظر آئی۔ سلیولیس شرٹ اور شارٹ پہنے وہ جاگنگ کے لیے تیار دکھائی دیتی تھی۔ عادل نے اسے ایک طرف لے جا کر بیٹھنے کو کہا۔ وہ بیٹھ گئی تو عادل بولا۔ ''کرسٹل! تم نے پچھلے چند ہفتوں میں خود کو کافی بدلا ہے۔ میں

چاہتا ہوں کہ تم ڈریسنگ کے سلسلے میں بھی احتیاط شروع کرو۔ لباس جسم چھپانے کے لیے ہوتا ہے، نمایاں کرنے کے لیے نہیں۔''

''ہام نے کیا کیا؟'' وہ اپنی نیلی آنکھیں جھپک کر بولی۔

''خود کو آئینے میں دیکھو اور خود سے پوچھو۔'' عادل نے اس کے بالائی جسم سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ دیر مسکراتی نظروں سے عادل کو دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''او کے...... تو م کہتا تو ہام اس بارے میں چینج لاتا۔ آر یو ہیپی؟''

''یس۔''

''لیکن تو م کو بھی ہام کا ایک بات پر دھیان دینا ہوئیں گا۔''

''ہاں کہو۔''

وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''لیوپڈ اور اس کے فرینڈز کی طرف سے بہت ہوشیار رہنا ہوئیں گا۔ وہ تو م کا کوئی نقصان کر سکتا۔ تو م کو کھانے پینے میں بھی بہت بہت...... وہ اٹک گئی۔

''...... احتیاط کرنا چاہیے۔'' عادل نے اس کا فقرہ مکمل کیا۔

''یس...... ہام یہی کہنا مانگتا۔''

اسی دوران میں انگلش لڑکے لڑکیوں کی ایک ٹولی وہاں پہنچ گئی انہوں نے کرسٹل کو بتایا کہ شام کو ڈانس پارٹی ہے۔ وہ بھی ضرور انجوائے کرے۔

کرسٹل نے بہانہ بنایا کہ اس کے گھٹنے میں درد ہے۔

ایک لڑکی زور سے ہنسی اور بولی۔ ''اتنی بڑی فزیوتھراپسٹ کے اپنے گھٹنے میں درد ہے۔ اب ہم بیچاروں کا کیا ہو گا۔''

○......❖......○

شام کو واقعی جنگل میں منگل کا سماں ہو گیا۔ پورٹرز کے خیموں کے پاس سے بہت سی خشک لکڑیاں لا کر کیمپ کے بیچوں بیچ ایک انبار سا لگا دیا گیا۔ اندھیرا گہرا ہوا تو انبار کو آگ دکھا دی گئی۔ ایک بڑا الاؤ روشن ہو گیا۔ انگریز خواتین و حضرات نے اس الاؤ کے گرد ڈیرے ڈال لیے۔ باربی کیو ہونے لگا۔ میوزک کی دھما دھم گونجنے لگی۔ نوجوان تھرکنا شروع ہو گئے۔ سرمد صاحب، عادل اور ہمایوں وغیرہ اس ہنگامے سے علیحدہ ہی رہے۔ کرسٹل وہاں چلی ضرور گئی لیکن ایک طرف بیٹھی رہی...... حیران کن طور پر اپنے والد اور سوتیلی والدہ سے اس کی بات چیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ روایت پسند انگریز باپ یقیناً بیٹی کی بغاوت سے نالاں تھا۔ ویسے بھی اب کرسٹل بہت بدلی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس پر مشرقی رنگ غالب آنے لگا تھا۔ دوسری لڑکیوں کی نسبت اس کا لباس بھی معقول تھا۔ وہ تو تقریباً نیم عریاں ہو رہی تھیں۔ اپنے بڑوں کے سامنے ہی اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ اٹکھیلیوں میں مصروف تھیں۔ جوں جوں رات ہوتی گئی، محفل جوبن پر آتی گئی۔ وہسکی اور واڈ کا کے پیگ چکرا رہے تھے۔ الکحل اپنا رنگ جما رہی تھی۔ نشیلے قہقہوں کی آوازیں بتدریج بلند ہونے لگیں۔ اب کچھ بڑی عمر کے لوگ بھی ترنگ میں آ کر تھرکنے لگے تھے۔ پورٹرز اور دیگر مقامی لوگوں کو اس جگہ سے کافی دور

رکھا گیا تھا۔

محفل عروج پر پہنچی تو لارڈ اوٹس خیموں کی طرف آئے اور سرمد صاحب سمیت ان دونوں کو بھی کھینچ کھانچ کر الاؤ کے پاس لے گئے۔ میوزک کی دھما دھم اب بہت بلند ہوگئی تھی۔ لڑکے لڑکیوں کا ایک گروہ دیوانہ وار ناچ رہا تھا۔ نیم عریاں جسم سازوں کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ مچل رہے تھے اور دعوتِ نظارہ دے رہے تھے۔ اچانک عادل کو ہمایوں کا خیال آیا۔ وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایسے ہنگاموں سے ہمیشہ دور رہتا تھا۔ خاص طور سے آگ کے گرد بیٹھنا تو اسے کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ شروع میں عادل کا خیال تھا کہ شاید سرمد صاحب کے فلسفے کے مطابق اسے سردی جھیلنا پسند ہے...... اور جب ناقابلِ برداشت ٹھنڈ میں آگ کی راحت میسر ہوتی ہے تو وہ سرمد صاحب ہی کی طرح اس سے دور رہتا ہے لیکن پھر اسے اندازہ ہوا کہ ایسا نہیں ہے۔ اسے ویسے ہی انگیٹھی، آتش دان اور الاؤ وغیرہ پسند نہیں تھے۔

اب وہ خاموشی سے کہیں کھسک گیا تھا۔ عادل اُٹھا اور اس کی تلاش میں نکلا۔ وہ ٹینٹ میں بھی نہیں تھا۔ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے عادل کیمپ سے آگے تاریکی میں نکل آیا۔ جنریٹرز کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ ڈھلوان پر آ گیا۔ ہمایوں اگر کیمپ سے باہر آیا تھا تو اسی رُخ پر گیا تھا۔ دوسری طرف تو پورٹرز کے خیمے تھے اور جانوروں کے سائبان وغیرہ بنے ہوئے تھے۔ ٹارچ عادل کے ہاتھ میں تھی۔ یہاں چھوٹی بڑی چٹانیں تھیں اور برف کے تودے تھے۔

اچانک عادل نے ہمایوں کو دیکھ لیا۔ پہلے عادل کو اس کے پاؤں ہی نظر آئے۔ وہ ایک پتھر کے پیچھے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ہمیشہ کی طرح گم صم اور کھویا ہوا۔ عادل کو دیکھ کر وہ ذرا چونکا۔ عادل اس کے قریب ہی ایک ہموار پتھر پر بیٹھ گیا۔

''یار! تم کیوں کرتے ہو ایسا، ایک دم ہی الگ تھلگ سے ہو کر رہ جاتے ہو؟'' عادل نے پوچھا۔

''بس عادت سی ہوگئی ہے۔'' وہ حسبِ عادت ہولے سے بولا۔

''ہر عجیب عادت کے پیچھے کوئی وجہ ہوتی ہے اور تمہاری بہت سی عادتیں عجیب ہیں۔''

''بس، تمہیں لگتا ہوگا۔''

''نہیں ہمایوں بھائی! ایسا ہے...... بالکل ہے...... اب اپنی یہی عادت دیکھو۔ میں نے بہت دفعہ نوٹ کیا ہے کہ سخت سردی کے باوجود تم آگ کے پاس بیٹھنا پسند نہیں کرتے۔ ایک دم بدک سے جاتے ہو۔ جیسے کوئی ڈر بیٹھا ہوا ہو تمہارے دماغ میں۔''

وہ چونک سا گیا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا پھر بولا۔ ''تم کیوں رہتے ہو ہر وقت میری کھوج میں...... اس سے کیا ملے گا تمہیں؟''

''ہمایوں بھائی! جس کے ساتھ اتنا وقت گزرا ہو، اس کے بارے میں جاننے کو دل تو چاہتا ہی ہے نا...... اور پھر یہ بھی تو کہتے ہیں کہ کبھی کبھی بندہ دیواروں سے بات کر کے بھی اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تم مجھ سے بات کرو تو اس بات میں سے کوئی اچھی بات نکل آئے۔''

اس نے عجب یاس بھرے انداز میں سر کو نفی میں ہلایا۔ ''کوئی اچھی بات نہیں نکلے گی عادل! یہ بہت پرانی باتیں ہیں۔ ان پر بس اب افسوس ہی کیا جاسکتا ہے یا آہیں بھری جاسکتی ہیں۔ گزرے دنوں کا نوحہ سنانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ چلو چھوڑو، کوئی اور بات کرو۔''

''اچھا...... چلو یہ آگ والی بات تو بتاؤ۔ اتنا الرجک کیوں ہو؟ کیا کوئی واقعہ ہے اس کے پیچھے؟'' عادل نے اسے دوسری طرح سے گھیرنے کی کوشش کی۔

ہمایوں کے ہونٹوں پر بے ساختہ ایک غیر محسوس مسکراہٹ کھیل گئی۔ ''تم بڑے ضدی ہو عادل......''

''تم جو بھی کہہ لو، ہمایوں بھائی۔''

وہ پتھر سے ٹیک لگائے دور کہیں بلند و بالا چوٹیوں کے ہیولوں کی طرف دیکھتا رہا۔ ان کے اوپر تاریک آسمان تھا اور چمکتے ستارے۔ آج اس کا موڈ کچھ عجیب سا تھا۔ عادل کے دل نے گواہی دی کہ شاید وہ کچھ بتائے گا۔ اس نے حسبِ عادت کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ''تم بانگڑی کے پیچھے بسنے والے پاؤندوں کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''یہی کہ وہ خانہ بدوش لوگ تھے جو یہاں آ کر پکے پکے آباد ہوگئے ہیں۔''

''نہیں عادل!'' وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ''ان میں سے کچھ خاندان خانہ بدوش ضرور ہوں گے لیکن ان میں سے اکثر وہی لوگ ہیں جنہوں نے کوئی ساڑھے تین سو سال پہلے راجپوت بستی پر حملہ کیا اور اسے تہس نہس کر دیا تھا۔''

''کیا مطلب ہمایوں بھائی؟''

''یہ انہی بے رحم لوگوں کی نسل ہے عادل! تمہیں سارا واقعہ معلوم ہی ہے۔ ہندو سردار وشوا ناتھ نے قبیلے کی ایک لڑکی سے زبردستی شادی رچانا چاہی تھی۔ راجپوت سرتاپا مزاحمت بن گئے تھے۔ کچھ نیک دل مسلمانوں نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا مگر ہندو سالار کی طاقت کے سامنے ان کی پیش نہیں چلی تھی۔ وہ سب ملیا میٹ ہوگئے تھے۔''

''ہاں، میں نے یہ سارا واقعہ سنا ہوا ہے لیکن...... ہمایوں بھائی...... تم سے اور تمہاری اُداسی سے اس کا کیا تعلق؟''

ہمایوں کی آنکھوں میں آنسو چمکے۔ وہ عجیب انداز میں بولا۔ ''میرا تعلق کیوں نہیں ہے؟ میرا تعلق ہے...... وہ...... وہ میری ہی کچھ لگتی تھی جس نے...... جس نے......'' بولتے بولتے اس کا گلا رندھ گیا۔ وہ چپ ہوگیا۔ اس کے سارے جسم پر لرزہ سا طاری تھا۔ پھر وہ ایک دم ہچکیوں سے رونے لگا۔ اس نے اپنا سر اپنے اوپر اُٹھے ہوئے گھٹنوں میں چھپا لیا۔

عادل ہکا بکا تھا۔ وہ عجیب جذباتی انداز میں بولا۔ ''وہ میری ہی کچھ لگتی تھی جس نے...... اپنے دو سال کے بیٹے کو گلے سے لگا لگا کر چوما تھا اور پھر روتی ہوئی...... اور چلاتی ہوئی...... اور اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتی ہوئی چلی گئی تھی...... آگ میں کودنے کے لیے، جل مرنے کے لیے...... اور وہ مر گئی تھی، بہت سی دوسری لڑکیوں اور عورتوں سمیت مر گئی تھی۔ اس کی آخری آوازیں اب تک میرے کانوں میں گونجتی ہیں، میری روح میں چھید کرتی ہیں۔ وہ اپنے خاوند سے کہہ رہی تھی...... میرے بچے کا دھیان رکھنا، اس کے دودھ کا دھیان رکھنا...... اور اس کی دوائی کا...... اور اسے بہت پیار دینا۔ یہ میری نشانی ہے تمہارے پاس۔''

''اور وہ چلی گئی تھی اور ایک دن بعد وہ بھی چلا گیا تھا جسے وہ نشانی سونپ کر گئی تھی۔ وشوا ناتھ کے سپاہیوں سے لڑتے لڑتے اس نے بھی جان دے دی تھی۔''

وہ گھٹنوں میں سر دیئے سسکتا رہا۔ سناٹے میں اس کی آواز پھیلتی اور درد کو بڑھاتی رہی۔ دور کیمپ کے اندر موسیقی کی لہریں ڈوبتی اور اُبھرتی رہیں۔ الاؤ کی سرخ روشنی دکھائی دیتی رہی۔ عادل بخوبی جانتا تھا کہ ہمایوں کا اشارہ کس واقعے کی طرف ہے۔ وہی سانحہ جب بہادر راجپوتوں نے اپنی عزت آبرو بچانے کے لیے اپنی نوجوان عورتوں کو آگ میں ڈال دیا

تھا اور خود سر تے ں پر رکھ کر لڑنے کے لیے نکل پڑے تھے۔

ایک دم عادل کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آیا کہ ہمایوں کے پاس انگریزی زبان کی جو تاریخی کتاب ہے اس میں بھی ایک بڑے الاؤ کا اسکیچ ہے اور کل رات بھی اس نے ہمایوں کو اسی اسکیچ کو دیکھتے اور اشک بار ہوتے پایا تھا۔ کڑی سے کڑی مل رہی تھی۔ پھر ایک اور بات عادل کو یاد آئی اور وہ مزید حیران ہوا۔ اس کی معلومات کے مطابق ہمایوں بھی راجپوت تھا۔ تو کیا...... کسی طور اس کا نسب انہی راجپوتوں سے جا ملتا تھا جو وشوا ناتھ سے لڑ مرے تھے؟

عادل کے ذہن میں اُٹھنے والے خیالات جیسے ہمایوں نے پڑھ لیے۔ بالکل ٹیلی پیتھی جیسا عمل جو اکثر ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہمایوں نے اپنا سر گھٹنوں پر سے اُٹھایا۔ ٹانگیں سیدھی کیں اور ایک بار پھر پتھر سے ٹیک لگا لی۔ دور خلا میں دیکھتے ہوئے قدرے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ایسا مت کہو عادل کہ میرا تعلق نہیں...... میری رگوں میں اسی راجپوت قبیلے کا خون ہے۔ جو چند بچے اور لڑکے کسی طرح بچ رہے تھے، وہ پہاڑوں کی طرف نکل گئے۔ پھر ایک اور راجپوت قبیلے نے انہیں اپنی پناہ میں لے لیا۔ وہ بڑے ہوئے، ان کی شادیاں ہوئیں۔ نسل آگے چلنے لگی۔ چند نسلوں بعد کئی خاندان آباد ہو گئے۔ اورنگ زیب سے بعد کے زمانے میں کچھ خاندانوں نے اسلام قبول کر لیا اور چلاس وغیرہ کی طرف نکل گئے۔ میں نے اپنی ساری خاندانی تاریخ پڑھی ہوئی ہے عادل! اور میری یہی باخبری ہے جو مجھے ہمیشہ سے بے قرار رکھتی ہے۔ میرے بڑوں کے قاتل انہی پاؤندوں میں سے ہیں...... میں ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو میری رگوں میں انگارے سے جلنے لگتے ہیں۔“ عادل حیران تھا۔ اس نے یہ واقعہ سنا ہوا تھا لیکن یہ تو اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ مرمٹنے والے اسی راجپوت قبیلے سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص بھی اسے کبھی ملے گا۔ وہ خود کو ان کی اولاد بتائے گا۔

عادل نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ہمایوں بھائی! یہ بہت پرانی باتیں ہیں اور سچ یہ ہے کہ میں اس بارے میں تمہیں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔“

وہ بدستور کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ”کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جو کچھ انسان کے خون میں ہوتا ہے، وہ ایک کے بعد دوسری نسل کی طرف چلتا رہتا ہے۔ ایک نسل اپنی آنے والی نسل کو اپنا غصہ، اپنا پیار، اپنا انتقام اور اپنے ادھورے کام...... بہت کچھ دیتی ہے۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ کسی شخص کو کوئی الہام قسم کی چیز ہوئی اور...... اس نے اپنے دادا یا پردادا...... وغیرہ کا کوئی چھوڑا ہوا کام مکمل کیا۔ کیا تم ایسی باتوں پر یقین رکھتے ہو؟“

”تمہیں معلوم ہے ہمایوں بھائی! میں بہت پڑھا لکھا نہیں ہوں ایسی باریکیاں میری سمجھ میں نہیں آسکتیں۔“

”تم زیادہ پڑھے لکھوں سے کہیں زیادہ سوچ سکتے ہو اور اچھا سوچ سکتے ہو۔“ ہمایوں نے اس کی تعریف کی۔ پھر دوبارہ گہری سوچ میں گم ہو کر بولا۔ ”عادل! میں تمہیں اپنے دل کی باتیں بتا رہا ہوں اور پوری سچائی سے بتا رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ کوئی ہر وقت میرے ارد گرد رہتا ہے، مجھے اپنی مظلومیت کے بارے میں بتاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں اس کے خون کو رائیگاں نہ جانے دوں کیونکہ جب خون رائیگاں جاتا ہے تو پھر انسانیت بھی رائیگاں ہونے لگتی ہے۔“

برفانی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی لیکن وہ دونوں سرمد صاحب کی صحبت میں رہ کر سردی گرمی و بھوک پیاس کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ یہ چیزیں اب ان پر کچھ خاص اثر نہیں کرتی تھیں۔ خاص طور سے ہمایوں تو ایک بالکل مختلف سانچے میں ڈھل چکا تھا۔ اس نے کھوئے کھوئے انداز میں اپنی بھاری بھرکم جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈالا اور وہی کتاب نکال لی جسے

وہ اکثر دیکھتا تھا۔ اس نے عادل کو پنسل ٹارچ روشن کرنے کا اشارہ کیا۔ عادل نے ٹارچ روشن کی۔ ہمایوں نے کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے، ایک آرٹیکل نکالا۔ آرٹیکل کا عنوان کچھ اس طرح تھا کے ٹو کے دامنوں میں دو ہزاری سردار وشوا ناتھ کی ظلم کہانی۔ اس آرٹیکل میں کچھ نفیس پنسل اسکیچز بھی تھے۔ ان میں وہ الاؤ والا اسکیچ بھی تھا۔ کچھ مناظر جنگ و جدل کے تھے۔ ایک منظر میں ایک جواں سال عورت اپنے دو ڈھائی سال کے بچے کی طرف بازو پھیلا رہی تھی اور رو رہی تھی۔ چند بڑی عمر کی عورتیں جواں سال عورت کو کھینچ کر بچے سے دور لے جا رہی تھیں۔ ان عورتوں کے چہرے بھی الم کی تصویر تھے۔ بچہ اور بچے کا والد بھی رو رہے تھے۔

ہمایوں نے کہا۔ ”دیکھو اس عورت کو۔ یہ میری کچھ تو لگتی تھی نا۔ میری دادی کی دادی یا پھر اس کی دادی یا پڑدادی لیکن یہ ہے تو میرا ہی خون۔ اس کا چہرہ دیکھو، اس کا غم اور بے بسی دیکھو۔ عادل! آخر کیوں ہوتے ہیں ایسے ظلم؟ کیوں جنگ کے نام پر بہادر سورما ہمیشہ سے عورتوں کو پامال کرتے رہے ہیں؟ میں جب بھی اس عورت کو دیکھتا ہوں عادل! مجھے لگتا ہے...... یہ یہیں کہیں میرے آس پاس موجود ہے۔ ایک روح کی طرح بھٹک رہی ہے۔ مجھے کہہ رہی ہے...... تُو جو بھی ہے، جس مذہب سے بھی ہے، جس خاندان سے بھی ہے، تُو میرا بچہ ہے...... تیری ماں کے ساتھ ظلم ہوا تھا۔ انہی پاؤندوں نے کیا تھا۔ ہم امن سے رہ رہے تھے۔ ہماری کھیتیاں ہری تھیں۔ ہماری گلیوں میں ہمارے بچوں کی چہکاریں گونجتی تھیں۔ ہم کسی کے دشمن نہیں تھے۔ ہم پر بے وجہ زندگی کے دروازے بند کیے گئے۔ ہمیں بے بس کیا گیا۔ اس حد تک مجبور کیا گیا کہ ہم اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لے لیں۔ اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لینا کوئی آسان ہوتا ہے میرے بچے؟ اس ظلم کو بھول نہ جانا۔ ہمیں فراموش نہ کر دینا...... ہاں عادل! یہ تصویر کہتی ہے مجھ سے...... یہ کہتی ہے۔“

عادل نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ”لیکن...... ہمایوں بھائی...... یہ بات تو آپ مانو گے نا...... کہ یہ باتیں پرانی ہو چکی ہیں۔“

وہ تیزی سے بات کاٹ کر بولا۔ ”باتیں پرانی ہو چکی ہیں لیکن بدلا کچھ نہیں ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں۔ ان کی رگوں میں وہی بے رحم خون لہریں لے رہا ہے۔ ان کو جب بھی موقع ملے گا پھر ایسی ہی درندگی دکھائیں گے۔ پھر میری ماں کو اس حد تک مجبور کر دیں گے کہ وہ اپنے روتے بلکتے بچے کو چھوڑ کر آگ میں کود جائے۔ اپنے ہنستے بستے گھر کو الوداع کہہ دے۔ یہ پھر اسے مجبور کر دیں گے۔“ وہ جیسے نیم دیوانگی کے عالم میں بول رہا تھا۔ اس کی انگلیاں بے ساختہ عورت والے اسکیچ پر گردش کر رہی تھیں۔

عادل نے ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ہمایوں بھائی! یہ عورت بے شک تمہارے آباؤ اجداد میں سے ہے لیکن تمہاری ماں تو نہیں ہے نا۔ تم......“

”ماں نہیں ہے...... ماں نہیں ہے۔“ اس نے پھر تیزی سے عادل کی بات کاٹی۔ ”لیکن ماں جیسی تو ہے نا اور مائیں سب ایک ہی جیسی ہوتی ہیں۔ ان کے سینوں میں ایک ہی طرح کے دل دھڑکتے ہیں۔ ٹھہرو، میں تمہیں دکھاتا ہوں۔ دکھاتا ہوں میں تمہیں۔“

اس نے ایک بار پھر اپنی جیکٹ کے اندرونی حصے میں ہاتھ گھمایا اور اپنا چرمی پرس نکال لیا۔ پرس کے بیرونی خانے میں ایک جواں سال عورت کی تصویر تھی۔ وہ سر پر پھول دار اوڑھنی لیے اپنے تین بچوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ عادل نے

پنسل ٹارچ کی روشنی میں فوراً پہچان لیا۔ ان میں سے سات آٹھ سالہ ایک بچہ یقیناً ہمایوں تھا۔ وہ بولا۔ ''دیکھو، یہ ہے میری ماں...... اور یہ ہے اس اسکیچ میں دوسری ماں کیا تمہیں ان کی شکلیں ملتی ہوئی نہیں لگتیں؟ ان کی آنکھیں، ان کے ہونٹ...... ان کے سینے، ممتا کے جذبے سے بھرے ہوئے، اپنی اولاد پر سب کچھ قربان کر دینے کے جذبے سے سرشار۔ یہ دونوں مائیں اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ایک اپنی طبعی موت مری لیکن دوسری کی موت طبعی نہیں تھی۔ وہ جوان تھی، تندرست تھی۔ ابھی تو اس نے بس جینا شروع کیا تھا...... اسے مجبور کیا گیا کہ وہ موت کو گلے لگائے...... ہاں دیکھو اس کو غور سے، یہ میری ماں نہیں تھی لیکن ماں جیسی تو تھی۔''

عادل واقعی حیران ہوا۔ دونوں عورتوں کے خدوخال اور ڈیل ڈول میں بہت مماثلت تھی۔ ظاہر ہے دونوں ایک ہی نسل اور لڑی کی عورتیں تھیں۔

اچانک عادل کو اپنی پنسل ٹارچ بجھانا پڑی۔ اسے شک ہوا کہ کوئی ان پتھروں کی طرف آ رہا ہے۔ اگلے دو تین منٹ میں یہ شک درست ثابت ہو گیا۔ قدموں کی آہٹ واضح ہوئی۔ پھر دو ہیولے نظر آئے۔ یہ ایک لڑکی لڑکا تھے۔ عادل اور ہمایوں بے حس و حرکت اس سات آٹھ فٹ اونچے پتھر کی اوٹ میں بیٹھے رہے۔ لڑکی لڑکا انگریز تھے اور نشے میں مست دکھائی دیتے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ لڑکی نے کسی بات پر ہلکا سا قہقہہ لگایا، جواب میں لڑکا بھی ہنسا اور انگلش میں بولا۔ ''اب کتنی دور جاؤ گی؟ کوئی بھیڑیا کھا جائے گا تمہیں؟''

''بھیڑیا تو میرے ساتھ ہی ہے۔'' لڑکی نے شرارت سے کہا۔

''او یو بچ۔'' لڑکے نے بہکی آواز میں کہا اور لڑکی پر چڑھ دوڑا۔ دونوں ایک پتھر کی اوٹ میں گرے اور گتھم گتھا ہونے لگے۔ لڑکی کی مدھم ہنسی ڈوبنے اُبھرنے لگی۔

عادل سناٹے میں تھا۔ اس نے آواز پہچان لی تھی۔ یہ لیوپڈ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ لڑکی کی آواز بھی عادل کے لیے اجنبی نہیں تھی...... یہ لارڈ اوٹس ماؤنٹے کی نوجوان بیٹی ڈورتھی تھی۔ وہی اونچی ناک اور بڑی آن بان والا لارڈ اوٹس۔

پتھر کے پیچھے شراب بولتی رہی اور جسم کی بھوک ہانپتی رہی۔ الکحل نے شاید ان دونوں کے بدن میں آگ بھر رکھی تھی۔ ورنہ یہ سردی اور یہ کھلا آسمان اس قسم کی مصروفیت کے لیے ہرگز موزوں نہیں تھا۔ ایک بار تو عادل کا دل چاہا کہ وہ لیوپڈ کے سر پر پہنچ جائے اور اس کو ایک زوردار ٹانگ جما کر کہے۔ ''بدبخت! تُو تو کرسٹل سے محبت کا دعویدار ہے۔ یہاں اس حرافہ کے ساتھ لیٹ کر اس محبت کی شان میں کون سا اضافہ فرما رہا ہے۔'' لیکن پھر اس نے ضبط کیا اور اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ دور کیمپ میں ابھی تک گٹار اور ڈرم بج رہے تھے۔ نہ جانے پتھر کے پیچھے حرص و ہوس کا مکروہ کھیل کب تک جاری رہتا لیکن پھر دو تین اور بدمست نوجوان وہاں پہنچ گئے۔ دور سے انہوں نے لیوپڈ کا نام لے کر آوازیں دیں۔ عادل اور ہمایوں کو لیوپڈ کی جھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''ان باسٹرڈز کو بھی ابھی آنا تھا۔''

چند سیکنڈ بعد لیوپڈ اور ڈورتھی کے ہیولے نظر آئے۔ انہوں نے اپنے لباس درست کیے اور واپس تو دوں اور پتھروں کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔

اب ہوا کے جھکڑ تیز ہو گئے تھے۔ ان دونوں نے بھی گفتگو کا سلسلہ منقطع کرنا مناسب سمجھا۔ ہمایوں نے مڑ کر دیکھا۔ کیمپ میں الاؤ کی روشنی اب بالکل ماند پڑ چکی تھی۔ اس صورت حال نے اس کی بے قراری میں کمی واقع کی۔ دونوں اُٹھ کر خیموں کی طرف چل دیئے۔

صبح بہت چمکیلی اور خوشگوار تھی۔ برفانی پہاڑوں کا یخ بستہ اندھیرا دھیرے دھیرے اُجالے میں ڈھل رہا تھا۔ کیمپ میں سب سے پہلے جاگنے والے عام طور پر سرمد صاحب، عادل اور ہمایوں وغیرہ ہی ہوتے تھے۔ سرمد صاحب تو اپنی ٹانگ کی وجہ سے صبح کی دوڑ میں حصہ نہیں لے سکتے تھے، تاہم کرسٹل، عادل اور ہمایوں یہ روٹین بحال رکھے ہوئے تھے۔

آج عادل زیادہ ہی جلدی اُٹھ گیا۔ اس نے ٹینٹ کے روزن سے Cover ہٹا کر باہر جھانکا۔ شفاف آسمان پر سفید بادل کا ایک ٹکڑا تیر رہا تھا۔ ٹکڑے نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنی شکل بدلی اور کسی ایسی دوشیزہ کی طرح دکھائی دینے لگا، جس کے کھلے بال تیز ہوا میں لہرا رہے ہوں۔ نہ جانے کیوں عادل کو یکایک شہزادی یاد آ گئی۔ تایا کے باغ میں پیش آنے والے واقعات عادل کے ذہن پر نقش ہو چکے تھے۔ وہ منظر اسے بھلائے نہیں بھولتا تھا، جب وہ احاطے میں داخل ہوا تھا اور شہزادی نے اسے حیران نظروں سے دیکھا تھا۔ اس کے حسین بال ایسے ہی ہوا میں حرکت کر رہے تھے۔ چند لمحوں کے لیے تو بالکل یہی لگا تھا کہ وہ سب کچھ بھول بھال کر عادل کی طرف لپکے گی اور اس کے سینے سے لگ جائے گی اور شاید اس نے اپنی جگہ سے ذرا سی حرکت بھی کی تھی لیکن پھر زمانہ دیوار بن گیا تھا اور وہ جیسے کسی حسین سپنے سے ایک دم جاگ اُٹھی تھی۔

عادل کو آج کل دن رات اس کی فکر کھائے جاتی تھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہاں لالی اور پال پور گاؤں میں کیا ہو رہا ہے...... اور کون کر رہا ہے۔ یکایک وہ اپنے خیالات سے چونکا۔ ٹینٹ سے باہر کرسٹل کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو عاڈل! ٹائم ہو گیا۔ توم جاگ جاؤ۔''

عادل نے ہمایوں کو جگایا اور خود بھی جیکٹ پہنتا ہوا ٹینٹ سے باہر آ گیا۔ جوگرز اس کے ہاتھ میں تھے۔ کرسٹل اب ایک دو روز سے بہتر لباس میں نظر آ رہی تھی۔ چست پتلون کی جگہ بھی اب ''بیگی ٹائپ'' ٹراوزرز نے لے لی تھی۔ عادل بولا۔ ''کرسٹل! میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ میں نے الارم لگایا ہوتا ہے، تم فکر نہ کیا کرو۔''

وہ ہولے سے مسکرائی۔ ''ہام فکر کیوں نہ کرے۔ ہام کا سارا ہوپ توم ہی تو ہو۔ توم ہی ہو جو ہام کی لائف کو لیوپڈ والی دلدل سے نکال سکتے ہو۔''

عادل نے جوگرز پہنتے ہوئے کہا۔ ''ہمارا کام تو دل و جان سے کوشش کرنا ہوتا ہے کرسٹل! کامیابی اور ناکامی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔''

''شاید یہی وجہ ہے کہ آج کل گاڈ پر ہام کا ٹرسٹ بہت بڑھ گیا ہے۔ ہام نے کل ''ایوننگ'' میں توم کے طریقے کے مطابق پوجا بھی کیا۔''

''خدا کا خوف کرو۔ اسے پوجا نہیں...... عبادت کہتے ہیں...... نماز کہتے ہیں۔''

''سوری...... سوری۔ ہام نے غلط بولا۔ ہام مافی مانگتا۔''

''اب پھر غلط بول رہی ہو۔ تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا۔'' عادل نے کہا۔

اس دوران میں ہمایوں بھی ٹینٹ سے باہر آ گیا۔ پورا کیمپ سو رہا تھا۔ رات کو جو الاؤ بھڑکایا گیا تھا، وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ کوئلوں اور راکھ کے چاروں طرف وہسکی اور واڈکا کی خالی بوتلیں بکھری ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں باربی کیو کی ہڈیاں بھی

نظر آ رہی تھیں۔ انگریز فیملیز کے خیموں سے باہر گارڈز پہرا دے رہے تھے۔

ایک گارڈ ٹہلتا ہوا ان کے پاس آیا اور اس نے کرسٹل سے انگلش میں پوچھا۔ ''میم، کچھ پتا چلا ان لوگوں کا؟''

''کن لوگوں کا؟'' کرسٹل نے غیر ملکی گارڈ سے اُلٹا سوال کیا۔

''آپ کو پتا نہیں...... رات کو کیا خبر پھیلی تھی؟''

''نہیں۔''

غیر ملکی گارڈ مؤدب انداز میں بولا۔ ''گلیشیئر کی طرف کچھ مقامی لوگ دیکھے گئے تھے...... ان کا رُخ اُدھر نوبل راک کی طرف تھا۔''

''ہوسکتا ہے کوہ پیما ہوں۔'' ہمایوں نے کہا۔

''نہیں سر! ان کے پاس شاید ہتھیار وغیرہ بھی ہیں۔''

''تو شکاری ہوسکتے ہیں۔ نیچے گلیشیئر کی طرف شکار وغیرہ مل جاتا ہے۔''

گارڈ بولا۔ ''رات تو ہم پریشان ہوگئے تھے کہ کہیں فنکشن ہی خراب نہ ہو جائے لیکن تھینکس گاڈ...... خیریت گزری۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی اور طرف نکل گئے ہوں یا پھر انفارمر کو ہی غلطی ہوئی ہو۔''

کچھ دیر بعد عادل، ہمایوں اور کرسٹل جاگنگ کے لیے روانہ ہوگئے۔ انہوں نے گارڈ کی بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ مگر وہ جانتے نہیں تھے کہ یہ بہت اہم اطلاع ہے اور اس اطلاع کے حوالے سے وہ سنگین صورتِ حال کا شکار ہونے والے ہیں۔ سنگین اور بالکل غیر متوقع۔

O......❖......O

انہوں نے کیمپ کے آس پاس ایک نیم دائرے کی شکل میں جاگنگ کی اور دوڑ لگائی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مسلسل مشقت نے یخ بستہ ٹھنڈ میں بھی انہیں پسینے سے شرابور کر دیا۔ کرسٹل اور ہمایوں ایک جگہ دم لینے کے لیے بیٹھ گئے۔ مگر عادل مسلسل بھاگتا رہا۔ ہر روز اپنی جان پر کچھ مزید ستم ڈھانا اور اپنے اسٹیمنا کو کچھ اور بڑھانا اس کی ہابی بن چکا تھا۔ وہ ہمایوں اور کرسٹل سے قریباً دو فرلانگ دور تھا اور یہ جگہ ڈھلوان پر تھی، اچانک وہ ٹھٹک گیا۔ اسے سفید برف پر کچھ لوگ حرکت کرتے دکھائی دیئے۔ وہ اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ عادل کے پاس ٹیلی اسکوپ نہیں تھی ورنہ وہ مزید وضاحت سے انہیں دیکھ سکتا۔ وہ غور ہی کر رہا تھا۔ جب اسے بائیں جانب برفیلے تودوں کے پیچھے سو ڈیڑھ سو فٹ کی دوری پر آہٹیں سنائی دیں۔ اسے خطرے کا احساس ہوا اور وہ پلٹا...... لیکن اس کے لیے شاید اب دیر ہو چکی تھی۔ وہ پندرہ بیس قدم ہی دوڑا تھا کہ ایک تودے کے عقب سے للکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''رُک جاؤ، گولی چلا دوں گا۔''

عادل ٹھٹک کر رُک گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تودوں اور پتھروں کے پیچھے سے چار افراد نکل کر سامنے آگئے۔ انہوں نے شلوار قمیص پر بھاری بھرکم جیکٹس پہن رکھی تھیں۔ ان کے چہرے گرم ٹوپیوں میں چھپے ہوئے تھے۔ صرف ایک بندہ شلوار کے بجائے پتلون میں دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی نال کی روسی رائفل صاف نظر آ رہی تھی۔

چند ہی سیکنڈ بعد وہ لوگ عادل کے سر پر پہنچ گئے۔ شلوار قمیص والے ایک شخص نے عادل کے سامنے پہنچ کر اپنے سر پر سے ٹوپی ہٹائی، اس کا چہرہ دیکھ کر عادل سکتے میں رہ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس شخص کو یہاں

دیکھے گا...... اس کے ذہن میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی...... اس کے سامنے چند فٹ کی دوری پر شہزادی کا بڑا بھائی قاسم کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھوں سے جیسے شعلے نکلنے لگے تھے۔ وہ پھنکارا۔ ''امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی، تمہاری یہ لعنتی صورت دیکھنے کو مل جائے گی۔''

عادل خاموش رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے اور کیا نہیں۔ قاسم نے پھر زہر فشاں لہجے میں کہا۔ ''حیران کیوں ہوگیا ہے عادے؟ تُو کیا سمجھتا تھا، بہت دور نکل آیا ہے۔ اب کوئی مجھ تک پہنچ نہیں سکے گا؟''

''میں واقعی حیران ہوں۔'' عادل د[illegible] لہجے میں بولا۔

قاسم تیزی سے آگے آیا۔ اب اس کے ہاتھ میں بھی رائفل نظر آ رہی تھی۔ اس نے رائفل کی سرد نال عادل کی گردن پر ٹھوڑی کے نیچے لگائی اور اسے اتنی وحشت سے دبایا کہ وہ گردن میں گھستی محسوس ہوئی۔ ''کہاں ہے میری بہن؟'' قاسم نے بے حد خطرناک لہجے میں سوال کیا۔

اب یہ عادل پر حیرت کا دوسرا شدید حملہ تھا۔ وہ گردن پر نال کا دباؤ کم کرنے کے لیے ذرا سا پیچھے ہٹا اور بولا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ شہزادی سے......''

عادل کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی قاسم نے رائفل گھما کر عادل کی کنپٹی پر رسید کی۔ وہ لہراتا ہوا برف پر گرا۔ قاسم نے رائفل کی نال اس کے سینے پر رکھ دی اور اسی لہجے میں بولا۔ ''میں اپنے ہوش میں نہیں ہوں۔ میں اسی جگہ تجھے مار دوں گا کتے۔ مجھے بتا کہاں ہے میری بہن؟'' وہ چنگھاڑا۔

عادل کی آنکھوں کے سامنے ایک برق سی لہرا گئی...... ان لمحوں میں وہ سمجھ گیا کہ وہاں گاؤں میں وہ کون سا غیر معمولی واقعہ پیش آیا تھا جس کے بعد وہاں تہلکہ مچ گیا تھا اور تایا کے کارندوں نے ہر طرف بھاگ دوڑ شروع کر دی تھی۔ شہزادی...... ہاں شہزادی کے ساتھ کچھ ہوگیا تھا۔ اگر ہوگیا تھا تو اس نے نہیں کیا تھا۔ پھر کس نے کیا تھا؟ اس کے سینے میں آتش سی دہکنے لگی۔ وہ لرزاں آواز میں بولا۔ ''کیا ہوا ہے شہزادی کے ساتھ؟''

قاسم نے اندھا دھند اس کی پسلیوں میں ٹھوکر لگائی اور چنگھاڑا۔ ''اوئے کتے کی اولاد! مجھ سے پوچھتا ہے کہ کیا ہوا ہے اس کے ساتھ؟ بتا مجھے کہاں ہے وہ؟ نہیں تو اسی تھاں تجھے ٹھنڈا کر دوں گا۔''

گالی نے عادل کے سینے میں بھڑکتی آگ کو کچھ اور بلند کیا۔ لیکن اس نے خود کو سنبھالا۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ یہ لوگ ایک بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ وہ اسی طرح لیٹے لیٹے بولا۔ ''قاسم! شہزادی میرے پاس نہیں ہے، میں قسم کھاتا ہوں، میں نے......'' اس کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔ قاسم اور اس کے ساتھی وحشیوں کی طرح اس پر پل پڑے۔ رائفلوں کے کندھے، ٹھوکریں، گھونسے بے دریغ اس پر برسائے جانے لگے۔ ایک بار پھر یہ ویسا ہی منظر تھا جیسا تایا کے باغ والے احاطے میں پیش آیا تھا...... لیکن اس بار عادل مار کھانے اور ذلت سہنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس کے سینے میں دھماکے سے ہوئے اور وہ پوری طاقت کے ساتھ پلٹ پڑا۔ اس کے سر کی زوردار ٹکر نے قاسم کے ساتھی کو رائفل سمیت نیچے نشیب میں لڑھکا دیا۔ قاسم نے لاٹھی کی طرح رائفل کو استعمال کیا اور اس کے سر کو نشانہ بنانا چاہا، عادل نے جھک کر یہ وار بچایا اور جوابی گھونسے نے قاسم کا چوڑا تھوبڑا رنگین کر دیا۔ ایک فربہ اندام شخص نے عادل کو عقب سے اپنے بازوؤں کے آہنی شکنجے میں لے لیا۔ یہی وقت تھا جب عادل کی نگاہ قدرے بلندی پر ہمایوں پر پڑی۔ اس نے سب دیکھ

لیا تھا اور تیزی سے عادل کی مدد کو آرہا تھا۔ وہ کبھی بھاگتا اور کبھی برف پر سلائیڈ کرتا ہوا آناً فاناً موقع پر پہنچ گیا۔ وہ ایک جی دار ساتھی تھا اور اس نے یہاں یہ جی داری ثابت کی۔ اگلے ڈیڑھ دومنٹ میں عادل اور ہمایوں نے ڈٹ کر ان چار افراد کا مقابلہ کیا لیکن وقت ان کے خلاف جا رہا تھا۔ قاسم کے مزید ساتھی جو فاصلے پر تھے، بڑی تیزی سے ان کی طرف آرہے تھے۔ وہ پہنچ جاتے تو پھر ان لوگوں کا پلڑا بہت بھاری ہو جانا تھا...... اور وہ بس پہنچا ہی چاہتے تھے۔

قاسم کے فربہ اندام ساتھی کے ہاتھ میں اب تیز دھار چاقو نظر آرہا تھا۔ یہ فربہ اندام شخص دراصل وہی ملازم انور تھا جس نے گاؤں میں یہ جھوٹ بولا تھا کہ عادل اسے گن پوائنٹ پر باغ والے احاطے میں لایا تھا اور احاطے کا دروازہ کھلوایا تھا۔ اب اس شخص کی بدقسمتی ہی تھی کہ وہ ان نازک لمحوں میں عادل کے سامنے آگیا تھا، اس نے عادل پر چاقو کے دو اندھا دھند وار کیے۔ عادل نے دائیں بائیں جھک کر یہ وار بچائے۔ اس کی چیتے جیسی سبک کمر اس کی بے پناہ پھرتی میں اس کی معاون تھی۔ فربہ اندام انور کو پتا ہی نہیں چلا کہ کب اس کا بازو عادل کی آہنی گرفت میں چلا گیا۔ عادل نے یہ بازو انتہائی وحشت سے مروڑا کہ اس کے ٹوٹنے کی آواز دور تک سنائی دی۔ انور بھیانک آواز میں چلایا۔ اس کا چاقو اب عادل کے ہاتھ میں تھا۔ ایک شخص نے عادل پر سیدھا فائر کیا۔ سیون ایم ایم کا یہ فائر عادل کے کندھے کو چھوتا ہوا نکل گیا۔ قاسم کے سب ساتھی اب بس پہنچنے ہی والے تھے۔ عادل نے ہوا میں جست کی اور سیدھا قاسم پر آیا جو اپنی گری ہوئی رائفل اُٹھانے کے لیے لپک رہا تھا۔ عادل نے کسی جنگلی چیتے ہی کی طرح اسے عقب سے دبوچا اور چاقو کا پھل اس کی شہ رگ سے لگا دیا۔

''خبردار...... خبردار......'' وہ دھاڑا۔ ''کوئی آگے نہ آئے۔''

قاسم کے تازہ دم ساتھیوں کے تیور بہت خطرناک تھے لیکن قاسم کو عادل کے شکنجے میں دیکھ کر وہ جہاں کے تہاں رُک گئے۔ عادل کسی جونک کی ہی طرح قاسم سے چمٹ گیا تھا اور اسے کسمسانے کی گنجائش بھی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر دھاڑا۔ ''کوئی آگے بڑھا تو کاٹ دوں گا اسے...... کاٹ دوں گا۔''

وہ واقعی مارنے اور مر جانے کے موڈ میں تھا۔ ہمایوں نے لپک کر قاسم کی گری ہوئی رائفل اُٹھائی اور اُلٹے قدموں چل کر عادل کے شانہ بشانہ کھڑا ہو گیا۔ فربہ اندام انور کا بازو اس بُری طرح ٹوٹا تھا کہ ٹوٹی ہوئی ایک ہڈی اس کی جیکٹ کی آستین پھاڑ کر باہر نکل آئی تھی۔ لہو کے قطرے سفید برف پر گر رہے تھے۔

قاسم کے بعد میں آنے والے ساتھیوں میں دراز قد ناصر کو عادل نے صاف پہچان لیا۔ اسے دیکھتے ہی عادل کے غیظ وغضب میں اضافہ ہو گیا۔ وہ تنومند قاسم کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا چند قدم مزید پیچھے لے گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہمایوں سے کہا۔ ''واکی ٹاکی ہے نا تمہارے پاس؟ کال کرو سرمد صاحب کو۔''

ہمایوں نے ایک ہاتھ اپنی جیکٹ میں ڈالا اور واکی ٹاکی نکال لیا لیکن کال کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ قاسم کے بعد میں آنے والے ساتھیوں سے ایک غلطی ہو چکی تھی۔ چند منٹ پہلے انہوں نے عادل اور ہمایوں کو ڈرانے کے لیے کئی ہوائی فائر کر دیئے تھے۔ اس فائرنگ کی آواز کیمپ تک پہنچ چکی تھی۔ عادل نے مڑ کر دیکھا، اوپر بلندی پر برف کی سفید چادر تھی اور اس چادر پر حرکت کرتے ہوئے درجنوں افراد تیزی سے نیچے آرہے تھے۔ یہ ان کے کیمپ کے لوگ تھے۔

اگلے تین چار منٹ کافی تناؤ والے تھے۔ قاسم، عادل کی نہایت سخت گرفت میں تھا۔ پھل دار چاقو اس کی چربی دار

گردن سے لگا ہوا تھا۔ عادل اپنے ہاتھ کا دباؤ ذرا سا بڑھاتا تو شہ رگ کٹنے کا عمل شروع ہو سکتا تھا۔ وہ بار بار قاسم کے ساتھیوں کو خبردار بھی کر رہا تھا کہ ان کی کسی مہم جوئی کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ دراز قد ناصر کو دیکھنے کے بعد عادل کی وحشت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا اور اس کا دیوانگی آمیز لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ جو کہہ رہا ہے کر گزرے گا۔ قاسم اس کا تایا زاد تھا لیکن فی الوقت وہ صرف اور صرف ایک دشمن تھا...... جس سے رعایت کرنے کا مطلب، خود کو موت کے منہ میں دھکیلنا تھا......

اور پھر عادل اور ہمایوں کے مددگار پہنچ گئے۔ یہ کیمپ کے درجنوں ملکی اور غیر ملکی گارڈز تھے۔ دیگر لوگ بھی تھے جن میں لارڈ اوئنس اور کرسٹل وغیرہ بھی تھے۔

صورتِ حال بھانپنے کے بعد گارڈز نے ناصر اور اس کے قریباً ایک درجن ساتھیوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور ایک دومنٹ کے اندر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ ان کے پاس پانچ عدد رائفلیں تھیں جن میں سے ایک پہلے ہی ہمایوں کے قبضے میں آچکی تھی۔ باقی ہتھیاروں میں دو پستول اور دو چاقو شامل تھے۔ رائفلوں کے کم وبیش ڈیڑھ ہزار راؤنڈ بھی برآمد ہوئے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ لوگ بڑی تیاری سے یہاں پہنچے ہیں۔ ان کے ساتھ بشارت اور مدثر نامی دو ماہر گائیڈ بھی تھے۔

انور کا بازو اس بُری طرح ٹوٹا تھا کہ اب وہ تکلیف کی شدت سے نیم بے ہوش ہو چکا تھا۔ اسے ایک ٹٹو پر بٹھا کر کیمپ پہنچایا گیا۔ باقی لوگ رائفلوں کے نرغے میں پا پیادہ پہنچے۔ ان میں سے قاسم اب بھی غیظ وغضب کا مظاہرہ کر رہا تھا اور عادل کو خوفناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ عادل کی درخواست پر لارڈ اوئنس نے قاسم کے ہاتھ پشت پر بندھوا دیئے تھے۔

کیمپ میں سرمد صاحب بڑی بے قراری کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ناصر اور قاسم کو شکلوں سے جانتے تھے۔ انہیں یہاں اس برف زار میں دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے۔ عادل اور ہمایوں نے سرمد صاحب کو مختصر الفاظ میں سارا واقعہ کہہ سنایا۔ یقیناً یہ سب کچھ سرمد صاحب کے لیے بھی حیران کن تھا۔ خاص طور سے جو کچھ شہزادی کے حوالے سے کہا گیا تھا، وہ تو ناقابلِ یقین تھا۔

''شہزادی والی بات تو بالکل سمجھ میں نہیں آرہی۔'' ہمایوں نے کہا۔

''لیکن میری سمجھ میں اب آنے لگی ہے۔'' عادل نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''مالکانے زادہ؟'' سرمد صاحب نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''جی سر! اسی خبیث نے پہلے لاہور سے صادق کو اُٹھایا اور پھر اس کی مدد سے میرے گاؤں تک اور ماموں طفیل کے گھر تک پہنچا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ صادق کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا؟''

''سو فیصد جناب...... اور پھر گاؤں پہنچنے کے لیے اس نے صادق والا لوڈر ہی استعمال کیا۔ وہ مجھے نقصان پہنچانا چاہتا تھا لیکن میں اسے نہیں ملا۔ اس نے ماموں طفیل کو شدید زخمی کیا۔ صادق سے ہی اسے معلوم ہو گیا ہو گا کہ شہزادی میرے لیے کیا حیثیت رکھتی ہے۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے اس نے شہزادی کو اُٹھا لیا۔''

قاسم کا شور شرابا بند کرنے کے لیے عادل نے اس کے منہ میں ایک کپڑا ٹھونس دیا تھا۔ اب وہ غوں غاں کی

آوازیں نکال رہا تھا۔ سرمد صاحب کے اشارے پر ہمایوں نے اس کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔ وہ ایک بار پھر عادل کو گالیاں دینے اور چلانے لگا۔ ''عادے! تیرا انجام چنگا نہیں ہوگا۔ کتے کی موت ماروں گا تجھے۔ یہ مت سمجھنا ہم اکیلے ہیں۔ اور لوگ بھی آ رہے ہیں پیچھے...... پولیس بھی ہے۔ سرِعام تجھے چھتر نہ لگواؤں عادے تو میرا نام قاسم نہیں۔''

عادل نے اس کے عین سامنے پہنچ کر اس کا گریبان پکڑا اور جھنجوڑ کر کہا۔ ''قاسو! مجھے تیرا کوئی ڈر نہیں...... کیونکہ تُو میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ میں اب بھی تجھ سے یہی کہہ رہا ہوں کہ مجھے شہزادی کا کچھ پتا نہیں۔ یہ کوئی اور ہے۔ اسی نے میرے یار صادق کو بھی غائب کیا ہے اور پھر اسی کے لوڈر (پک اَپ) پر پنڈ بھی پہنچا ہے۔ اس نے شہزادی کو......''

''بکواس بند کر۔'' قاسم، عادل کی بات کاٹ کر چنگھاڑا۔ ''اپنی پلید زبان سے نام نہ لے میری بہن کا۔ میں کاٹ ڈالوں گا تیری یہ زبان...... کاٹ ڈالوں گا۔''

طیش کے عالم میں اس نے اُٹھ کر عادل پر جھپٹنے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھ ابھی تک پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ہمایوں نے اسے تھپڑ رسید کیا۔ وہ اوندھے منہ برف پر جا گرا۔ ناصر اور اس کے دو تین ساتھیوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر گارڈز نے رائفلیں ان کے جسم سے لگا دیں اور انہیں جہاں کا تہاں روک دیا۔

اب تقریباً پورے کیمپ کے لوگ اس تماشے کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ انگریز مرد و زن کے چہروں پر دلچسپی کے ساتھ ساتھ خوف آمیز بیزاری بھی موجود تھی۔ وہ یہاں تفریح کے لیے آئے تھے اور اس کے لیے کثیر زرِ مبادلہ خرچ کیا تھا۔ اپنی مصروفیات میں اس طرح کی سنگین دخل اندازی ان کے لیے نہایت پریشان کن تھی کئی لوگ تشویش آمیز انداز میں اوئس اور کرسٹل وغیرہ سے مختلف سوالات پوچھ رہے تھے۔ انگریز مہمانوں میں ایک سرجن بھی موجود تھا۔ انور کے ٹوٹے ہوئے بازو کی حالت زار دیکھ کر وہ اسے طبی امداد دینے کے لیے اپنے ٹینٹ میں لے گیا۔

قاسم بالکل ''ہائپر'' ہو رہا تھا۔ اس سے کوئی ڈھنگ کی بات کی ہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ عادل کے اشارے پر دو گارڈز نے ایک بار پھر اس کے منہ میں زبردستی کپڑا ٹھونس دیا اور اوپر سے ایک مفلر باندھ دیا۔

عادل دراز قد ناصر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ بانس کی طرح لمبا اور سخت تھا۔ شہزادی کے حوالے سے وہ اس کا رقیبِ رُوسیاہ تھا۔ وہ کئی بار عادل سے دشمنی لے چکا تھا لیکن آج عادل کا پلڑا بھاری تھا۔ وہ چاہتا تو کوئی ایسی صورتِ حال بھی پیدا کر سکتا تھا کہ ناصر کی جان ہی چلی جاتی لیکن وہ صاف ستھری لڑائی لڑنا چاہتا تھا۔ اپنی ہمت اور طاقت سے شہزادی کو جیتنے کا خواہش مند تھا۔ عادل نے ناصر سے پوچھا۔ ''چھوٹے چودھری! ابھی قاسم نے کہا ہے کہ کچھ اور لوگ بھی پیچھے آ رہے ہیں، وہ کون ہیں؟''

ناصر خشک لہجے میں بولا۔ ''تیرے تایا صاحب ہیں...... اور ان کے کارندے ہیں، پولیس کے لوگ بھی ہیں۔ کئی درجن لوگ ہیں...... ان کے آنے پر تم نے سخت مشکل میں پڑ جانا ہے۔'' ناصر کا لہجہ دھمکانے والا تھا۔

تایا فراست کی آمد کی اطلاع نے عادل کو حیران کیا۔ بہرحال وہ صاف محسوس کر رہا تھا کہ ناصر ہمیشہ کی طرح سچ نہیں بول رہا۔ انہیں ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے۔

عادل نے تایا فراست کے کارندوں میں سے اس مشتاق نامی شخص کو منتخب کیا جس نے باغ والی لڑائی میں لیڈنگ رول ادا کیا تھا اور عادل کو برہنہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ عادل اسے گریبان سے دبوچ کر خیموں کے پیچھے لے گیا۔

پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے سنگین لہجے میں مشتاق کو وارننگ دی کہ اس نے سب کچھ صاف صاف نہیں بتایا تو وہ اسے اس بُری طرح سے زخمی کرے گا کہ وہ اس ویرانے میں زندگی اور موت کے درمیان لٹک جائے گا۔

مشتاق جانتا تھا کہ یہاں عادل پوری طرح حاوی ہے اور اپنی باغ والی بے عزتی کا پورا پورا بدلہ لے سکتا ہے۔ اس نے عادل کی آنکھوں میں اس کے سنگین ارادے پڑھ لیے اور سچ بولنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''تایا فراست والا گروپ واقعی چار پانچ میل پیچھے آ رہا ہے لیکن اس میں زیادہ بندے نہیں ہیں۔''

''کتنے بندے ہیں؟''

''چودھری صاحب کے علاوہ حویلی کے چار ملازم ہیں۔ تین بندے چودھری مختار کے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک گائیڈ رشید خاں ہے۔''

''پولیس کے کتنے لوگ ہیں؟'' عادل نے پوچھا۔

''پولیس کے صرف دو کانسٹیبل ہیں اور وہ سادہ لباس میں ہیں۔''

''ہتھیار کتنے ہیں ان لوگوں کے پاس۔''

''میرا خیال ہے کہ دو رائفلیں اور ایک پستول ہے۔''

''کوئی واکی ٹاکی بھی ہے ان لوگوں کے پاس؟''

''آہو...... گائیڈ رشید خاں کے پاس ہے واکی ٹاکی۔''

ابھی واکی ٹاکی کی بات ہی ہوئی تھی کہ واکی ٹاکی کا سگنل آ گیا۔ یہ سگنل گائیڈ مدثر کے پاس موجود واکی ٹاکی پر آیا تھا۔ عادل نے مشتاق کی طرف سے توجہ ہٹائی اور گائیڈ کے پاس پہنچ گیا۔ پستول ہمایوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے گائیڈ مدثر کو وارننگ دی کہ وہ اپنے کسی ساتھی کو یہاں کی صورتِ حال کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔ مدثر نے واکی ٹاکی پر کال ریسیو کی۔ دوسری طرف غالباً دوسرا گائیڈ رشید خاں ہی تھا۔ وہ بولا۔ ''مدثر! بڑی خاص خبر ہے، کہاں ہو تم لوگ؟''

''ام چھوٹے گلیشیئر سے دو ڈھائی میل آگے نکل آیا ہے۔ تم خیریت سے ہو؟''

''ہاں ایک دم خیریت ہے، تم قاسم یا ناصر صاحب سے بات کراؤ۔ چودھری فراست صاحب خود بات کریں گے۔''

مدثر نے عادل کی طرف دیکھا۔ عادل نے مدثر کو اشارہ کیا کہ وہ واکی ٹاکی ناصر کو تھما دے۔ قاسم شور مچانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کپڑے کی وجہ سے آواز اس کے گلے کے اندر ہی گونج رہی تھی۔ ''ہیلو کون؟'' دوسری طرف سے تایا فراست کی آواز سنائی دی اور عادل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

''مم...... میں ناصر بول رہا ہوں تایا جی۔'' ناصر نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

''پتر جی! بڑی خوشی کی خبر ہے۔ دھی رانی مل گئی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ملی ہے۔ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ قاسو کہاں ہے، اسے بلاؤ......'' تایا فراست کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔

دھی رانی سے تایا فراست کی مراد یقیناً شہزادی ہی تھی۔ ناصر اور قاسم وغیرہ تو ہکا بکا تھے ہی، عادل بھی ششدر تھا۔ واقعات تیزی سے رُونما ہو رہے تھے۔

ناصر نے لرزتی آواز میں پوچھا۔ ''یہ کیسے ہوا تایا جی...... کہاں ہے شہزادی؟''

''میرے پاس ہی ہے۔ ابھی تو بس روندی ہی چلی جارہی ہے۔ ہمارے سارے اندازے غلط نکلے ہیں ناصر پتر۔ یہ...... یہ اس عادے کا چکر نہیں تھا۔ یہ کوئی اور ہی معاملہ ہے۔ تم لوگ آتے ہو تو بتاتے ہیں سب کچھ۔ قاسو کہاں ہے؟''

''قق...... قاسم ذرا پیشاب کرنے گیا ہے۔ ابھی آتا ہے۔'' ناصر نے بہانہ بنایا۔

عادل نے واکی ٹاکی کے مائیک پر ہاتھ رکھا اور کرخت لہجے میں ناصر سے بولا۔ ''تایا جی سے کہو وہ ادھر ہی رُکیں، ہم آرہے ہیں۔''

ناصر کچھ دیر تذبذب میں رہا لیکن جب اس نے عادل کی آنکھوں میں خون اُترتے دیکھا اور یہ دیکھا کہ پستول اس کی پسلیوں سے قریب تر ہو گیا ہے تو اس نے تایا فراست کو یہ پیغام دیا کہ وہ آرہے ہیں۔

یہ سب کچھ بے حد ڈرامائی تھا۔ بیٹھے بٹھائے عادل پر ایک سنگین الزام لگا تھا اور اب غلط بھی ثابت ہو رہا تھا۔ شہزادی بازیاب ہو گئی تھی لیکن کس سے اور کیسے؟ بہت سے سوال ذہن میں اودھم مچانے لگے تھے۔

عادل، ہمایوں، سرمد صاحب اور لارڈ اولس میں ایک ہنگامی میٹنگ ہوئی۔ لارڈ صاحب اس سارے معاملے میں ملوث ہونا نہیں چاہ رہے تھے لیکن صورتِ حال ایسی ہو گئی تھی کہ اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ کچھ پس و پیش کے بعد وہ مدد کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

ناصر، قاسم، مشتاق اور ان کے قریباً سولہ ساتھیوں کو ایک ہی جگہ زمین پر بٹھا دیا گیا تھا۔ چار رائفل بردار گارڈز جن میں سے دو مقامی تھے، ان کے اردگرد چوکس کھڑے تھے۔ چونکہ تمام افراد کی اچھی طرح تلاشی لی جا چکی تھی اس لیے ان کی طرف سے زیادہ اندیشہ نہیں تھا۔ عادل، ہمایوں اور مدثر وغیرہ قریباً بیس افراد کے ساتھ مطلوبہ جگہ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ سب کے سب مسلح تھے۔ وقتِ رخصت لیوپڑ نے عادل کو کینہ توز نظروں سے دیکھا۔ کئی دوسرے برٹشرز کی طرح وہ بھی اس حق میں نہیں تھا کہ سرمد صاحب اور عادل وغیرہ کے ذاتی مسائل حل کرنے کے لیے خود کو کسی بکھیڑے میں ملوث کیا جائے۔ بہرحال اب تو یہ ہو چکا تھا۔ عادل کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ شہزادی کو اور تایا فراست کو اس ویرانے میں بھی دیکھے گا۔ وہ پتا نہیں کس حال میں تھی اور کیوں تھی؟ مالکانے زادہ کا منحوس چہرہ بار بار عادل کی نگاہوں کے سامنے آرہا تھا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ ان تمام سنگین واقعات کا ذمے دار وہی سرمنڈا شرابی ہے جو پاؤندوں کے نزدیک ایک پہنچا ہوا عامل ہے اور کسی حد تک لگتا بھی تھا کہ اس کے پاس کسی طرح کی ماورائی توانائی موجود ہے یا شاید یہ صرف اتفاق تھا کہ بانگڑی چوٹی کے بارے میں کہی ہوئی اس کی کچھ باتیں بالکل درست ثابت ہوئی تھیں۔ ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے کے تیز رفتار سفر کے بعد وہ لوگ ایک بڑی چٹان کا کلاوا کاٹ کر ایک چھوٹے سے نشیب میں پہنچے اور آناً فاناً وہاں موجود قریباً دس افراد کو گھیر لیا۔ ان میں عادل کے تایا فراست اور گائیڈ رشید خاں کے علاوہ ایک پورٹر اور اس کے تین خچر بھی تھے۔ عادل کی بے قرار نگاہوں نے سب سے پہلے اپنی شہزادی کو ڈھونڈا...... ہاں، وہ موجود تھی وہاں۔ ایک بڑی چادر میں لپٹی لپٹائی...... حیران و پریشان تایا فراست کے قریب کھڑی تھی۔ تایا فراست اور رشید خاں سمیت وہ سب لوگ اس اچانک افتاد پر وحشت زدہ تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ اچانک ملکی اور غیر ملکی اجنبیوں

نے ان پر رائفلیں کیوں تان لی ہیں۔ یہاں پتھروں کا بنا ہوا نیچی چھت والا ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ کمرے کے سامنے عادل کو لکڑی کی بنی ہوئی ایک چھوٹی سی ڈولی نظر آئی۔ ڈولی کو اُٹھانے کے لیے ایک لمبا بانس لگایا گیا تھا۔ عادل کو برف پر خون کی آلائش بھی دکھائی دی۔ عادل...... اپنے تایا فراست سے صرف دس پندرہ قدم کی دوری پر کھڑا تھا مگر اس کا ''منہ سر'' اونی ٹوپی میں چھپا ہوا تھا۔ آنکھوں پر گلاسز تھے۔ باقی افراد کا حلیہ بھی تقریباً ایسا ہی تھا۔

''کون ہو تم لوگ؟'' تایا فراست نے لرزتی آواز میں پوچھا اور شہزادی کو حفاظتی انداز میں اپنے پیچھے کر لیا۔ عادل کو شہزادی کی بس آنکھیں ہی دکھائی دیں۔ سہمی ہرنی جیسی گہری سیاہ آنکھیں۔ عادل نے اپنی اونی ٹوپی اُتاری اور گلاسز بھی آنکھوں سے ہٹا لیے۔ تایا فراست کے سر پر جیسے ہزار پاؤنڈ کا بم پھٹ گیا۔ وہ ہکا بکا عادل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جو دیگر افراد عادل کو جانتے تھے، ان کا حال بھی یہی تھا۔ عادل کو شہزادی کی آنکھوں میں بھی بے پناہ حیرت دکھائی دی۔

''عادے...... تم...... یہاں۔'' تایا فراست مدئے۔

''جی تایا جی۔'' عادل نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ یہ لوگ اپنے ہی ہیں۔ کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ ہمیں بس یہ ڈر تھا کہ آپ کے ساتھ آنے والے کہیں گھبراہٹ میں فائر وغیرہ نہ کر دیں۔'' تایا خود کو مسلسل حیرت کے شدید دھچکوں سے سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''اور...... باقی لوگ؟ میرا مطلب ہے قاسم اور ناصر وغیرہ؟'' تایا نے پوچھا۔

''ان کے بارے میں بھی کوئی فکر نہ کریں۔ وہ ہمارے پاس ہیں اور بالکل حفاظت سے ہیں۔'' عادل نے تایا کو یقین دلایا۔

اگلے دو چار منٹ میں وہ نہ صرف تایا کو قائل کرنے میں کامیاب ہوا بلکہ تایا کے کارندوں نے اپنی دو رائفلیں اور پستول بھی گارڈز کے حوالے کر دیئے۔ شہزادی پردے میں تھی لیکن اس کے جسم کی کپکپاہٹ عادل کو صاف محسوس ہو رہی تھی۔ شہزادی کی ایک کلائی پر میلی کچیلی پٹی بھی بندھی ہوئی تھی۔ ایک پولیس والے کی پیشانی اور ایک کارندے کی کلائی پر بالکل تازہ چوٹیں نظر آرہی تھیں۔ دونوں پولیس والے سادہ کپڑوں میں تھے۔ شہزادی کسی نشہ آور دوا کے اثر میں لگتی تھی۔ شاید اس کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ کھڑے ہونے پر بیٹھنے کو ترجیح دے رہی تھی۔ عادل کو صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ پیدل سفر نہیں کر سکتی۔ عادل کے مشورے پر تایا نے اسے ڈولی میں بٹھا دیا۔ تایا فراست جیسے اب خود بھی چاہ رہے تھے کہ جلد از جلد یہ جگہ چھوڑ دی جائے۔

راستے میں عادل نے تایا فراست سے پوچھنا چاہا کہ انہوں نے شہزادی کو کیسے بازیاب کرایا اور اسے زبردستی یہاں لانے والا کون تھا؟ لیکن تایا نے صاف کہا کہ وہ جب تک قاسم اور ناصر وغیرہ سے مل نہیں لیتے، کوئی بات نہیں کریں گے اور نہ کسی سوال کا جواب دیں گے۔

کیمپ میں واپس پہنچنے کے بعد ساری صورتِ حال تایا کے سامنے واضح ہو گئی۔ انہوں نے جان لیا کہ یہاں اچھا خاصا ہنگامہ ہوا ہے اور ناصر، قاسم سمیت تمام افراد یہاں بندوق کی نوک پر موجود ہیں۔ تایا کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ خاص طور پر قاسم کو بندھی ہوئی حالت میں دیکھ کر انہیں تکلیف ہوئی تھی۔ شہزادی نے بھی باقاعدہ سسکنا شروع کر دیا تھا۔ عادل نے وضاحت کی کہ قاسم کو کیوں اس حالت میں رکھنا پڑا۔ اس نے تایا سے وعدہ کیا کہ جونہی وہ ذرا نارمل ہوتا ہے وہ اسے کھول

دیں گے۔

شہزادی کو پورے احترام سے خیمے میں کرسٹل کے پاس پہنچا دیا گیا۔ بندھے ہوئے قاسم کو بھی ایک خیمے کی خوشگوار حرارت میسر آ گئی۔ عادل نے تایا فراست اور ناصر کو ساتھ لیا اور سرمد صاحب کے پاس ٹینٹ میں پہنچ گیا۔ دس پندرہ منٹ تو ''اعتماد سازی'' میں لگے پھر اصل گفتگو شروع ہوئی۔ تایا کے ایک سوال کے جواب میں عادل نے کہا۔ ''جیسا کہ میں نے بتایا ہے تایا جی! یہاں ایک پہاڑ پر چڑھنے کے مقابلے ہوتے ہیں ہر سال۔ ہم انہی مقابلوں کے لیے یہاں موجود تھے۔ ہمارے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں اس طرح، پہلے قاسم اور ناصر سے اور پھر آپ سے ملاقات ہو جائے گی۔''

تایا نے ایک آہ کھینچ کر کہا۔ ''یہ پچھلے پندرہ وی دن جو گزرے ہیں، میری زندگی کے سب سے بُرے دن تھے۔ سچی گل تو یہ ہے کہ وہاں پنڈ میں جو کچھ بھی ہوا، اس کے سارے اشارے تمہاری طرف ہی جاتے تھے۔ رات کو بارہ بجے کے قریب دو بندے حویلی میں گھسے۔ ایک پہریدار کے سر پر رائفل کے دستے مار کر اسے بیہوش کر دیا۔ انہوں نے دھی رانی کو اُٹھانے کی کوشش کی۔ جب ان کو روکنے کی کوشش کی گئی تو انہوں نے فائرنگ کر دی۔ عاصم سخت زخمی ہوا ہے۔ ایک گولی اس کی چھاتی پر اور دوسری ٹانگ میں لگی۔ ایک پہریدار کو بھی گولی لگی۔ وہ لوگ شہزادی کو لے کر نکل گئے۔'' تایا فراست کی آواز بھرا گئی۔

کوشش کر کے انہوں نے خود کو سنبھالا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ''یہ بہت بڑی بدنامی کی بات تھی۔ ہم نے پولیس میں رپورٹ درج نہیں کرائی اور نہ کسی کو بتایا کہ ہم پر کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ میرے بس خاص خاص کارندوں کو اس گل کا پتا تھا۔ ہم نے عاصم اور پہریدار کو بہاولپور کے ایک واقف کار ڈاکٹر کے ہسپتال میں بھیج دیا اور شہزادی کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ تمہارے یار صادق کی سفید گڈی پنڈ کے پاس کھیتوں سے مل گئی۔ اس کے بعد ہم سب کا یہ شک اور بھی پکا ہوا کہ یہ سب کچھ تم نے ہی کیا ہے۔ تیسرے دن جب ہم پولیس میں رپورٹ کرانے کا سوچ رہے تھے ایک بڑی خاص اطلاع مل گئی۔ بہاولپور شہر میں شہزادی کی ماں کے ایک رشتے دار صدیق کو ایک فون آیا۔ اس نے شہزادی کو روتے سنا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اسے بچایا جائے۔ ابھی اس نے کچھ بتایا بھی نہیں تھا کہ فون بند ہو گیا۔ ہم نے بھاگ دوڑ کر کے پتا کروایا اور یہ جان کر حیران ہوئے کہ یہ فون کہیں آلے دوالے سے نہیں کیا گیا۔ یہ ایبٹ آباد اور داسو سے بھی آگے کہیں چلاس سے کیا گیا ہے۔ ہم نے فوراً انتظام کیا اور ایک کوسٹر پر بھاگم بھاگ لمبا پینڈا کر کے چلاس پہنچے۔ ہمارے پہنچنے تک ہمارے جاننے والوں نے فون والی جگہ کا پتا چلا لیا تھا۔ یہ چلاس کے اندر ہی بڑے ڈاک خانے کے پاس ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ پتا چلا کہ گھر کے مالک کا نام افضال خاں ہے اور وہ سیر کرنے والوں کو آگے پہاڑوں پر لے جانے کے لیے جیپ چلاتا ہے۔ ہم نے افضال خاں کو پکڑا۔ اس نے بتایا کہ پرسوں رات دو بندے اس کے پاس آئے تھے۔ ان میں سے ایک تو انہی علاقوں کا رہنے والا لگتا تھا۔ دوسرا شاید ایبٹ آباد کا تھا۔ ان کے ساتھ ایک بیمار زنانی تھی۔ ایبٹ آباد سے اس کا علاج کروا کے لائے تھے اور واپس اپنے گاؤں جا رہے تھے۔ وہ چار پانچ گھنٹے اسی کے گھر میں رہے پھر وہ ان کو جیپ پر لے کر آگے روانہ ہو گیا۔ وہ اسکردو روڈ کی کسی تھاں (جگہ) کا نام لے رہا تھا...... کہ وہ جیپ پر ان کو لے کر وہاں تک گیا۔ وہاں سے آگے انہوں نے ڈولی کا انتظام کیا اور بیمار لڑکی کو لے کر آگے چلے گئے۔''

تایا فراست کی آنکھوں میں نمی آ چکی تھی۔ انہوں نے اپنے رومال سے آنکھیں صاف کیں اور غمزدہ انداز میں بات جاری رکھتے ہوئے اس رُوداد کو آگے بڑھایا۔ ان کی بقایا رُوداد کا لبِ لباب کچھ یوں تھا۔ تایا فراست کی ہدایت پر پال پور گاؤں سے کچھ اور لوگ بھی طویل سفر کر کے بلتستان کے اس دور دراز قصبے چلاس میں پہنچ چکے تھے۔ افضال خاں کی زبانی معلوم ہوا کہ اسکردو روڈ کے پاس سے ان لوگوں نے شہزادی کو ایک مقامی طرز کی ڈولی میں بٹھایا تھا اور لے کر آگے نکل گئے تھے۔ ناصر کے ایک دوست نے ایبٹ آباد میں پولیس سے بھی آف دی ریکارڈ رابطہ کیا۔ دو ہیڈ کانسٹیبل سادہ لباس میں ان کے ساتھ روانہ کر دیئے گئے۔ اسکردو روڈ سے آگے شہزادی کو تلاش کرنے والے دو گروپس میں بٹ گئے۔ شہزادی کا بھائی قاسم، منگیتر ناصر اور مشتاق وغیرہ آگے روانہ ہوئے۔ تایا فراست، ہیڈ کانسٹیبلز اور گائیڈ رشید خاں دوسرے گروپ میں تھے۔ نہایت سخت موسم کا مقابلہ کرنے کے لیے ان لوگوں کے پاس پورا ساز و سامان اور ٹینٹ وغیرہ بھی موجود تھے۔ کئی روز تک یہ لوگ نہایت دشوار راستوں پر اور بے حد کٹھن موسم میں سفر کرتے رہے۔ بالآخر آج صبح سویرے ایک انہونی ہو گئی۔ گائیڈ رشید خاں کو برف پر ایسے نشان نظر آئے جن سے اندازہ ہوا کہ یہاں سے ایک ڈولی گزری ہے۔ اور اسے گزرے ہوئے چند گھنٹے ہی ہوئے ہیں۔ اپنے تجربے کی بنا پر رشید خاں نے تیزی سے ان نشانات کا تعاقب کیا اور آناً فاناً پتھروں کے اس کوٹھے تک جا پہنچا جو برفانی تودوں کے بیچوں بیچ بنایا گیا تھا۔ مقامی مسافروں کے لیے اس طرح کے پتھریلے کوٹھے کہیں کہیں بنے ہوئے تھے۔ کوٹھے کے باہر ڈولی پڑی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک درمیانی عمر کا شخص لیٹا ہوا تھا۔ وہ بھی سو رہا تھا۔ اس کی رائفل پاس ہی پڑی تھی۔ تایا فراست اور ان کے ساتھیوں نے سب سے پہلے یہ رائفل قبضے میں لی۔ رائفل کے بہت سے راؤنڈ اور پستول کی گولیاں بھی انہوں نے قبضے میں لے لیں۔

اس شخص کو اُٹھایا گیا۔ شکل صورت اور بول چال سے وہ ایبٹ آباد یا مانسہرہ وغیرہ کا لگتا تھا۔ اس نے مزاحمت کی مگر اسے مار کوٹ کر لمبا لٹا دیا گیا۔ پھر وہ لوگ شہزادی کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ نیم بیہوش تھی۔ جب وہ لوگ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے، درمیانی عمر والے اس شخص کو موقع مل گیا۔ اس نے چھوٹی دستے والی ایک کلہاڑی اُٹھائی۔ کانسٹیبل مجید کے سر پر وار کیا اور ایک کارندے کے ہاتھ پر چوٹ لگا کر اس کے ہاتھ سے رائفل چھڑا دی۔ پھر اس نے نشیب میں چھلانگ لگائی اور ڈھلوان برف پر پھسلتا ہوا دور نکل گیا۔ تایا فراست تو شہزادی کے پاس رہے، باقیوں نے اس کا پیچھا کیا۔ تین چار فائر بھی اس پر کیے گئے لیکن اسے فائر لگا نہیں۔ قریباً ایک فرلانگ آگے اس کا ایک ساتھی بھی موجود تھا۔ وہ شاید علی الصباح حاجت وغیرہ سے فارغ ہو کر واپس آ رہا تھا۔ یہ منڈے ہوئے سر اور بھاری تن و توش والا ایک پاؤندہ تھا۔ اس کے پاس پستول موجود تھا۔ اس نے فراست صاحب کے ساتھیوں پر جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ یہ مقابلہ بس چار پانچ منٹ ہی جاری رہ سکا۔ اس پاؤندے کے پاس پستول کی فقط پانچ چھ گولیاں ہی تھیں۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ مارا جائے گا یا پکڑا جائے گا تو اپنے ایبٹ آبادی ساتھی سمیت بھاگ نکلا۔ وہ اس علاقے کے شناور تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پتھروں اور برفانی تودوں کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ عادل کے علم میں ہی تھا۔ گائیڈ رشید خاں اور گائیڈ مدثر میں واکی ٹاکی پر رابطہ تھا۔ رشید خاں نے ناصر سے تایا فراست کی بات کرائی اور یوں عادل وغیرہ کو علم ہو گیا کہ شہزادی کے حوالے سے ایک اچھی خبر موجود ہے۔

تایا فراست کی مکمل رُوداد سننے کے بعد عادل اور اس کے ساتھیوں پر یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ ان کے اندازے

اور اندیشے درست تھے۔ شہزادی، عاصم، صادق اور طفیل وغیرہ کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کا اصل ذمے دار وہی مالکانے زادہ ہے۔ تایا فراست اس شخص کا جو حلیہ بیان کر رہے تھے، اس کے بعد شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

اب بہت سے سوال ذہن میں سر اُٹھا رہے تھے۔ مثلاً یہ کہ مالکانے زادہ نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟ وہ شہزادی کو کہاں لے جانا چاہتا تھا اور اس کے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا؟ اور اس سے بھی اہم سوال جو عادل کے دل کا بار بار خون کر رہا تھا، یہ تھا کہ کیا شہزادی کی عزت آبرو محفوظ رہی ہے؟ وہ تو اسے کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی برداشت نہیں کر پاتا تھا۔ کہاں یہ کہ وہ کئی دن تک شب و روز ایک جنونی پاؤندے کے قبضے میں رہی تھی۔

اسی دوران میں ایک اور روح فرسا خبر بھی عادل کے کانوں تک پہنچی۔ اس نے تایا فراست سے زخمی عاصم اور ماموں طفیل کی حالت کے بارے میں پوچھا تو تایا فراست کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ انہوں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''عاصم بچ تو گیا ہے لیکن اس کی ٹانگ کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا......''

''اور ماموں طفیل۔'' عادل نے پوچھا۔

''طفیل نہیں بچا عادل۔'' تایا نے بوجھل آواز میں کہا۔ ''اس کے سر کی چوٹ بڑی سخت تھی، وہ تیسرے ہی دن ہسپتال میں اللہ بیلی ہو گیا تھا۔''

عادل کے دل پر گھونسا سا لگا۔ وہ کتنی ہی دیر گم صم بیٹھا رہا۔ آنکھیں نم ہو گئیں۔ اب اسے صادق کے بارے میں بھی زیادہ تشویش ہونے لگی۔ تایا فراست نے بتایا کہ صادق کا ابھی تک کوئی پتا نہیں۔ مالکانے زادہ کی کرخت صورت عادل کی نگاہوں میں گھومنے لگی اور اسے اپنا خون کھولتا ہوا محسوس ہوا۔

یہ گفتگو ختم ہوئی تو عادل نے تایا کو ایک طرف لے جا کر پوچھا۔ ''تایا جی! شہزادی تو خیریت سے ہے نا؟ میرا مطلب ہے...... کہ...... اس سے آپ کی بات ہوئی ہے؟''

تایا فراست کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھا اور بولے۔ ''میرے سوہنے رب کا لکھ لکھ شکر ہے، اس نے میری دھی رانی کی لاج رکھی ہے...... اس نے مجھے سب کچھ بتایا ہے، کوئی گل بھی چھپائی نہیں ہے مجھ سے۔''

''کیا بتایا ہے اس نے؟''

''وہ کہتی ہے کہ وہ موٹے سر والا جنونی بندہ تھا۔ اس کی بولی عجیب تھی۔ بس کوئی کوئی گل ہی سمجھ میں آتی تھی۔ پر اس کے ساتھ ہماری بولی میں ہی گل کرتا تھا۔ موٹے سر والا کہتا تھا کہ اس کا بھتیجا قتل ہوا ہے۔ اس کو پہاڑ سے گرا کر مارا گیا ہے۔ وہ جب تک اس کا بدلہ نہیں لے گا، اس کو چین نہیں آئے گا۔ مرنے والا اپنے پیو کی بس ایک ہی اولاد تھا۔ وہ اس کے غم میں دن رات روتا ہے۔ موٹے سر والا کہتا تھا کہ وہ شہزادی کو اپنے پنڈ لے جائے گا اور اس کا دیاہ، مرنے والے کے پیو یعنی اپنے بھرا سے کروائے گا۔ یہاں کی پہاڑی رسم کے مطابق اس کا بدلہ اسی طرح سے پورا ہو گا۔''

عادل کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ اس کے بدترین خدشات درست ثابت ہو رہے تھے۔ یہ سارا قصہ یقیناً اسی خناب گل سے شروع ہوا تھا جسے عادل نے لڑائی کے دوران میں بلندی سے گرا دیا تھا۔ خناب کا ساتھی فولاد جان اسی وقت خناب کا بدلہ لینا چاہتا تھا اور وہ لے بھی سکتا تھا لیکن رابے خاں نے وقتی طور پر اسے روک دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ

معاملہ دفینے تک پہنچنے کے بعد طے کریں گے۔ مگر پھر موت نے ان دونوں کو اس کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ اب یہ کام مالکانے زادہ نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو عادے؟'' تایا فراست نے پوچھا۔

''کک...... کچھ نہیں جی! ان لوگوں کے رسم و رواج عجیب ہیں۔ ان کے مذہب کی طرح، رواج بھی سمجھ میں نہیں آتے۔''

تایا نے کہا۔ ''سب سے زیادہ تو یہ گل پریشان کرتی ہے کہ یہاں پہاڑوں میں قتل ہونے والے کسی بندے کا میری دھی رانی سے کیا تعلق؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہاں پہاڑوں میں...... تم سے...... کوئی ایسا کام ہو گیا ہو...... جس کی وجہ سے شہزادی......''

تایا فراست نے بات ادھوری چھوڑ دی اور سوالیہ نظروں سے عادل کو دیکھنے لگے۔ عادل خاموش تھا۔ یہ بات تو اچھی طرح اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ شہزادی کو مالکانے زادہ وغیرہ سے سب معلوم ہو گیا ہو گا لیکن اس نے اپنے والد کو جان بوجھ کر یہ بات نہیں بتائی تھی کہ مالکانے زادہ جس قتل کی بات کر رہا ہے، وہ عادل سے ہی ہوا ہے۔

عادل نے اس موقع پر گول مول بات کر دینا مناسب سمجھا۔ اس نے کہا۔ ''تایا جی! یہاں کچھ پریشان کرنے والے واقعات ضرور ہوئے ہیں۔ میں اس بارے میں آپ کو بعد میں تفصیل سے بتاؤں گا۔ مجھے تسلی صرف ایک بات کی ہے...... بلکہ خوشی ہے کہ شہزادی کے حوالے سے آپ مجھ پر جو شبہ کر رہے تھے، وہ غلط نکلا ہے۔ وہاں لالی اور پال پور میں جو کچھ ہوا، اس سے میں بھی اتنا ہی بے خبر تھا جتنے آپ تھے۔''

تایا فراست نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''لیکن عادے! یہ بات تو ہے نا کہ اگر تمہارے ماموں طفیل پر حملہ کرنے والے اور شہزادی کو اُٹھا کر یہاں پہنچانے والے اور تمہارے یار صادق کو غائب کرنے والے ایک ہی لوگ ہیں تو پھر انہوں نے تم سے دشمنی چکانے کی کوشش کی ہے۔ کہیں تم سے واقعی کسی بندے کا...... خون تو نہیں ہوا؟''

''نہیں تایا! میرے اندر بھی آپ ہی کا خون ہے۔ اگر آپ کسی کو ناحق قتل نہیں کر سکتے تو میں کیسے کر سکتا ہوں۔ بہرحال اس بارے میں جلد ہی آپ کو تفصیل سے بتاؤں گا۔''

تایا فراست کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر انہوں نے وہی سوال پوچھا جس کی عادل توقع کر رہا تھا۔ انہوں نے جاننا چاہا کہ عادل یہاں اس برف زار میں کیا کر رہا ہے۔ یہ اتنے سارے انگریز مرد عورت یہاں کیوں موجود ہیں اور یہاں کس طرح کا مقابلہ ہونے والا ہے۔

عادل نے انہیں مختصر الفاظ میں بتا دینا مناسب سمجھا کہ آئندہ اڑتالیس گھنٹوں میں یہاں کیا ہونے والا ہے اور جو کچھ یہاں ہونے والا ہے، اس کی ہسٹری کتنی پرانی ہے...... اور اس غیر معمولی ایونٹ میں حصہ لے کر اس کو کس طرح کا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے...... تایا فراست حیرت کے عالم میں سنتے رہے۔ کچھ باتیں ان کی سمجھ میں آئیں، کچھ نہیں آئیں۔

تایا فراست زیادہ باریکیوں میں پڑنا نہیں چاہتے تھے...... ان کی بس ایک ہی خواہش تھی کہ وہ شہزادی اور قاسم وغیرہ کے ساتھ جلد از جلد اس خطرناک علاقے سے نکل جائیں اور واپس اپنے گاؤں تک پہنچ جائیں۔

عادل نے انہیں سمجھایا کہ وہی ہوگا جو وہ چاہتے ہیں لیکن طریقے سے۔ بس اب صرف اڑتالیس گھنٹے کی بات ہے۔ یہاں کیمپ میں موجود سارے لوگ ایک قافلے کی صورت میں سفر کریں گے اور واپس کنکورڈیا گلیشیئر تک پہنچیں گے۔ عادل نے تایا کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''تایا جی! یہاں آپ کے ساتھ آنے والا ہر شخص، مہمان کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں کسی کو کسی طرح کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ آپ بالکل بےفکر رہیں۔ انور کے بازو کا بھی بڑا اچھا علاج کیا گیا ہے۔ شاید شہر میں بھی اس طرح سے نہ ہوتا، اسے پلاستر چڑھایا گیا ہے۔ قاسم بھائی کی طرف سے بھی آپ تسلی دے دیں تو میں اس کے ہاتھ وغیرہ کھول دیتا ہوں۔ قاسم بھائی اتنے غصے میں تھا کہ ہمیں ہاتھ باندھنے کے سوا کوئی چارہ ہی نظر نہیں آیا۔''

تایا نے کہا۔ ''ہماری طرح اس کے دماغ میں بھی یہی تھا کہ شہزادی کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، تم نے کیا ہے۔ اب اس گل کا فیصلہ تو ہو گیا ہے۔ اب قاسم کو بھی یہ گل سمجھ میں آ جائے گی۔ میں اسے جا کر سمجھاتا ہوں۔ وہ اب کسی طرح کا غصہ نہیں دکھائے گا۔''

''تایا! آپ ناصر کو بھی سمجھا دیں۔ میری اس سے کوئی لڑائی نہیں ہے۔ آپ میرے بڑے ہیں، میرے لیے جو بھی حکم کریں گے، میں اسی طرح کروں گا۔ پنڈ میں جو کچھ بھی ہوا ہے، میں اسے بھول چکا ہوں اور آپ کو یہ بھی یقین دلاتا ہوں تایا جی کہ وہاں باغ میں میرے ساتھ ڈراما کیا گیا تھا۔ میں وہاں صرف آپ سے ملنے گیا تھا۔'' تایا سب کچھ اشکبار خاموشی کے ساتھ سنتے رہے۔

وہ رات بڑی تشویش بھری اور سنسنی خیز تھی۔ سر سرمد، عادل اور ہمایوں اپنے خیمے میں تادیر سر جوڑ کر بیٹھے رہے۔ حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ بظاہر تو یہ بڑا زبردست اتفاق ہوا تھا کہ تایا فراست اور رشید خان وغیرہ مالکانے زادہ سے شہزادی کو چھڑانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ مالکانے زادہ اور اس کا نامعلوم ساتھی جان بچا کر بھاگ گئے تھے لیکن اسے بھاگنے کے بجائے پسپا ہونا کہا جاتا تو زیادہ مناسب تھا۔ مالکانے زادہ کی خصلت کا اندازہ اب اچھی طرح ہو چکا تھا۔ وہ اتنی جلدی پیچھے ہٹنے والا نہیں تھا۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ اپنے پاوٗندہ ساتھیوں کے ہمراہ دوبارہ اس طرف آئے گا۔ وہ لوگ بانگڑی پہاڑ کی مغربی جانب آباد تھے۔ فاصلہ بہت زیادہ تو نہیں تھا لیکن راستہ دشوار تھا۔ سرمد صاحب نے ''ٹینٹ لیمپ'' کی روشنی میں نقشہ دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تیز رفتاری سے بھی سفر کیا جائے تو یہ تقریباً دو دن کا راستہ ہے۔ یعنی مالکانے اور اس کے ساتھی کو دو دن پاوٗندہ بستی تک جانے میں لگیں گے اور دو دن آنے میں...... یعنی چار دن۔''

ہمایوں بولا۔ ''مطلب یہ کہ یہاں کے مقابلوں سے فارغ ہونے کے بعد بھی ہمارے پاس کافی وقت بچا رہے گا۔''

''بہت زیادہ وقت تو نہیں، لیکن اتنا ضرور ہوگا کہ ہم اس کیمپ کو سمیٹ کر یہاں سے کنکورڈیا کی طرف نکل سکیں۔ اس کے باوجود ہمیں کسی بھی امکان کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ مسٹر اوٹس کا بھی یہی کہنا ہے کہ ایونٹ ختم ہوتے ہی ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

انگریز فیملیز یہاں کے کسی مقامی مسئلے میں اُلجھنا نہیں چاہتی تھیں۔ ان میں ایک طرح کی تشویش پائی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ لوگ کل کے مقابلوں کی تیاریوں میں بھی لگے ہوئے تھے۔ نوبل راک کے گرد چار مختلف جگہوں پر

کیمرے نصب کیے گئے تھے۔ ان کیمروں کے اوپر سائبان تھے۔ کسی حادثے کی صورت میں طبی امداد کا مناسب انتظام بھی موجود تھا۔ کل صاف موسم کی پیشین گوئی تھی۔

سہ پہر کو کرسٹل، عادل کے پاس آئی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ''تم کے لیے آچھی نیوز لائی ہوں، شہزادی تم سے ملنا چاہتا ہے۔''

''کہاں؟''

''وہ وہیں ہام کے ٹینٹ میں ہے۔ اس کا فادر دوسرے ٹینٹ میں ہے، تھک کر سو رہا ہے۔''

شہزادی سے ملنے کو عادل کا دل بھی مچل رہا تھا۔ اب خود بخود ہی یہ سچویشن بن گئی تھی۔ ناصر، قاسم اور مشتاق وغیرہ سمیت سب لوگ ابھی تک سخت نگرانی میں تھے۔ انہیں ایک ہی جگہ زمین پر بٹھایا گیا تھا اور چار مسلح گارڈز ان پر پہرا دے رہے تھے۔ اس صورتِ حال میں عادل اور شہزادی کی ملاقات میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ پھر بھی اس نے احتیاط کی اور کسی کی نگاہ میں آئے بغیر شہزادی والے ٹینٹ میں داخل ہو گیا۔ عادل کو دیکھ کر وہ سسک پڑی...... اور اس کا توانا بازو تھام کر...... بازو کے ساتھ لگ گئی۔ وہ اب غنودگی کی کیفیت سے نکل آئی تھی۔ اشکبار آواز میں بولی۔ ''یہ سب کیا ہو رہا ہے عادل! اس سے تو...... موت آ جاتی تو اچھا تھا۔''

عادل نے بےساختہ اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''ایسی بات منہ سے نہ نکالو۔ سب اچھا ہو جائے گا ان شاءاللہ۔''

انہوں نے دو چار اِدھر اُدھر کی باتیں کیں، پھر وہ روتے ہوئے بولی۔ ''عادل! وہاں باغ میں تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا، اس نے مجھے بڑا اُرلایا۔ میں اس کو بہت بڑا دُکھ سمجھتی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ ابھی اس سے بڑے بڑے دُکھ سامنے آنے ہیں۔ ابا جی کی عزت مٹی میں مل گئی ہے عادل! لوگ میرے بارے میں کیا سوچیں گے، کیا کہیں گے؟''

''تمہیں کچھ نہیں ہوا۔ اللہ پاک کا لاکھ لاکھ شکر ہے، تم ویسی ہی ہو، جیسی اپنے گھر میں تھیں۔ لیکن اگر خدانخواستہ...... خدانخواستہ کچھ ہو بھی جاتا تو تم میرے لیے اسی طرح پاک اور صاف تھیں شہزادی! تمہیں نہیں پتا، تم میرے لیے کیا ہو؟''

اس نے اپنی خوبصورت پلکیں اُٹھا کر عادل کی طرف دیکھا۔ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''عادل! کیا...... تم سے کسی کا...... خون ہو گیا ہے؟ مجھے اسی موٹے (سرمنڈے) کے ساتھی نے بتایا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ہر صورت اس قتل کا بدلہ لے کر رہیں گے۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ اس بدلے کے لیے انہوں نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟''

''انہیں پتا چل گیا ہوگا کہ...... تم میرے لیے کیا حیثیت رکھتی ہو۔'' عادل نے بوجھل لہجے میں کہا۔

''لیکن کیسے عادل؟''

''ابھی اس بارے میں یقین سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' عادل نے جواب دیا۔ بہرحال، عادل کے ذہن میں یہ بات موجود تھی کہ مالکانے کو شہزادی اور ماموں طفیل وغیرہ کے بارے میں ساری معلومات صادق سے ہی حاصل ہوئی ہوں گی۔ وہ قسمت کا مارا پتا نہیں کس حال میں تھا۔

شہزادی ایک بار پھر روہانسی آواز میں بولی۔ ''عادل! مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا

چاہیے۔ میں اب اور کچھ نہیں دیکھ سکتی۔'' وہ دوبارہ سسکنے لگی۔

''اب اور کچھ نہیں دیکھنا پڑے گا شہزادی! سمجھو اب ہم بس یہاں سے نکلنے کی تیاری کر رہے ہیں۔''

وہ چپ ہو گئی۔ عادل بھی چپ رہا۔ اس کی انگلیوں کی گرفت بدستور عادل کے بازو پر قائم تھی۔ کچھ دیر بعد وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔'' عادل! میں آج تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ مجھے بہت بُرے بُرے خیال آ رہے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ آنے والے دنوں میں ہمارے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہونے والا۔ چودھری مختار اور اس کا بیٹا، میرے رشتے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ یا تو...... یا تو مجھے لے کر کہیں دور نکل جاؤ...... یا پھر بھول جاؤ مجھے...... اور زیادہ اچھا یہی ہے کہ بھول جاؤ۔ میں اپنے ابا جی کی عزت کو اور مٹی میں رولوں گی تو شاید مجھے مر کے بھی چین نہیں آئے گا۔'' اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان تھا۔

عادل نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔'' نہیں شہزادی! میں تمہیں اس طرح لے کر نہیں جاؤں گا...... اور نہ ہی تمہیں بھولوں گا۔ میرے اور تایا کے درمیان ایک وعدہ ہے۔ میں وہ وعدہ پورا کروں گا۔ تم میرے تایا کی عزت ہو۔ میں نے تمہیں عزت سے ہی حاصل کرنا ہے...... اور کر کے رہنا ہے۔ اچھی بات ہے کہ اب تم بھی یہیں ہو۔ تم دیکھنا شہزادی! تم دیکھنا، میں کس طرح اپنی جان کی بازی لگا کر تمہارا ہاتھ جیتوں گا۔ وہ وقت اب بہت قریب آ گیا ہے۔''

عادل کے لہجے میں فولادی ارادوں کی کھنک اور مہیب طوفانوں کی گرج تھی۔ ان لمحوں میں اس کے اندر ایسی توانائی تھی کہ اسے لگتا تھا کہ وہ شہزادی کی پیشانی چومنے کے بعد ستاروں کو بھی ہاتھ لگا سکتا ہے...... اور پھر اس نے واقعی شہزادی کی پیشانی چومی اور اسے بولنے کا موقع دیئے بغیر تیزی سے باہر نکل آیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ آئندہ چند گھنٹوں میں قسمت اس کے ساتھ کیا کھیل کھیلنے والی ہے۔

○.....❖.....○

اگلے روز موسم واقعی صاف تھا۔ نوبل راک کے اردگرد میلے کا سا سماں تھا۔ برٹش مرد و زن بہت پُرجوش نظر آ رہے تھے اور اپنے اپنے کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ بہت سے تماشائیوں کے گلے میں ٹیلی اسکوپس جھول رہی تھیں۔ کچھ نے ویڈیو کیمرے تھامے ہوئے تھے۔ گاہے بگاہے فلش لائٹس بھی چمک رہی تھیں۔

ایک دن پہلے فائنل مقابلوں کے لیے 18 کھلاڑی چن لیے گئے تھے۔ عادل کا نام ان میں شامل تھا۔ کئی سو سال پرانی ترتیب ہی اب تک چل رہی تھی۔ کھلاڑیوں کو تین تین کی چھ ٹولیوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ تین کھلاڑیوں کی ایک ٹولی کو ایک ساتھ چٹان پر چڑھائی کرنا تھی۔ ان میں سے پہلے نمبر پر آنے والا اگلے مرحلے میں جانے کا حق دار تھا۔ یوں چھ ٹولیوں یا ٹیموں میں سے چھ کھلاڑی اگلے مرحلے میں چلے جاتے۔ ان چھ کھلاڑیوں کو پھر دو ٹولیوں میں تقسیم کیا جانا تھا۔ اس مقابلے میں فائنل دو کھلاڑی منتخب ہونا تھے جن کے درمیان آخری مقابلہ ہونا تھا۔ عادل کو قوی امید تھی کہ وہ اس آخری مقابلے میں موجود ہو گا۔

عادل چوتھی ٹیم میں شامل تھا۔ اس ٹیم کی باری شام چار بجے کے قریب آئی۔ سرمد صاحب نے اس کا شانہ تھپکا۔ اپنی پلاسترشدہ ٹانگ کے باوجود وہ ہمہ وقت اس کی کوچنگ اور حوصلہ افزائی میں مصروف رہے تھے۔ عادل نے دور اس سرخ ٹینٹ کی طرف دیکھا جہاں شہزادی موجود تھی۔ اسے یہی لگا جیسے آج وہ پھر شاہ نوانہ کے میلے میں ہے اور کھجور کے تنوں پر چڑھائی کرنے والا ہے...... دور ایک رنگ برنگے تانگے کے گرد ریشمی پردے تنے ہیں اور اس کی شہزادی ان پردوں کے اندر سے اس کو دیکھ رہی ہے۔ اس کے جسم میں نیا ولولہ بھر گیا۔

کلائمبنگ شروع ہوئی۔ آغاز میں تھامس نامی برٹش نوجوان آگے نکل گیا لیکن پانچ چھ سو فٹ کی چڑھائی کے بعد عادل نے اسے جالیا اور اس سے ''لیڈ'' لے لی۔ یہ لیڈ عادل نے آخر تک برقرار رکھی اور یہ Heat جیت گیا۔ چوٹی پر کھڑے ریفریز نے اسے سٹاپ واچ دکھائی۔ عادل کا ٹائم تھا 48 منٹ اور یہ کافی اچھا ٹائم تھا۔

اب وہ ان چھ خوش قسمت کھلاڑیوں میں شامل ہو چکا تھا جنہیں اگلے روز دوپہر سے پہلے کلائمبنگ میں حصہ لینا تھا۔ لیوپڈ بھی ان چھ کھلاڑیوں میں جگہ بنا چکا تھا۔ عادل کے لیے خوشی کی بات یہ تھی کہ اس کا ٹائم لیوپڈ کے ٹائم سے قریباً تین منٹ کم تھا۔

سرمد صاحب کے حکم پر کرسٹل نے عادل کی فزیوتھراپی کی تاکہ اس کے کندھے اور بازو مشقت کے لیے تیار ہو جائیں۔ کرسٹل اسے ٹینٹ میں لے گئی۔ نیکر کے سوا اس کے سارے کپڑے اُتار دیئے اور اس کے رگ و پٹھوں کی خوب

مالش کی۔ مشقت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن وہ دلجمعی سے لگی رہی۔ تاہم ایک بات عادل نے صاف محسوس کی۔ اب وہ خود کو سنبھال چکی تھی۔ عادل کے حوالے سے اس کے جذبات میں کوئی کج روی یا سفلی خواہش نظر نہیں آتی تھی۔ عادل کی گردن اور کندھوں کا مساج کرتے ہوئے وہ مسکرائی اور بولی۔ ''آج ہام نے اپنا سارا ہنر توم کے مساج پر لگایا۔ ہام کو یقین ہے توم کل شہزادی کو مایوس نا ئیں کرے گا۔ وہ بہت آچھا...... بہت زیادہ آچھا۔''

عادل نے اس کے لہجے کی نقل اُتاری۔ ''توم بھی بہت آچھی۔ توم نے ہام کا بہت ساتھ دیا۔ کل ہم صرف شہزادی کے لیے ہی نا ئیں توم کے لیے بھی جیتے گا۔ توم کو لیوپڈ کے شکنجے سے نکال کر دکھائے گا۔ شکنجہ سمجھتی ہونا توم؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور عادل کے لہجے پر ہنس دی۔ عادل بھی ہنسا۔ ہنستے ہوئے اس کی پسلیوں کے نیچے ہلکی سی ٹیس اُٹھی لیکن اس نے زیادہ غور نہیں کیا۔

کچھ دیر بعد جب وہ سرمد صاحب کی ہدایت کے مطابق لیٹنے کے لیے ''سلیپنگ بیگ'' میں گھسا تو اسے لگا کہ معدے کی جگہ پر ہلکا درد ہو رہا ہے...... اس نے درد کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی مگر وہ اپنی جگہ موجود تھا اور بڑھ رہا تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر یہ کیفیت ہو گئی کہ عادل کروٹ پر کروٹ بدلنے لگا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ اس نے کیا کھایا تھا۔

ہمایوں نے اس کی کیفیت کو بھانپا اور پوچھا۔ ''کیا بات ہے عادل، کچھ بے آرام لگ رہے ہو۔''

''نہیں، کوئی خاص بات نہیں۔'' وہ بولا۔

''تم سینہ مل رہے تھے۔ جلن وغیرہ تو محسوس نہیں ہو رہی؟''

''ہاں، کچھ کچھ لگ رہا ہے۔''

ہمایوں اُٹھ کر بیٹھ گیا اور لیمپ کی روشنی تیز کی۔ ''کھانا تو ہمارے ساتھ ہی کھایا تھا نا تم نے؟ اور اس کے بعد تو کوئی چیز نہیں کھائی؟''

''نہیں۔'' عادل نے کہا پھر جیسے اسے یاد آیا۔ تین لڑکوں کی ٹولی میں اول آنے کے بعد جب وہ نیچے اُترا تھا اور سب خوشی کا اظہار کر رہے تھے تو اس نے کچھ پیا تھا۔ پھر اسے یاد آیا۔ برٹش تماشائیوں میں سے کسی نے زور سے اس کا کندھا تھپکا تھا اور جوس کا ٹن اس کی طرف بڑھایا تھا۔ اس کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ اس سے وہی غلطی ہو چکی ہے جس سے کرسٹل نے اور سرمد صاحب نے اسے بار بار خبردار کیا تھا۔ اس جوس کے سوا اور کیا چیز ہو سکتی تھی جو اب اس کے معدے میں باقاعدہ خنجر چلانے لگی تھی۔ بے شک وہ جوس ''ٹن پیک'' تھا اور سر بمہر تھا لیکن کرنے والے کیا نہیں کر لیتے۔

یکایک عادل کا دل بے طرح متلایا۔ وہ منہ دبا کر اُٹھا۔ ہمایوں نے فوراً آگے بڑھ کر Vomit bag اس کے سامنے کیا۔ عادل نے اس میں قے کی۔

ایک بار یہ سلسلہ شروع ہوا تو بڑھتا چلا گیا۔ اگلے ایک گھنٹے میں عادل کو چار بار قے ہوئی اور آخری بار قے میں تھوڑا سا خون بھی آیا۔

ہمایوں نے بے قرار ہو کر کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ سر کو بتا دینا چاہیے۔''

عادل نے انگلی کے اشارے سے اسے منع کیا۔ اسے جیسے اب بھی امید تھی کہ شاید طبیعت سنبھل جائے۔ لیکن اسی دوران میں ٹینٹ سے باہر سرمد صاحب کی آواز سنائی دی۔ وہ عادل کو پکار رہے تھے۔ شاید یہ ان کی نہایت تیز چھٹی حس ہی تھی جس نے انہیں عادل کی مصیبت سے خبردار کر دیا تھا۔ اب سرمد صاحب کو باہر تو نہیں روکا جا سکتا تھا۔ وہ اندر آ گئے...... اور پھر ساری صورتِ حال سے آگاہ ہو گئے۔ ان کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔ وہ بہت حوصلے والے تھے لیکن ان گھڑیوں میں عادل انہیں پریشان دیکھ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ نہایت تشویش ناک صورتِ حال تھی۔ صبح فائنل مقابلے تھے اور عادل بُری طرح فوڈ پوائزنگ کا شکار ہو چکا تھا۔

اب چھپانے سے کچھ فائدہ نہیں تھا۔ اسی وقت ایک برٹش ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس نے بھی فوڈ پوائزنگ کی تصدیق کی۔ اس سے جو کچھ بن پڑا، اس نے کیا۔ درد اور متلی کے لیے دو انجکشن لگائے اور گلوکوز کی ڈرپ بھی چڑھا دی۔ وہ بڑی تکلیف دہ رات تھی۔ عادل کے بہی خواہ ساتھیوں کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے۔ کرسٹل کا چہرہ برف کی طرح سفید دکھائی دیتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اس شدید تکلیف کی حالت میں کلائمبنگ جیسی مشقت کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ مقابلے سے پہلے ہی باہر ہو گیا تھا...... لیکن عادل کی نگاہوں میں ایک اور ہی طرح کا منظر بسا ہوا تھا۔ یہ منظر جیسے اس کے دل و دماغ پر نقش ہو چکا تھا۔ اس منظر کا تعلق سرمد صاحب سے تھا۔ اپنے شدید زخمی کندھے کے ساتھ وہ ایک ابر آلود، یخ بستہ دوپہر کو ''گمشدہ اینکر'' ڈھونڈنے کے لیے کرسٹل کے ساتھ دو ہزار فٹ بلند چٹان پر چڑھ گئے تھے۔ وہ واقعہ ان کے فلسفے ''نو پین نو گین'' کی عملی تفسیر تھا۔ ہاں...... انہوں نے اس دوپہر میں عادل کے سامنے غیر معمولی برداشت و ہمت کا جو بے مثل نمونہ پیش کیا تھا...... وہ آج پوری آب و تاب کے ساتھ عادل کی نگاہوں میں دمک رہا تھا۔ اور اسے ایک انہونی کی طرف بڑھا رہا تھا۔

O......❖......O

اس صبح چشمِ فلک نے ایک عجب نظارہ دیکھا۔ ساری رات اُلٹیاں کرنے اور پوائزنگ کا شکار رہنے کے بعد عادل مقابلے کے لیے تیار تھا۔ اس کا رنگ ہلدی کے مانند تھا، ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ اسے دیکھ کر ہی لگتا تھا کہ وہ ہفتوں کا بیمار ہے۔ مگر اس کے ارادے اس چٹان سے زیادہ مضبوط تھے جس کے سامنے وہ کھڑا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، وہ اسی بدباطن لیوپڈ کا کیا دھرا ہے۔ لیوپڈ کو دیکھنے کے بعد اس کے سینے میں بھڑکتے شعلے کچھ اور فروزاں ہو گئے۔ وہ آج مر جانا چاہتا تھا یا پھر اس گورے سے جیت جانا چاہتا تھا۔

سرمد صاحب، ہمایوں حتیٰ کہ کرسٹل نے بھی اسے روکنے کی بہت کوشش کی تھی مگر اس نے کسی کی نہیں سنی تھی۔ وہ سن ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے آج صبح سویرے ہی اپنی ساری کشتیاں جلا ڈالی تھیں۔ طے کر لیا تھا کہ جب تک اس کے جسم میں جان ہے، وہ جیتنے کی کوشش کرے گا۔

اس نے سرمد صاحب کی ایک بات کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''آپ ہی نے کہا تھا سر، جہاں انسان کی ہمت جواب دینے لگتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کا جسم اور دماغ اس سے زیادہ مشقت نہیں جھیل سکتا، وہیں سے بڑی اور یادگار کامیابیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ آپ نے کہا تھا نا سر؟''

''لیکن یہاں تمہاری جان کو خطرہ ہے عادل۔''

"مجھے ایسی زندگی چاہیے بھی نہیں سر۔" اس نے باغیانہ انداز میں جواب دیا تھا۔

سرمد صاحب نے اس کے لب و لہجے کو نوٹ کیا اور پھر اس کے راستے سے ہٹ گئے تھے۔ یہ صبح سویرے کی باتیں تھیں اور اب دس بج چکے تھے...... اب وہ تھا اور نوبل راک تھی۔ تین تین کھلاڑیوں کی دو ٹولیاں فائنل مقابلوں کے لیے تیار تھیں۔ عادل پہلی ٹولی میں شامل تھا۔ تینوں کھلاڑی مخصوص جوتے پہنے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ہیلمٹ، گلاسز اور دستانے وغیرہ بھی ان کے لباس کا حصہ تھے۔

فائر ہوا اور اس کے ساتھ ہی تینوں کھلاڑیوں نے کلائمبنگ شروع کر دی۔ اگلا قریباً پون گھنٹہ عادل کی زندگی کا کٹھن ترین وقت تھا۔ اسے ہر گھڑی یہی لگ رہا تھا کہ وہ جاگتی آنکھوں سے ایک خواب دیکھ رہا ہے۔ اس کے سینے میں سانس ایک برچھی کی طرح چل رہی تھی۔ اس کا جسم جگہ جگہ سے چھل رہا تھا۔ انگلیوں پر زخم آ رہے تھے مگر وہ اوپر کی طرف جا رہا تھا۔ اوپر جانا اس کی فطرت میں تھا...... اس کے خون میں تھا۔ وہ بلندیاں طے کرنے کے لیے پیدا کیا گیا تھا...... اور پھر اس نے کر دکھایا۔ ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ نہایت ابتر حالت میں ہونے کے باوجود وہ آٹھ دس سیکنڈ کے فرق سے یہ مقابلہ جیت گیا۔

تبصرہ کرنے والے کچھ حیران تھے۔ ان کی پیشین گوئی تھی کہ عادل یہ مقابلہ بآسانی چھ سات منٹ کے فرق کے ساتھ جیت جائے گا لیکن یہاں بس چند سیکنڈ کا فرق پڑا تھا۔ دراصل یہ وہ لوگ تھے جو عادل کی ابتر حالت سے بے خبر تھے۔ عادل واپس آیا تو کرسٹل اور ہمایوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انہیں احساس تھا کہ ان لمحوں میں عادل پر کیا گزر رہی ہے۔ جس طرح کوئی سپر سانک طیارہ، آواز کی حد کو توڑتا ہے، اسی طرح وہ بھی اپنی برداشت کی حد کو پار کر رہا تھا۔

سب کچھ اسی طرح ہو رہا تھا جس طرح توقع کی گئی تھی۔ دوسری ٹیم میں سے لیوپڈ واضح فرق کے ساتھ جیت گیا تھا۔ اس کا ٹائم شاندار رہا تھا...... رنر اَپ کھلاڑی سے قریباً پانچ منٹ کم۔

اور اب آخری مرحلہ تھا۔ وہی جس کے لیے دل دھڑک رہے تھے اور سانسیں رُکی ہوئی تھیں۔ نوبل راک کی قریباً 1600 فٹ خطرناک چڑھائی سامنے تھی اور اس ایونٹ کے دو تیز رفتار ترین کلائمبرز، اسٹارٹنگ پوائنٹ پر بالکل تیار تھے۔ لیوپڈ نے شعلہ بار نظروں سے عادل کو دیکھا۔ عادل نے اس کی شعلہ بار نظروں کا جواب شعلہ بار نظروں سے ہی دیا۔ اس نے خاموشی کی زبان میں کہا۔ "اے سفید چمڑی والے جانور...... میں تیری ہر زیادتی کا جواب یہیں پر دینے کی کوشش کروں گا۔"

ہوائی فائر ہوا اور دونوں نے چڑھائی شروع کی۔ عادل کے لیے یہ زندگی اور موت کا کھیل بن چکا تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ مر جائے گا، یا جیت جائے گا۔ چند منٹ پہلے سرمد صاحب نے اسے ایک انرجی ڈرنک قریباً آدھ لیٹر پانی میں ملا کر زبردستی پلایا تھا۔ وہ مشکل سے دو سو فٹ ہی اوپر گئے ہوں گے کہ عادل کے معدے نے یہ سارا ڈرنک اُلٹ دیا۔ اس قے میں بھی خون کی آمیزش تھی۔ عادل نے یہ سب کچھ دیکھا لیکن اب وہ ان چیزوں سے آگے نکل چکا تھا۔ اس کی نگاہیں بس نوبل راک کی چوٹی پر تھیں۔ جہاں سرخ جھنڈا لہرا رہا تھا اور ریفریز کی سفید وردیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس کے کانوں میں سرمد صاحب کے الفاظ گونج رہے تھے۔ انسان جب اپنی برداشت کی حد پار کرتا ہے تو پھر اسے ناقابل

یقین کامیابیاں سامنے کھڑی نظر آتی ہیں لیکن......

اس کے بعد انہوں نے کیا کہا تھا۔ شاید یہ کہا تھا کہ جب برداشت کی حد پار کی جاتی ہے تو طبی سائنس کے مطابق کبھی کبھی دماغ کام کرنا چھوڑ جاتا ہے اور بیہوشی طاری ہو جاتی ہے (جسم اور دماغ کا رابطہ ٹوٹ جاتا ہے) تو کیا اس پر بھی بیہوشی طاری ہو رہی تھی؟ اس عمودی دیوار پر چڑھتے ہوئے بیہوش ہو جانے کا مطلب کیا تھا؟ سیدھی...... سیدھی موت۔ لیکن وہ رُک نہیں سکتا تھا۔ اب رُکنے کا وقت گزر چکا تھا۔ اب اوپر چڑھنے کا وقت تھا یا سیکڑوں فٹ گہرائی میں گرنے کا وقت تھا۔

لیوپڈ شروع میں ہی اس سے چار پانچ فٹ آگے نکل گیا تھا اور اب وہ یہ برتری برقرار رکھے ہوئے تھا...... بلکہ دھیرے دھیرے اس میں اضافہ کر رہا تھا۔ سرمد صاحب کے فقرے ایک جادوئی اثر کے ساتھ عادل کے کانوں میں گونجتے رہے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی باتیں چھوٹے چھوٹے ٹپس۔ انہوں نے کہا تھا...... پانی سے بھرے ہوئے گلاس میں سے ایک کپ پانی تو ہر کوئی نکال سکتا ہے لیکن ایک گلاس میں سے ڈیڑھ گلاس پانی نکالنے کو ہمت کا کرشمہ کہتے ہیں...... اور وہ یہی کر رہا تھا۔ گلاس بھر پانی میں سے ڈیڑھ گلاس نکالنے کی دیوانی کوشش میں مصروف تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ ایسا کر لے گا۔

لیکن حقیقتیں کچھ اور کہہ رہی تھیں۔ اس کا اور لیوپڈ کا فاصلہ آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ اب فاصلہ پندرہ منٹ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ نتیجہ صاف نظر آ رہا تھا لیکن کیا وہ ہمت چھوڑ دے؟ رُک جائے؟ یا پھر آنکھیں بند کر کے موت کی گہرائی میں چھلانگ لگا دے؟ اور پھر اسے دوسری قے آئی۔ صرف پانی نکل رہا تھا۔ اسے اپنے ہاتھ پاؤں سے جان جاتی محسوس ہوئی۔ اس کی ماں...... خود بھوکی رہ کر اسے کھانا دیتی تھی اور کبھی وہ دونوں ہی بھوکے رہتے تھے۔ اس فاقہ کشی نے عادل کے جسم میں اضافی برداشت پیدا کر دی تھی۔ سرمد صاحب کی آواز کی بازگشت اس کے کانوں میں گونجی۔ اپنے کسی لیکچر میں انہوں نے کہا تھا۔ "آخری سانس اور آخری گولی تک لڑنے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ بدترین حالات میں کوشش جاری رکھنا۔"

لیوپڈ سے اس کا فرق اب مزید بڑھ گیا تھا۔ نیچے سات آٹھ سو فٹ کی گہرائی میں تماشائیوں کا جوش دیدنی تھا۔ یقیناً وہ لیوپڈ کی حوصلہ افزائی میں مصروف تھے۔ عادل کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اب وہ لیوپڈ کی یہ لیڈ ختم نہیں کر پائے گا۔ لیڈ بڑھ رہی تھی بیس فٹ سے زائد ہو چکی تھی۔

عادل نے آخری بار زور مارا۔ شہزادی اور کرسٹل کے مرجھائے ہوئے چہرے نگاہوں میں بسا کر اس نے دیوانہ وار اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت دی۔ اب چوٹی کی طرف دو تہائی فاصلہ طے ہو چکا تھا۔ بس پندرہ سولہ منٹ کی بات اور تھی...... تین چار منٹ اور گزر گئے۔ عادل لیڈ کم کرنے میں تقریباً ناکام رہا۔ لیکن ایک دیوانی کوشش کے طور پر ہاتھ پاؤں ضرور چلاتا رہا...... اور پھر معجزہ ہوا...... معجزے ایسے ہی وقتوں کا انتظار کرتے ہیں۔ جب عقل اور مصلحت کے پرخچے اُڑا دیئے جاتے ہیں، شیشوں سے پتھر توڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پانیوں میں دیے جلانے کا تہیہ کیا جاتا ہے۔ کشتیاں جلا کر بے دریغ اجنبی سرزمینوں پر قدم رکھ دیئے جاتے ہیں...... اور یہاں بھی ایک کرشمہ رُونما ہوا۔ عادل کی دیوانہ وار جدوجہد دیکھ کر لیوپڈ میں جو اضطراب پیدا ہوا تھا، اس نے اس کا "ٹیمپو" خراب کر دیا۔ ایک دراڑ میں پاؤں جمانے کے بعد جب اس

نے ایک اینکر پوائنٹ کو تھامنا چاہا تو دراڑ میں سے اس کا پاؤں پھسل گیا۔ وہ ایک دھچکے کے ساتھ نیچے آیا اور پھسلتا ہوا عادل سے قریباً پندرہ فٹ نیچے چلا گیا۔ اس کے ''ہارنیس'' میں حفاظتی رسا موجود تھا۔ اس ''بیک اَپ'' نے اسے مزید نیچے جانے سے بچایا اور وہ مضبوط بولٹنگ کے ساتھ ہوا میں جھول گیا۔ شدید جھلاہٹ میں اس کے منہ سے بے ساختہ ننگی گالیوں کی بوچھاڑ نکل گئی۔ ان میں سے زیادہ تر گالیاں یقیناً عادل کے لیے ہی تھیں۔

یہ سنہری موقع قدرت نے عادل کو دیا تھا اور یہ اس کی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ تھا۔ وہ اس موقع سے فائدہ نہ اُٹھاتا تو نوبل راک کی تاریخ کا ناکام ترین شخص کہلاتا۔ اس نے اپنی رہی سہی قوت جمع کی اور باقی ماندہ سوڈیڑھ سو فٹ کا فاصلہ طے کرنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دی۔ لیوپڈ بلا کی تیزی سے اس کے پیچھے آرہا تھا۔ عادل کی برتری بتدریج کم ہو رہی تھی۔ آٹھ فٹ...... سات فٹ...... پانچ فٹ...... تین فٹ...... عادل نے آخری زور مارا۔ اتنا قریب پہنچ کر وہ ہارنا نہیں چاہتا تھا...... ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

عادل کی برتری اب تین فٹ سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی۔ لیوپڈ یہ برتری کسی بھی وقت ختم کر سکتا تھا۔ بیس پچیس فٹ کی چڑھائی اب بھی باقی تھی۔ عادل نے اپنی رہی سہی طاقت جمع کی اور یہ آخری بیس پچیس فٹ طے کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا...... اور پھر وہ سنہری موقع آیا جب اس نے اپنے ہاتھوں سے نوبل راک کے بالائی کنارے کو چھوا۔ اوپر کھڑے ''ریفریز'' نے سرخ جھنڈی بلند کر کے اور سیٹی بجا کر عادل کی فتح کا اعلان کیا...... عادل بمشکل دو فٹ کے مارجن سے یہ مقابلہ جیت چکا تھا۔

وہ راک کے اوپر پہنچا اور قریباً چکرا کر اوندھے منہ گر گیا۔ چٹان پر موجود افراد اس کی طرف لپکے۔ ان کے پاس چھوٹے آکسیجن سلنڈر اور ماسک وغیرہ موجود تھے، انہوں نے ایک ماسک عادل کے منہ پر چڑھا دیا۔

O......❖......O

یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ اس کامیابی نے جہاں برطانیہ کے گوروں کو ہلا کر رکھ دیا، وہاں عادل اور اس کے ساتھیوں کا جوش وخروش بھی دیکھنے کے قابل کر دیا۔ قریباً ایک گھنٹے بعد جب عادل نیچے پہنچا تو ہمایوں اور چند مقامی پورٹرز نے اسے کندھوں پر اُٹھا لیا۔ تالیوں کی گونج اور نعروں کے شور سے قرب وجوار گونج اُٹھے۔ سناترا برادری کے بہت سے افراد بھی چار و ناچار عادل کی کامیابی پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ سرمد صاحب کے چہرے پر فتح کی چمک دیکھ کر عادل کا خون سیروں بڑھ گیا۔ یہ بات بھی عادل کے لیے بہت حوصلہ افزا تھی کہ تایا فراست کے ساتھ آئے ہوئے کئی افراد بھی اس موقع پر خوش دکھائی دے رہے تھے۔ یہ سب عادل کے جانے پہچانے چہرے تھے...... اس کے ہم وطن...... اس کے گاؤں کے لوگ، جن کے ساتھ وہ کھیلا کودا تھا اور جن کے درمیان وہ پروان چڑھا تھا۔

ہمایوں نے اسے کندھوں سے اُتارا تو کرسٹل دوڑ کر آئی اور اس کے گلے سے لگ گئی۔ اس کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ اس کے عقب میں عادل کو کرسٹل کے والد اور سوتیلی والدہ کی جھلک نظر آئی۔ ان کے منہ پھولے ہوئے تھے اور کدورت چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ کسی نے عادل کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور اس کے سینے میں جیسے اَن گنت شگوفے کھل اُٹھے۔ تایا فراست اس کے سامنے تھے۔

''مبارک عادے پتر۔'' انہوں نے لرزتی آواز میں کہا اور عادل کو گلے سے لگا لیا۔

''آپ کو بھی مبارک تایا جی۔'' عادل نے کہا اور اس کی آنکھوں میں نمی آگئی۔

بہت سے کیمرے دھڑا دھڑ عادل کی تصویریں کھینچ رہے تھے۔ اس کے گرد مقامی اور غیر مقامی لوگوں کا ہجوم تھا۔ برٹش لڑکیاں عادل کو قریب سے دیکھنے کے لیے اُمڈی پڑ رہی تھیں لیکن جسے وہ دیکھنا چاہ رہا تھا وہ کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ وہ یقیناً یہاں موجود تھی۔ شاید اپنے ٹینٹ کے روزن میں سے اسے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی شہزادی...... اس کی منزل...... اس کی زندگی۔

لارڈ اونس لوگوں میں سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھے۔ لوگ انہیں راستہ دینے کے لیے دائیں بائیں بٹ گئے۔ انہوں نے عادل کی پیٹھ تھپکی اور سرسرمد سے انگلش میں بولے۔ ''ویل ڈن مسٹر سرمد! آپ کے کھلاڑی نے کمال کر دیا۔ یقیناً اس میں عادل کی خداداد صلاحیت کے ساتھ آپ کی محنت اور لگن کا بھی حصہ ہے۔ میں آپ دونوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔''

''آپ کی عزت افزائی کا بے حد شکریہ۔'' سرسرمد نے کہا۔

وہ مسکرائے۔ ''اب اس خراج تحسین کو ایک عملی شکل دینے کا وقت بھی آگیا ہے۔ آپ لوگ اپنے استقبال سے فارغ ہو کر میرے ٹینٹ میں تشریف لے آئیے۔ وہاں پرائز سیرمنی کا انتظام ہے۔''

وہ بڑی دلنواز شام تھی۔ خوشگوار...... حوصلہ بخش...... اور فتح مندی کے احساس میں ڈوبی ہوئی۔ سرسرمد کا کہا سچ ثابت ہوا تھا۔ آج عادل کو وہ دفینہ مل گیا تھا جس کا وعدہ انہوں نے اس سے کیا تھا۔ وہ سب تکلیفیں اور مشقتیں آج بار آور ثابت ہوئی تھیں جن کا سامنا عادل نے پچھلے چند مہینوں میں کیا تھا۔ بے شک اس کے جسم میں اذیتوں کے بے شمار کانٹے ٹوٹے تھے لیکن آج وہ کانٹے نکال لیے گئے تھے اور اس کے جسم کو محبت کے گلابوں کا مرہم مل رہا تھا اور محبت کے ان گلابوں میں اہم ترین گلاب شہزادی کی محبت کا تھا۔ ہاں یہ ''کایا کلپ'' شام تھی۔ بہت سرد ہونے کے باوجود روح کو گرما رہی تھی، سرشار کر رہی تھی۔

دو تین گھنٹوں کے اندر اندر عادل ایک کروڑ پتی شخص بن گیا تھا۔ ہاں...... آج ان برف پوش چوٹیوں نے اپنے اندر چھپا ہوا دفینہ اس کے حوالے کر دیا تھا۔ جب خوشیوں کی یلغار ہو تو جسمانی تکلیفیں اس کے اندر دب جاتی ہیں۔ عادل بھی تقریباً بھول چکا تھا کہ مقابلہ شروع ہونے سے پہلے اور مقابلے کے دوران میں اس کی حالت کس قدر خراب ہوئی ہے۔ اب وہ خود کو بالکل بھلا چنگا محسوس کرنے لگا تھا۔ اس سب کے باوجود اس نے کھانے پینے میں بہت احتیاط سے کام لیا۔ وہ جانتا تھا کہ فوڈ پوائزننگ کی حقیقت کیا تھی؟ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا، لیوپڈ اور اس کے ساتھیوں کا کیا دھرا تھا پھر بھی وہ اب سارے گلے شکوے بھلا کر لیوپڈ کو گلے سے لگانا چاہتا تھا لیکن لیوپڈ اسے اپنے آس پاس کہیں نظر نہیں آیا۔ شاید کہیں غم غلط کر رہا تھا۔

کھانے کے بعد عادل نے سرمد صاحب سے اجازت لی اور تایا فراست کے ٹینٹ کی طرف چل دیا۔ وہ تایا فراست سے اکیلے میں ملنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے ہمایوں سے کہا تھا کہ وہ قاسم کو کچھ دیر کے لیے دوسرے ٹینٹ میں بھیج دے۔ قاسم کے ہاتھ اب کھولے جا چکے تھے...... اور وہ کسی طرح کی مزاحمت یا ناراضگی ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ پھر بھی ہمایوں نے احتیاطاً ایک گن مین اس کے اردگرد رکھا ہوا تھا۔ ایک ایسا ہی گن مین دراز قد ناصر کے آس پاس بھی موجود

رہتا تھا۔

عادل، تایا فراست والے ٹینٹ میں پہنچا تو وہ نماز پڑھ کر جائے نماز تہ کر رہے تھے۔ دو چار دن میں ہی وہ بہت بدلے ہوئے نظر آنے لگے تھے۔ عادل کو دیکھ کر وہ آگے بڑھے اور عادل کو گلے لگا لیا۔

عادل نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''تایا جی...... آپ کی دعاؤں سے میں نے آپ سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا ہے۔''

وہ سسک پڑے۔ ''مجھے یقین تھا عادے پتر! تُو جو کچھ بھی ہے لیکن تیرے اندر ہمت ہے...... تُو لڑنا جانتا ہے۔ تُو کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔ میں قاسو اور عاصم سے بھی یہی گل کہتا تھا......''

''میں تو کچھ بھی نہیں ہوں تایا جی! بس قدرت نے میری مدد کی ہے۔''

تایا فراست نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے ایک بار پھر گلے سے لگا کر رونے لگے لیکن اس بار وہ سسکیوں کے بجائے ہچکیوں سے رو رہے تھے۔ عادل بھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا۔ وہ کتنی ہی دیر اسی طرح کھڑے رہے۔ پھر عادل نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ڈھائی ڈھائی لاکھ پاؤنڈ کے وہ دو ''پے آرڈرز'' تایا فراست کی طرف بڑھا دیئے جو اسے پرائز سیرمنی میں پیش کیے گئے تھے۔

''یہ کیا ہے عادے پتر؟'' تایا فراست نے کہا۔

''یہ انعام کی رقم ہے تایا جی! آپ میرے بڑے ہیں، اسے اپنے پاس رکھیں۔ آپ جس طرح چاہیں گے، میں اسے خرچ کروں گا۔''

''نہیں عادے...... یہ...... تمہاری کمائی ہے۔ تم اسے اپنے پاس رکھو۔''

''تایا جی! آپ جانتے ہی ہیں، میں روپے پیسے کے معاملے میں بالکل نکما ہوں۔ یہ آپ کے پاس ہوں گے تو مجھے تسلی رہے گی۔''

''نہیں عادے پتر......'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''جو بندہ پیسے کما سکتا ہے، وہ انہیں سنبھال بھی سکتا ہے۔ یہ تمہارے پاس رہیں گے اور مجھے یقین ہے کہ تم انہیں خرچ بھی چنگے طریقے سے کرو گے۔''

اسی دوران میں انور بھی خیمے میں آ گیا۔ وہاں عادل کو دیکھ کر اس نے جلدی سے واپس جانا چاہا لیکن پھر تایا فراست کے اشارے پر رُک گیا۔ تایا فراست نے کہا۔ ''انورے! تمہاری طرف سے عادل کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ تم کو عادل سے معافی مانگنی چاہیے۔''

انور نے اپنا زخمی بازو گلے سے لٹکا رکھا تھا۔ بازو پر کندھے سے کلائی تک پلاستر چڑھا ہوا تھا۔ انور اندر آیا اور گلوگیر آواز میں بولا۔ ''عادل بھائی! میں نے واقعی تمہارے ساتھ چنگا نہیں کیا۔ میں نے پنڈ میں جھوٹ بولا کہ تم مجھے زبردستی احاطے کے دروازے پر لے گئے تھے۔ یہ سب...... یہ سب......'' وہ کہتے کہتے اٹک گیا۔ پھر ہمت کر کے بولا۔ ''یہ سب ناصر چودھری نے مجھ سے کہا تھا۔ وہ بہت تگڑا بندہ ہے۔ اگر میں اس کی گل نہ مانتا تو وہ میرے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ مجھ کو معافی دے دو عادے بھائی۔'' وہ ایک دم آگے بڑھ کر عادل کے قدموں میں گر پڑا۔

عادل نے فوراً اسے اُٹھایا اور تسلی دی۔

سب کچھ تبدیل ہو رہا تھا۔ جو لوگ دو دن پہلے تک اسے نفرت اور کدورت کی نظروں سے دیکھ رہے تھے، وہ اب سے کندھوں پر اُٹھانے کے لیے تیار تھے۔ وہ برطانوی شہریوں کو فخر سے بتا رہے تھے کہ وہ عادل کے گاؤں کے رہنے الے ہیں۔ برطانوی تماشائیوں میں کچھ صحافی بھی موجود تھے۔ وہ عادل کا انٹرویو لینے کے لیے بیتاب تھے۔ ان میں یک لڑکی بھی تھی۔ وہ عادل کو لے کر اپنے ٹینٹ میں جانا چاہتی تھی اور وہاں اس کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کرنے کی خواہش مند تھی۔ سرمد صاحب نے بھی اس کی سفارش کی اور عادل، سرمد صاحب کی بات رَد نہ کر سکا لیکن جب وہ اس خاتون صحافی کے خیمے میں پہنچا تو ششدر رہ گیا۔ وہاں شہزادی پہلے سے موجود تھی۔ شہزادی تھوڑی گھبرائی ہوئی تھی۔ بہرحال اس نے عادل کو دیکھ کر سلام کیا اور ہولے سے مسکرائی۔

عادل نے پلٹ کر دیکھا۔ نوجوان خاتون صحافی بھی مسکرا رہی تھی۔ ''یہ کیا ہے؟'' عادل نے خاتون صحافی سے پوچھا۔

اس نے انگلش میں جو جواب دیا، اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے انٹرویو کے دوران میں شہزادی کی موجودگی اچھی لگے گی اور وہ یہ بات اچھی طرح جانتی ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور عادل کی اس عظیم کامیابی کے بعد ان دونوں کی شادی کے قوی امکان بھی موجود ہیں۔

''یہ کیا کہہ رہی ہے؟'' شہزادی نے عادل سے پوچھا۔

عادل ہولے سے مسکرایا۔ ''بڑی اچھی اچھی باتیں کر رہی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ شاید ہم دونوں بہت جلد ایک ہونے والے ہیں۔''

شہزادی کے چہرے پر شفق کے رنگ بکھر گئے۔ اسی دوران میں نوجوان صحافی خاتون بولی۔ ''او گاڈ! مائی آڈیو سسٹم۔''

وہ آڈیو سسٹم کا بہانہ کر کے جلدی سے باہر نکل گئی۔ یقیناً وہ عادل اور شہزادی کو موقع دینا چاہتی تھی کہ وہ دو چار منٹ اکیلے میں بات کر لیں۔

شہزادی کے دلکش چہرے پر گھبراہٹ نظر آنے لگی۔ پھر وہ تیزی سے اُٹھی۔ ''عادل! مجھے اپنے خیمے میں جانا چاہیے۔''

وہ دروازے کی طرف بڑھی تو عادل نے ہمت کر کے اس کی کلائی تھام لی۔ کلائی کی چوڑیاں چھنکیں، وہ ٹھٹک کر رُک گئی۔ ''مجھے مبارکباد نہیں دو گی۔'' عادل نے جذباتی لہجے میں پوچھا۔

اس نے سر جھکایا اور سادگی سے بولی۔ ''نہیں۔''

''کیوں؟'' عادل نے پوچھا۔ شہزادی کی نازک کلائی ابھی تک اس کی گرفت میں تھی۔

''مبارک ہو لیکن......''

''لیکن کیا؟'' عادل نے پوچھا۔

''میرا دل بڑا بوجھل ہے عادل! بھائی عاصم ہسپتال میں زخمی پڑا ہے اور پھر...... تمہارے ماموں طفیل، ان کا بہت دُکھ ہے مجھے۔ کاش یہ سب نہ ہوا ہوتا۔''

"غم اور خوشی تو دھوپ چھاؤں کی طرح ہوتے ہیں۔" عادل کا لہجہ بھی کچھ بوجھل ہو گیا۔

"لیکن...... لیکن پتا نہیں کیوں عادل...... مجھے لگتا ہے کہ ابھی ہمارے دُکھ ختم نہیں ہوئے۔ بس وہم سا دل میں بیٹھا ہوا ہے۔ کہیں کچھ ہو نہ جائے۔"

"تم اتنا زیادہ سوچتی ہو کہ تمہارا دل ہر وقت غم کے گھیرے میں رہتا ہے۔ خوشی کے جو مواقع آتے ہیں وہ بھی تمہارے غم کے بوجھ کے نیچے دب جاتے ہیں۔"

وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ "ماموں طفیل کو کس نے مارا عادل؟ کیا اسی بدمعاش نے جو مجھے بھی گاؤں سے یہاں لے کر آیا؟"

عادل نے اثبات میں سر ہلایا۔ "حالات تو یہی بتا رہے ہیں۔"

"وہ اب کہاں ہے عادل؟" شہزادی نے روہانسی آواز میں کہا۔

"مجھے کچھ کچھ پتا ہے کہ وہ کہاں ہے اور اللہ نے چاہا تو وہ اپنے انجام کو بھی ضرور پہنچے گا۔"

دونوں کچھ دیر خاموش رہے پھر شہزادی موضوع بدل کر بولی۔ "عادل! میں تمہاری جیت سے بہت خوش ہوں...... اور...... اور مجھے لگتا ہے کہ اباجی بھی خوش ہیں۔" اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ یقیناً ان آنسوؤں کا تعلق خوشی سے ہی تھا۔

اس نے عادل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں زور سے دبایا یہ اس کی گرم جوشی کا اظہار تھا۔ عادل کو لگا جیسے شہزادی کا ہاتھ ہی نہیں اس کا پورا جسم اس کے جسم سے پیوست ہے۔ وہ عادل کو کھینچ رہی ہے۔ اپنے اندر جذب کر رہی ہے۔ اپنے تمام تر حسین احساسات کے ساتھ۔

عادل نے بھی اس کے ہاتھ کو دبایا۔ اپنی انگلیوں کو اس کی انگلیوں میں پیوست کر دیا۔ شہزادی نے پلکیں جھکا لیں جیسے وہ عادل کی آنکھوں میں دیکھنے کی تاب نہ رکھتی ہو۔ شاید ایسا ہی تھا۔ اس کے خوبصورت ہونٹ بے ساختہ لرز رہے تھے...... وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھی۔ تمہاری طرح میں بھی کچھ بھی بھولی نہیں۔ ہاں عادل! لالی کے سارے روز و شب مجھے یاد ہیں۔ وہ ساری گرم سنسان دوپہریں جن میں ہماری سرگوشیاں گونجیں اور وہ ساری خوبصورت شامیں جن میں دلنشین وعدوں کی مٹھاس تھی۔

اچانک وہ دونوں بُری طرح چونک گئے۔ خیمے سے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ شاید صحافی خاتون واپس آ رہی تھی لیکن نہیں، یہ تو مردانہ قدموں کی آواز تھی۔ پھر یکایک جیسے ایک طوفان آ گیا۔ خیمے کا پردہ زور سے پھڑپھڑایا۔ کسی نے عادل کا گریبان پکڑا اور ایک تند و تیز جھٹکا دے کر اسے باہر کھینچ لیا۔ وہ اوندھے منہ گرتے گرتے بچا۔ اس کے کانوں میں شہزادی کے چلانے کی آواز آئی۔ اسے اپنے سامنے ایک ریسلر نما انگریز نظر آیا۔ اس کے پہلو میں لیوپڈ تھا۔ لیوپڈ کو ایک نظر دیکھ کر ہی عادل جان گیا کہ وہ شراب کے نشے میں دھت ہے۔ اس کی آنکھیں شعلے اُگل رہی تھیں۔ اس نے منہ سے جھاگ اُڑاتے ہوئے انگلش میں کچھ کہا۔ پھر ہاتھ میں پکڑے چاقو کو نہایت وحشت سے عادل پر چلایا۔ یہ وار عادل کی گردن پر تھا۔ عادل نے تیزی سے جھک کر یہ مہلک وار بچایا لیکن وہ اگلا وار نہیں بچا سکا۔ یہ وار پیچھے سے کیا گیا تھا اور اسی پہلوان نما شخص نے کیا تھا جس نے اسے خیمے سے گھسیٹا تھا۔ اس نے کسی نہایت وزنی شے سے عادل کے سر پر ضرب

لگائی۔ عادل کی آنکھوں میں...... اَن گنت ستارے ناچ گئے۔ وہ پہلو کے بل سخت برف پر گرا اور ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔

O......❖......O

وہ عجیب کیفیت تھی۔ وہ ایک ناقابل بیان صورتِ حال تھی۔ عادل خود کو جیسے ہواؤں میں معلق محسوس کر رہا تھا۔ اس کے نیچے جیسے پگھلی ہوئی برف کا دریا تھا جو بڑے شور کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ وہ شاید بیہوش تھا لیکن وہ ایسی بیہوشی تھی جس میں گاہے بگاہے نیم بیہوشی جیسے وقفے بھی آتے تھے۔ کبھی یہ نیم بیہوشی واضح ہوتی تھی اور اس میں اسے اردگرد کی آوازوں کا احساس ہوتا تھا اور کبھی یہ نیم بیہوشی...... بیہوشی کا حصہ ہو جاتی تھی۔ اسے پگھلی ہوئی برف کے شور کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔

جب وہ نیم بیہوشی میں ہوتا تھا، وہ اپنے آپ کو حرکت دینے کی کوشش کرتا تھا لیکن کامیابی نہیں ہوئی برف کے دریا کا رنگ سنہری ہو جاتا تھا۔ اس کے اندر سے کوئی پکار کر کہتا تھا...... تمہارا ذہن مفلوج ہو چکا ہے۔ تم خود بھی فالج زدہ ہو چکے ہو۔ یہ ادھوری موت ہے اب تمہیں واپس نہیں آنا۔ ادھوری موت سے پوری موت کی طرف جانا ہے۔ پوری موت، جس میں سفید کفن ہوتا ہے کافور کی بُو ہوتی ہے اور اندھیری قبر۔ پھر سب کچھ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا، ہر احساس ناپید ہو جاتا۔ یہ وقفہ معلوم نہیں کتنا لمبا ہوتا۔ شاید ایک دو گھنٹے، شاید ایک دو دن، یا پھر اس سے بھی زیادہ۔

آہستہ آہستہ نیم بیہوشی والے وقفے بڑھنے لگے۔ وہ گہری بیہوشی جو اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیتی تھی۔ کم ہونے لگی تھی۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول کو محسوس کرنے لگا۔ آوازیں زیادہ وضاحت کے ساتھ اس کی سماعت سے ٹکرانے لگیں۔ وہ کسی کسی آواز کا مفہوم بھی سمجھنے لگا لیکن وہ اپنے وجود کو حرکت دینے کے قابل اب بھی نہیں تھا۔ اپنی پلکوں کو ہلا نہیں سکتا تھا۔ اس کا دھندلایا ہوا ذہن اسے بتا رہا تھا کہ اس کے اردگرد کچھ انوکھا ہو چکا ہے۔ کچھ بہت خاص...... اور غیر متوقع...... شاید کوئی آفت ٹوٹ پڑی ہے۔ کسی قدرتی ابتلا نے اسے اور اس کے قریب موجود سب افراد کو گھیر لیا ہے۔ شاید کوئی برف کا طوفان...... یا پھر کچھ نہایت بے رحم لوگ...... جن کی آنکھوں سے آگ نکل رہی ہے اور جن کے ہونٹوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ یہ سب کچھ کہاں پر ہو رہا ہے؟ کون لوگ ہیں یہ...... کیا چاہتے ہیں؟ کیا حقیقت میں ایسا ہے...... یا پھر یہ سب اس کا وہم ہے؟ اس کے بیمار، مفلوج ذہن کا کوئی من گھڑت احساس ہے؟ اس کا ذہن واقعات کو آپس میں مربوط کرنے میں قطعی ناکام تھا۔

کبھی کبھی اسے اپنے بازو یا پھر کندھے پر ہلکی سی چبھن محسوس ہوتی۔ اسے لگتا کہ اسے انجکشن لگایا گیا ہے۔ گاہے بگاہے کسی دوا کی نہایت تیز بُو بھی وہ اپنے نتھنوں میں محسوس کرنے لگا۔

ایک دن جب وہ نیم بیہوشی والی حالت میں تھا، کسی نے انگلش میں کہا۔ "اس کی حالت میں کچھ بہتری تو نظر آ رہی ہے لیکن ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

پھر دو افراد اردو میں باتیں کرنے لگے۔ کبھی عادل کو لگتا کہ یہ اس کا تصور ہے۔ کبھی محسوس ہوتا کہ نہیں وہ لوگ حقیقت میں بول رہے ہیں۔ وہ سن رہا تھا لیکن خود کو حرکت دینے کے قابل نہیں تھا۔ ایک آواز نے کچھ اس قسم کی بات کہی۔ "قسمت کی بات ہے، جو کچھ ہوا اس طوفان کی وجہ سے ہوا۔ اگر ہم پندرہ بیس گھنٹے پہلے یہاں سے نکل جاتے تو

کبھی یہ سب نہ ہوتا۔''

''قدرت کے کاموں میں کس کو دخل ہے۔ یہ مصیبت ہمارے مقدر میں لکھی تھی۔''

پہلی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ''میں تو اب بھی کہتا ہوں۔ ان لوگوں سے بات کی جائے۔ کچھ لو، کچھ دو کی بنیاد پر معاملہ طے کیا جائے۔ روپے میں بڑی طاقت ہوتی ہے اور دینے کے لیے روپیہ غیر ملکیوں کے پاس کم نہیں ہے۔''

''لیکن بات تو تقدیر کی ہے نا۔ یہ بڑے خبیث لوگ ہیں۔ کسی وعدے پر اعتبار نہیں کریں گے۔ یہ یہی سوچیں گے کہ جو مل رہا ہے وہ لے لیں اور جو کچھ ان کو مل رہا ہے، وہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ لاکھوں پاؤنڈز کا بہترین سامان ہے۔ خوبصورت لڑکیاں ہیں، ہتھیار ہیں......اور کیش کی شکل میں بھی لاکھوں پاؤنڈ تو ہوں گے۔''

دفعتاً عادل کی سماعت سے کچھ آوازیں ٹکرائیں۔ اسے لگا کہ وہ برف کے دریا سے نکل چکا ہے اور اب ایک بہت بڑے اور گہرے، برفیلے کنویں میں ہے۔ اس کنویں میں گولیاں چل رہی ہیں۔ کبھی سنگل فائر ہوتے ہیں، کبھی برسٹ چلنے لگتے ہیں۔ لوگ چلا رہے ہیں، زخمی ہو رہے ہیں۔

اس کے قریب گفتگو کرنے والے بھی باہر چلے گئے۔ عادل کے دل کی گہرائیوں سے ایک آواز ابھری۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وحشی پاؤندوں نے انہیں گھیر لیا ہو۔ پاؤندوں کا خیال ذہن میں آتے ہی عادل کے ذہن میں ایک کرخت چہرے کی شبیہ اُبھری۔ سوجی سوجی آنکھیں، تمتمایا ہوا گندمی رنگ، منڈا ہوا سر۔ یہ کون تھا؟ اس نے دماغ پر زور دیا لیکن کچھ یاد نہیں آیا۔ خیالات بکھرے بکھرے تھے۔ پھر اس کے تصور میں شہر لاہور کا نقشہ اُبھرا۔ ایک معروف چوک، ٹریفک، ہارنوں کا شور، ہجوم......اس ہجوم میں اس نے کچھ دیکھا تھا۔ شاید یہی چہرہ......شرابی چہرہ......کیا نام تھا اس کا؟ کیا نام تھا، اس نہایت ناپسندیدہ شخص کا؟ ذہن میں جھماکا سا ہوا...... مالکانے زادہ......تو کیا مالکانے زادہ یہاں موجود تھا؟ وہ یہاں کیوں موجود تھا؟ اس سے اس کی کیا دشمنی تھی، کیا معاملہ تھا؟ اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ لیکن یہ یاد آ رہا تھا کہ کچھ ہے۔ کچھ بہت بُرا ہے۔ ایک بار پھر نیم بیہوشی کا دورانیہ ختم ہو گیا۔ وہ اپنے اردگرد سے......بے خبر ہو گیا۔ کتنی دیر کے لیے ایک گھنٹے کے لیے ایک دو دن کے لیے؟ وہ یقین سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔

O......❖......O

کوئی اس پر جھکا ہوا تھا۔ ہولے ہولے اس کے بالوں میں انگلیاں چلا رہا تھا۔ بڑی نازک انگلیاں تھیں۔ یہ کس کی انگلیاں تھیں؟ جسم سے اُٹھنے والی یہ بھینی بھینی خوشبو کس کی تھی؟ کوئی بہت پسندیدہ ہستی تھی۔ مگر کون تھی؟ وہ ٹھیک سے یاد نہیں کر پا رہا تھا۔ یہ عجیب کیفیت تھی، آگاہی تھی مگر ادھوری۔

پھر اس نازک انگلیوں والی ہستی نے اسے دوا پلائی۔ دوا کی ناگوار بو، کومل جسم کی جانی پہچانی خوشبو پر غالب آ گئی۔ تب ایک بار پھر وسیع برفیلے کنویں کے اندر گولیاں چلنے لگیں۔ ریٹ ٹیٹ......ریٹ ٹیٹ......کچھ لوگ چلائے، کسی آواز نے بَین کیا۔

بھینی بھینی خوشبو ایک دم اوجھل ہو گئی۔ دوا کی ناگوار بُو بھی پس منظر میں چلی گئی۔ کچھ وقت گزرا پھر اس نے دو افراد کو اپنے قریب باتیں کرتے ہوئے پایا۔ ایک آواز کو اس نے فوراً پہچان لیا۔ یہ اس کے تایا فراست کی آواز تھی۔ وہ غصے

میں کسی سے کچھ کہہ رہے تھے۔ یہ آواز کانوں سے ٹکرائی تو عادل کو کچھ اور بھی یاد آنے لگا لیکن جو یاد آ رہا تھا، وہ بہت دھندلا تھا۔ ایک صورت سی نگاہوں کے سامنے بن بن کر بگڑ رہی تھی۔ یہ کس کی صورت تھی؟

تایا فراست کی آواز پہچاننے کے بعد عادل نے اُٹھنا چاہا، تایا کو پکارنا چاہا مگر اس کی آواز نے ساتھ نہ دیا، نہ وہ اپنے جسم کے کسی حصے کو حرکت دے سکا۔ بس پتھر کا پتھر لیٹا رہا۔ تایا کسی سے بول رہے تھے۔ دوسری آواز کس کی تھی؟ کس کی تھی؟ یکایک اس کے ذہن میں برق سی لہرائی۔ یہ آواز تایا کے بیٹے کی تھی۔ تایا کا بیٹا......تایا کا بیٹا......وہ کہہ رہا تھا۔

''ابا اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

تایا کی آواز اُبھری۔ ''تیرا قصور ہے......قصور ہے، تُو نے یار بنایا ہوا تھا اسے۔ اس کی ہر چنگی بُری گل کی حمایت کرتا تھا۔ میری آنکھوں پر بھی پردہ ڈالا ہوا تھا تُو نے۔ اب دیکھ لیا نا انجام۔ وہ ہمارا لہو پینا چاہ رہا ہے۔ غیروں کے ساتھ مل کر ہمیں گولیوں سے چھاننی کر رہا ہے وہ کمینہ۔''

''ابا! وہ کہتا ہے کہ ہم شہزادی کے معاملے میں اس سے دھوکا کریں گے۔ اسے دغا دیں گے......اس نے اپنے دل میں پتا نہیں کیا کیا سوچ لیا تھا۔''

اچانک عادل کے دل و دماغ میں برق سی لہرا گئی۔ اسے یاد آیا کہ اسے ابھی کچھ دیر پہلے جو وجود اس کے بالوں میں اپنی نازک انگلیاں چلا رہا تھا اور اسے دوا پلا رہا تھا......وہ کوئی اور نہیں تھا، شہزادی کا وجود تھا۔ اس کی جان، اس کی روح۔ وہ اس کے لیے آگ اور برف کے سات سمندروں کے اوپر سے گزرا تھا۔ اور ابھی ایسے مزید کئی سمندر پار کر سکتا تھا......لیکن کیسے؟ وہ تو اب اپنے اندر ہلنے جلنے کی طاقت بھی نہیں رکھتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر بھرپور کوشش کی۔ اپنے ذہن پر چھائی ہوئی دھند کو صاف کرنا چاہا۔ اپنے پاؤں کو اور ہاتھوں کی انگلیوں کو حرکت دینا چاہی لیکن کچھ نہ کر سکا۔ ذہن پر چھائی دھند کچھ اور گہری ہو گئی۔ آوازیں فاصلے پر چلی گئیں مگر سنائی دیتی رہیں۔ چہرے یاد آ رہے تھے لیکن واقعات کی بہت سی درمیانی کڑیاں غائب تھیں۔

تایا کہہ رہے تھے۔ ''بکواس بند کر قاسو......تُو بیوقوف ہی نہیں، بے غیرت بھی ہے۔ ابھی ایک آدھ دن میں جب وہ کتے کا پتر ہم سب کو گھیر لے گا اور تیری بہن کو تیری آنکھوں کے سامنے خوار کرے گا......اور باقی ساری زنانیاں بھی خوار ہوں گی تو پھر بھی یہی کہنا کہ اس میں ہمارا قصور ہی تھا۔''

قاسو چنگھاڑا۔ ''میری بہن کو کوئی ہتھ بھی نہیں لگا سکتا میں اس کے ٹوٹے کر دوں گا ابا......میں خون پی جاؤں گا اس کا۔''

کہرام سا مچ گیا۔ پتا نہیں کیا ہو رہا تھا۔ بس عادل اپنے دھندلائے ہوئے مفلوج ذہن کے ساتھ اندازے ہی لگا سکتا تھا۔ قاسو شاید رائفل پکڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تایا فراست اسے سنبھالنا چاہ رہے تھے۔ ان کا کوئی کوئی فقرہ عادل کی سماعت تک بھی پہنچ رہا تھا۔ ''وہ وحشی ہو رہے ہیں، چھاننی کر دیں گے تجھے......اگر مرنا ہی ہے تو پھر اپنے ہاتھوں سے گولی مار لے خود کو......''

''چھوڑ دے ابا......چھوڑ دے مجھے۔ تُو نے مجھے بے غیرت کہا ہے، میں بتاؤں گا کہ غیرت کیا ہوتی ہے۔''

یکایک شوروغل کی یہ ساری آوازیں، عادل سے دور چلی گئیں......او جب یہ آوازیں دور جا رہی تھیں، عادل کے

کانوں میں کسی عورت کے چلانے کی آواز آئی۔ اس مرتبہ وہ پہچان گیا۔ یہ اس کی شہزادی کی آواز تھی۔ وہ کیوں چلائی تھی؟ وہ! ابھی اس سوال کا جواب ہی ڈھونڈ رہا تھا کہ ایک بار پھر برف کے وسیع اور گہرے کنویں کے اندر گولیاں چلنے لگیں۔ ریٹ ٹیٹ...... ریٹ ٹیٹ۔ آواز شدید تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ایک دم درجنوں لوگ ایک دوسرے پر فائر کر رہے ہیں۔ واقعی فائرنگ ہو رہی تھی یا صرف اس کی ساعت اسے واہموں میں مبتلا کر رہی تھی؟ نہیں یہ فائرنگ تھی، چھوٹے بڑے ہتھیار چل رہے تھے۔ کیوں ہو رہی تھی یہ فائرنگ؟ اس نے اپنے کمزور ذہن پر زور دیا۔

جواب نہیں ملا۔ دھند مزید گہری ہو گئی۔ ایسا ہی ہوتا تھا۔ جب وہ کچھ سوچنے کے لیے زیادہ کوشش کرتا تھا، ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگتا تھا۔

کچھ وقت گزرا پھر اسے اپنے آس پاس تایا کی روتی بلکتی آواز سنائی دی۔ ''قاسو...... قاسو! میں نے تجھے کہا تھا نا...... اوئے نامراد۔ میں نے تجھے کہ تھا نا۔ اوئے تُو نے تو میری کمر توڑ کر رکھ دی۔''

پھر اس نے شہزادی کی دلدوز آوازیں سنیں۔ وہ قاسو کو پکار رہی تھی۔ بَین کر رہی تھی...... ہاں وہ بَین کر رہی تھی۔ وہ تو اس کا ایک آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کہاں یہ کہ وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی، چلا رہی تھی۔

عادل کا سینہ پھٹنے لگا۔ وہ سب کچھ جھیل سکتا تھا، اپنی شہزادی کی گریہ وزاری نہیں جھیل سکتا تھا۔ اس نے اپنی ساری جسمانی اور دماغی توانائیاں جمع کیں، اُٹھ کر بیٹھنا چاہا۔ اسے لگا کہ وہ اپنے پاؤں کے انگوٹھوں کو حرکت دینے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس نے اس حرکت کو بڑھانا چاہا۔ اپنے بالائی دھڑ کو اُٹھانا چاہا۔ یہ بڑا جان گسل عمل تھا۔ اسے محسوس ہوا، اس کے جسم کی ہڈیوں میں اذیت کا دریا بہہ نکلا ہے۔ اس نے آنکھیں کھولنا چاہیں، اس نے ہونٹوں کو وا کرنا چاہا۔ ایک دم کوئی کنکشن سا کٹ گیا۔ ذہن پھر تاریکیوں میں ڈوبنے لگا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ اس کا آخری احساس یہی تھا کہ یہاں اس جگہ اس کے اردگرد کچھ بہت خوفناک ہو رہا ہے۔ کوئی ایسا مہلک حصار ہے جو لوگوں کو ایک ایک کر کے کھا رہا ہے، ان کا خون پی رہا ہے۔

○......❖......○

اس کے مفلوج ذہن نے اردگرد کے ماحول کو دوبارہ محسوس کرنا شروع کیا تو اسے لگا کہ اس کے قریب کسی لیمپ کی مصنوعی روشنی ہے۔ اسے اپنے بازو میں سوئی چبھنے کی ہلکی سی تکلیف محسوس ہوئی۔ پھر ایک دم اسے شہزادی کی دلدوز آہ و بکا یاد آئی۔ تو کیا قاسم مر چکا تھا؟ یقیناً اس کے ساتھ کچھ ہو چکا تھا۔ شہزادی تو بڑے حوصلے والی تھی، وہ یونہی بلک بلک کر نہیں روئی تھی۔

شہزادی...... عادل کے دل کی گہرائیوں سے ایک پکار اُٹھی۔

اس نے پھر اُٹھنا چاہا...... مگر وہ صرف اپنے پاؤں کے انگوٹھوں کو ہی حرکت دے پایا۔ باقی جسم اسی طرح پتھر رہا۔ اسے ان باتوں کی گونج سنائی دینے لگی جو شہزادی کی آہ و بکا سے پہلے تایا فراست اور قاسو میں ہوئی تھیں۔ اسے اندازہ ہوا کہ ان باتوں میں بار بار جس بندے کا ذکر کیا گیا...... وہ ناصر تھا۔ لمبے قد اور سرد آنکھوں والا بدنیت ناصر۔ تو کیا ناصر پاؤنڈوں کے ساتھ مل چکا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہی پاؤنڈوں کو اور مالکانے زادہ کو یہاں لے کر آیا ہو؟

عادل کو محسوس ہوا کہ اب اس کا ذہن پہلے سے کچھ بہتر کام کر رہا ہے۔ اسے نہ صرف چہرے اور نام یاد آ رہے تھے

بلکہ ان کا باہمی تعلق بھی کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس کے سر پر کوئی شدید ضرب لگی تھی لیکن یہ کس موقع پر لگی اور کس نے لگائی، اس کے بارے میں تصورات دھندلے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ سے اپنے سر کو چھونا چاہا لیکن وہ ہاتھ کو حرکت نہ دے سکا، نہ سر کو۔ اس کی بے بسی برقرار تھی۔ اس کی ناتوانیوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

وہ شاید ایک خیمے میں تھا۔ خیمے سے باہر کوئی زخمی عورت جسمانی اذیت کے سبب رو رہی تھی اور انگلش میں کچھ کہہ رہی تھی۔ الفاظ عادل کی سمجھ میں نہیں آئے۔ پھر کوئی عادل کے بالکل پاس سے بولا۔ غالباً یہ برٹش ڈاکٹر تھا۔ اس ڈاکٹر کا نام عادل کو یاد نہیں آیا لیکن اس کا چہرہ اس کے تصور میں گھوم گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ یہ حالت ہفتوں اور مہینوں تک رہ سکتی ہے اور......'' وہ کہتے کہتے رُک گیا۔

''اور کیا ڈاکٹر؟'' ایک دوسری آواز نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے بالکل سرگوشی میں کچھ کہا۔ الفاظ عادل کی سمجھ میں نہیں آئے۔

دوسری آواز نے کہا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے ڈاکٹر...... یہ آوازیں سن سکتا ہے۔''

''یہ ممکن ہے...... لیکن یہ جتنا زیادہ سکون میں رہے گا اور اس کے برین کی حرکت جتنی کم ہو گی، اتنا ہی اس کے لیے بہتر ہے۔ ہم ڈاکٹری زبان میں اس کیفیت کو Temporary Paralysis کہتے ہیں لیکن اگر احتیاط نہ کی جائے تو پھر یہ حالت مستقل شکل بھی اختیار کر سکتی ہے۔''

''پلیز، ڈاکٹر کچھ کریں، اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔'' آواز نے پھر کہا۔

اور ایکا ایکی عادل کے سینے میں جیسے سیکڑوں چراغ روشن ہو گئے۔ اس نے پچھلے چند دنوں میں کئی بار یہ آواز سنی تھی لیکن پہچان نہیں پایا تھا مگر آج اس نے پہچان لیا۔ یہ اس کے مہربان استاد...... اس کے روحانی باپ کی آواز تھی۔ اس کے راہنما اس کے مرّبی، سرسرمد...... ہاں، وہ سرسرمد تھے اور وہ اس کے پاس موجود تھے اور یہ وہ تھے جنہوں نے اسے جینا سکھایا تھا۔ زندگی کو زندگی کرنے کے گُر بتائے تھے۔ انہوں نے اسے بتایا تھا کہ چٹانوں سے کیسے ٹکرایا جاتا ہے۔ سنگلاخ دیواروں میں راستے کیسے بنائے جاتے ہیں۔ انہوں نے اسے بتایا تھا کہ تقدیر اپنے ہاتھوں میں کیسے لی جاتی ہے۔ کیسے خود کو مصیبتوں، مشقتوں اور تکلیفوں سے نبرد آزما کیا جاتا ہے اور اس بات کی پروا نہیں کی جاتی کہ صلہ کب ملے گا اور ملے گا بھی یا نہیں۔ بس اپنا کام اس غیر متزلزل یقین کے ساتھ جاری رکھا جاتا ہے کہ خوشیوں اور راحتوں کو آنا ہی آنا ہے۔ جیسے کالی رات کے بطن میں دن چھپا رہتا ہے، اسی طرح تکلیف کے اندر ہی کہیں ''ہم وزن'' راحت کا وعدہ بھی ہوتا ہے۔ وہ ''ہم وزن'' کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ یعنی جتنی تکلیف اتنی ہی خوشی اور راحت۔ تقدیر کو ہاتھ میں لینے کا گر وہ یہ بتاتے تھے کہ انسانی زندگی میں تکلیفوں اور راحتوں کی مقدار برابر ہوتی ہے۔ اس لیے اگر ہم تکلیفوں کے کھاتے میں بہت سی تکلیفیں سہہ لیتے ہیں اور جمع کر لیتے ہیں تو پھر ہم وزن راحتوں کو بھی زندگی میں آنا ہوتا ہے۔ اب اگر ایک بندہ خود پر دیگر راحتوں اور خوشیوں کے دروازے بند کر لیتا ہے اور اپنا من چاہا، دروازہ کھلا رہنے دیتا ہے...... مثلاً اپنے محبوب سے وصال کا دروازہ...... تو پھر اس بات کا قوی امکان پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کے حصے کی خوشیاں اسے اپنے من چاہے دروازے کے راستے ہی سے ملیں...... یعنی محبوب سے وصال کی صورت میں...... عادل کو بہت سی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

ہاں یہ وہی استاد محترم تھے۔ عادل نے چاہا کہ وہ اُٹھے اور ان کے سینے سے لگ جائے۔ اس نے انہیں پکارنا چاہا، اُٹھنا چاہا لیکن یہ دونوں کوششیں ناکام ہوئیں۔ اس کا ذہن یہ مشقت برداشت نہیں کر پایا۔ تاریکی گہری ہونے لگی۔ ہاں اسے لگا کہ وہ اپنے پاؤں کے انگوٹھوں کے ساتھ ساتھ دیگر انگلیوں کو بھی حرکت دینے میں کامیاب رہا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد بے خبری و بیہوشی کے اندھیرے اسے ڈھانپنے لگے۔

○......❖......○

تابڑ توڑ گولیاں چل رہی تھیں۔ اب یہ آوازیں نسبتاً قریب سے آ رہی تھیں۔ عادل کو لگ رہا تھا کہ برف کا وسیع کنواں تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی دیواریں قریب قریب آ رہی ہیں۔ اس کے دھند آلود دل و دماغ کی گہرائیوں میں کہیں یہ احساس موجود تھا کہ اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے، بہت بُرا ہو رہا ہے۔ زخمی چلا رہے ہیں، لاشیں گر رہی ہیں۔ دفعتاً ایک بار پھر اس کی روح لرز اُٹھی۔ اس نے اپنے بالکل پاس سے شہزادی کی دل فگار آواز سنی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ اس کے مخاطب یقیناً تایا فراست ہی تھے۔ الفاظ پگھلے سیسے کی طرح عادل کی سماعت میں اُترے۔ ''ابا جی...... میں...... ایسی موت...... مرنا نہیں چاہتی۔ آپ کو رب کا واسطہ ابا جی! مجھے اپنے ہاتھوں سے مار دیں، مجھے گولی مار دیں۔''

''نہ کر میری دھی رانی...... نہ کر...... رب سے آس رکھ......'' تایا فراست کی لرزتی ہوئی آواز اُبھری۔

''اب کیا آس ہے ابا جی...... آپ نے دیکھ ہی لیا ہے، وہ کیا کر رہے ہیں عورتوں کے ساتھ۔ مجھے اس طرح نہیں مرنا ابا جی۔'' وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

عادل کے سینے میں شعلے پھنکارنے لگے۔ اس کا جی چاہا، اس کی جان، اس کے جسم کے پنجرے سے آزاد ہو جائے۔ وہ اپنے جسم کے پنجرے سے باہر نکلنے کے لیے زور لگانے لگا۔ اندر ہی اندر تڑپنے لگا۔ اسے لگا کہ ایسی صورتحال اس نے کہیں پہلے بھی دیکھی تھی یا شاید سنی تھی، کسی کہانی میں۔ کسی رُوداد میں۔ جب عورت کو مرنا آسان لگتا ہے، اپنی پیاری زندگی کو اپنے ہاتھوں سے ختم کرنا بالکل سہل ہو جاتا ہے۔ کہاں سنی تھی یہ کہانی؟ کیا تھی یہ رُوداد؟

وہ کیوں سوچ نہیں پاتا؟ کیوں اُٹھ نہیں پاتا؟ اب اور کیا ہونا باقی ہے؟ اس کی شہزادی جا رہی ہے، وہ مر رہی ہے، وہ منوں مٹی کے نیچے چلی جائے گی...... پھر وہ زندہ رہ کر کیا کرے گا۔ اس نے پوری قوت صرف کر کے اپنے پاؤں کو حرکت دی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے دونوں پاؤں کا اگلا حصہ حرکت کر رہا ہے۔ جو لوگ اس کے پاس موجود تھے، وہ اس کے پاؤں کی حرکت کیوں نہیں دیکھ رہے تھے؟ کیا اس کے پاؤں کے اوپر کوئی لحاف وغیرہ پڑا تھا؟ وہ اپنے اندر ہی اندر چلایا۔ اس نے اپنی منوں وزنی پلکوں کو اُٹھانا چاہا۔ مفلوج ذہن برداشت نہیں کر پایا۔ ہر آواز غیر حقیقی محسوس ہونے لگی۔ خیالات گڈمڈ ہوتے چلے گئے۔ ایک بار پھر بے خبری کی تاریک لہر نے اسے ڈھانپ لیا۔

اس مرتبہ بیہوشی کا یہ وقفہ کافی طویل ہے۔ وہ اس وقفے سے نکلا تو غنودگی کی کیفیت محسوس ہوئی۔ اس غنودگی میں اس نے دیکھا وہ ایک تنگ اور گہرے کنویں میں ہے۔ اس کنویں کے اوپر کنارے پر دو عورتیں بیٹھی ہیں۔ ایک اس کی ماں ہے ایک اس کی شہزادی ہے۔ دونوں اشک بار ہیں۔ اسے پکار رہی ہیں۔ ماں کہہ رہی ہے۔ ''آ جا عادے پتر! اب بھی نہ آیا تو کب آئے گا۔ دیکھ تیری ووہٹی نے خون کی مہندی لگا لی ہے۔ وہ ڈولی میں بیٹھنے کے لیے تیار ہے۔''

پھر شہزادی بلک کر بولی۔ ''ہاں...... آ جا عادے! آ کہ میں ایک بار تجھے جی بھر کر دیکھ لوں...... اور تُو بھی مجھے دیکھ

لے۔ پتا نہیں پھر کبھی دیکھنا نصیب ہو کہ نہ ہو۔''

عادل پکار کر بولا۔ ''ایسی باتیں نہ کر شہزادی! میں نے ماں کے لیے اور تیرے لیے اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے۔ میں کمائی لے کر آیا ہوں اور تُو جانے کی باتیں کر رہی ہے۔''

کچھ لمحے خاموشی میں گزرے۔ پھر عادل نے دیکھا۔ شہزادی نے کہانیوں کی شہزادی کی طرح اپنے لمبے بال تنگ کنویں میں پھینکے۔ سیاہ ریشمی بال۔ عادل نے ان بالوں کو تھاما۔ وہ ہوا کی طرح ہلکا پھلکا تھا۔ معمولی سی کوشش کے ساتھ وہ اوپر چڑھنے لگا۔ بلندیوں کی طرف جانے کا ہنر اسے خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا۔ اگر یہ کنواں ہزاروں فٹ گہرا ہوتا تو بھی وہ یہ فاصلے طے کر لیتا تھا...... لیکن یہ کیا؟ ابھی وہ آدھے راستے میں تھا کہ اس کے بازوؤں میں سے جان ختم ہو گئی۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑی اور پھر ریشمی بال اس کے ہاتھوں میں سے نکل گئے۔ وہ پشت کے بل کنویں کی گہرائی میں گرا اور اس کی کمر ٹوٹ گئی۔ اس کا سر دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔

وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اس غنود کیفیت میں سے نکل آیا۔

اردگرد کی آوازیں پھر اس کی سماعت سے ٹکرانے لگیں۔ کہیں بالکل پاس ہی ادھیڑ عمر انگریز عورت اپنے زخموں کی وجہ سے تڑپ رہی تھی اور ڈاکٹر کو پکار رہی تھی۔ ہاں، عادل کو یاد آ گیا۔ ڈاکٹر کا نام رابرٹ تھا۔ رابرٹ فورڈ۔ اردگرد سے گولیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ریٹ ٹیٹ...... ریٹ ٹیٹ۔

کہاں سے آ رہی تھی یہ آوازیں؟ اس نے اپنے سر کو تھوڑا سا اونچا کیا۔ دائیں طرف ٹینٹ کے روزن کی جالی تھی۔ اس نے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ چاندنی رات تھی، سفید برف چمک رہی تھی۔ برف پوش چٹانیں یہاں وہاں بکھری ہوئی تھیں۔ اس نے ایک چٹان کی اوٹ سے شعلہ نکلتے دیکھا۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی شعلے نکلے۔ ریٹ ٹیٹ...... ریٹ ٹیٹ۔

اچانک عادل سرتاپا ہل گیا۔ اسے اپنی حالت پر یقین نہیں آیا۔ اس نے کہنیوں پر زور دے کر اپنا سر اُٹھا رکھا اور روزن سے باہر جھانک رہا تھا۔ کیا یہ، کوئی جاگتی آنکھوں کا خواب تھا؟ کوئی ناقابلِ یقین بصری واہمہ تھا؟ وہ ایک بچھونے پر نیم دراز تھا۔ اس نے اضطراری طور پر اپنے پاؤں کے اگلے حصے کو حرکت دی۔ پاؤں کا اگلا حصہ ہی نہیں پورا پاؤں ہلایا جا سکتا تھا۔ اس نے بے ساختہ اپنا دایاں ہاتھ اُٹھایا اور اپنے چہرے کو چھوا۔

دائیں طرف ایک تپائی پر کئی دوائیں اور انجکشن وغیرہ رکھے تھے۔ وہ زور لگا کر اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ لیکن ابھی رکوع کی حالت میں ہی تھا کہ اس کا سر خیمے کی چھت سے جھولتے لیمپ سے ٹکرایا۔ سر کے پچھلے حصے سے شدید ٹیسیں اٹھیں۔ اس نے اپنے ہاتھ سے سر کو چھوا۔ وہ پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ ایکا ایکی سارے مناظر پوری وضاحت کے ساتھ اس کی نگاہوں میں گھومنے لگے۔ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ کب ہوا تھا؟ وہ نوبل راک کا چمپئن بن چکا تھا۔ اس نے لیوپڈ کو شہ مات دی تھی۔ فتح کی خوشی میں سرشار وہ شہزادی سے ملنے گیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی بے پناہ قربت محسوس کی تھی اور پھر لیوپڈ...... وہ خنزیر لیوپڈ......

عادل کے تن بدن میں شعلے لپک گئے۔ اس کا جی چاہا، وہ خیمے سے نکلے اور لیوپڈ کو پکارے۔ اس کی کمینگی و کم ظرفی کو للکارے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ مزید سوچتا یا کرتا...... اس کی سماعت کو چند آوازوں نے جکڑ لیا۔ یہ

آوازیں صرف ڈیڑھ دوسوفٹ کے فاصلے سے چٹانوں کے عقب سے بلند ہو رہی تھیں۔ یہ نسوانی آوازیں، لڑکیوں کے چلانے کی تھیں۔ غالباً یہ انگریز لڑکیاں تھیں...... وہ مدد کے لیے پکار رہی تھیں...... دہائی دے رہی تھیں۔ کسی شرابی مرد نے خوشی سے بھرپور بلند قہقہہ لگایا۔ کسی دوسرے بدمست شخص کی آواز ہوا پر تیر کر عادل کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے پشتو سے ملتی جلتی زبان میں کچھ کہا تھا۔

یقیناً یہ پاؤندے ہی تھے جو نشے میں دھت ہو کر لڑکیوں کے ساتھ بدسلوکی کر رہے تھے۔ عادل کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ تب عادل کی نظر ایک اور لرزہ خیز منظر پر پڑی۔ چٹانوں کے پاس چار پانچ لاشیں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک لاش کو عادل نے اس کے بازو کی وجہ سے پہچانا...... یہ پلاسٹر شدہ بازو یقیناً تایا فراست کے ملازم انور کا تھا...... وہ اکڑی ہوئی حالت میں برف پر اوندھا پڑا تھا۔ غالباً کسی میں ہمت نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر انور یا دیگر افراد کی لاشوں کو اٹھا سکتا۔

عادل کو اپنے سارے بدن میں عجیب سی ناتوانی محسوس ہو رہی تھی جیسے جسم اور دماغ کا رشتہ کمزور پڑا ہوا ہو لیکن خوش آئند...... بلکہ بہت خوش آئند بات یہی تھی کہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت دے سکتا تھا۔ اس کا پورا جسم اب قابلِ حرکت تھا۔ یہ کرشمہ یقیناً آناً فاناً ہی ہوا تھا اور جب یہ ہوا، اس کے اردگرد کوئی ڈاکٹر نہیں تھا۔ کوئی ٹریٹمنٹ نہیں ہو رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ اس نے حالتِ غنودگی میں خود کو بلندی سے گرتے محسوس کیا تھا۔ اس کا جسم پختہ زمین سے ٹکرایا تھا اور اس کی ہڈیاں ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں۔ شاید یہی وہ شدید ذہنی شاک تھا جس نے اس کے Paralysis کو ختم کیا تھا۔ ڈاکٹر رابرٹ کی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ ایک موقع پر ڈاکٹر نے اس کے سرہانے کھڑے ہو کر کہا تھا...... یہ سب کچھ کئی ہفتے، مہینے یا غیر معینہ مدت کے لیے چل سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آناً فاناً ختم ہو جائے۔

کھڑے ہونے سے عادل کا سر بری طرح گھومنے لگا۔ اسے لگا کہ وہ پھر چکرا کر گر جائے گا اور وہی منحوس...... بے حسی و ناتوانی اسے ڈھانپ لے گی جس نے اسے نامعلوم عرصے کے لیے پتھر بنائے رکھا ہے۔ سر اور جبڑے سے شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے اپنے جبڑے پر ہاتھ پھیرا اور چونک گیا۔ شیو کافی بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے اندازہ لگایا...... یہ کم از کم دس دن کی شیو تھی۔

''اوہ گاڈ! اس کا مطلب ہے، میں آٹھ دس دن یہاں پڑا رہا ہوں۔'' اس نے سوچا اور اپنے چکراتے ذہن کو سنبھال کر بستر پر لیٹ گیا۔

اور تب ہی اسے یہ احساس ہوا کہ اسے پیشاب کی نالی لگی ہوئی ہے۔ ایک طرف موجود تھیلی میں کوئی چوتھائی لیٹر یورین موجود تھا اور پھر اسے اپنے بائیں ہاتھ کی پشت بھی دکھائی دی۔ یہاں ڈرپس وغیرہ کے لیے ''برانولا'' لگا ہوا تھا۔ اس نے پیشاب والی نالی اور برانولا، دونوں اپنے جسم سے علیحدہ کیں۔

سر مسلسل چکرا رہا تھا۔ اسے خدشہ محسوس ہونے لگا کہ وہ کہیں پھر بے ہوش نہ ہو جائے۔ کچھ بھی مزید ہونے سے پہلے وہ ایک بار شہزادی کو دیکھنا چاہتا تھا اور سرمد صاحب کو بھی۔ وہ کہاں تھے؟ کہیں...... کہیں ان کے ساتھ...... اس سے آگے وہ سوچ ہی نہیں سکا۔

اچانک ایک بار پھر فائرنگ شروع ہو گئی۔ یہ دوطرفہ فائرنگ تھی۔ عادل والا خیمہ ایک تکونی چٹان کے پیچھے تھا، اس لیے براہِ راست فائرنگ کی زد میں نہیں تھا۔ پھر بھی وہ بستر پر چت لیٹ گیا۔ اگلے قریباً تین منٹ تک دونوں طرف سے اندھادھند فائرنگ ہوئی۔ اس فائرنگ کے دوران میں چٹانوں کے پیچھے سے للکارے سنائی دیتے رہے اور نشے میں ڈوبی ہوئی گالیوں کی بوچھاڑ بھی سنائی دیتی رہی۔

ان تین چار منٹ میں عادل اس صورتِ حال کو کافی حد تک سمجھ گیا۔ چٹانوں کے پیچھے یقیناً پاؤندے تھے۔ وہ اس کیمپ کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ یہ گھیرا یقیناً آٹھ دس روز سے برقرار تھا اور دھیرے دھیرے تنگ ہوتا چلا گیا تھا۔ اب تو کیمپ کے خیموں اور پاؤندوں کے درمیان بمشکل سو ڈیڑھ سو فٹ کی دوری رہ گئی تھی بلکہ دھیان سے دیکھا جاتا تو پتا چلتا تھا کہ کیمپ کا وہ حصہ جہاں ملازموں کے خیمے تھے اور خچروں، ٹٹوؤں وغیرہ کے لیے سائبان تھے، مکمل طور پاؤندوں کے قبضے میں جا چکا تھا۔ اس حصے کے ساتھ ہی برٹش شہریوں کے جو جدید خیمے تھے، ان میں سے پندرہ بیس بھی پاؤندوں کے قبضے میں تھے۔ یقیناً ان خیموں میں موجود ہر چیز کو لوٹا جا چکا تھا۔ لگتا یہی تھا کہ لوٹ کے اس مال میں کچھ خواتین بھی شامل ہیں۔

فائرنگ کے تھمتے تھمتے پاؤندے کچھ اور نزدیک آ گئے۔ نظر آ رہا تھا کہ انہوں نے اپنی پوزیشن کچھ اور بہتر بنا لی ہے۔ نہ جانے کیوں ہمایوں کے کہے ہوئے الفاظ ایک بازگشت کی طرح عادل کے کانوں میں گونجنے لگ۔ اس نے کہا تھا، یہ پاؤندے انہی لوگوں کی نسل میں سے ہیں جنہوں نے گئے وقتوں میں سالار وشوا ناتھ کی زیرِ کمان، راجپوتوں پر حملہ کیا اور اپنی تعداد کے بل بوتے پر انہیں روند کر رکھ دیا۔ یہ اسی قبیل کے لوگ تھے، جنگ و جدل جن کا پیشہ ہوتا ہے اور خون ریزی و آبروریزی جن کے پسندیدہ ترین مشاغل ہوتے ہیں۔ آج یہ بات ثابت ہو رہی تھی۔

پھر بستر پر لیٹے لیٹے عادل نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ پاؤندوں کی جانب سے ایک خچر کیمپ کی طرف ہانکا گیا۔ وہ پہلے بھاگا پھر دھیرے دھیرے کیمپ کی طرف بڑھا۔ اس پر کچھ لدا ہوا تھا۔ وہ کیمپ کے نزدیک پہنچا تو برٹش گارڈز میں سے کسی نے اس پر سرچ لائٹ ڈالی۔ چند سیکنڈ کے لیے خچر تیز روشنی میں نہا گیا۔ عادل کی دھڑکن تھم گئی۔ خچر اس کے خیمے سے صرف دس پندرہ قدم کے فاصلے پر تھا۔ اس پر ایک برہنہ لاش اوندھی پڑی تھی۔ لاش کو کوہ پیمائی والے رسے سے خچر کی پشت پر باندھا گیا تھا۔ یہ ایک لڑکی کی لاش تھی اور یہ لڑکی عادل کے لیے اجنبی نہیں تھی...... ہاں، وہ اجنبی نہیں تھی۔ یہ مسکراتے چہرے والی وہی نوجوان صحافی تھی جو عادل اور شہزادی کا انٹرویو کرنے کے لیے انہیں خیمے میں لائی تھی۔ وہ ان دونوں کو تنہائی میں بات کرنے کا موقع دے کر باہر نکلی تھی اور اسی دوران میں بدبخت لیوپڈ نے وہاں پہنچ کر عادل کے سر پر قیامت توڑ دی تھی۔

عادل لاش کا منظر دیکھ کر آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اسی دوران میں چٹانوں کی دوسری جانب سے ایک بلند آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ کسی مخمور پاؤندے نے اطلاع دینے والے انداز میں کچھ کہا۔

پھر ایک اور آواز آئی۔ ہوا کے دوش پر تیر کرنے آنے والی یہ منحوس آواز وہ ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ اسی بدخصلت چھوٹے چودھری ناصر کی آواز تھی۔ اس نے غالباً پاؤندے کی ''اطلاع'' کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لے ہمایوں پتر! یہ نیا تحفہ قبول کر ہماری طرف سے۔ لیکن ساتھ یہ بھی یاد رکھ۔ اسے ہم نے نہیں تم نے مارا ہے۔ ہم تو بس

''کھیل'' رہے تھے اس کے ساتھ۔ یہ تمہاری چلائی ہوئی گولیوں سے مری ہے۔''

خیمے کے بالکل قریب سے ہمایوں کی للکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''حرامزادے...... کتے!''

اس کے ساتھ ہی ایک طویل برسٹ چلا۔ یقیناً یہ ہمایوں یا اس کے بچے کھچے ساتھیوں میں سے کسی نے چلایا تھا۔

اس ایک برسٹ کے جواب میں دوسری طرف سے کم وبیش دس برسٹ چلے اور برف پوش چٹانوں پر ہر طرف چنگاریاں بکھرتی نظر آئیں۔ خچر ڈر کر بھاگا اور لاش سمیت گولیوں کی زد میں آ گیا۔ عادل نے اسے گر کر تڑپتے اور پھر ساکت ہوتے دیکھا۔ برہنہ لاش ابھی تک اس کی پشت پر بندھی تھی۔

یہ کیا ہو رہا تھا؟ یہ کیا قیامت برپا تھی؟ سردی کے باوجود عادل کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ شہزادی کہاں تھی؟ سرمد صاحب کہاں تھے؟ اور تایا فراست اور کرسٹل؟...... خدانخواستہ...... خدانخواستہ...... اس سے آگے وہ کچھ سوچ نہ سکا۔ نقاہت کے سبب اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اس کے کانوں میں وہی الفاظ گونجے جو اس نے نیم بے ہوشی کی حالت میں سنے تھے۔ شہزادی نے روتی سسکتی آواز میں کچھ اس طرح کی بات کہی تھی۔

''ابا جی...... مجھے اپنے ہاتھوں سے گولی مار دیں۔ میں بے عزتی کی موت مرنا نہیں چاہتی۔'' وہ تڑپ اٹھا۔ اس نے سوچا وہ ہمایوں کو پکارے لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے پکارتا یا بچھونے سے اٹھنے کی کوشش کرتا، کوئی تیزی سے خیمے کی طرف آیا...... عادل نے ساکت ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جس ہاتھ سے اس نے برانو لا اتارا تھا، وہ کمبل کے نیچے تھا۔ آوازوں اور آہٹوں سے اندازہ ہوا کہ کچھ لوگ کسی زخمی کو اٹھا کر اندر لائے ہیں اور خیمے کے فرش پر لٹا دیا ہے پھر ایک اور شخص کو لایا گیا اور اسے بھی لٹا دیا گیا۔ جو لوگ بول رہے تھے، ان میں ہمایوں کے علاوہ ڈاکٹر رابرٹ کی آواز میں شامل تھی۔ وہ سب بہت گھبرائے ہوئے لگتے تھے۔

چار پانچ منٹ بعد یہ وسیع خیمہ پھر خالی ہو گیا۔ عادل کو اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ رات کا آخری پہر ہے۔ چاند مغرب کی طرف جھکا ہوا تھا اور اس کی ترچھی کرنیں برف کی چادر کو چمکا رہی تھیں۔ ایک زاویے سے بلند و بالا نوبل راک کا ایک پہلو بھی نظر آیا۔ وہ جیسے ستاروں کو چھو رہی تھی۔ چاندنی نے اسے بھی جھلملاہٹ عطا کر دی تھی۔ یقیناً یہ سارا منظر خوب صورت ہوتا اگر سامنے برف پر کئی لاشیں پڑی نہ ہوتیں...... اور چٹانوں کے پیچھے سے گاہے بگاہے غیر ملکی لڑکیوں کی آہ و بکا سنائی نہ دے رہی ہوتی۔

عادل کا ذہن اب مختلف کڑیوں کو جوڑنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اسے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ گئی تھی کہ پاؤندے اور ان کے ساتھی درندہ صفت ڈاکوؤں کا روپ اختیار کر گئے ہیں۔ کیمپ کے ایک حصے پر قبضے کے دوران میں انہوں نے کچھ مقامی اور غیر ملکی عورتوں کو اٹھا لیا ہے اور اب ان سے برا سلوک کر رہے ہیں۔ خچر کی پشت سے بندھی ہوئی لاش اس کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ ایک دم اس کا ذہن شہزادی کے حوالے سے دوبارہ تفکرات سے بھر گیا۔

وہ ہوش میں تو آ گیا تھا لیکن ابھی جسمانی طور پر پوری طرح درست نہیں تھا۔ خاص طور سے اپنی ٹانگیں اسے...... بے جان محسوس ہوئی تھیں۔ اسے لگتا تھا کہ اس نے چلنے کی کوشش کی تو وہ گر پڑے گا۔ وہ کئی منٹ تک اسی

طرح چت لیٹا رہا اور اپنی ٹانگوں کو ہلا جلا کر ان کی قوتِ کار جانچنے کی کوشش کرتا رہا۔ خیمے میں اب گھپ اندھیرا تھا۔ لیمپ بجھا دیا گیا تھا۔ اچانک عادل کو خرخراہٹ سنائی دی جیسے کسی کے گلے میں سانس پھنس رہی ہو۔ یہ کون تھا؟ ابھی وہ اس سوال کا جواب جاننے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ایک یا دو افراد اندر داخل ہوئے۔ ان کی آوازوں سے پتا چلا کہ ان میں سے ایک ڈاکٹر رابرٹ ہے اور دوسری کرسٹل۔ وہ کسی زخمی شخص کے سرہانے کھڑے تھے۔ دونوں نے انگلش میں بات کی۔ ڈاکٹر رابرٹ نے کہا۔ ''یہ بڑی تیزی سے کمزور ہو رہا ہے۔ اسے گلوکوز کی ضرورت ہے لیکن گلوکوز کے بیگ اب ختم ہو چکے ہیں۔''

کسی مقامی نے انگلش میں ڈاکٹر سے پوچھا۔ ''اسے منہ کے ذریعے کوئی چیز نہیں دی جا سکتی؟ مثلاً دودھ وغیرہ۔''

''دودھ بھی اب کہاں ہے؟ شاید ہی ایک دو پیکٹ ہوں۔ راشن اب بالکل ختم ہو رہا ہے۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

کرسٹل نے بھی مدھم...... نقاہت بھری آواز میں کچھ کہا جو عادل کی سمجھ میں نہیں آ سکا۔ باہر سے وقتاً فوقتاً فائرنگ کی آواز بھی آ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد یہ افراد خیمے سے باہر نکل گئے۔ اب تک عادل نے اپنے اردگرد جو گفتگو سنی تھی اور مختلف لوگوں کی باتوں سے جو نتیجہ اخذ کیا تھا، اس سے اس کے ذہن میں صورتِ حال کا ایک نقشہ سا بن گیا تھا۔ یہ نقشہ کچھ یوں تھا۔ نوبل راک پر کلائمنگ کا مقابلہ ختم ہونے کے فوراً بعد ہی کیمپ کو ختم ہو جانا تھا اور تمام ملکی اور غیر ملکی مہمانوں کو یہاں سے نکل جانا تھا۔ اس جلدی کے پیچھے یہ اندیشہ موجود تھا کہ کہیں پاؤندے یہاں پہنچ کر مشکلات پیدا نہ کریں لیکن اس دوران میں قراقرم کے رنگ بدلتے شدید موسم نے دغا دیا۔ ایک تند طوفان نے انہیں آ لیا اور روانگی میں کچھ تاخیر ہو گئی۔ دوسری دغابازی کیمپ کے اندر سے ہی سامنے آئی۔ چھوٹے چودھری ناصر نے جب یہ دیکھا کہ شہزادی کے حوالے سے پانسا پلٹ گیا ہے اور تایا فراست نے عادل کو گلے سے لگا لیا ہے تو وہ سمجھ گیا کہ اب کھیل اس کے ہاتھ میں نہیں رہا۔ عین ممکن تھا کہ تایا فراست اور ناصر میں کوئی جھڑپ وغیرہ بھی ہوئی ہو۔ جب پاؤندوں نے یہاں پہنچ کر کیمپ کو گھیرا تو ناصر فوراً اپنے ساتھیوں سمیت پاؤندوں سے جا ملا۔ اب وہ لوگ پوری طرح حاوی تھے اور دم بہ دم کیمپ کے گرد گھیرا تنگ کرتے جا رہے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اب کیمپ والوں کی جدوجہد زیادہ دیر چلنے والی نہیں۔ ہر طرف مقامی اور غیر مقامی گارڈز کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں اور ایمونیشن بھی ختم ہونے والا تھا۔ لگتا تھا کہ جلد ہی پاؤندے ان پر چڑھ دوڑیں گے اور سب کچھ تہس نہس کر دیں گے۔

اچانک عادل کو نیم تاریکی میں ایک بار پھر خرخراہٹ سنائی دی۔ کسی کی سانس اس کے گلے میں الجھ رہی تھی۔ شاید وہ قریب المرگ تھا۔ عادل نے اپنی نیم جان ٹانگوں کو سمیٹا اور ہمت کر کے اٹھ بیٹھا۔ اس نے سر موڑ کر آواز کی سمت دیکھا۔ کوئی کمبل کے نیچے چت لیٹا تھا۔ اس کے قریب کوہ پیمائی میں استعمال ہونے والا چھوٹا آکسیجن سلنڈر رکھا تھا اور آکسیجن ماسک اس کے چہرے پر تھا۔ عادل نے اس کے قریب جھک کر غور سے دیکھا اور سناٹے میں رہ گیا۔ یہ اس کا وہی بدخصلت حریف تھا جس نے قدم قدم پر اسے نقصان پہنچایا تھا۔ یہ لیو پڈ تھا، اس کی آنکھیں بند

تھیں اور اس کے رخسار کا پرانا زخم نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔ آکسیجن ماسک اس کے منہ سے کھسک کر اس کی ٹھوڑی پر چلا گیا تھا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی سانس سینے میں اٹک رہی تھی۔ خرخراہٹ کی آواز بھی اسی کا نتیجہ تھی۔

عادل نے اس کے سینے پر سے کمبل ہٹایا۔ بدبو کا ایک جھونکا آیا۔ وہی بدبو جو گہرے خراب زخموں سے اٹھتی ہے۔ لیوپڈ کے سینے پر بہت سی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ چند دن پہلے اس کے سینے پر ایک یا ایک سے زائد گولیاں لگی ہیں...... اور اس زخم نے بتدریج خراب ہو کر اسے قریب المرگ کر دیا ہے۔ اس نے اس کا آکسیجن ماسک درست کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن پھر رک گیا۔ نفرت کی ایک بلند لہر اس کے اندر سے اٹھی...... اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد آیا کہ اس کی فتح کی خوشی کو لیوپڈ نے کس طرح برباد کیا تھا۔ سر پر لگنے والی جس شدید ضرب کے سبب وہ کئی دن کومے کی سی کیفیت میں رہا تھا، وہ اسی بدبخت کے پہلوان نما ساتھی نے لگائی تھی۔ اب وہ مر رہا تھا، اسے مرنا چاہیے تھا۔ عادل نے اس کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں۔ یکا یک پاؤندوں کی طرف سے آٹومیٹک رائفل کا ایک برسٹ آیا...... اس چٹان پر چنگاریاں سی بکھر گئیں جس کے پیچھے یہ کشادہ خیمہ لگایا گیا تھا۔ چٹان کے کئی سنگریزے فضا میں اچھلے اور ان میں سے کچھ خیمے کی دیواروں سے ٹکرائے۔ یوں لگتا تھا کہ اب گھیرا ڈالنے والوں کی فائرنگ کے زاویے خطرناک ہوتے جا رہے ہیں۔

عادل نے ایک بار پھر لیوپڈ کی طرف توجہ کی۔ وہ برا دشمن تھا...... لیکن عادل خود کو اس کی مدد کرنے سے باز نہیں رکھ سکا۔ اپنے اندرونی جذبات کو دباتے ہوئے اس نے آکسیجن ماسک پھر اس کے منہ پر چڑھا دیا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔ لگتا تھا کہ وہ زیادہ دیر سانس کی ڈور سے بندھا نہیں رہے گا۔ اس کے پہلو میں ایک اور جسم کمبل تلے پڑا تھا۔ عادل نے اس جسم پر سے کمبل ہٹایا لیکن پھر جلدی سے واپس ڈال دیا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ بھی ایک لڑکی کی لاش تھی اور وہ اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ لارڈ اوٹس کی شوخ و چنچل بیٹی ڈور تھی تھی۔ اس کا بالائی لباس بری طرح پھٹا ہوا تھا اور کومل جسم پر تشدد کے نشان تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ بھی پاؤندوں کی وحشت کا شکار ہوئی ہے۔ عادل کو اپنی آنکھوں میں نمی محسوس ہوئی۔ آخر ''آبرو کا لٹیرا'' کیا حاصل کرتا ہے آبرو لوٹنے سے۔ بس خوشی کا حاصل کرنے کی ایک سعی لاحاصل...... اور اس سعی لاحاصل کے آخر میں...... پچھتاوا، ندامت، کراہت...... اور اپنے ہی اوپر لعنت ملامت کرتا ہوا اپنا جسم۔

لیوپڈ کی طرح یہ ڈور تھی بھی عادل اور سرسرمد کے بدخواہوں میں سے تھی لیکن یہاں اسے اس حالت میں دیکھ کر عادل کو تکلیف ہوئی۔ اس کی نیم جان ٹانگوں میں لرزش بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر اپنے بچھونے پر گر پڑا۔ خیمے کے بالکل پاس سے ایک ہانپی ہوئی آواز سنائی دی۔

''میرے خیال میں کوئی زہریلی چیز ہے۔ شاید کوئی ایسڈ وغیرہ۔'' یہ ہمایوں کی آواز تھی۔

''اب کیا ہوئیں گا۔ تم کچھ کرو ہمایوں۔'' یہ ڈری ڈری آواز کرسٹل کی تھی۔

''شاید ان کا معدہ صاف کرنا پڑے گا۔ سامان تو موجود ہے، میں ڈاکٹر سے بات کرتا ہوں۔'' ہمایوں نے کہا۔

''ہام کو ڈر لگتا۔'' کرسٹل لرزتی کانپتی آواز میں بولی۔

عادل کے دماغ میں اب آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اس کے اردگرد بہت کچھ ہو رہا تھا اور خوف ناک تیزی سے ہو رہا تھا۔ اسے شہزادی، تایا فراست اور سرسرمد کی خیر خبر ابھی تک نہیں ملی تھی اور یہی بات اسے سب سے زیادہ پریشان کر رہی تھی۔ وہ باہر نکلنا چاہتا تھا۔ شہزادی اور ہمایوں کو پکارنا چاہتا تھا لیکن اسے لگ رہا تھا کہ اس کا نچلا دھڑ ابھی پوری طرح کام نہیں کر رہا۔ شاید ابھی فالج کے اثرات باقی تھے۔ گاہے بگاہے دماغ میں دھند سی بھی بھر جاتی تھی۔ سر اور گردن کے پچھلے حصے کا درد تو پچھلے سفر سے ہی موجود تھا۔ کچھ دن پہلے لیوپڈ کے ساتھی نے کندآلے سے جو ضرب لگائی تھی، اس نے عادل کی اس تکلیف کو زبردست بڑھاوا دیا تھا۔ وہ ہمت کر کے اٹھا، سر میں ٹیس اٹھی اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ اسے چھوٹی نال والی ایک چینی رائفل کونے میں پڑی نظر آئی۔ رائفل کے دستے پر خون جما تھا اور حالات کی بدترین سنگینی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ عادل اپنے جسم کو سنبھالتا ہوا رائفل تک پہنچا۔ یہ چھوٹی سی رائفل اسے غیر معمولی طور پر وزنی محسوس ہوئی۔ اسے اندازہ ہوا کہ یہ رائفل کا بوجھ نہیں، یہ اس کے ہاتھوں کی ناتوانی ہے۔ وہ اپنے قویٰ کو ابھی مکمل طور پر استعمال کرنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔ اسلحے کی جو تھوڑی بہت سمجھ اسے تھی، اس کے مطابق اسے پتا چلا کہ رائفل کا میگزین بالکل خالی ہے۔

اس نے رائفل ایک طرف رکھ دی۔ اتنی سے مشقت نے ٹانگوں پر لرزہ طاری کر دیا اور دماغ میں دھند بھر دی تھی۔ وہ لیٹ گیا...... اچانک ہمایوں کسی شخص کو گھسیٹتا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ شخص رو رہا تھا۔ ''وہ نہیں بچے گی، وہ ختم ہو جائے گی۔''

عادل نے آواز پہچان لی۔ یہ اسی جواں سال گائیڈ مدثر کی آواز تھی جو قاسم وغیرہ کے ساتھ کیمپ تک پہنچا تھا۔ بعد ازاں اس نے حالات کو کنٹرول کرنے میں سرسرمد اور عادل وغیرہ کی بہت مدد کی تھی۔ اس سفر میں اس کی نوجوان بیوی بھی شریک تھی۔ وہ قافلے کے لیے کھانے پکانے کا کام کرتی رہی تھی۔ شہزادی نے عادل کو اس کا نام فیروزہ بتایا تھا۔

مدثر ایک بار پھر دلدوز آواز میں پکارا۔ ''وہ پہلے ہی کہتی تھی، میں نہیں بچوں گی...... نہیں بچوں گی۔''

ہمایوں گلوگیر آواز میں بولا۔ ''بدفال منہ سے نہ نکالو۔ اللہ سے دعا کرو۔ اس کے لیے کچھ مشکل نہیں۔''

''مم...... میرا دل پھٹ جائے گا بابو جی...... میں اس سے بڑی محبت کرتا ہوں، میں نہیں جی سکتا اس کے بغیر۔''

''اسی لیے تو کہتا ہوں کہ دعا کرو۔ جن لوگوں سے پیار کیا جاتا ہے ان کے لیے دعائیں قبول ہوتی ہیں۔''

ہمایوں اسے دلاسا دینے لگا۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کسی کے زہریلی چیز کھانے کی جو بات ہوئی تھی، وہ فیروزہ کے بارے میں ہی تھی۔ حالات کی سنگینی سے دل برداشتہ ہو کر اس نے کچھ کھا لیا تھا اور اب اس کی حالت خطرے میں تھی۔

باہر فائرنگ ایک بار پھر تیز ہو گئی تھی۔ عادل اسی طرح آنکھیں بند کیے پڑا رہا...... ہمایوں...... مدثر کو دلاسا دیتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

مدثر غالباً گھٹنوں میں سر دیئے سسکیوں سے رو رہا تھا اور دعائیہ انداز میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ وہ چوڑے سینے والا ایک باہمت اور سخت جان پہاڑیا تھا لیکن...... فی الوقت ایک بچے کی طرح بلک رہا تھا۔ یہ سنگین ترین حالات کی ستم ظریفی ہی تھی کہ ایک کڑیل جوان یوں بے چارگی سے آنسو بہا رہا تھا۔

عادل کی سوچیں ایک بار پھر شہزادی اور سرسرمد کے گرد گھومنے لگیں۔ ان سنگین حالات میں اس طرح لاتعلق پڑے رہنا اسے کسی طرح گوارا نہیں تھا۔ اسے اپنے جسم کی ناتوانی پر جھنجلاہٹ محسوس ہونے لگی۔ اپنی ہانپی ہوئی سانسوں پر اسے طیش آنے لگا۔

چند منٹ اسی طرح گزرے۔ عادل آنکھیں بند کیے پڑا رہا اور مدثر کی دعائیہ بڑبڑاہٹ سنتا رہا۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ کوئی خیمے میں داخل ہوا ہے۔ یہ ہمایوں ہی تھا۔ مدثر نے لرزاں آواز میں پوچھا۔ ''کیا ہوا بابو جی۔''

جواب میں ہمایوں کی آواز سنائی نہ دی۔ مدثر غالباً اُٹھ کھڑا ہوا تھا، وہ دلدوز انداز میں چلایا۔ ''آپ چپ کیوں ہو بابو جی؟ کیا ہوا؟''

''اللہ کو یہی منظور تھا۔'' ہمایوں کی کراہتی ہوئی آواز ابھری۔

مدثر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ وہ پکار رہا تھا۔ ''فیروزہ...... فیروزہ!'' اس کے ساتھ ساتھ شاید وہ خیمے سے نکلنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ ہمایوں نے اسے سنبھال لیا تھا۔ اسے بازوؤں کے شکنجے میں کس لیا تھا۔ وہ خود بھی آبدیدہ تھا۔

اس نے روتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''وہ تینوں مر گئیں مدثر...... تینوں مر گئیں۔''

عادل پر انکشاف ہوا کہ زہریلی چیز کھانے والی ایک لڑکی نہیں تھی...... تین لڑکیاں تھیں۔ باقی دو کون تھیں؟

اگلا لمحہ بھی انکشاف انگیز تھا اور یہ ایسا انکشاف تھا جس نے عادل کو سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک پتھر کر دیا۔ اسے لگا کہ کائنات کی گردش تھم گئی ہے اور وہ خود سیکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر فضائے بسیط میں بکھر گیا ہے۔ ہمایوں نے روتے ہوئے دل فگار لہجے میں مدثر کو بتایا۔ ''ہاں، شہزادی، فیروزہ، نسرین...... تینوں ختم ہو گئیں......''

یہ چھ سات الفاظ نہیں تھے، چھ سات قیامتیں تھیں جو چند ساعتوں میں عادل پر ٹوٹیں۔ کئی لمحے تک جیسے اس کے ذہن نے کام ہی نہیں کیا...... پھر اس کے حواس نے اسے بتایا کہ اس کے جینے کا جواز ختم ہو چکا ہے۔ وہ ہستی اب نہیں رہی جس کے لیے وہ زندگی کا زہر پی سکتا تھا۔ وہ مر گئی ہے، چلی گئی ہے۔ کچھ وحشی درندوں کے خوف سے اس نے اپنی زندگی کو اپنے ہاتھوں سے ختم کر لیا ہے۔ آنے والے دنوں کے سارے حسین سپنے وہ اپنے ساتھ لے کر موت کے اندھیروں میں اتر گئی ہے۔ اب وہ کبھی نہیں ہنسے گی، اب وہ کبھی اس کی چوڑیوں کی چھن چھن نہیں سنے گا۔ اب وہ کبھی اس کا ریشمی لمس محسوس نہیں کرے گا۔ زندگی سو برس بھی ہوئی تو یہ آگ کے سو سمندروں میں سے گزرنے جیسی ہو گی۔ تو پھر وہ بھی کیوں جیے گا؟ لیکن کیا واقعی مر گئی؟ کہیں اس کے تخیل نے اسے کوئی بھیانک منظر تو نہیں دکھایا؟ کہیں وہ ابھی تک بے ہوشی کے اندھیروں میں تو نہیں ہے؟

وہ چلا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ ہمایوں پر جھپٹا۔ اس نے ہمایوں کا گریبان پکڑ لیا۔ اپنے سینے کی پوری طاقت سے گرجا۔ ''ہمایوں! کیا بکواس کر رہے ہو، شہزادی کا نام کیوں لے رہے ہو؟ کیا ہوا ہے اسے؟ مجھے سچ بتاؤ کیا ہوا ہے اسے؟''

اس نے ہمایوں کو جھنجوڑ ڈالا۔ اس کی قمیص پھاڑ دی۔ ہمایوں کا چہرہ غم و الم کی بے مثل تصویر تھا۔ اس نے کچھ کہا نہیں لیکن اس کی اشک بار آنکھوں میں عادل کو اپنی زندگی کی سب سے بھیانک خبر نظر آ گئی۔ عادل مچھلی کی طرح تڑپا اور باہر کی طرف لپکا۔ ہمایوں نے اس کی کمر میں دونوں ہاتھ ڈالے اور پوری طاقت سے اسے روکا۔ ''نہیں عادل! گولی چل رہی ہے، رک جاؤ۔''

وہ رکنے والا کہاں تھا۔ اس کے سینے میں تو ہزاروں ٹن بارود کے دھماکے ہو رہے تھے۔ وہ ہمایوں کو گھسیٹتا ہوا خیمے سے باہر آ گیا۔ ''شہزادی...... شہزادی۔'' وہ پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے چلا رہا تھا۔

اب دن کا اُجالا پھیل چکا تھا۔ برف پر لاشیں بکھری تھیں اور خون جما ہوا تھا۔ ہر طرف فائرنگ کی سماعت شکن تڑتڑاہٹ تھی اور گولیوں کے خول بکھرے ہوئے تھے۔ چٹانوں کی دوسری طرف پاؤندوں نے اور نشیب کی طرف کیمپ کے بچے کھچے گارڈز نے پوزیشنیں لے رکھی تھیں۔ عادل کو صاف محسوس ہوا، سنسناتی گولیاں اس کے سر اور کندھوں کے قریب سے گزر رہی ہیں۔ وہ موت کی سرگوشیاں سنا رہی تھیں لیکن...... موت کی پروا اب کسے تھی؟ وہ شہزادی کو دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ہمایوں کو اپنے ساتھ گھسیٹتا چلا جا رہا تھا...... اور پھر ایک بڑی چٹان کے پیچھے ایک سائبان کے نیچے اسے کچھ جسم نظر آئے۔ وہ برف پر بچھے Mats پر ساکت پڑے تھے۔ پہلا جسم کس کا تھا؟ پہلا جسم سرسرمد کا تھا۔ ان کے سینے پر...... عین دل کے مقام پر دو سرخ پھول کھلے ہوئے تھے۔ گولیاں انہیں چیر کر گزر گئی تھیں۔ ان کا جبڑا ایک سفید پٹی سے باندھ دیا گیا تھا۔ اس سے اگلی لاش مدثر کی جواں سال بیوی فیروزہ کی تھی...... اور اس سے اگلی شہزادی کی۔ اس کا رنگ ہلدی اور زعفران سے زیادہ زرد تھا۔ وہ جیسے ادھ کھلی آنکھوں سے سائبان کو دیکھ رہی تھی۔ گلوکوز کی ڈرپ کی سوئی اس کے بازو سے نکال کر اس کے سینے پر رکھ دی گئی تھی۔

''شہزادی!'' عادل درد و کرب میں ڈوب کر چلایا۔ ایک گولی اس کے بازو کو چھیدتی ہوئی گزر گئی۔ اب ہمایوں کے علاوہ مشتاق اور ایک تیسرے شخص نے بھی عادل کو جکڑ لیا تھا۔ وہ اسے گولیوں کی براہِ راست زد سے نکالنا چاہ رہے تھے۔ وہ اسے طاقت سے کھینچتے ہوئے کچھ پیچھے لے آئے۔ عادل گر گیا۔ ہمایوں اور مشتاق بھی گر گئے۔

''مجھے چھوڑ دو...... مجھے مرنے دو۔'' عادل کی آواز فرطِ الم سے پھٹ کر ناقابلِ شناخت ہو گئی تھی۔

ہمایوں بھی اب طیش میں تھا۔ اس نے ایک جھٹکا دے کر اپنا گریبان عادل کے ہاتھ سے چھڑایا اور بولا۔

''اگر مرنا ہی ہے تو پھر ان کو مار کر مرو جنہوں نے شہزادی کو مارا...... سر کو مارا۔''

گولیوں کی ایک بوچھاڑ ان کے سروں پر سے گزر گئی۔ وہ گرے پڑے تھے۔ اگر کھڑے ہوتے تو شاید چھلنی ہو جاتے۔ پھر عادل نے دیکھا، بلندی سے کریہہ شکلوں والے کچھ پاؤندے، رائفلیں اور چھوٹی کلہاڑیاں سونتے خیموں کی طرف لپک رہے ہیں۔ عادل نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا...... ہاں یہی تھے جنہوں نے سرسرمد کو

مارا......شہزادی کو مارا...... یہی درندے تھے......اوران کا سرغنہ وہ کمینہ مالکانے زادہ تھا...... عادل نے انور کی لاش کے پاس سے ایک رائفل اٹھائی اوراندھادھند پاؤندوں کی ٹولی کی طرف بھاگا۔اسے کچھ معلوم نہیں تھا، وہ کیا کررہا ہے......اوراس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔اسے یہ بھی یادنہیں تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے اس کی ٹانگیں نیم جان تھیں اوروہ اپنے بازوؤں کوٹھیک سے حرکت نہیں دے پارہا تھا۔اسے وہ گولی بھی یادنہیں تھی جوکچھ دیر پہلے اس کے بازو میں اتری تھی اورشاید یہ بھی یادنہیں تھا کہ زندگی نام کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔پاؤندے اس کی طرف لپک رہے تھے اوروہ ان کی طرف لپک رہا تھا۔پھراس نے ٹریگر دبایا۔دونوں طرف سے اندھادھند گولیاں چلیں۔وہ چنگھاڑتا گیا اور بھاگتا گیا۔اس نے پاؤندوں کوزخمی ہوہوکرگرتے دیکھا۔اس کے اپنے بازو میں بھی ایک اورانگارااترا لیکن وہ رکا نہیں۔ کم وبیش پانچ پاؤندوں کوڈھیر کرتے ہوئے وہ ایک قدم آدم چٹان کی اوٹ میں گرا۔

اس کی رائفل خالی ہوچکی تھی۔اس نے دیکھا، ہمایوں بھی سرتاپا قہراس کے پیچھے آرہا ہے۔اس نے آٹو میٹک رائفل کے دوبھرے ہوئے میگزین عادل کی طرف پھینکے اورخود عادل سے بھی چند قدم آگے جا کرایک پتھر کے پیچھے پوزیشن لے لی۔کسی نے عادل کے شانے کے ساتھ شانہ ملایا۔عادل نے دیکھا یہ فیروزہ کا شوہر مدثر تھا۔اس کی آنکھوں میں بھی شعلے رقصاں تھے۔چارج کرنے کے دوران میں کارتوس کے دوتین چھرے مدثر کی کلائی میں لگے تھے۔خون بہہ رہا تھا لیکن اسے کوئی احساس نہیں تھا۔

ہمایوں نے عادل کومخاطب کرتے ہوئے پکارا۔

''عادل! اس سامنے والی چوٹی پر ان کی گن ہے۔ وہی سب سے زیادہ مار رہی ہے۔ اس کونہیں چھوڑنا۔''

اس کے ساتھ ہی ہمایوں اٹھ کر بھاگا۔اس کا یہ اقدام نہایت پُرخطر تھا لیکن خطرے کی پرواشاید اب ان تینوں کونہیں تھی......اور عادل کوتو بالکل بھی نہیں۔ایک لحظہ ضائع کیے بغیر وہ بھی ہمایوں کے پیچھے لپکا۔عقب سے مدثر نے انہیں Cover فائر دیا۔ عادل اور ہمایوں دوڑتے...... گرتے اور اٹھتے، برفیلے ٹیلے کی چوٹی پر پہنچ گئے۔وہ زخمی شیروں کی طرح پاؤندوں کے اس مورچے پر جھپٹے۔ یہاں ایک ایم جی 42 مشین گن تھی اور چھ کے قریب افراد تھے۔یہ سب نہایت سخت دل، لٹیرے اور قاتل تھے لیکن عادل اور ہمایوں کی دیوانی جھپٹ نے انہیں چند سیکنڈ کے لیے مسمرائز کردیا تھا۔ غالباً اسی کیفیت میں وہ اپنی خطرناک جرمن مشین گن کا بھرپور استعمال بھی نہیں کر پائے تھے۔عادل اور ہمایوں نے تین چار سیکنڈ کے اندر چالیس کے قریب گولیاں برسائیں اورانہیں بھون کررکھ دیا۔ان میں سے فقط ایک شخص جان بچا کر بھاگا، وہ پاؤندہ نہیں لگتا تھا۔ عادل نے اسے پہچان لیا۔وہ دراز قد ناصر تھا۔وہ حواس باختہ ہوکرمخالف سمت میں دوڑا۔ عادل نے ایک لحظہ ضائع کیے بغیراس کی پشت پر گولی چلائی۔رائفل میں سے ''ٹھک'' کی آواز نکل کررہ گئی۔میگزین خالی ہوچکا تھا۔دوسرا میگزین لگانے کی مہلت نہیں تھی۔ عادل رائفل کو نال کی طرف سے پکڑ کرناصر کے پیچھے بھاگا۔صرف پندرہ بیس قدم بھاگ کراس نے اسے جالیا۔وہ عادل کے نیچے اوندھا گرا اور ڈھلوان برف پر دونوں دور تک پھسل کرایک برفاب گڑھے میں گرے۔ یہاں گولیوں کی بوچھاڑیں بے اثر تھیں۔ناصر نے پلٹ کردیکھا تو اسے عادل کی آنکھوں میں اپنی موت نظر آئی۔اس سے پہلے کہ وہ

کچھ کہتا، عادل نے جنونی انداز میں رائفل کولاٹھی کی طرح ناصر کے سر پر رسید کیا۔آہنی دستے نے اس کی پیشانی پھاڑدی......وہ گھگیایا۔''عادے! میں نے کچھ نہیں کیا۔مم...... میں تولڑائی رکوانے لگا......''

''بکواس بند کر۔'' عادل چنگھاڑا۔''میں نے سب کچھ سنا ہے۔تُو قاتل ہے، غدار ہے۔ کتے کی موت ماردوں گا تجھے۔'' (یہ وہی نوری نت تھا جواس کے دل ودماغ میں بسا ہوا تھا) اس نے پے درپے رائفل کے دستے کی تین ضربیں اس کے سر پر لگائیں۔وہ لہو میں نہا گیا اور گھٹنوں پر گرگیا۔''تُو نے مارا ہے میری شہزادی کو......تُو نے۔'' عادل دیوانی آواز میں بولا۔ناصر کی آنکھوں میں ہراس اور دہشت کے سوااور کچھ نہیں تھا۔اس نے ایک بار پھراٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن اب وہ اس قابل نہیں رہا تھا۔عادل کی دواور ضربوں نے اس کی کھوپڑی توڑ ڈالی۔سرخ خون میں سفید مغز کی جھلک نظر آئی۔لالی گاؤں کا بددماغ چھوٹا چودھری زندگی کی رمق سے خالی ہوچکا تھا۔

چند سیکنڈ بعد ہمایوں اور مدثر بھی بھاگتے ہوئے عادل کے پاس پہنچ گئے۔ان تینوں کی ٹانگیں پنڈلیوں تک برفیلے پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔درحقیقت ایم جی 42 مشین گن والے مورچے پر قبضہ کرکے انہوں نے ایک بڑی کامیابی حاصل کرلی تھی۔یہ جگہ کافی بلندی پرتھی۔پاؤندوں کی باقی پوزیشنیں یہاں سے صاف دکھائی دے رہی تھیں۔اب اگر ایک بھرپور حملہ اور کیا جاتا تو نہ صرف پاؤندوں کا گھیرا ٹوٹ جاتا بلکہ وہ تہس نہس بھی ہوتے۔

عادل، ہمایوں اور مدثر کی غیرمعمولی دلیری وجانبازی نے کیمپ کے بچے کھچے افراد کے حوصلے بھی بڑھادیئے تھے۔قریباً دس مقامی وغیرمقامی افراد اب عادل اور ہمایوں کے ساتھ تھے اورمرنے یا مارنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ان کا لیڈر ورزشی جسم اور تمتماتے چہرے والا ایک نوجوان تھا۔اس کی آنکھوں میں آگ تھی اور پیشانی پرسرخ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ہمایوں کی خاموش آنکھوں میں ایک نیلی آگ تھی۔شاید وہی آگ جو پچھلے ساڑھے تین سو برس سے اس کے خون میں سفر کررہی تھی۔راجپوتوں کی عورتیں مرگئی تھیں اوروہ خود بھی مرگئے تھے۔عورتیں جوآج بھی مر گئی تھیں لیکن انتقام لینے والے ابھی زندہ تھے۔کیا آج وہ ادھورا کام مکمل ہوسکے گا؟ کیا آج وہ کام پایہ تکمیل کوپہنچ سکے گا؟ یقیناً ہمایوں کی آنکھوں جیسی آگ عادل کی آنکھوں میں بھی روشن تھی لیکن اسے اپنی آنکھیں نظر نہیں آرہی تھیں۔ہاں اپنے رخساروں پر رینگنے والے آتشیں آنسوؤں کی حدت وہ ضرور محسوس کررہا تھا۔سرسرمد اورشہزادی کی لاشوں کودیکھنے کے بعد زندگی اور موت میں اس کے لیے ایک ذرّے کا فرق بھی نہیں رہا تھا۔

''وہ بوکھلائے ہوئے ہیں،ہمیں ان کوسنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔'' ہمایوں مہیب آواز میں بولا۔

ایک پٹھان پورٹر نے کہا۔''اگرام دوٹولیوں میں بٹ جائے تو زیادہ اچھا ہے۔ایک ٹولی چکر کاٹ کردائیں طرف چلی جائے۔وہ وہاں سے فائرنگ شروع کرے توام سامنے سے ہلا بول دے۔''

ایک دوسرے شخص نے کہا۔''یا تھوڑا انتظار کیا جائے۔ان کوآگے آنے کا موقع دیا جائے۔''

تیسرے شخص نے کوئی اور بات کہی...... یہ باتیں جیسے کسی دور دراز گونج کی طرح عادل کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ وہ ہر حکمتِ عملی اور مصلحت کے مرحلے سے گزر چکا تھا۔اس کے کانوں میں بس شہزادی کی آخری ہنسی

تھی۔اس کی آنکھوں میں بس اس کی آخری جھلک تھی۔وہ اپنی رائفل سے نیا میگزین اٹیچ کر چکا تھا۔اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھے بغیر، ایک لفظ بھی کہے بغیر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور پاؤندوں کی پوزیشنوں کی طرف دوڑا۔ایک لمحہ ساکت رہنے کے بعد ہمایوں اور مدثر بھی اس کے پیچھے دوڑے۔اب باقیوں کے لیے بھی کوئی آپشن نہیں رہ گیا تھا۔ان سب نے ان تینوں کو فالو کیا...... للکارے مارتے اور گولیاں برساتے وہ پاؤندوں کی پوزیشنوں کی طرف دوڑے۔ سچ ہی کہتے ہیں کہ لڑائی کے میدانوں میں قسمت ہمیشہ دلیروں کا ساتھ دیتی ہے اور یہ تو دلیری سے بھی آگے کی بات تھی۔ ایک جنون...... ایک وحشت...... سامنے سے گولیوں کی باڑیں آئیں۔قرب و جوار اندھادھند دھماکوں سے گونجے۔ عادل، ہمایوں کے ساتھیوں میں سے دو تین افراد زخمی ہو کر گرے، باقی للکارتے ہوئے پاؤندوں کی پوزیشنوں پر جا پڑے۔ پہلے گولیاں چلیں پھر دست بدست لڑائی ہوئی۔ رائفلوں کی سنگینیں چمکیں، کلہاڑیاں لہرائیں۔ تیز دھار چاقو متحرک ہوئے۔ گوشت سے لوہا ٹکرایا، جسموں سے خون اچھلا...... جنون غالب آ گیا...... ہراس پسپا ہوتا چلا گیا، ہمیشہ سے ایسا ہوتا آتا ہے، ہمیشہ ایسا ہوتا رہے گا۔جن کی زندگیاں لٹ جاتی ہیں، جن کی کشتیاں جل جاتی ہیں، جنہیں اپنے پیاروں کو اپنے ہاتھوں سے مار کر اذیت ناک موت سے بچانا پڑتا ہے...... وہ پھر خود بھی زندگی سے دور چلے جاتے ہیں، ان کو مرنے کا ڈر نہیں رہتا...... اور تاریخ گواہ ہے جن کو موت کا ڈر نہیں رہتا، وہ اپنے دشمنوں کی زندگیوں کے مالک بن جاتے ہیں۔

پاؤندے تعداد میں کثیر تھے۔ان کے پاس وقتاً فوقتاً سیاحوں سے لوٹا ہوا اور بارڈر سے خریدا ہوا جدید اسلحہ تھا۔ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا شاید کہ ان پر ایسا مہلک ہلا بولا جائے گا۔ان میں سے بہت سے زخمی ہوئے۔ بہت سے موقع پر ہی مارے گئے اور باقی محاصرہ چھوڑ کر بھاگ نکلے۔موت کا سندیسہ لے کر سرسراتی ہوئی گولیوں نے ان کا تعاقب کیا اور وہ زخم کھا کھا کر برف پر گرے۔ان میں سے کم ہی تھے جو بچ کر نکلے۔ عادل دیوانوں کی طرح کسی کو ڈھونڈ رہا تھا۔وہ اُن کے سرغنہ مالکانے زادہ...... کو ڈھونڈ رہا تھا۔وہی بدخصلت شرابی جس نے لاہور کے گلی کوچوں تک اس کا تعاقب کیا تھا۔وہ عادل کے ماموں کا قاتل تھا اور عاصم کو شدید زخمی کرنے والا وہی تھا۔اس کے علاوہ شہزادی کو اس برفستان تک پہنچانے اور پھر زندگی سے دور کر دینے کی ذمے داری بھی اسی شیطان صفت شخص پر آتی تھی...... اور پھر وہ عادل کو مل گیا۔وہ گولیوں سے چھلنی ہو جانے والی لاشوں کے نیچے پڑا تھا اور خود بھی لاش میں تبدیل ہونے والا تھا۔اس کی ناف اور پیٹ میں پورا ایک برسٹ لگا ہوا تھا۔

عادل نے مزید دیکھا، مالکانے زادہ کے شرابی چہرے اور اس کی گردن پر کھرونچوں کے دو تین دن پرانے نشان تھے۔اس کے قریب ہی برف پر ایک جھمکا اور ایک زنانہ سینڈل بھی نظر آیا۔ یقیناً یہ سرکردہ پاؤندہ مقامی اور غیر مقامی عورتوں کی عصمت دری میں بھی ملوث رہا تھا۔ جھمکا تو کسی مقامی لڑکی کا تھا (ایسی کئی لڑکیاں سناترا برادری کے مقامی ''دوست خاندانوں'' میں شامل تھیں) سینڈل دیکھ کر عادل کو شک ہوا کہ یہ صحافی خاتون یا پھر اوتس کی بیٹی ڈورتھی کا ہے۔

مالکانے زادہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ایک حریص دنیا دار کی طرح وہ اب بھی جینا چاہ رہا تھا۔اس کی آنکھوں میں اب بھی بچ جانے اور جینے کی خواہش تھی۔ عادل کی آنکھوں میں شعلے تھے،اس نے رائفل اٹھائی اور

مالکانے زادہ کی اس خواہش کے درجنوں ٹکڑے کر دیئے۔اس نے اس بے رحم پاؤندے کے چہرے پر سیون ایم ایم کے دو برسٹ مارے اور اس کے نقوش اڑا کر رکھ دیئے۔اس کے بعد بھی وہ رکا نہیں، اس نے قریب پڑا ہوا ایک شکاری چاقو اٹھایا اور مالکانے زادہ پر پل پڑا۔وہ اس کی چھاتی پر پے در پے وار کرتا رہا اور پکارتا رہا۔''تُو نے میری شہزادی کی جان لی۔تُو نے سرسرمد کی جان لی......''

پھر یک دم اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ اس کے بازو پر دو گولیاں لگ چکی ہیں اور زخموں سے لگاتار خون بہتا رہا ہے۔وہ تو پہلے ہی شدید نقاہت اور ناتوانی کے گھیرے میں تھا۔خون کا مسلسل اخراج اسے بالکل نیم جان کر چکا تھا۔وہ تیورا کر مالکانے زادہ کی لاش کے اوپر ہی گرا۔بے ہوشی نے پھر اسے ڈھانپنا شروع کر دیا تھا۔وہ اس حالت میں بھی بڑبڑا رہا تھا۔''شہزادی...... شہزادی!'' کچھ دیر بعد اس کی بڑبڑاہٹ ختم ہو گئی۔

اس کے قریب ہی ہمایوں کسی مجسمے کی طرح ساکت و جامد کھڑا تھا۔اس کی سرخ انگارا آنکھوں میں اب نمی تھی۔وہ یک ٹک مالکانے زادہ کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔اس کے دل نے ہمیشہ یہ گواہی دی تھی کہ اس بدمعاش عامل کی رگوں میں انہی بے رحم قاتلوں کا خون ہے جنہوں نے زَن اور زمین کے لالچ میں اس کے قبیلے کو تاراج کیا تھا۔ مالکانے زادہ قاتلوں کا وارث تھا اور ہمایوں مقتولوں کا...... اور آج کئی صدیوں بعد وہ ایک نئے روپ میں ایک دوسرے کے سامنے موجود تھے۔

O......❖......O

عادل ایک بار پھر بے ہوشی کے حصار میں تھا۔اس حصار میں پھر نیم بے ہوشی کے چھوٹے چھوٹے وقفے بھی آ رہے تھے۔ایسے ہی ایک وقفے کے دوران میں اس نے ہیلی کاپٹر کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ محسوس کی...... اور اسے یوں لگا کہ اس کے زخمی بازو پر کوئی تیز دھار آلہ کٹ لگا رہا ہے۔اس نے خود کو کسی ہنڈولے میں جھولتے ہوئے محسوس کیا۔

پھر نیم بے ہوشی کا ایک وقفہ ایسا آیا جب اسے لگا کہ رات ہے اور وہ کسی تیز رفتار گاڑی میں سفر کر رہا ہے۔ملی جلی آوازیں تھیں جو گاہے بگاہے اس کی سماعت سے ٹکراتی تھیں۔سرسرمد اور شہزادی کی لاشوں کا منظر اس کے ذہن میں نہیں تھا لیکن یہ احساس ضرور موجود تھا کہ اس کے ساتھ کچھ بہت خوف ناک ہو چکا ہے۔کوئی بہت گمبھیر حادثہ۔ وہ عالم بے ہوشی میں بھی اس حادثے کا بوجھ اپنے سینے پر محسوس کر رہا تھا۔

ایک بار جب اس کی بے ہوشی کی شدت کم ہوئی، اس کے نتھنوں سے اسپرٹ کی تیز بو ٹکرائی، وہ کسی نرم بستر پر تھا...... اسے سرسرمد اور شہزادی کی لاشیں یاد آئیں...... اسے سر سے پاؤں تک ایک آتشیں غم نے ڈھانپ لیا۔کہیں وہ اس کا تصور تو نہیں تھا؟ جاگتی آنکھوں کا خواب تو نہیں تھا؟ وہ بری طرح تڑپا...... اس نے نیم بے ہوشی کے حصار سے نکلنے کی کوشش کی...... اور نکل آیا۔

اس کی دھندلائی ہوئی نگاہوں کے سامنے ایک سفید چھت تھی۔ دو تین افراد اس پر جھکے ہوئے تھے اور ان کے چہرے عادل کو اپنے سامنے نظر آ رہے تھے۔ان میں سے ایک چہرہ کسی نرس کا تھا۔سفید کوٹ والے ایک ادھیڑ عمر

شخص نے اپنا ہاتھ نرمی سے اس کے سینے پر رکھا اور بولا۔ ”نہیں...... لیٹے رہو...... ابھی اٹھنا تمہارے لیے ٹھیک نہیں۔“

وہ زور لگا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے زخمی بازو اور سر میں شدید ٹیس اٹھیں۔ اسے پہلا احساس یہی ہوا کہ اس کا جسم اب پہلے کی طرح مفلوج نہیں ہے۔ اس کا گلا آنسوؤں سے بھر گیا۔ وہ زور لگا کر بولا۔ ”میں کہاں ہوں...... ہمایوں کہاں ہے؟ تایا جی کہاں ہیں؟“

ادھیڑ عمر ڈاکٹر بولا۔ ”وہ بھی یہیں ہیں۔ وہ ابھی تم سے ملنے آتے ہیں لیکن ابھی تم لیٹے رہو۔“

”مجھے بتاؤ میں کہاں ہوں؟ باقی سب کہاں ہیں؟“ وہ چنگھاڑا۔

”تم اس وقت راولپنڈی کے اسپتال میں ہو۔ ہمایوں اور تمہارے تایا بھی یہیں ہیں......“

عادل کے ذہن میں سرسرمد اور شہزادی کی لاشوں کا منظر آسمانی بجلی کی طرح چمکا اور اس کی ہمت اور برداشت کو خاکستر کر گیا۔ وہ دلدوز لہجے میں پکارا۔ ”کہاں ہیں میرے سر؟ کہاں ہے شہزادی؟ میں ان کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہمایوں کو بلاؤ...... ہمایوں بھائی...... ہمایوں بھائی۔“ وہ چلانے لگا۔ دس پندرہ سیکنڈ پہلے اسے اپنی کلائی میں چبھن محسوس ہوئی تھی۔ شاید کلائی میں لگے ہوئے ”برانولا“ میں کوئی دوا انجیکٹ کی گئی تھی۔ اس دوا کا اثر تیزی سے اس کے خون میں شامل ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی پلکوں پر بوجھ محسوس کیا۔ ذہن میں دھندسی بھرنے لگی۔ اس نے بے قرار ہو کر بستر سے اٹھنے کی کوشش کی مگر بس ٹانگوں کو حرکت دے کر رہ گیا۔ کسی نے اس کی پشت پر مضبوطی سے ہاتھ رکھا اور اس کے گرتے ہوئے جسم کو سہارا دے کر بستر پر لٹا دیا۔

وہ عجیب سے شب و روز تھے۔ عالم بے خبری میں بھی اس کے ذہن میں یہ احساس موجود تھا کہ اسے گاہے بگاہے انجکشن لگائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے اس کا ذہن ایک سکون بخش تاریکی میں ڈوب جاتا ہے۔ ایک دوبار اسے یوں بھی محسوس ہوا کہ وہ سفر میں ہے پھر ایک بار اسے اپنے بالکل قریب ہی ہمایوں کی آواز بھی سنائی دی۔ اس نے اپنے حواس پر چھائی ہوئی دبیز دھند میں سے نکلنے کی کوشش کی اور جزوی طور پر کامیاب ہوا۔ اسے لگا کہ شاید وہ سرسرمد کے گھر میں ہے۔ اگر وہ سرسرمد کے گھر میں تھا تو پھر یقیناً لاہور پہنچ چکا تھا۔ کھڑکی سے باہر اسے ایک چھوٹا ٹریکٹر نظر آیا اور وہ سرسبز کھیت بھی نظر آیا جس میں سرسرمد اپنے ہاتھوں سے کام کیا کرتے تھے۔ اس کے گلے میں ایک بار پھر آنسوؤں کا آبشار گرنے لگا۔ ”ہمایوں بھائی...... کہاں ہو تم...... ہمایوں بھائی۔“

چند لمحے بعد اسے دروازے میں ہمایوں کی غمزدہ صورت نظر آئی۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے دس پندرہ روز سے شیو نہیں کی۔ اس کے ایک ہاتھ پر ابھی تک پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یہ پٹی یقیناً اس خون ریز لڑائی کا نتیجہ تھی جو نوبل راک کی قریبی ڈھلوانوں پر ان کے اور پاؤندوں کے درمیان ہوئی تھی۔ دروازے کی دوسری جانب سرسرمد کا ایک ملازم نظر آیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے فرش پر بیٹھا تھا اور غم واندوہ کی تصویر نظر آتا تھا۔

ہمایوں بستر پر بیٹھ گیا اور عادل کو گلے سے لگا لیا۔ دونوں سسک اٹھے۔ پندرہ بیس سیکنڈ اسی طرح بیٹھے رہے پھر عادل نے دلدوز آواز میں پوچھا۔ ”ہمایوں بھائی! کہاں چھپا دیا ہے میرے سر کو؟“

وہ آنسو پونچھ کر بولا۔ ”وہ جہاں بھی ہیں، بہت خوش ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ ہماری نسبت، بہت اچھی جگہ

پر ہیں۔ اللہ اپنے ایسے بندوں کو شاید ساری تکلیفیں دنیا میں ہی دے دیتا ہے۔“

عادل زار وقطار روتے ہوئے بولا۔ ”اور شہزادی......؟“

ہمایوں نے دلاسا دینے والے انداز میں اس کی پشت تھپکی اور اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ اسی دوران میں ادھیڑ عمر ڈاکٹر اور جواں سال نرس کی شکل دوبارہ نظر آئی۔ ڈاکٹر نے ذرا تحکم سے کہا۔ ”ہمایوں! آپ باہر جاؤ۔ میں نے کہا بھی ہے کہ ابھی اس کے لیے کوئی جذباتی ہلچل ٹھیک نہیں۔“

ہمایوں آنسو پونچھتا ہوا باہر نکل گیا۔ عادل کو اندازہ ہوا کہ نرس اسے پھر انجکشن لگانا چاہ رہی ہے۔ اس نے انجکشن لگوانے سے انکار کر دیا۔ تاہم ڈاکٹر نے اسے سمجھایا، بجھایا اور اصرار کر کے انجکشن لگا دیا۔ عادل خود بھی محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کا سر درد سے پھٹنے لگا ہے۔ شاید ابھی یہ انجکشن اس کے لیے ضروری تھے۔

O......❖......O

وہ ستمبر کی آخری تاریخوں کی ایک نیم خنک رات تھی۔ آج شاید عادل کو انجکشن نہیں لگایا گیا تھا۔ اس کے حواس پر چھائی ہوئی دبیز دھند آج کچھ چھٹی ہوئی تھی۔ وہ بستر پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کا ہاتھ ہمایوں کے ہاتھوں میں تھا۔ ہمایوں نے اسے بتا دیا تھا کہ سرسرمد نے کن حالات میں اور کیسے جان دی۔ اس نے بتایا تھا کہ آخری لڑائی سے دو دن پہلے، صبح کے وقت اس نے دیکھا تو سرسرمد اپنے خیمے میں موجود نہیں تھے۔ ان کی بیساکھیاں بھی کہیں نظر نہیں آئیں۔ وہ سر کو اِدھر اُدھر تلاش کرتا رہا پھر اسے سر کے بیگ کے نیچے ایک کاغذ دبا ہوا نظر آیا۔ یہ سر کا لکھا ہوا تھا۔ یہ خط کچھ اس طرح تھا۔

”ہمایوں اور کرسٹل! تم لوگ دیکھ ہی رہے ہو کہ حالات کیا سے کیا ہو گئے ہیں۔ اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں، بس قدرت کی طرف سے ایک سخت آزمائش ہے جو ہم پر آئی ہے۔ تم لوگوں نے دیکھ ہی لیا ہے، مالکانے زادہ اور اس کے ساتھی کچھ بھی سننے کو تیار نہیں۔ وہ بے دریغ مار رہے ہیں اور گھیرا تنگ کر رہے ہیں۔ ان کا پہلا مطالبہ یہی ہے کہ خناب گل کے قاتل کو ان کے حوالے کیا جائے...... وہ عادل کو مانگ رہے ہیں۔ شاید یہ بات تمہارے اور کرسٹل کے لیے انکشاف کی حیثیت رکھتی ہو کہ پچھلے تین روز سے میں مالکانے زادہ کے ساتھ رابطے میں ہوں۔ یہ رابطہ ایک واکی ٹاکی کے ذریعے ہو رہا ہے۔ میں نے مالکانے زادہ سے کہا تھا کہ دونوں طرف سے جانیں ضائع ہو رہی ہیں۔ میں نے اسے آفر کی تھی کہ اگر وہ خون کا بدلہ خون چاہتا ہے تو میں خود کو اس کے حوالے کرنے کو تیار ہوں لیکن شرط یہی ہے کہ وہ اس کے بعد محاصرہ اٹھا لے گا اور پکڑے جانے والوں کو بھی رہا کر دے گا۔ ہاں قیمتی سامان اور کیش وغیرہ کی صورت میں اس نے جو کچھ لوٹا ہے، وہ اس کے پاس ہی رہے گا۔

”آج رات مالکانے زادہ نے ایک دو مزید شرطوں کے ساتھ یہ آفر قبول کر لی ہے۔ تم لوگ مجھے معاف کرنا۔ میں مزید جانی نقصان سے بچنے کے لیے اور آبروریزی کے اس گھناؤنے سلسلے کو ختم کرنے کے لیے خود کو مالکانے زادہ کے حوالے کر رہا ہوں۔ مجھے پتا ہے

کہ مقتول خناب گل کا باپ رواج کے مطابق مجھے اپنے ہاتھ سے گولی مارنا چاہتا ہے۔ میں اس کے لیے بالکل تیار ہوں۔ میری عمر اس وقت ساٹھ سال ہے اور شکر الحمدللہ میں نے ایک بھرپور زندگی گزاری ہے۔ اگر اپنے بچے بچیوں کے لیے مجھے اپنی جان دینا پڑتی ہے تو میرے لیے اس سے اچھا سودا اور کوئی نہیں ہے۔ اندیشہ صرف ایک بات کا ہے اور وہ یہ کہ مالکانے زادہ اپنے وعدے سے پھرنے کی کوشش نہ کرے۔ یہ بات ممکن ہے کہ مجھے مارنے کے باوجود وہ کیمپ کا محاصرہ ختم نہ کرے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر تم لوگ اپنا فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہو لیکن میرے بچو! یہ میرے دل کی گواہی ہے کہ اگر پاؤندوں نے اور مالکانے زادہ یہ بدعہدی کی تو ان پر ضرور اللہ کی مار آئے گی۔ وہ بدترین شکست کا شکار ہوں گے اور تم دیکھ لینا ایسا ہی ہوگا۔ میں نے ایک خط علیحدہ سے اپنی شریکِ حیات فائزہ کے لیے بھی لکھ دیا ہے اور اس میں اسے ضروری ہدایات بھی دے دی ہیں۔ تم جانتے ہو، میں اس کی طرف سے بھی بالکل مطمئن ہوں۔

''اب میں جا رہا ہوں، اس خواہش اور دعا کے ساتھ کہ میری اس چھوٹی سی حقیر قربانی کے بدلے اللہ تعالیٰ تم بچوں کی زندگیوں کو محفوظ بنائے اور انہیں خوشیوں اور راحتوں سے بھر دے۔ خدا حافظ۔''

یہ خط پانے کے بعد ہمایوں دیوانہ سا ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ سرمد صاحب نے اپنی تحریر میں صاف لکھا تھا کہ وہ حجت پوری کر رہے ہیں، ورنہ انہیں اس بات کا شدید اندیشہ ہے کہ مالکانے زادہ کی طرف سے بدعہدی سامنے آ سکتی ہے اور پھر یہی ہوا۔ دن کا اُجالا پھیلنے کے کچھ ہی دیر بعد اوپر چٹانوں کے پیچھے گرانڈیل مالکانے زادہ نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ ایک اور مسلح شخص بھی تھا۔ مالکانے زادہ نے سرمد صاحب کو ایک ڈھال کی صورت میں اپنے سامنے رکھا ہوا تھا۔ مالکانے زادہ کی آٹومیٹک ایم 16 رائفل سر سرمد کی کنپٹی سے چھو رہی تھی۔ سر سرمد کا دوسرا بازو مالکانے زادہ کے ساتھی کی گرفت میں تھا۔

مالکانے زادہ نے مقامی زبان میں پکار کر کہا۔ ''چاچا یہ اکیلا خناب گل کا قاتل نہیں ہے۔ ہمایوں اور عادل بھی اس قتل میں برابر کے حصے دار ہیں۔ وہ بھی خود کو ہمارے حوالے کریں۔ اس کے بعد ہی ہم کوئی رعایت دے سکتے ہیں۔''

ہمایوں نے پکار کر کہا تھا۔ ''تم اپنی بات سے پھر رہے ہو۔ تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ تم سے کسی طرح کا سمجھوتا کیا جائے۔''

مالکانے زادہ بولا۔ ''اور تم بھی اس قابل نہیں ہو۔ تمہارے پاس ہے کیا، ہمیں دینے کے لیے؟ جو کچھ بھی ہے، وہ ہم اپنے زور پر حاصل کر سکتے ہیں۔ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر تھوڑی بہت بچت چاہتے ہو تو اپنے ہتھیار پھینک کر اور اپنے کمینے دوست کو لے کر اوپر آ جاؤ۔'' یہ مکالمہ دو چار منٹ جاری رہا۔ مالکانے زادہ اور اس کا تنومند ساتھی مسلسل اپنا دباؤ بڑھا رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ہمایوں اور عادل خود کو ان کے حوالے کر دیں ورنہ سرمد

صاحب کو شوٹ کر دیں گے۔ سرمد صاحب کی زندگی ہمایوں کے لیے ہر شے سے زیادہ عزیز تھی۔ اس وقت عادل بے ہوشی کی حالت میں تھا لیکن ہمایوں تو ہوش میں تھا اور اپنی آنکھوں کے سامنے جیتے جاگتے سرمد صاحب کو شدید خطرے میں دیکھ رہا تھا۔ وہ تذبذب میں تھا کہ کیا کرے۔ دوسری طرف شاید سرمد صاحب بھی جان گئے تھے کہ ان کی وجہ سے ہمایوں اور عادل کی زندگیاں داؤ پر لگ سکتی ہیں۔ انہوں نے اس ''بدلی ہوئی صورتِ حال'' میں وہی کیا جو ان جیسے بے خوف اور باہمت شخص کو کرنا چاہیے تھا۔ ہمایوں اور اس کے ساتھیوں نے دیکھا کہ اچانک سرمد صاحب کی ایک بیساکھی ہوا میں لہرائی اور تنومند شخص کے پستول والے ہاتھ پر لگی۔ اس جچی تلی ضرب نے پستول اس پاؤندے کے ہاتھ سے چھڑا دیا۔ سرمد صاحب اپنی بیساکھیوں سمیت پستول کے اوپر گرے۔ انہوں نے پلٹ کر دو فائر کیے اور خود پر جھپٹتے ہوئے پاؤندے کو ڈھیر کر دیا۔ مالکانے زادہ نے چنگھاڑ کر سرمد صاحب پر گولی چلائی۔ ایک فائر ان کے سینے پر لگا لیکن وہ کمال ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مالکانے زادہ پر جا پڑے۔ دونوں اوپر نیچے گرے اور گتھم گتھا ہو گئے۔

ہمایوں اور اس کے ساتھیوں نے آگے بڑھنا چاہا مگر پاؤندوں کی طرف سے اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ ہمایوں اور اس کے دیگر ساتھیوں میں سے دو افراد شدید زخمی ہو کر گرے۔ اس کے بعد انہوں نے بھی پوزیشنیں لے کر فائرنگ شروع کر دی۔ درمیان میں مالکانے زادہ اور سرمد صاحب کے بیچ زندگی موت کی لڑائی جاری تھی۔ سرمد صاحب ادھیڑ عمر تھے، مالکانے درمیانی عمر کا تھا اور نسبتاً جاندار بھی تھا۔ پھر بھی سرمد صاحب نے اس کی حیران کن مزاحمت کی۔ وہ پستول دوبارہ استعمال نہیں کر سکے تھے۔ شاید اس میں گولی پھنس گئی تھی یا پھر وہ ویسے ہی ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ اپنی پوری طاقت سے مالکانے زادہ کی رائفل کا رخ موڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر رائفل سے ایک اور گولی چلی۔ یہ گولی بھی سرمد صاحب کو چھاتی پر ہی لگی۔ ان لمحوں میں یوں محسوس ہوا جیسے سرمد صاحب مکمل طور پر زیر ہو گئے ہیں لیکن نہیں...... ابھی ان کی غیر معمولی سخت جانی و سخت کوشی انہیں سہارا دے رہی تھی۔ وہ شاید مرتے مرتے مالکانے زادہ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے اور پھر سب نے دیکھا کہ وہ کامیاب ہوئے۔ رائفل کا ایک پورا برسٹ چلا۔ اس میں سے چند گولیاں ہوا میں گئیں، زیادہ تر مالکانے زادہ کے پیٹ میں پیوست ہو گئیں۔ وہ پشت کے بل برف پر گرا۔ سرمد صاحب بھی اپنی اکلوتی صحت مند ٹانگ پر کھڑے نہ رہ سکے اور ڈھلوان پر لڑھکے اور پھسلتے ہوئے نیچے آ گئے۔ فائرنگ کے دوران میں ہی انہیں اٹھا کر مورچے میں لایا گیا۔ وہ سانس لے رہے تھے۔ ان کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا۔ اس وقت انہوں نے چند باتیں بھی کی تھیں۔ ان کی نگاہیں دور کہیں جیسے مستقبل کے پردوں کے پیچھے جھانک رہی تھیں۔ پیشانی پر انوکھی چمک تھی۔ انہوں نے ہمایوں کا ہاتھ دباتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا تھا۔ فکر نہ کرنا، یہ آزمائش اب زیادہ دیر نہیں چلے گی۔ میں دیکھ رہا ہوں، تم کامیاب رہو گے...... لیکن۔'' وہ کہتے کہتے رک گئے تھے۔ پھر سانس درست کر کے انہوں نے بات مکمل کی۔ ''میں اس میں عادل کا بھی کردار دیکھ رہا ہوں۔''

ہمایوں نے کہا تھا۔ ''مگر سر! وہ تو بے ہوش پڑا ہے۔''

انہوں نے دور کہیں دیکھتے ہوئے عجیب انداز میں کہا تھا۔ ''شاید وہ زیادہ دیر بے ہوش نہ رہے۔ اس کا بہت

جاتی ہے لیکن آج وہ محسوس کر رہا تھا، بے پناہ شدت اور وضاحت کے ساتھ۔ اسے لگا اس کی حرکتِ قلب تھم جائے گی۔

''ہمایوں بھائی! کہاں ہے شہزادی؟'' وہ خود کو سنبھال کر بہ مشکل یہ پانچ الفاظ کہہ پایا۔

پھر اس نے آنسوؤں کی جھلملاہٹ کی دوسری جانب دیکھا۔ دروازے میں شہزادی نمودار ہو رہی تھی۔ وہ ہلکے گلابی پھولوں والی سفید شلوار قمیص میں تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ابھی تک وہی چوڑیاں تھیں جو عادل نے بے ہوش ہونے سے پہلے صحافی لڑکی کے خیمے میں دیکھی تھیں۔ شہزادی کے چہرے کو ایک دلکش زردی نے ڈھانپ رکھا تھا۔ عادل کو کچھ پتا نہیں چلا، وہ کب بستر سے نیچے اُترا، کب اس نے دروازے تک کا فاصلہ طے کیا...... کب شہزادی کی گہری سیاہ آنکھوں میں جھانکا اور کب اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ وہ جیسے اس کے جسم کا حصہ بن گئی۔ اس کے اندر جذب ہو گئی۔ وہ دیدنی ملاپ تھا...... وہ دونوں رو رہے تھے۔ گردوپیش سے بے خبر ہو گئے تھے۔ شہزادی کے بال عادل کے چہرے پر بکھر رہے تھے۔ وہ اپنے ہونٹوں پر شہزادی کے بھیگے چہرے کی نمی محسوس کر رہا تھا۔ ہمایوں اٹھ کر خاموشی سے باہر نکل گیا تھا۔

O......❖......O

عادل کو اس سوال کا جواب قریباً دو گھنٹے بعد ملا جس نے اس کے دل و دماغ کی چولیں ہلا ڈالیں تھیں۔

ہمایوں اور عادل کو دوبارہ تنہائی ملی تو ہمایوں نے سرخ متورم آنکھوں کے ساتھ عادل کو بتایا۔ ''تمہیں یاد ہے عادل! تم نے خیمے میں اپنے بچھونے سے اٹھ کر لیوپڈ کے منہ پر اس کا گیس ماسک درست کیا تھا؟''

''ہاں ہمایوں بھائی! تھوڑا تھوڑا یاد ہے۔ اس وقت مجھے ٹھیک سے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔''

''عادل! میں نے اس وقت تمہیں دیکھ لیا تھا اور جان لیا تھا کہ تم ہوش میں آ گئے ہو۔ نہ صرف ہوش میں آ گئے ہو بلکہ تمہارا ''سکتہ یا فالج'' بھی بہت حد تک ختم ہو گیا ہے۔''

''تو تم نے مجھے بتایا نہیں کہ تم جان گئے ہو۔''

''تم نے بھی تو نہیں بتایا تھا۔ ہوش میں آنے کے باوجود آنکھیں بند کیے لیٹے رہے تھے۔''

''میں اس وقت خود کو بس تیس چالیس فی صد ہی ٹھیک محسوس کر رہا تھا۔ ہوش میں آ کر بھی میرا سر چکرا رہا تھا اور میرے ہاتھ پاؤں بے جان تھے ہمایوں بھائی۔''

ہمایوں نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''میرے دماغ میں وہی سب کچھ چل رہا تھا عادل جو سرمد نے بتایا تھا۔ ہم جانتے ہیں عادل کہ ان کی کہی ہوئی اکثر باتیں درست ثابت ہوتی ہیں...... اور انہوں نے کہا تھا کہ تم اس آزمائش سے نکلنے میں بڑا کردار ادا کرو گے...... لیکن کیسے؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے تمہیں بتایا ہی ہے، کچھ لوگ تو پاؤنڈوں کے ''گھیرے'' سے پہلے ہی کیمپ سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ باقی جو بچے ان میں سے پچیس کے قریب مر چکے تھے اور کوئی چالیس کے لگ بھگ زخمی پڑے تھے۔ پاؤنڈوں کا گھیرا تنگ ہو رہا تھا۔ کسی بھی لمحے سب کچھ ملیا میٹ ہو سکتا تھا اور پھر میرے ذہن میں وہ بات آئی جس کے لیے میں نے تم سے معافی مانگی ہے اور جسے میں اپنی سخت بے حسی ہی کہوں گا...... مجھے وہ ساری کہانی یاد آئی جو تاریخ کی کئی کتابوں میں درج ہے۔

ہندو سالار کا حملہ، راجپوتوں کا اپنی عورتوں کو ختم کرنا اور خود کٹ مرنا۔ وہ کہانی ہمیں بتاتی ہے کہ جب ظالم کا ظلم انتہا سے بڑھ جاتا ہے...... اور جنگ و جدل کا بازار گرم ہوتا ہے، کمزور گھیرے جاتے ہیں اور طاقتور گھیر لیتے ہیں تو پھر سب سے بڑی آفت بچوں اور عورتوں پر ہی آتی ہے۔ اس کہانی میں بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ وہ میری مائیں بہنیں نہیں تھیں...... لیکن میری ماؤں بہنوں جیسی تو تھیں۔ جب ان کے مردوں نے مجبور ہو کر انہیں اپنے ہاتھوں سے مار ڈالا تو پھر کیا ہوا؟ وہ خود بھی جیتے جی مر گئے اور انہوں نے اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھ لیے۔ اپنا سب کچھ لٹانے کے بعد وہ ایسی دیوانگی سے لڑے کہ انہوں نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ یہ اور بات ہے کہ آخری نتیجہ ان کے حق میں نہ نکلا اور وہ سب کے سب مارے گئے۔ لیکن ان کی جانفشانی نے دشمن کو لرزہ براندام کر دیا۔ وہ مدت تک ان کی دہشت کے اثر سے نہ نکل سکا۔ وہاں مجھے بھی یہی لگا عادل کہ موت کے اس گھیرے کو توڑنے کے لیے مجھے کم از کم دو تین ساتھیوں کی ضرورت ہے۔ ایسے ساتھی جو واقعی اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھ چکے ہوں اور موت جن کے لیے بے معنی ہو چکی ہو...... اور پھر میں نے وہ کیا جو اب تمہاری سمجھ میں آ چکا ہو گا۔ میں نے دل پر پتھر رکھ کر مدثر کو تینوں لڑکیوں کی موت کی اطلاع پہنچائی اور میں اس وقت جانتا تھا کہ تم بھی میری بات سن رہے ہو۔ مجھے پتا تھا کہ تم دونوں پر اور خاص طور سے تم پر شدید ترین ردِعمل ہو گا لیکن یہ ردِعمل پیدا کرنے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ اس وقت ہمیں ہوش نہیں، دیوانگی درکار تھی عادل! اور یہ دیوانگی ہمیں ملی۔ شاید یہی ایک وجہ ہے جس کے سبب میں خود کو قابلِ معافی سمجھ سکتا ہوں۔ تم سمجھ رہے ہو نا۔ ہم مر تو ویسے بھی رہے تھے...... اگر ہم سر دھڑ کی بازی لگا دیتے تو شاید کامیاب ہو جاتے اور پھر یہی ہوا عادل...... ہم نتائج سے بے پروا ہو کر بس ٹوٹ پڑے...... اور وہ کر دکھایا جو بہ ظاہر ناممکن تھا۔ جب ہم نے بلندی پر رکھی ہوئی ''ایم جی 42'' پر قبضہ کر دکھایا تو کیمپ کے بچے کھچے جوان بھی ہمارے پیچھے آئے اور بازی مکمل طور پر پلٹ دی۔''

عادل حیرت سے گنگ سن رہا تھا۔ اسے اپنے کانوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ اسے وہ قیامت خیز لمحے یاد آئے جب موت اسے ایک بے معنی چیز محسوس ہوئی تھی اور اس کے اندر بہنے والے آگ کے دریا نے اس کے سامنے آنے والی ہر چیز کو راکھ کر ڈالا تھا۔ وہ دونوں کتنی ہی دیر خاموش رہے۔ شاید ہمایوں کے ذہن میں بھی وہی مناظر چل رہے تھے تب ہمایوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں یاد ہے، میں نے ایک مرتبہ سرمد صاحب کے ایک جیکی نامی شاگرد کا ذکر کیا تھا؟'' عادل نے چند لمحے سوچ کر اثبات میں سر ہلایا۔ ہمایوں بولا۔ ''جو بچے کھچے لڑکے ہمارے ساتھ شریک ہوئے، ان میں سب سے آگے وہی جیکی تھا...... وہی جس نے ماتھے پر سرخ پٹی باندھ رکھی تھی۔ وہ بڑی بہادری سے لڑا عادی! وہ مارشل آرٹ کا ایک بہترین کھلاڑی بھی ہے۔ وہ اس مقابلے کے تماشائیوں میں بھی شامل تھا جو نوبل راک پر ہوا اور جسے تم نے جیتا۔''

''وہ اب کہاں ہے؟'' عادل نے پوچھا۔

''دو دن پہلے تک وہ یہیں تھا اور وہ نہیں سرمد صاحب کے شاگردوں اور بے شمار چاہنے والوں کا بھی یہاں تانتا بندھا رہا ہے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ سرمد صاحب کو چاہنے والے اور ان سے زندگی کے لیے راہنمائی حاصل کرنے والے باہر کی دنیا میں بھی موجود ہیں۔'' گھڑی کا الارم بجنے لگا۔

جاتی ہے لیکن آج وہ محسوس کر رہا تھا، بے پناہ شدت اور وضاحت کے ساتھ۔ اسے لگا اس کی حرکتِ قلب تھم جائے گی۔

''ہمایوں بھائی! کہاں ہے شہزادی؟'' وہ خود کو سنبھال کر بہ مشکل یہ پانچ الفاظ کہہ پایا۔

پھر اس نے آنسوؤں کی جھلملاہٹ کی دوسری جانب دیکھا۔ دروازے میں شہزادی نمودار ہو رہی تھی۔ وہ ہلکے گلابی پھولوں والی سفید شلوار قمیص میں تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ابھی تک وہی چوڑیاں تھیں جو عادل نے بے ہوش ہونے سے پہلے صحافی لڑکی کے خیمے میں دیکھی تھیں۔ شہزادی کے چہرے کو ایک دلکش زردی نے ڈھانپ رکھا تھا۔ عادل کو کچھ پتا نہیں چلا، وہ کب بستر سے نیچے اُترا، کب اس نے دروازے تک کا فاصلہ طے کیا...... کب شہزادی کی گہری سیاہ آنکھوں میں جھانکا اور کب اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ وہ جیسے اس کے جسم کا حصہ بن گئی۔ اس کے اندر جذب ہو گئی۔ وہ دیدنی ملاپ تھا...... وہ دونوں رو رہے تھے۔ گردوپیش سے بے خبر ہو گئے تھے۔ شہزادی کے بال عادل کے چہرے پر بکھر رہے تھے۔ وہ اپنے ہونٹوں پر شہزادی کے بھیگے چہرے کی نمی محسوس کر رہا تھا۔ ہمایوں اٹھ کر خاموشی سے باہر نکل گیا تھا۔

O......❖......O

عادل کو اس سوال کا جواب قریباً دو گھنٹے بعد ملا جس نے اس کے دل و دماغ کی چولیں ہلا ڈالیں تھیں۔

ہمایوں اور عادل کو دوبارہ تنہائی ملی تو ہمایوں نے سرخ متورم آنکھوں کے ساتھ عادل کو بتایا۔ ''تمہیں یاد ہے عادل! تم نے خیمے میں اپنے بچھونے سے اٹھ کر لیوپڈ کے منہ پر اس کا گیس ماسک درست کیا تھا؟''

''ہاں ہمایوں بھائی! تھوڑا تھوڑا یاد ہے۔ اس وقت مجھے ٹھیک سے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔''

''عادل! میں نے اس وقت تمہیں دیکھ لیا تھا اور جان لیا تھا کہ تم ہوش میں آ گئے ہو۔ نہ صرف ہوش میں آ گئے ہو بلکہ تمہارا ''سکتہ یا فالج'' بھی بہت حد تک ختم ہو گیا ہے۔''

''تو تم نے مجھے بتایا نہیں کہ تم جان گئے ہو۔''

''تم نے بھی تو نہیں بتایا تھا۔ ہوش میں آنے کے باوجود آنکھیں بند کیے لیٹے رہے تھے۔''

''میں اس وقت خود کو بس تیس چالیس فی صد ہی ٹھیک محسوس کر رہا تھا۔ ہوش میں آ کر بھی میرا سر چکرا رہا تھا اور میرے ہاتھ پاؤں بے جان تھے ہمایوں بھائی۔''

ہمایوں نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''میرے دماغ میں وہی سب کچھ چل رہا تھا عادل جو سر نے بتایا تھا۔ ہم جانتے ہیں عادل کہ ان کی کہی ہوئی اکثر باتیں درست ثابت ہوتی ہیں...... اور انہوں نے کہا تھا کہ تم اس آزمائش سے نکلنے میں بڑا کردار ادا کرو گے...... لیکن کیسے؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے تمہیں بتایا ہی ہے، کچھ لوگ تو پاؤنڈوں کے ''گھیرے'' سے پہلے ہی کیمپ سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ باقی جو بچے ان میں سے پچیس کے قریب مر چکے تھے اور کوئی چالیس کے لگ بھگ زخمی پڑے تھے۔ پاؤنڈوں کا گھیرا تنگ ہو رہا تھا۔ کسی بھی لمحے سب کچھ ملیا میٹ ہو سکتا تھا اور پھر میرے ذہن میں وہ بات آئی جس کے لیے میں نے تم سے معافی مانگی ہے اور جسے میں اپنی سخت بے حسی ہی کہوں گا...... مجھے وہ ساری کہانی یاد آئی جو تاریخ کی کئی کتابوں میں درج ہے۔

ہندو سالار کا حملہ، راجپوتوں کا اپنی عورتوں کو ختم کرنا اور خود کٹ مرنا۔ وہ کہانی ہمیں بتاتی ہے کہ جب ظالم کا ظلم انتہا سے بڑھ جاتا ہے...... اور جنگ و جدل کا بازار گرم ہوتا ہے، کمزور گھیرے جاتے ہیں اور طاقتور گھیر لیتے ہیں تو پھر سب سے بڑی آفت بچوں اور عورتوں پر ہی آتی ہے۔ اس کہانی میں بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ وہ میری مائیں بہنیں نہیں تھیں...... لیکن میری ماؤں بہنوں جیسی تو تھیں۔ جب ان کے مردوں نے مجبور ہو کر انہیں اپنے ہاتھوں سے مار ڈالا تو پھر کیا ہوا؟ وہ خود بھی جیتے جی مر گئے اور انہوں نے اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھ لیے۔ اپنا سب کچھ لٹانے کے بعد وہ ایسی دیوانگی سے لڑے کہ انہوں نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ یہ اور بات ہے کہ آخری نتیجہ ان کے حق میں نہ نکلا اور وہ سب کے سب مارے گئے۔ لیکن ان کی جانفشانی نے دشمن کو لرزہ براندام کر دیا۔ وہ مدت تک ان کی دہشت کے اثر سے نہ نکل سکا۔ وہاں مجھے بھی یہی لگا عادل کہ موت کے اس گھیرے کو توڑنے کے لیے مجھے کم از کم دو تین ساتھیوں کی ضرورت ہے۔ ایسے ساتھی جو واقعی اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھ چکے ہوں اور موت جن کے لیے بے معنی ہو چکی ہو...... اور پھر میں نے وہ کیا جواب تمہاری سمجھ میں آ چکا ہوگا۔ میں نے دل پر پتھر رکھ کر مدثر کو تینوں لڑکیوں کی موت کی اطلاع پہنچائی اور میں اس وقت جانتا تھا کہ تم بھی میری بات سن رہے ہو۔ مجھے پتا تھا کہ تم دونوں پر اور خاص طور سے تم پر شدید ترین ردِعمل ہوگا لیکن یہ ردِعمل پیدا کرنے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ اس وقت ہمیں ہوش نہیں، دیوانگی درکار تھی عادل! اور یہ دیوانگی ہمیں ملی۔ شاید یہی ایک وجہ ہے جس کے سبب میں خود کو قابلِ معافی سمجھ سکتا ہوں۔ تم سمجھ رہے ہو نا۔ ہم مر تو ویسے بھی رہے تھے...... اگر ہم سر دھڑ کی بازی لگا دیتے تو شاید کامیاب ہو جاتے اور پھر یہی ہوا عادل...... ہم نتائج سے بے پروا ہو کر بس ٹوٹ پڑے...... اور وہ کر دکھایا جو بہ ظاہر ناممکن تھا۔ جب ہم نے بلندی پر رکھی ہوئی ''ایم جی 42'' پر قبضہ کر دکھایا تو کیمپ کے بچے کھچے جوان بھی ہمارے پیچھے آئے اور بازی مکمل طور پر پلٹ دی۔''

عادل حیرت سے گنگ سن رہا تھا۔ اسے اپنے کانوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ اسے وہ قیامت خیز لمحے یاد آئے جب موت اسے ایک بے معنی چیز محسوس ہوئی تھی اور اس کے اندر بہنے والے آگ کے دریا نے اس کے سامنے آنے والی ہر چیز کو راکھ کر ڈالا تھا۔ وہ دونوں کتنی ہی دیر خاموش رہے۔ شاید ہمایوں کے ذہن میں بھی وہی مناظر چل رہے تھے تب ہمایوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں یاد ہے، میں نے ایک مرتبہ سرمد صاحب کے ایک جیکی نامی شاگرد کا ذکر کیا تھا؟'' عادل نے چند لمحے سوچ کر اثبات میں سر ہلایا۔ ہمایوں بولا۔ ''جو بچے کھچے لڑکے ہمارے ساتھ شریک ہوئے، ان میں سب سے آگے وہی جیکی تھا...... وہی جس نے ماتھے پر سرخ پٹی باندھ رکھی تھی۔ وہ بڑی بہادری سے لڑا عادی! وہ مارشل آرٹ کا ایک بہترین کھلاڑی بھی ہے۔ وہ اس مقابلے کے تماشائیوں میں بھی شامل تھا جو نوبل راک پر ہوا اور جسے تم نے جیتا۔''

''وہ اب کہاں ہے؟'' عادل نے پوچھا۔

''دو دن پہلے تک وہ یہیں تھا اور وہی نہیں سرمد صاحب کے شاگردوں اور بے شمار چاہنے والوں کا بھی یہاں تانتا بندھا رہا ہے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ سرمد صاحب کو چاہنے والے اور ان سے زندگی کے لیے راہنمائی حاصل کرنے والے باہر کی دنیا میں بھی موجود ہیں۔'' گھڑی کا الارم بجنے لگا۔

عادل کی دوا کا وقت ہوگیا تھا۔ ہمایوں نے اصرار کر کے اسے دوا کھلائی۔ اس کے بعد ان کی گفتگو جاری رہی۔ عادل نے نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔''ہمایوں بھائی! مجھے اور مدثر کو تو تمہاری ''اطلاع'' نے ہر خطرے سے بے نیاز کر دیا لیکن تمہیں کس چیز نے دیوانہ کیا؟''

وہ کئی سیکنڈ تک خاموش رہنے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا''میں نے تمہیں بتایا تھا نا عادل! میری دیوانگی بہت پہلے کی ہے...... شاید بدلے کی یہ آگ کئی نسلوں سے میرے اندر بھڑک رہی تھی۔ مجھے پتا تھا میرے پاس دو ہی راستے ہیں۔ کسی روز میں ان پاؤندوں سے ٹکراؤں گا اور اس آگ کو ٹھنڈا کروں گا یا پھر اس آگ میں خود جل مروں گا۔ ماکانے زادہ کو سر سرمد نے مارا...... اور تم نے اسے ٹھنڈا کیا لیکن مجھے اس سے اتنا ہی اطمینان ملا ہے، جتنا اپنے ہاتھوں سے اسے قتل کر کے ملتا۔ یقین کرو، مجھے یہی لگتا ہے کہ اسے اپنے ہاتھوں سے جہنم واصل کرنے کی میری خواہش پوری ہوگئی ہے۔''

دونوں کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر عادل نے ہمایوں سے پوچھا۔''کرسٹل کہاں ہے؟''

''وہ ائیرپورٹ گئی ہے۔ اپنے والدین کو سی آف کرنے کے لیے۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہیں مانی۔ سر کی موت نے اسے بہت دکھ پہنچایا ہے...... وہ ہر دوسرے روز ان کی قبر پر جاتی ہے اور دیر تک بیٹھی رہتی ہے۔''

''مدثر کہاں ہے؟'' عادل نے دریافت کیا۔

''وہ ابھی ایبٹ آباد کے اسپتال میں ہے۔ اس کے پیٹ میں ایک گولی لگی تھی اور بازو بھی شاٹ گن کی فائرنگ سے زخمی ہوا تھا۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہے۔ فیروزہ بھی اب صحت یاب ہے بلکہ اس کی تیمارداری بھی کر رہی ہے...... تمہاری طرح میں نے مدثر سے بھی ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی ہے۔ میں نے اسے فیروزہ کی موت کی جھوٹی اطلاع دی...... کسی وقت سوچتا ہوں کہ اگر تم دونوں میں سے کسی کو کچھ ہو جاتا تو میں خود کو کبھی معاف نہ کرتا...... زندگی بھر پچھتاوے کی آگ میں جلتا رہتا۔''

عادل نے کچھ دیر توقف کیا پھر گہری سانس لے کر بولا۔''نہیں ہمایوں بھائی! میں سمجھتا ہوں کہ تم نے جو کیا ٹھیک ہی کیا۔ وقت نے بھی ثابت کیا ہے کہ وہ ٹھیک ہی تھا۔ اس وقت ہمیں ہوش کی نہیں جوش کی...... بلکہ اندھے جوش کی ضرورت تھی۔ ہم ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر ان سے لڑے...... اور پھر ہمایوں بھائی اس ''بے نیازی'' میں تم بھی تو ہمارے ساتھ شریک تھے۔ تمہیں بھی تو کچھ ہو سکتا تھا؟ ہاں...... وہ جو ہوا ٹھیک ہی ہوا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو یقیناً ہم میں سے کوئی یہاں نہ ہوتا۔''

عادل اور ہمایوں کی گفتگو جاری رہی۔ ہمایوں کی باتوں سے پتا چلا کہ لیوپڈ، ڈورتھی اور صحافی لڑکی سمیت قریباً سولہ غیر ملکی اس مسلح تصادم میں جان سے گئے ہیں۔ پاؤندوں کے قبضے میں چلی جانے والی لڑکیوں کو بازیاب کرا لیا گیا ہے۔ لارڈ اوٹس اور ان کے ساتھی جو یہاں ایک سالانہ ایونٹ میں شرکت کے لیے آئے تھے، اپنے ساتھ سولہ تابوت لے کر واپس جا چکے تھے۔ شکر کا مقام یہ تھا کہ پاؤندوں کے گھیرے سے پہلے کچھ لوگ کیمپ سے نکلنے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ تاہم یہ لوگ شدید طوفان میں راستہ بھٹک کر راکاپوشی کی چوٹی کی طرف نکل گئے۔ وہ

صرف پانچ روز پہلے ڈھونڈے جا سکے تھے۔

اس مسلح تصادم میں اٹھارہ کے قریب مقامی لوگ بھی جان سے گئے تھے۔ ان میں سے کچھ سناترا برادری کی دوست فیملیز میں سے تھے۔ کچھ مقامی پورٹرز اور گارڈز تھے۔ دراز قد چودھری ناصر اور اس کے دو ساتھی بھی مرنے والوں میں شامل تھے۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد بھی تیس سے کم نہیں تھی۔ آخری لڑائی کے بعد پاؤندوں کی ہلاکتیں کافی بڑھ گئی تھیں۔ ہمایوں نے بتایا کہ محتاط اندازے کے مطابق پچاس کے قریب پاؤندے موقع پر ہی جان سے گئے تھے کچھ زخمی حالت میں پکڑے گئے تھے۔ ان میں رمزی بھی شامل تھا جو بعد ازاں دو تین مقدمات میں وعدہ معاف گواہ بنا۔ پولیس نے اس مسلح تصادم کے لیے دونوں طرف کے افراد پر مقدمات قائم کیے تھے۔ اس سنگین صورتِ حال کی زیادہ تر ذمہ داری یقیناً پاؤندوں پر ہی آئی تھی۔ ان کے خلاف لوٹ مار کی شکایات پہلے سے موجود تھیں۔ ان لوگوں کی گرفتاری کے لیے کئی جگہ چھاپے مارے جا رہے تھے۔ یہ اطلاعات بھی تھیں کہ ان میں سے کچھ لوگ پاک چائنا بارڈر کی طرف فرار ہو گئے ہیں۔

عادل اور ہمایوں، سرمد صاحب کی قبر پر پہنچے...... تا دیر وہاں بیٹھے رہے اور انہیں اشکوں کا نذرانہ پیش کرتے رہے۔ سرمد صاحب کی آخری آواز عادل نے وہیں کیمپ میں نیم بے ہوشی کے عالم میں سنی تھی۔ وہ الفاظ ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ سر سرمد نے ڈاکٹر سے مخاطب ہو کر کہا تھا''پلیز ڈاکٹر! عادل کے لیے کچھ کریں...... اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے۔''

اسے کچھ نہیں ہوا تھا لیکن وہ خود ہمیشہ کے لیے اس سے روٹھ گئے تھے۔

قبرستان سے واپسی کے بعد عادل اور ہمایوں جب سرمد صاحب کے گھر پہنچے تو وہاں پولیس کی دو گاڑیاں موجود تھیں۔ یہ لوگ ایک ڈی ایس پی کی قیادت میں آئے تھے۔ سرمد صاحب کے چاہنے والوں میں شہر کے ایک نامور ایڈووکیٹ اقبال ملک بھی شامل تھے۔ وہ بھی ہمایوں وغیرہ کی معاونت کے لیے موقع پر موجود تھے۔ انہوں نے عادل کو بتایا کہ پولیس اس کا بیان قلم بند کرنا چاہتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمایوں، کرسٹل اور تایا فراست سے بھی کچھ سوال جواب کیے جانے تھے۔

یہ ساری کارروائی مکمل ہونے میں کئی گھنٹے لگے۔ پولیس شام کے بعد واپس گئی۔ ہمایوں نے سب کو بتایا کہ اقبال ملک اور ان کی ٹیم کے ہوتے ہوئے انہیں قانونی معاملات میں کسی طرح بھی پریشان نہیں ہونا چاہیے۔

قراقرم کے اس برفیلے ویرانے میں ہونے والے مسلح تصادم کو اب کئی روز ہو چکے تھے، اس کے باوجود کئی اخبارات میں اس واقعے کے بارے میں چھوٹی موٹی خبریں آ رہی تھیں۔ نوبل راک اور اس پر ہونے والے کلائمبنگ کے مقابلے کو بھی موضوع بنایا جا رہا تھا۔ جرنلسٹ ڈھونڈ ڈھونڈ کر خبریں لا رہے تھے۔ اس شاندار فائنل مقابلے کا ذکر بھی ہو رہا تھا جو لالی گاؤں کے ایک بے نام نوجوان نے جیتا تھا۔ قریباً 1600 فٹ کی وہ خطرناک ترین چڑھائی جس میں اس نے بڑے بڑے نامور ''راک کلائمبرز'' کو چاروں شانے چت کیا تھا۔ وہ غریب اور بے آسرا تھا...... غیر تربیت یافتہ تھا۔ اپنے حریفوں کی طرح اسے دنیا کے بہترین کوچز کی خدمات بھی حاصل نہیں تھیں۔ اسے بس کھجور کے سوکھے تنوں پر چڑھنا آتا تھا، لیکن اس کے اندر خدا کی عطا کردہ بے مثال صلاحیت موجود تھی۔ پھر اسے ایک فن

شناس ملا۔اس نے چند ماہ میں اسے مٹی سے سونا بنایا اور یہ سونا نوبل راک کی بلندیوں پر یوں چمکا کہ سب کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔غربت اور فاقہ کشی کے مارے ہوئے اس بے نام نوجوان کا نام عادل تھا۔اس مقابلے کے بعد جو کچھ ہوا، وہ بھی زندگی کا حصہ ہی تھا۔انسان مشکلات کا ایک دریا ہاتھ پاؤں مار کر پار کرتا ہے تو اس کے سامنے ایک دوسرا دریا موجود ہوتا ہے۔پاؤنڈوں کا آنا بھی تو ایک دوسرے دریا کی طرح ہی تھا مگر سرسرمد کے مشکل پسند شاگرد اس دوسری آفت سے بھی سرخرو ہو کر نکلے تھے۔انہوں نے نہ صرف خود کو بچایا بلکہ کئی غیر ملکی خواتین کی عزت و آبرو کے سامنے بھی ڈھال بن گئے۔

O.....❖.....O

موسم بدل گیا......گرمی اور حبس کے مہینے گزر گئے۔دھوپ سنہری اور نرم ہوگئی۔یہ نومبر کی آخری تاریخیں تھیں......زخموں پر کھرنڈ آرہے تھے لیکن تین اموات ایسی تھیں جنہیں عادل اب بھی نہیں بھولا تھا۔پہلی موت سرسرمد کی تھی، دوسری ماموں طفیل اور تیسری شہزادی کے بھائی قاسم کی۔وہ غیرت کے طوفانی ریلے میں سینہ تان کر نکلا اور پاؤنڈوں کی گولیوں کا شکار ہوا۔شہزادی بھی ابھی اس غم سے پوری طرح نہیں نکل پائی تھی۔کہتے ہیں کہ جو مر جاتے ہیں، ان کے لیے آہستہ آہستہ صبر آنا شروع ہو جاتا ہے لیکن جو کھو جاتے ہیں، وہ مستقل درد بن کر دل میں رہتے ہیں۔عادل کے گمشدہ دوست صادق کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔اس کا ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا تھا۔اسے مالاکانے زادہ نے پک اَپ سمیت لاہور کے مقام شاہدرہ سے اغوا کیا تھا اور پھر وہ لاپتا ہو گیا تھا۔عادل اب تک اس کی تلاش جاری رکھے ہوئے تھا۔آج کل عادل لاہور میں تھا۔

گاؤں میں بھی حالات دھیرے دھیرے معمول پر آرہے تھے۔ناصر کی موت کے بعد اس کے باپ چودھری مختار پر فالج کا حملہ ہوا تھا اور اب وہ بستر پر تھا۔مختلف کیسوں میں قانونی کارروائی بھی معمول کے مطابق چل رہی تھی۔بہرحال تایا فراست نے اب گاؤں چھوڑ کر لاہور میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔وہ حویلی جو عادل نے گاؤں میں بنوانا تھی، اب وہ لاہور میں بنوا رہا تھا......اس نے سرسرمد کی رہائش گاہ کے بالکل ساتھ ایک بڑا قطعۂ زمین حاصل کر لیا تھا اور اس پر عین سرسرمد کے گھر کی طرز پر ایک گھر بنوا رہا تھا۔اس میں بہت سی جگہ کھلی چھوڑی گئی تھی جس میں پھلواریاں تھیں، پھل دار پودے تھے اور اناج بونے کے لیے رقبہ تھا۔

ایک شام جب وہ، ہمایوں اور کرسٹل زیرِتعمیر گھر میں بیٹھے چائے پی رہے تھے، عادل نے کہا۔''ہمایوں بھائی! دو سوال اب بھی میرے ذہن میں کھٹکتے رہتے ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ شروع میں تمہارے بارے میں پتا چلا تھا کہ تم بچپن میں ہی اپنے والدین کے ساتھ انگلینڈ چلے گئے تھے اور وہاں کئی سال رہنے کے بعد پاکستان آئے لیکن بعد میں پتا چلا کہ والدین کی وفات کے بعد تم بلتستان میں ہی رہے۔محنت مشقت کی اور پہاڑوں پر اپنی روزی ڈھونڈتے رہے۔''

''اس سوال کا جواب کافی لمبا ہے عادل! مختصر یوں سمجھ لو کہ آج سے کوئی دس سال پہلے جب میں سولہ سترہ سال کا لڑکا تھا، مانسہرہ کے قریب ایک پاؤنڈے کے ساتھ میری لڑائی ہوئی اور وہ بھاگنے کی کوشش میں ایک کھائی میں گر کر مارا گیا۔اس کے بعد سے مجھے اپنی شناخت چھپانا پڑی۔میرا لڑکپن کا نام بھی ہمایوں نہیں آفتاب تھا۔

بہرحال یہ ایک علیحدہ کہانی ہے، تمہیں کبھی آرام سے بتاؤں گا......اور دوسرا سوال کیا ہے تمہارا؟''

عادل نے ایک گہری سانس لی۔''دوسرا سوال سرسرمد صاحب کے بارے میں ہے ہمایوں بھائی! میں نے ان کا آخری خط دیکھا ہے۔اس میں ایک جگہ انہوں نے تمہیں مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے......میں نے ایک خط علیحدہ سے اپنی شریکِ حیات کے لیے بھی لکھ دیا ہے، تم جانتے ہو کہ میں اس کی طرف سے بھی پوری طرح مطمئن ہوں......اس کی طرف سے مطمئن ہونے کا کیا مطلب ہے؟''

ہمایوں نے اس سوال کا طویل جواب دیا۔اس کا خلاصہ یہ تھا کہ سرمد صاحب کے خاص طرزِ زندگی اور مشکل پسندی کی وجہ سے ان کی بیوی علیحدہ گھر میں رہنے لگی تھی۔اس کا خیال تھا کہ ایک دن سرمد صاحب اپنا درویشی ڈیرا چھوڑ کر اس کے پُر آسائش گھر میں آجائیں گے لیکن کئی سال گزرنے کے بعد بھی ایسا نہ ہوا۔آخر ان کی شریکِ حیات کو اپنا رویہ بدلنا پڑا۔وہ گاہے بگاہے ان سے ملنے اور ان کے ساتھ رہنے کے لیے آنے لگی۔اپنی زندگی کے آخری تین چار سال میں سرمد صاحب کو اس سے کوئی شکوہ نہیں رہا تھا۔

ابھی عادل اور ہمایوں وغیرہ کی گفتگو جاری ہی تھی کہ ایڈووکیٹ اقبال ملک ایک ڈی ایس پی کے ساتھ عادل کے زیرِتعمیر گھر میں داخل ہوئے۔وہ کمرے کے دروازے پر پہنچے تو عادل بھونچکا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ان کے ساتھ ایک دبلا پتلا نوجوان تھا جس کی چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی تھی۔اسے پہچان کر عادل ششدر رہ گیا۔وہ صادق تھا۔صادق اور عادل کا ملاپ دیدنی تھا۔دونوں دیر تک ایک دوسرے کے گلے لگے رہے۔آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

ایڈووکیٹ اقبال ملک کی زبانی معلوم ہوا کہ ایبٹ آباد میں جو چند پاؤنڈے زیرِحراست تھے، ان میں سے ایک نے پچھلے ہفتے اپنی زبان کھولی اور اس سے پتا چلا کہ لاہور سے اغوا شدہ صادق، اسکردو کے ایک قریبی دیہات میں موجود ہے۔مقامی پولیس نے اس اطلاع پر فوری چھاپا مارا اور صادق کو برآمد کر لیا۔

اداسیوں کے موسم میں یہ عادل کے لیے خوشگوار ہوا کا ایک جھونکا تھا۔صادق نے جو روداد سنائی، وہ ان اندازوں کے عین مطابق تھی جو عادل اور ہمایوں وغیرہ نے اب تک لگائے تھے۔مالاکانے زادہ اور اس کے ایک ساتھی نے صادق پر بے رحمی سے تشدد کیا تھا۔اس کے پاؤں، پنڈلیوں اور کمر پر چھڑیوں سے پیٹے جانے کے پرانے نشان موجود تھے۔عادل اور صادق رات گئے تک بیٹھے رہے۔کرسٹل اور ہمایوں بھی ان کے ساتھ تھے۔بہت سی باتیں ہوئیں اور دل کے بوجھ ہلکے کیے گئے۔

آدھی رات کے بعد ہمایوں نے صادق کو لیا اور چند قدم طے کر کے سرسرمد والے گھر میں چلا گیا۔نحیف و نزار صادق کو آرام کی ضرورت تھی۔زیرِتعمیر گھر کے کمرے میں عادل اور کرسٹل اکیلے رہ گئے۔

کرسٹل نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔''عاڈل! آج کئی مہینوں کے بعد ہام اپنے دل میں تھوڑا سا Happiness محسوس کر رہا ہے۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ توم بھی Happiness محسوس کرتا۔آج تمہارا کھویا ہوا فرینڈ صادق توم سے دوبارہ ملا۔

اِٹ اِز رئیلی وَنڈر فل۔ ہام بہت خوش۔"

عادل غور سے کرسٹل کو دیکھتا رہا۔ آج کافی عرصے بعد اس نے اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر زندگی کے آثار دیکھے تھے۔ وہ کافی بدل چکی تھی۔ اب زیادہ تر مشرقی لباس پہنتی تھی۔ عادل نے اسے انگلش ترجمے والا قرآن مجید پڑھتے بھی دیکھا تھا۔ اب بھی اس کے سر پر ایک شال نظر آ رہی تھی۔

عادل گہری سانس لے کر ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ "کرسٹل! کہتے ہیں کہ جب کوئی بہت خوش ہو تو اس سے کچھ مانگا جا سکتا ہے...... اور وہ اکثر دے دیتا ہے۔"

"ہام نے بھی یہ سنا لیکن...... تو م کیا لینا مانگتا؟" وہ سادگی سے بولی۔

عادل نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ "تمہیں یاد ہے کرسٹل، تم نے بانگڑی چوٹی کی طرف جانے سے پہلے ایک رات مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا...... تم نے کہا تھا...... مجھے بتاؤ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ اور میں نے کہا، وقت آنے پر بتاؤں گا۔ تمہیں یاد ہے؟"

اس کی آنکھوں میں سوچ کی لکیریں ابھریں۔ پھر ہولے سے مسکرائی اور سر ہلا کر بولی۔ "یس عادل! ہام، تو م کا بات سمجھ رہا۔ ہام کو یاد ہے لیکن...... تو م...... کیا مانگنا چاہتا؟"

عادل نے اس کی خوب صورت آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "کرسٹل! میں تم کو مانگنا چاہتا...... اپنے دوست ہمایوں کے لیے...... ہاں کرسٹل! میں تمہیں اس کی زندگی میں دیکھنے کی شدید خواہش رکھتا ہوں۔ وہ بہت خاموش ہے۔ سمندر کی طرح گہرا اور بھیدوں بھرا۔ وہ تم سے بہت پیار کرتا ہے لیکن زندگی بھر تمہیں اس پیار کا پتا نہیں چلنے دے گا۔ کبھی کوئی درخواست، کوئی التجا اپنی زبان پر نہیں لائے گا لیکن میں اس کے دل کا حال اچھی طرح جانتا ہوں۔ سمجھو کہ وہ انسانوں کے ایک خاموش قبیلے کا فرد ہے۔ اس قبیلے کے لوگ اپنی محبتوں کو اپنے سینوں میں دفن رکھتے ہیں...... ساری زندگی خاموشی کی آگ میں جلتے رہتے ہیں اور اکثر راکھ ہو جاتے ہیں۔"

کچھ باتیں کرسٹل کی سمجھ میں آئیں، کچھ نہیں آئیں لیکن عادل کا مدعا وہ سمجھ گئی تھی۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں گہری سوچ نظر آنے لگی تھی۔ عادل التجا آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑے بھاری لمحے تھے۔ عادل کو لگا، شاید اسے کرسٹل کو قائل کرنے کے لیے ابھی طویل کوشش کرنا پڑے گی۔ دلیلوں اور وضاحتوں کا سہارا لینا پڑے گا لیکن جو کچھ ہوا، وہ بالکل اچانک تھا۔ جیسے ایک پہلے سے پکا ہوا پھل، نسیم سحری کے ہلکے سے جھونکے سے جھولی میں آ گرتا ہے۔

کرسٹل نے عادل کا ہاتھ تھاما۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں نمی چمکی...... اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ شاید وہ پہلے سے سب کچھ جانتی تھی۔

"ٹھیک ہے عادل!" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "لیکن اس کے لیے ہام کی بھی ایک کنڈیشن ہے۔"

"بتاؤ کرسٹل!" اس نے بے تابی سے کہا۔

"تو م اور شہزادی کا شادی پہلے ہوئیں گا۔ اسی دسمبر میں۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

عادل نے اثبات میں سر ہلانے میں دیر نہیں کی تھی۔

Pakistanipoint.com
Waqar Azeem

ہوا کے ایک سرد جھونکے سے کمرے کی کھڑکی کھل گئی۔ رات کی رانی کی مدھر خوشبو سر سرمد کے گھر کے باغیچوں سے اٹھ کر آئی اور کمرے میں بھر گئی۔ یہ پورے چاند کی، سرد رات کا آخری پہر تھا۔ عادل اور کرسٹل نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ تیس چالیس قدم کے فاصلے پر سر سرمد کے گھر کا وسیع و عریض احاطہ نظر آ رہا تھا۔ ان دونوں نے خاموش طبع ہمایوں کو دیکھا۔ اس نے اتنی ٹھنڈ میں بھی معمولی سی پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ اس نے کسی دیہاتی محنت کش کی طرح قمیص کی آستینیں چڑھا رکھی تھیں اور ایک گیلن کے ذریعے اس چھوٹے سے ٹریکٹر میں ڈیزل ڈال رہا تھا جو پچھلے کئی ماہ سے بند پڑا تھا۔ ڈیزل ڈالنے کے بعد اس نے ٹریکٹر کی جھاڑ پونچھ کی اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا۔ تھوڑی سی کوشش سے انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ ہیڈ لائٹس میں ایک کھیت روشن ہو گیا۔ اس کھیت میں گھاس اُگ آئی تھی اور یہ کچھ ویران دکھائی دینے لگا تھا۔ ہمایوں یقیناً اس کھیت کو پھر سے آباد کرنا چاہ رہا تھا، ایک نئے عزم اور ارادے کے ساتھ۔

ابھی بہت اندھیرا تھا...... ابھی بہت سردی تھی۔ ابھی تو بستر میں گھسے رہنے کو ہی دل چاہتا تھا لیکن "دل کی چاہت" ہی کو تو سر سرمد نے ختم کرنا سکھایا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ دنیا کی عظیم کامیابیاں نفس کی چاہت کے پیچھے چھپی ہوتی ہیں۔ نفس کی چاہت کو ریزہ ریزہ کر دو...... کامیابیاں سامنے نظر آئیں گی۔

ہمایوں نے ٹریکٹر آگے بڑھایا اور کھیت میں داخل ہو گیا۔

O......ختم شد......O